دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ

ماھنامہ

جاسوسی ڈائجسٹ

کراچی

اپریل 2021



صفحات 290

قیمت 100 روپے





پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی



عزیزان من...... السلام علیکم!

اپریل کا شمارہ حاضرِ خدمت ہے۔ کورونا کی پہلی لہر آئی اور گزر گئی۔ الحمدللہ کہ ملکِ عزیز پر اللہ کا خاص کرم رہا۔ دنیا کے بہت سے ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں یہاں جانی نقصان کم بلکہ بہت کم رہا۔ اس دوران میں گھروں، بازاروں اور دیگر اجتماعی مقامات پر عوام خاصے بے فکر اور توکل علی اللہ کے قائل نظر آئے۔ مصافحہ کرنا...... بغل گیر ہونا...... بھیڑ بھاڑ میں گھومنا...... سب کچھ ہی چلتا رہا۔ بیشتر لوگ ماسک کو کوئی اہمیت دینے کو تیار نہیں تھے مگر بلا ٹھی الحمدللہ...... بخیر گزشت...... وہ دور گزر گیا اب اس وبا کی دوسری لہر آئی ہے جو پہلی سے زیادہ خطرناک ہے۔ مہینوں سے بند تعلیمی ادارے کھولنے کا فیصلہ ہوا مگر پنجاب کے کئی اضلاع میں کورونا کے تیز وار ہوتے دیکھ کر یہ ادارے دو ہفتوں کے لیے بند کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ دیگر صوبوں میں طلبا کی پچاس فیصد حاضری کے ساتھ ادارے کھلے رہیں گے۔ یہ بڑی جاں گسل آزمائش ہے۔ سرکاری اعداد و شمار میں اس وبا کا ہر شکار صرف ایک نمبر ہے جس کی یومیہ گنتی جاری کی جاتی ہے لیکن اپنے گھر والوں، پیاروں، دوستوں اور عزیزوں کے لیے وہ ایک انمول ہستی ہوتا ہے۔ آپ اور ہم سب اسی گنتی میں آتے ہیں۔ احتیاط...... احتیاط اور احتیاط کیجیے...... ماسک استعمال کریں...... پُرہجوم مقامات اور تفریحات سے گریز کریں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو اس امتحان سے سُرخرو گزارے...... آمین۔

آیئے اپنی محفل میں چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں وہاں کون سی ہنگامہ خیزیاں جاری ہیں۔

پرویز احمد لانگاہ کا جامشورو سے درہم برہم کرتا تبصرہ ”لو بھئی حسینو اور ان کے بھائی کمینو! میں پھر سے سب درہم برہم کرنے آگیا ہوں پر چل رہن دے۔ ایک وقت تھا کہ نیا شمارہ ہمیں سعودیہ میں ہونے کی وجہ سے دو دو ماہ بعد میں جا کر ملا کرتا تھا اور اب کمال دیکھیں کہ مارچ کا شمارہ بھی فروری میں مل جاتا ہے پر چل رہن دے؟ سرورق پر غریبوں کی ایشوریا راے سر پر کفن باندھے دولہا کی تلاش میں نکلنے کو تیار ہے کیونکہ نئے سال کے بھی تین مہینے گزر گئے لیکن وہ شوہر نہیں ملا جسے خلاص کر سکوں، پر چل رہن دے۔ نیچے والا عدنان سمیع خان خود کو اصلی کیپٹن سمجھ کر ایکشن دکھا رہا ہے پر چل رہن دے۔ پہلی نشست پر کنول صاحبہ تاؤ کھاتی دکھائی دیں، سانسیں بے حال تھیں لیکن تبصرہ کمال تھا پر چل رہن دے؟ دوسرے تبصرے میں ظہیر ملک مکھن لگا کر کلیجا ساڑتے نظر آئے پر چل رہن دے۔ میری بہو ایمانے تو مشکل پسند ہوتی جارہی، ایسے چن چن کے تبصرے کرنے لگی ہے کہ دماغ ہاتھ جوڑ کر کہتا ہے چل رہن دے۔ باقی تبصرے بھی اچھے تھے اور جس جس نے میرے تکیے اور کلام پسند کیے، ان سب کا شکریہ، آپ سب کی محبتوں اور پسندیدگی پر لانگاہ کبھی بھی نہیں کہہ سکتا چل رہن دے۔ مغل صاحب کی مختصر کہانیوں کا میں نے ایسا علاج نکالا ہے جس پر سب عوام درہم برہم ہو کر رہ جائے گی اور میں کہوں گا سالوں کی پر چل رہن دے۔ میں اب دو دو چھوٹی کہانیاں اکٹھا پڑھتا ہوں، مزہ بھی آتا ہے اور کسی حد تک قسط وار کی کمی کی شکایت بھی دور ہو جاتی ہے لیکن دل تو بچہ ہے جی وہ ونس مور کی ڈیمانڈ کرتا ہے اور اس کو بالکل بھی نہیں کہا جاسکتا چل رہن دے۔ الاؤ کی پچھلی قسط پڑھ کر حیران ہوا کہ ڈاکٹر سیف بھی نیو خان ائر لائن استعمال کرتا تھا جو کبھی کی سواری بھی اٹھا لیتی تھی۔ پاکستان، اٹلی کے مسافروں کی اکٹھی پرواز تو حیران کن تھی ہی اس سے زیادہ حیرت اس بات پر ہوئی کہ ایسا سیم ٹو سیم سین آوارہ گرد میں بھی بھٹی صاحب لکھ چکے پر چل رہن دے۔ اس قسط میں انہوں نے انڈیا کو پتا نہیں کیا بنا دیا ہے کہ مہینے گزرنے کے باوجود کوئی جہاز گرنے کا سراغ لگانے نہیں آیا پر چل رہن دے۔ امجد جاوید کی انا گیر کا آغاز اچھا تھا لیکن اب پڑھنا نہ پڑھنا برابر ہو گیا اور دل کہتا ہے چل رہن دے۔ اس بار کچھ بہتری نظر آئی ہے پر چل رہن دے۔ قسط وار اگر مغل صاحب نہیں لکھ رہے تو ناصر ملک سے لکھوا لیں۔ اپنی روبینہ رشید بھی اچھا لکھتی ہیں ان کی خدمات حاصل کی جاسکتیں۔ (ان کی خدمات حاصل کی جاچکی ہیں مگر اب وہ چاہتی ہیں، ہم خدمت کریں۔ ہم تیار ہیں...... وہ ہاتھ تو آئیں) عمدہ پلاٹ، بہترین منظر کشی اور لفظوں کا جادو جگانا تو کوئی مودی صاحب کی بیگم نجمہ مودی سے سیکھے لیکن آج کل کے رائٹر کہتے چل رہن دے۔ چہرہ چور جیسی کہانیوں نے ابھی تک جاسوسی سے باندھ کر رکھا ہوا ہے، نجمہ مودی اور امجد رئیس کو تو ہر ماہ جاسوسی میں رکھا کریں لیکن آپ اس مشورے پر بھی کہتے چل رہن دے۔ ایچ اقبال واپسی کے بعد تھوڑے ماٹھے ہو گئے ہیں، جرم و سزا پر اچھا

لکھتے ہیں اور اس ماہ بھی بھول تماشا نام کی ایک زبردست کہانی لکھتے لکھتے پٹری سے اتر گئے پر چل رہن دے۔ یعقوب بھٹی نے لہولہان رشتے میں کمال کا ایکشن و سسپنس رکھا اور کہانی پسند آئی۔ ایسے ہی رنگ ہر ماہ سب رائٹر سے لکھوائیں تو کیا ہی بات ہے پر آپ بھی کہتے جاؤ اوئے لانگاہ چل رہن دے۔"

انور یوسف زئی کی اسلام آباد سے کوفت "اس ماہ کا رسالہ کھولتے ہی گولڈن جوبلی نمبر کے اعلان پر نظر پڑی۔ مارے خوشی کے چھت پر جا کر ہوائی فائرنگ کا دل چاہا مگر گلی میں گشت لگاتی پولیس کو دیکھ کر ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ خطوط کی محفل میں نووارد چنیوٹ کی کنول کو اول آنے پر مبارک باد۔ شکر ہے اس ماہ میرا تبصرہ آپ کو مل ہی گیا۔ ظہیر ملک، خلیل انجم، ماورا عالمگیر، محمد عثمان خان اور بدر اسلام بدر کو محفل میں خوش آمدید۔ بینا راجپوت، ریاست خان، ایمانے زارا شاہ، عثمان ذوالفقار، انجم فاروق اور احسن زمان کو مسلسل حاضری پر شاباش۔ اس ماہ کی اولین ترجمہ شدہ کہانی چہرہ چور شاندار تھی مگر زیادہ ہی تلخیص ہوگئی پھر بھی اول نمبر قرار پائی۔ دیسی کہانیوں میں حسام بٹ کی کایا پلٹ بہترین رہی۔ سرورق کی دونوں کہانیاں لہولہان رشتے اور بھول تماشا اچھی تھیں مگر ایک جیسی کہانیاں پڑھ کر کوفت ہوئی۔ سلسلے وار کہانی الاؤ میں اپنے ہیرو ڈاکٹر سیف ابھی تک راجھستان کے صحرا ہی میں ہیں اور پاکستان واپسی کی امید نظر نہیں آتی۔ دوسری کہانی اناگیر بھی الف لیلہ کی طرح طویل ہوتی جارہی ہے اور یوجاسے پھر ملاقات ہوگئی ہے۔"

مسز فاروق بلوچ کی اوکاڑہ سے افسردگی شکایت "دو، تین ماہ کے وقفے کے بعد ہی محفل میں حاضر ہوں، شاید دل میں کچھ گلہ سا آیا تو سوچا کہ اظہار کردیا جائے۔ (بسروچشم) ہمارا تبصرہ ہمیشہ ہی مختصر ہوتا ہے لیکن دسمبر 20ء کے مختصر ترین تبصرے میں آپ نے کٹوتی کی تو تشنگی کا شدید احساس ہوا۔ ہماری دو، چار سطریں کاٹنے سے آپ کو کتنی رکعت کا ثواب ملا؟ مسٹر اینڈ مسز عباس نے میرے پسندیدہ موضوعات کو اخبار میں پڑھی جانی والی خبروں سے مشابہ قرار دیا ہے تو عرض ہے کہ خبر کی جگہ ایک نئی خبر لے لیتی ہے، لوگ صبح پڑھ کر شام کو بھول جاتے ہیں لیکن خبر کو موضوع بنا کر جب جاسوسی کے قابل ترین لکھاری کہانی کا روپ دیتے ہیں تو وہ ناقابلِ فراموش شاہکار کا روپ دھار لیتی ہے جسے عرصہ تک یاد رکھا جاتا ہے بلاشبہ اس میں کمال ان عالی دماغ مصنفین کا ہے جو ایک عام خبر کو بھی اپنی محنت و کاوش سے جاوداں کردیتے ہیں۔ اب آتے ہیں کچھ تبصروں کی جانب۔ دسمبر 20ء میں محترمہ زویا اعجاز صاحبہ کی عشق زہرناک اور جنوری 21ء میں محترم یعقوب بھٹی کی تحریر سلگتے خواب جیسی شاہکار تخلیقات پڑھنے کو ملیں جو میری پسند اور ذوق کے عین مطابق تھیں۔ دل کی گہرائیوں میں اترتے درد کے ایسے افسانے جو طویل عرصے تک اپنا اثر قائم رکھیں گے۔ مصنفین کے لیے شکریہ اور مبارک باد۔ ایسا ہی احساس دل میں جاگا جیسے انگارے کی آخری قسط کی آخری چند لائنیں۔ جب جب پڑھیں دل کرب کی ایک نئی لہر سے آشنا ہوا۔ اناگیر اور الاؤ اپنے اپنے انداز سے آگے بڑھ رہی ہیں مگر وہ بات نہیں جو سرکش، دیوی، للکار، گرداب اور انگارے میں تھی۔ مغل صاحب نے عمران جونیئر اور تابش کو تو دوبارہ سامنے لاکھڑا کردیا اب ہم منتظر ہیں کہ شاہ زیب، تاجور، قسطینہ اور سجاول سے کب ملاقات کرواتے ہیں۔"

محمد عثمان خان کی لاہور سے حاضری "مارچ کا جاسوسی 22 فروری کو سلطان نیوز ایجنسی سے لیا۔ سرورق اچھا تھا۔ خطوط میں اپنا خط دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ میرا خط شائع کرنے کا بہت شکریہ۔ کنول صاحبہ کو مبارک باد۔ سب قارئین کے خطوط پسند آئے۔ ظہیر ملک، بینا راجپوت اور ایمانے زارا شاہ نے تفصیلی تبصرے لکھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے چہرہ چور پڑھی۔ کہانی روانی سے پڑھی کب ختم ہوئی پتا بھی نہیں چلا۔ کایا پلٹ بس ٹھیک تھی۔ خواہش دلچسپ کہانی تھی۔ کھوٹ میں رقم کسی کے ہاتھ نہیں آئی۔ خوفناک حادثہ سراغ رسانی سے بھرپور کہانی تھی۔ ناکام کوشش بھی پسند آئی۔ انجام زبردست تحریر تھی۔ شروع سے لے کر آخر تک کہانی نے اپنی گرفت میں رکھا۔ اوتے کو آخر اپنے کاموں کا انجام بھگتنا پڑا۔ دشمن جان بھی فردوس صاحبہ کی عمدہ کاوش تھی۔ سرورق کی پہلی کہانی لہولہان رشتے ایک نئے جرثومے کے متعلق کہانی تھی۔ لگتا ہے اس سلسلے کی مزید کہانیاں بھی آئیں گی۔ سرورق کی دوسری کہانی ایچ اقبال کے مخصوص انداز میں تھی۔ اچھی کہانی تھی۔ جاسوسی کے گولڈن جوبلی نمبر کا انتظار ہے۔"

ریاست خان داؤدخیل میانوالی سے لکھتے ہیں "ملتان...... اولیاء اللہ کا شہر کافی خوب صورت شہر ہے۔ یہاں آج کل ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں یہاں خاص فائدہ یہ ہوا کہ جاسوسی جلدی ہاتھ آگیا۔ فروری کا مہینہ چل رہا لیکن یہاں تو ابھی سے وہ رنگ بدلا ہے کہ...... سورج آگ برسانے لگا ہے اور رضائی سے بھی جان چھوٹ گئی ہے۔ پی ایس ایل بھی شروع ہے لیکن جاسوسی کو پورا موقع مل رہا ہے۔ اس بار تو جاسوسی لاجواب رہا سب اسٹوریز بیسٹ تھیں۔ سرورق حسینہ خشمگیں نظروں سے ہمیں گھور رہی تھی کہ میرا اتنا جائزہ کس خوشی میں لیا جا رہا ہے۔ ہم نے کہا بھئی یہ ضروری ہے وگرنہ ادارہ برا منائے گا کہ ہم اتنی محبت سے سرورق بناتے ہیں اور آپ کو پسند بھی نہیں آتا۔ لیکن سچ

میں اس بار سرورق لاجواب رہا۔ باقی کی سمجھ نہیں آئی کہ لڑکا لڑکی کو کیوں مار رہا ہے اور لاش کس کی ہے لڑکے کی یا لڑکی کی، آپ یہ گتھی سلجھائیں۔ صدارت کی کرسی پر محترمہ کنول براجمان ہیں آپ چنیوٹ سے ہیں۔ میرے فیورٹ ناصر چنیوٹی کے شہر سے، بہت خوب۔ دوسری بار میں صدارت مل گئی بہت بہت مبارک باد۔ ظہیر ملک پہلی بار تبصرہ نگاری کرنے آئے بہت اچھا لگا، ویلکم جناب۔ بینادارالخلافہ سے حاضر ہیں کمال ہے، اسلام آباد میں جاسوسی لیٹ ملتا ہے۔ مجھے تو لگا تھا بڑے شہروں میں جلدی آتا ہوگا۔ میں تو اپنے شہر کا رونا رو رہا تھا۔ خلیل احمد کھاریاں اسٹیشن پر ٹرین میں تبصرہ کرتے نظر آئے ویسے سفر میں جاسوسی پڑھنے کا اپنا مزہ ہے۔ ایمانے زارا صاحبہ حسین شہر اسلام آباد سے...... آپ نے... یہ نہیں لکھا کہ آگ بگولا بھی ہیں۔ آتے ساتھ ہی سب کو دھوڑ الا کاسنک سوڈا میں میرا تو رنگ ہی اڑ گیا۔ میں تو بچہ ہی تھا محترمہ نے پتا نہیں کیا بنا ڈالا۔ ماورا عالمگیر کی صبح 12 بجے چائے کی طلب اور پھر دسمبر میں پنکھے کے نیچے سونا کپکپی مجھ پر طاری ہے 12 بجے کون چائے پیتا ہے اور پنکھا اللہ اللہ۔ عرفان راجا دولھے راجا کی طرح بھاگتے نظر آئے۔ لاہور والے عثمان ذوالفقار صدارت پر آنے کا رونا رو رہے تھے۔ اقبال صاحب کراچی سے موجود ہیں بھائی آپ تو خوش قسمت ہیں کراچی میں رہتے ہیں جہاں ڈائجسٹ پہلے پہنچ جاتا ہے، کوشش کیا کریں ٹائم نکال لیا کریں۔ عثمان خان لاہور سے ہمارے فیس بک فرینڈ ناراض تھے کہ ان کا تبصرہ ادارے نے جان بوجھ کے نہیں شائع کیا۔ (ہمیں شائع نہ کر کے کیا فائدہ؟) میں نے اسے بہت سمجھایا کہ بھائی جاسوسی والے ایسا بالکل نہیں کرتے۔ آپ ایک بار اور ٹرائی کریں اب دیکھیں جناب شائع ہوگیا ناخوش رہیں۔ پہلی کہانی چہرہ چور نجمہ مودی صاحبہ نے بالکل الگ موضوع سے پہچان کرائی ہے۔ سورج گرہن اور چاند گرہن کی وجہ سے پیدا ہونی والی لڑکیوں میں کارلا بھی تھی اس کی کیفیات اور نفسیاتی الجھنوں کو بہترین انداز میں بیان کیا ہے۔ بہت لاجواب تحریر۔ کایا پلٹ، حسام بٹ صاحب کی زبردست تحریر فرہاد اپنے بھائی اور ابو کے ساتھ خوش حال زندگی گزار رہا تھا۔ وہ خود پڑھا ہوا زیادہ نہیں تھا اور چاہتا تھا کہ اس کا بھائی پڑھ لکھ کے بڑا آدمی بن جائے لیکن اس کا بھائی کالج میں منشیات کے زیادہ استعمال سے مر جاتا ہے۔ فرہاد کا ابو یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکتا اور وہ بھی مر جاتا ہے فرہاد پھر منشیات اور اس کے اسمگلروں کے خلاف ہو جاتا ہے ان سے لڑائی میں اس کو جیل ہو جاتی ہے جہاں اعظم شاہ پولیس والے سے اس کی ملاقات ہو جاتی ہے جس سے اس کی لائف بدل جاتی ہے اعظم فرہاد کو فرہاد سے دانیال بناتا ہے اور سکندر کے گینگ میں شامل ہو جاتا ہے جہاں وہ اس کی بہن ساحرہ پر ڈورے ڈالتا ہے وہ بے چاری سچ میں اس سے محبت کرنے لگ جاتی ہے ایک ڈیل میں فرہاد اعظم شاہ کے ساتھ مل کر ان کی ڈرگز اسمگلنگ کو ناکام بناتا ہے اور وہی سکندر شاہ بھی مارا جاتا ہے اعظم شاہ اور فرہاد کے حصے میں دو دو لاکھ ڈالر کی رقم آتی ہے لیکن فرہاد وہ رقم لینے سے انکار کر دیتا ہے کہ اچانک اس کے دل میں ساحرہ کی محبت جاگ اٹھتی ہے۔ الاؤ کی سترھویں قسط تو لاجواب تھی سیف صحرا میں جہاں قید ہوتا ہے وہاں سے بھاگ جاتا ہے پھر اس کی ملاقات ایک اسمگلر سے ہوتی ہے سیف اس کو کہتا ہے کہ مجھے پاکستان پہنچا دو وہ راضی ہو جاتا ہے کچھ اور لوگوں کو بھی بارڈر پار کرنا ہوتا ہے ان کی اسمگلر سے لڑائی ہو جاتی ہے راستے میں انڈین بی ایس ایف سے ان کا سامنا ہو جاتا ہے وہ سب کو مار دیتے ہیں سیف ریت میں گرنے کی وجہ سے بچ جاتا ہے اسے پرندے نظر آتے ہیں تو وہ ان کی سمت میں چلتا ہے وہاں بڑے بڑے پیڑ ہوتے ہیں اور بڑی سی نہر وہاں سے وہ پھل توڑ کے کھاتا ہے اور پانی پیتا ہے نہاتا ہے آگے اس کو ایک قافلہ ملتا ہے ان کے ساتھ چلتے چلتے وہ آبادی پہنچ جاتا ہے جہاں اسے پتا چلتا ہے کہ ایک مہاراجہ بہت بیمار ہیں اور اس پر کوئی علاج کام نہیں کرتا پھر سیف اس مہاراج ہری داس کا علاج کرتا ہے اور اسے ٹھیک کر دیتا ہے ہری داس اور اس کی بیوی بہت خوش ہوتے ہیں اور اس کو مہمان بنا لیتے ہیں۔ جوابی کارروائی مغل صاحب کی عمران سیریز کی ایک اور پیشکش عمران کی منہ بولی بہن کی شادی ہوتی ہے عمران تابش ماہین اور اس کا دوست حسام بھی اس میں شامل ہوتے ہیں وہیں شادی میں رہائی پانے والا مشاہدہ اللہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ پہنچ آجاتا ہے جس میں اس کا خاص ساتھی دلاور عرف تیزاب بھی ہوتا ہے وہ سب لوگوں کو یرغمال بنا لیتے ہیں وہ صوفیہ اور ماہین کو اغوا کر کے لے جاتے ہیں عمران اور تابش جوابی کارروائی کرنے تیزاب کی محبوبہ خانی کے گھر جاتے ہیں وہ اس کو یرغمال بنا کر تیزاب اور مشاہد اللہ سے ماہین اور صوفیہ کو بحفاظت واپس لے آتے ہیں۔ سرورق کی پہلی کہانی لہولہان رشتے یعقوب بھٹی نے کمال کر دیا اتنی خوب صورت کہانی کہ بیچ لگنے لگ گئی تھی چوہدری عاصم کا بھائی صائم اپنی ماں ابو اور چھوٹی بہن فاطمہ کو نشے کی حالت میں قتل کر دیتا ہے اور پھر چوکیدار کے ساتھ تصادم میں خود بھی مارا جاتا ہے چوہدری عاصم اس وقت گھر نہیں ہوتا وہ وکیل ہوتا ہے اور اس کی ساتھی فائزہ اس کی اسسٹنٹ ہوتی ہے تفتیشی افسر طارق سیال سے اس کی دوستی ہو جاتی ہے وہی اسے خبر دیتا ہے کہ قتل کرنے کے وقت صائم نشے کی حالت میں تھا یہ خبر اس کے لیے شاک ہوتی ہے اپنی فیملی کا بدلہ لینے کی ٹھان لیتا ہے فائزہ اس کو کہتی ہے کہ دشمن کے بارے سوچیں وہ کون ہو سکتا ہے جس نے صائم کو آلہ کار بنایا عاصم کو یاد کرتے ہوئے آصف جلال کا نام یاد آتا ہے جو ڈرگ ڈیلر ہوتا ہے عاصم اس کا کیس ہار جاتا ہے اور اسے پانچ سال کی سزا ہو جاتی ہے اسی قید میں اس کی فیملی کا قتل ہو جاتا ہے جس کا بدلہ وہ عاصم سے لیتا ہے اور صائم کی مدد

سے اس کی فیملی کو مروا ڈالتا ہے۔ دوسری سرورق کی کہانی بھول تماشا ایچ اقبال کی کہانی تھی۔ سلطان ہے، جو سر پر چوٹ لگنے کی وجہ سے کچھ چیزیں بھول جاتا ہے اس کو کچھ چیزیں یاد رہتی ہیں اور کچھ بھول جاتی ہیں۔ اس کو اپنی بیوی شبانہ کا بھی نہیں پتا ہوتا اسی دوران میں ایک عورت اسپتال میں آتی ہے اور سلطان کو اپنا دوست کہتی ہے وہ پیٹرول ماسٹر کی ساتھی ہوتی ہے در اصل سلطان بھی پیٹرول ماسٹر کا ساتھی ہوتا ہے الماس کو سلطان کے مارنے کا ٹاسک ملتا ہے وہ اس کے سر میں چوٹ لگاتی ہے کہ چوٹ کھا کے سلطان دلدل میں گر کے مر جائے گا لیکن وہ بچ جاتا ہے سلطان کو جب سب یاد آتا ہے تو وہ الماس کو اسی جگہ لے جا کر دلدل میں پھینک دیتا ہے اور پیٹرول ماسٹر ان کے پیچھے پولیس لگی ہوتی ہے ان سے بچنے کے لیے وہ ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر بھاگنے لگتا ہے کہ پولیس کی فائرنگ سے ہیلی کاپٹر پھٹ جاتا ہے اور سلطان پیراشوٹ کی وجہ سے چھلانگ لگا کر بچ جاتا ہے اڑنے کے دوران ہی پیٹرول ماسٹر کو سلطان گولی مار کے ہلاک کر دیتا ہے۔ فہمی فردوس کی مختصر تحریر دشمنِ جاں عمدہ تحریر تھی۔ آخر میں چھوٹی سی گزارش ہے کہ کہانیوں میں بعض جگہوں پر نازیبا الفاظ ہوتے ہیں مہربانی کر کے ان کو حذف کر دیا کریں۔'' (جیسا آپ کا حکم)

ظہیر ملک کی ہارون آباد سے داد ''22 فروری کو شمارہ ملا۔ جس کا سرورق حسین دوشیزہ کی قاتل نگاہوں سے سجا بہت پیارا تھا۔ مجھے بہت پسند آئی۔ سرورق قابلِ دید تھا۔ بلا جھجک فہرست پر پہنچے تو بہت بڑے بڑے لکھاریوں کے نام نظر آئے، ان سب کو مبارک باد دی اور ہمارے پسندیدہ ترین سلسلے پر پہنچ گئے جس میں اس دفعہ میرا نام بھی آ گیا اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ اداریے میں آپ کی باتیں بہت اچھی لگیں اور پنچھا کنول صاحبہ کے اچھے سے تبصرے پر جو اپنے مخصوص انداز میں تبصرہ کرتی ہوئی ملیں اسی طرح تمام مبصرین کے تبصرے قابلِ دید اور تعریف کے لائق تھے۔ بہت ساری دعائیں سب کے لیے۔ ایک صفحہ عہد ساز شخصیت کے بارے میں قابلِ رشک تھا۔ الحمدللہ پڑھ کر اچھا لگا۔ نجمہ مودی صاحبہ کو پہلی دفعہ پڑھا۔ آپ کی پہلی کہانی چہرہ چور اتنی زبردست اور لاجواب تھی کہ میں بیان ہی نہیں کر سکتا جب پڑھنا شروع کیا تو ایسے الفاظ کے جال میں پھنسا کہ دو گھنٹے بعد ہی جان چھوٹی۔ کہانی میں سسپنس، تھرل اور ایکشن بہت کمال ڈالا گیا۔ کہانی کے کرداروں کی بات کریں تو ایک ایسے کردار کے گرد کہانی گھومتی ہے جو انسان نما جانور تھا، اس کی بہت دہشت تھی، ہیرین کا کردار شروع سے ہی اچھا لگا لیکن اختتام پر جا کر دل ٹوٹ گیا۔ ہیرین کے ساتھ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ مجھے یہ پہلی بار پڑھنے کو ملا کہ کردار کہانی میں خود اپنے احساسات شیئر کر رہا تھا۔ زبردست کہانی کے لیے بہت ساری داد۔ حسام بٹ صاحب کی کہانی کا پلاٹ بھی لاجواب کہانی تھی جس کے شروع سے تسلسل نے ہی بہت مزہ دیا، ساحرہ کا کردار جاندار ڈالا گیا، ہر شخص ایسے ہی برا نہیں بنتا اس کے پیچھے واقعی کوئی ٹھوس وجہ ہوتی ہے جو اسے غلط کام کرنے پر اکساتی ہے بالکل ایسے ہی دانیال کی حالت تھی، لیکن وہ کیا کہتے ہیں کہ سچی محبت ہمیشہ کامیاب ہو جاتی ہے۔ خواہش، جمال دستی صاحب کی کہانی مختصر تھی لیکن متاثر کن نہ تھی۔ کھوٹ محمد سلیم کردی کی کہانی کی روانی نے بہت متاثر کیا شروع سے لے کر اینڈ تک اپنی گرفت مضبوط رکھتی ایک بہترین تحریر تھی۔ اختتام نے دل دہلا دیا۔ کسی کے بارے میں غلط سوچنے والوں کا انجام ہمیشہ ہی برا ہوتا ہے۔ خوفناک حادثہ تنویر ریاض صاحب نے بھی اپنے قلم کا بہترین جادو جگایا اور بہت زیادہ متاثر کیا۔ خوفناک حادثے کو خوفناک طریقے سے بیان کیا۔ پڑھ کر حیرت بھی ہوئی اور عبرت بھی حاصل کی۔ تنویر صاحب آپ کی کامیابی کے لیے دعا گو رہیں گے۔ ہمارے آئیڈیل محترم امجد جاوید کو اپنی انا گیر کے ساتھ اگلے ماہ ایک سال پورا ہو جائے گا اور ہمارے رائٹنگ کیریئر کو بھی اگلے ماہ ایک سال پورا ہو جائے گا۔ آپ کی انا گیر آہستہ آہستہ اپنی منزل کی طرف گامزن ہے۔ نوجوان اپنی منزل کی جانب نہایت دیدہ دلیری اور صبر و استقامت کے ساتھ بڑھ رہا ہے، اس کا حوصلہ پست ہونے والا نہیں تھا بلکہ حوصلہ اسے کامیاب کرے گا۔ امجد جاوید کے لیے بہت دعائیں۔ طاہر جاوید مغل کی جوابی کارروائی میں عمران جونیئر کی بہادری کے جو جوہر دکھائے گئے، وہ واقعی قابلِ رشک تھے بظاہر تو وہ اس قابل نہ تھا لیکن حالات کے پیشِ نظر اسے بننا ہی پڑا، طاہر صاحب ویلڈن اچھا لکھا آپ نے اختتام تھوڑا مزاحیہ لگا لیکن زبردست تھا۔ اتنے بڑے بڑے لکھاریوں کی محفل لگی ہو تو تنویر واسطی صاحب پیچھے رہ جائیں یہ تو ناممکن ہے ناں اپنی کہانی ناکام کوشش کے ساتھ بہترین چھاپ چھوڑ گئے اور حیرت میں ڈال گئے کہ کیا واقعی ایسا ہوتا ہے؟ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کو کون نہیں جانتا کسی قسم کے تعارف کے محتاج نہیں آپ جو یہ کام کر رہے ہیں، یہ کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا، الاؤ جو کہانی کاشف زبیر نے شروع کی اب اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا بیڑا ڈاکٹر صاحب نے اٹھالیا ہے جو قابلِ قدر ہے۔ احمد جعفری کی کہانی بھی اپنی مثال آپ تھی پڑھنا شروع کیا تو پڑھتا ہی چلا گیا۔ انجام کہانی کے عنوان میں ہی پوری کہانی چھپی تھی، یہ بات تو ہمیشہ واضح ہے برے کاموں کا انجام برا اور اچھے کاموں کا انجام اچھا ہوتا ہے، اوتے مانگ نے برے کام کیے اب وہ ہمیشہ کے لیے وہیل چیئر پر بیٹھ کر اپنے برے کاموں کو ہی سوچ سوچ کے پچھتائے گا۔ فہمی فردوس کی کہانی دشمنِ جاں کا پلاٹ جاندار تھا۔ آپ کی کہانی نے شروع سے ہی اپنے سحر میں جکڑا اور ختم کروا کے ہی دم لینے دیا۔ آپ کی کہانی مختصر تھی لیکن سسپنس سے بھرپور تھی۔ بہت ساری داد کہانی کے لیے۔ سرورق کی پہلی کہانی یعقوب بھٹی صاحب نے

لکھی۔ لہولہان رشتے پڑھنا شروع کیا تو عجیب سی بے چینی نے گھیر لیا کہ کب یہ کہانی ختم ہوتا کہ اس کا جلد از جلد اختتام پڑھ سکوں۔ کہانی میں بہت سسپنس ڈالا گیا جس سے ۔۔۔۔ مزہ دوبالا ہوگیا۔ نفرت و انتقام کے درمیان چھپی دردمندی و جراُت مندی کا امتحان ایک دردناک تحریر تھی۔ بہت ساری داد قبول کریں۔ سرورق کی دوسری کہانی اور مارچ کے شمارے کی آخری کہانی بھول تماشا میں سراج اقبال نے بہترین الفاظ کے ساتھ بہترین کہانی بھی پیش کی ماشاءاللہ۔ الماس، شبانہ اور اکبران تینوں کے کرداروں نے بہت مزہ دیا اور پسندیدہ رہے۔ لمحہ بہ لمحہ پُرتجسس بدلتی رنگ کہانی کے دلچسپ اتار چڑھاؤ پڑھ کر تھوڑی حیرت ہوئی لیکن مزہ بھی بہت آیا ایسی کہانیاں شوق سے پڑھتا ہوں بہت ساری داد مصنف کے لیے۔“

خلیل احمد انجم، گاؤں دمنی، کھاریاں سے لکھتے ہیں ”لال و لال حسن میں سجی لال پری کے سرورق سے مزین جاسوسی ڈائجسٹ 21 فروری کو کپٹل بک کارنر کھاریاں سے دستیاب ہوا۔ مار دھاڑ کے مشترکہ امتزاج پر مبنی سرورق کوئی خاص تاثر قائم کرنے میں ناکام رہا۔ ذاکر صاحب کے شہ پاروں والی بات اب سرورق میں نہیں رہی۔ تحاریر میں نجمہ مودی کی تحریر چہرہ چور اچھی اسٹوری تھی لیکن اولین صفحات کی مناسبت سے کچھ کم محسوس ہوئی، لطافت کی بات نہیں کررہا، تحریر کم صفحات پر مشتمل تھی۔ (تجربات کرتے رہنا چاہئیں) رنگوں میں یعقوب بھٹی صاحب نے جو آصف جلال کا کیس ادھورا چھوڑ دیا اس نے تشنگی سی پیدا کردی ہے کہ کب یہ گروہ اس کیس کو حل کرکے ہماری پیاس بجھائے گا ویسے ان کی سابقہ دونوں تحریر کی طرح یہ بھی ایک امر داستان ہے جو صدیوں ذہن پر نقش رہے گی ویسے یعقوب بھٹی کی تحریروں کا ٹیمپو بہت تیز رفتار ہوتا ہے جس سے لطافت دوگنا بڑھ جاتی ہے۔ دوسرا رنگ بھول تماشا ایک یادداشت باختہ شخص کی زندگی پر مبنی تحریر کافی اچھی کوشش تھی تاہم کوئی گہرا تاثر قائم کرنے میں ناکام رہی بس درمیانے درجے کی تحریر تھی۔ حسام بٹ کی تحریر نے تا اختتام اپنے سحر میں مقید رکھا۔ موت کے سوداگروں کو واصل جہنم کرتے ہوئے فرہاد کی سوچ کی کایا پلٹ نے بہت محظوظ کیا۔ اعظم شاہ جیسے کردار تو ہمارے اداروں میں بھرے پڑے ہیں، دولت کی ہوس ان کی آنکھوں میں دھول جھونک دیتی ہے۔ فہمی فردوس بہت اچھی قلمکار ہیں۔ کافی دنوں بعد نظر آئی ہیں دشمن جان لاجواب تحریر تھی۔ خاص کر ایک چھوٹے سے پوائنٹ کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے مردہ جیسے اندھے کیس کو فوراً حل کردینا اچھا لگا۔ احمد جعفری انجام کے ساتھ رونق افروز ہوئے۔ انسانی اسمگلنگ کے بارے میں تحریر نے تا اختتام اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ اوتے جیسے بھوتنے کا انجام اتنا تو بنتا تھا ویسے شیرن کا نشانہ خطا نہ ہوتا تو اوتے وکیل چیتر کے بجائے تابوت میں ہوتا، پاتھ کی دلکشی دل کو چھو گئی۔ جمال دستی صاحب خواہش لے کر میدان میں اترے۔ صحافت جیسے معزز و معتبر شعبے کو داغ دار کرنے والوں کا پردہ فاش کیا گیا۔ مجموعی طور پر ایک اچھی تحریر تھی، پسند آئی۔ محمد سلیم کردولوں کے کھوٹ لے کر آئے، پرانے پلاٹ پہ نئی طرز کی تحریر نے محظوظ کیا۔ تاہم نازیہ کے ساتھ سلیم صاحب آپ نے اچھا نہیں کیا۔ تنویر ریاض کی خوفناک حادثہ بھی اچھی تحریر تھی لیکن تھوڑی خشک ٹائپ سی تھی جبکہ تنویر واسطی کی تحریر ناکام کوشش مزے دار تھی۔ عمران جونیئر جوابی کارروائی کے سنسنی خیز اختتام نے اپنے سحر میں محصور کرلیا۔ قسط وار ناول بھی بہترین جارہے ہیں تاہم امجد جاوید صاحب کی انا گیر کی یہ قسط دھماکے دار تھی۔ محفلِ رنگ و بو میں ہمارے نامے کو شامل کرنے کے لیے ازحد شکریہ۔ سیاسی چالوں پر مشتمل آپ کے اداریے نے دل مسوس کررکھ دیا۔ کنول کو صدارت مبارک تاہم نامہ اول میں نکتہ چینی زیادہ تھی اور اگر ظہیر ملک کے تبصرے کی بات کریں تو یہاں چینی ہی چینی تھی۔ بہت میٹھا اور جاندار تبصرہ ہے ملک صاحب کا۔ بینا راجپوت محفل پر چھائی ہوئی تھیں، زبردست تبصرہ فرمایا آپ نے۔ ریاست خان صاحب اور محمد احسن زمان صاحب کے تبصروں نے محفل میں سماں باندھا جبکہ ایمانے زارا شاہ ہمیشہ کی طرح محفل کی رونق میں مزید اضافہ فرمارہی تھیں۔ محمد عثمان کو خوش آمدید۔ باقی احباب کے تبصرے بھی بھرپور تھے۔ معراج رسول صاحب کی یاد میں عہد ساز شخصیت نے افسردہ کردیا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ انہیں غریق رحمت فرمائیں اور ان کے لگائے ہوئے باغِ ادب کو سدا پُر بہار رکھیں آمین۔“

بینا راجپوت کی نیک خواہشات اسلام آباد سے ”میرا جے ڈی پی سے تقریباً 23 سال پرانا ساتھ ہے۔ 2015ء سے زندگی کی بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے میرا تعلق ڈائجسٹ ریڈنگ سے ایک دم ٹوٹ گیا۔ 2020ء میں لاک ڈاؤن کی وجہ سے پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہوا تو ساتھ میں لکھنے پر بھی طبع آزمائی شروع کی۔ کچھ دوستوں کے کہنے پر میں نے پہلی بار جاسوسی کے لیے تبصرہ لکھا جو شائع بھی ہوگیا۔ جس سے حوصلہ افزائی تو ہوئی ساتھ ہی جاسوسی کے لیے پرانی بے تابیاں بھی دوبارہ زندہ ہوگئیں۔ اب ہر مہینے جاسوسی کا بے چینی سے انتظار ہوتا ہے۔ سرورق اس بار مجھے کافی پسند آیا۔ ریڈ اسکارف میں کیوٹ سی لڑکی...... عادتاً پہلے مختصر کہانیاں پڑھیں۔ فہمی فردوس صاحبہ کی دشمنِ جاں مختصر لیکن دلچسپ کہانی تھی۔ ویسے تو سیدھا سیدھا شک کارلوس پر ہی جاتا تھا لیکن بار سلے نے جو ثبوت پیش کیا وہ چونکا دینے والا تھا۔ جمال دستی کی خواہش کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑ پائی البتہ مغل صاحب کی جوابی کارروائی اس بار میں پڑھنے میں کامیاب

ہو ہی گئی۔ محمد سلیم کردی کی کہانی حقیقت سے قریب ترین تھی کہ زر اور زن کے لیے جب دلوں میں کھوٹ آجائے تو صرف تباہی مقدر ہوتی ہے۔ تنویر واسطی کی ناکام کوشش اچھی کہانی تھی۔ بالآخر ولی اور نیول، ہیلن کے اغوا کی کوشش کو ناکام بنانے میں کامیاب رہے۔ تنویر ریاض کا خوفناک حادثہ بھی ایک پُرتجسس اور دلچسپ کہانی تھی۔ کایا پلٹ میں حسام بٹ اس بار اپنے قلم کا جادو جگانے میں پہلے کی طرح کامیاب نہیں ہو پائے۔ اعظم شاہ کی موت کے سوداگروں کو پکڑنے کی ساری ہی پلاننگ میں بہت سے جھول تھے۔ آخری سین میں دانیال کے ساحرہ سے محبت کے ناٹک کی کایا پلٹ کر حقیقت کا روپ دھار گئی۔ نجمہ مودی جی کی چہرہ چور کے شروع کے دو پیراگراف پڑھنے کے بعد ایک بار رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ لگ رہا تھا کہ ایک کولڈ بلڈڈ مرڈرر سے واسطہ پڑنے والا ہے لیکن جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی گئی، دل گداز ہوتی گئی۔ مجھے تو بے حد افسردہ کر دینے والی جذبات سے پُر کہانی لگی۔ ایک عجیب الخلقت لڑکی جو بچپن سے نفرت اور حقارت کا شکار ہوتی رہی۔ اس کے کسی بھی قسم کی نفسیاتی گرہوں کا شکار ہو جانے میں کوئی دوسری رائے نہیں ہو سکتی۔ البتہ وہ چاہتی تھی کہ اس کو ختم کر دیا جائے تاکہ قتل و غارت گری کا یہ سلسلہ بند ہو جائے تو ہیرن کو اسے مار دینا چاہیے تھا لیکن اس کے بچپن کے احساسِ جرم نے اس کے ہاتھ باندھ دیے، جو خود اسی کی موت کا سبب بن گیا۔ سرورق کی کہانیاں اس بار دونوں ہی بہت زبردست تھیں۔ یعقوب بھٹی صاحب کی باغی کٹھ پتلی کے بعد لہولہان رشتے پڑھی اور میں حقیقتاً ان کی فین ہو گئی۔ ان کے مزید قلم پارے پڑھنے کے لیے آتشِ شوق بھڑک اٹھی ہے۔ بھٹی صاحب بہت خوب لکھتے ہیں۔ ان کی سسپنس، تھرل اور ایکشن سے بھرپور کہانیاں ایک منٹ کے لیے بھی قاری کی توجہ کہانی سے ہٹنے نہیں دیتیں۔ کمال کی منظر کشی کہ پڑھنے والا نہ صرف کہانی پڑھتے ہوئے بلکہ کہانی ختم کرنے کے بعد بھی خود کو بہت دیر تک اسی ماحول میں محصور پاتا ہے۔ یعقوب بھٹی صاحب کے لیے نیک خواہشات۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ سرورق کی دوسری کہانی، ایچ اقبال صاحب کے قلم سے۔ میرے ایک اور بہت پسندیدہ قلمکار۔ بھول تماشا بھی اپنی نوعیت کا بہترین تجسس اپنے اندر سموئے ہوئی تھی۔ روایتی قسم کے مافیا گروپ اور ان کے مخصوص طور طریقوں پر مبنی کہانی کسی بالی ووڈ مووی سے کم محسوس نہیں ہوئی۔ سلطان کی یادداشت کا جانا اور آنا کافی فلمی سچویشن لگی۔ بہرحال کہانی مزے دار تھی شروع سے آخر تک پوری دلچسپی سے پڑھی۔ مارچ کے شمارے پر ڈرگ مافیا، موت کے سوداگروں کا رنگ غالب رہا۔“

جمائل حیدر کی پہلی آمد ”پہلی بار آپ کی محفل میں شامل ہونے کی جسارت کر رہی ہوں۔ یوں تو جاسوسی ڈائجسٹ سے تعلق برسوں پرانا ہے مگر کبھی تبصرہ لکھنے کی کوشش نہیں کی۔ مارچ کے شمارے کی بہترین کہانیوں میں نجمہ مودی کی چہرہ چور، طاہر جاوید مغل کی جوابی کارروائی یعنی للکار سیزن ٹو اور یعقوب بھٹی کی لہولہان رشتے رہیں۔ اس بار تبصرہ شامل ہونے کی صورت میں اگلی مرتبہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شامل ہوں گی، انشاء اللہ۔ (خوش آمدید)

کنول کی چنیوٹ شہر سے لفاظی ”جاسوسی کا سرورق اس بار بھی کافی منفرد اور خوب صورت سا تھا۔ پچھلے کچھ عرصے سے سرورق بہت الگ انداز کے اور خوب صورت بن رہے ہیں۔ اداریے میں سیاست اور سیاستدانوں کی خرید و فروخت کی بات کی گئی۔ سچی بات ہے اب سیاست میں دلچسپی نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔ اب کسی بھی بات سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ اس بار سب سے پہلا تبصرہ میرا ہی تھا۔ شامل ہونے کی خوشی ہوئی۔ ایمانے نے ویلکم کیا، ان کا بہت شکریہ۔ ظہیر ملک، بینا راجپوت اور ایمانے کے تبصرے تفصیلی اور خوب تھے۔ اس بار پڑھا کہ جاسوسی میں تبصرے بھیجنے کی آخری تاریخ بھی دس کے بجائے چھ کر دی گئی ہے اس حساب سے کافی لیٹ ہو چکی ہوں آج پانچ مارچ ہو گئی ہے تب یہ تبصرہ لکھ رہی ہوں۔ پتا نہیں شامل ہوتا ہے یا نہیں۔ کہانیوں پر بات کریں تو نہی فردوس کی دشمنِ جان ان کی مغربی ماحول پر لکھی گئی شاید پہلی تحریر تھی۔ اور پہلی کوشش کے طور اچھی تھی۔ واقعات کی کچھ کمی تھی۔ احمد جعفری کی انجام دلچسپ معلومات اور واقعات لیے ہوئے دلچسپ تحریر ثابت ہوئی۔ اوتے کی بے لگام ہوس اور بے راہ روی کا اچھا بدلہ ملا اسے۔ تنویر واسطی کی ناکام کوشش ٹھیک ٹھاک تھی۔ طاہر جاوید مغل کی جوابی کارروائی میں اس بار پھر عمران جونیئر ایکشن میں نظر آیا اور اس بار واقعی مزہ آگیا۔ کہانی تھرلنگ اور ایکشن سے بھرپور رہی۔ عمران سینئر کی یاد دلا دی۔ تنویر ریاض کی خوفناک حادثہ بھی اچھی تحریر تھی۔ کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا کے مصداق جس کیس کو قتل سمجھ کے تفتیش ہوتی رہی، وہ آخر میں حادثہ نکلا۔ محمد سلیم کردی کی کھوٹ بھی اچھی تحریر تھی۔ لالچ کا انجام بُرا دکھاتی ایک سبق آموز تحریر۔ جمال دستی کی خواہش اور حسام بٹ کی کایا پلٹ بھی ٹھیک ٹھاک کہانیاں تھیں۔ یعقوب بھٹی کی لہولہان رشتے کافی دلچسپ تحریر ثابت ہوئی۔ بھٹی صاحب کی زیادہ تر کہانیاں فل ایکشن ہوتی ہیں۔ یہ کہانی بھی تقریباً ویسی ہی تھی۔ اس کہانی کے اختتام سے لگا کہ اس کہانی کے کرداروں کو آگے مزید کہانیوں میں جاری رکھنے کا ارادہ ہے۔ جو کہ شاید اچھا ہی ہو۔ ایچ اقبال کی بھول تماشا بھی مناسب تحریر تھی۔ اب آتی ہوں اس بار کے شمارے کی سب سے بہترین کہانی کی طرف اور وہ تھی نجمہ مودی کی چہرہ چور۔ کیا شاندار کہانی تھی۔ سسپنس پُراسراریت اور ہارر کا ملا جلا امتزاج۔ کہیں کہیں رونگٹے بھی کھڑے ہو گئے

اور جذباتی بھی کر دیا کہانی نے۔ کارلا کا کردار بہت اچھے سے تخلیق کیا گیا۔ ہیریسن کا کردار بھی خوب تھا۔ ہاں لیکن اختتام تھوڑا ہلکا لگا۔ اس سے زیادہ جاندار ہونا چاہیے تھا۔"

ماورا عالمگیر کی تجویز رحیم یار خان سے "مارچ کا سرورق دلکشی لیے ہوئے تھا مگر پس منظر میں لاش دیکھ کر ملکی حالات ذہن میں آ گئے۔ مارچ شروع ہوتے ہی قتل و غارت گری کا بازار سرگرم ہو گیا ہے۔ میرے اپنے شہر میں کافی لوگ قتل ہوئے ہیں عجیب سی صورتِ حال ہو گئی ہے بندہ تھوڑی دیر کے لیے ہی ہنستا ہے پھر کچھ ایسا سن لیتا ہے کہ گھنٹوں اداسی کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ یہ سب تو جیسے اب معمول سا بن گیا ہے خیر موضوع تبدیل کرتے ہیں اور کہانیوں کی طرف نکلتے ہیں، طاہر جاوید مغل کی کہانی کسی تامل فلم کا سین معلوم ہو رہی تھی۔ اتنی آسانی سے وہی یہ سب کر لیتے ہیں مگر چونکہ کہانی اپنے ہیرو کی تھی اس لیے میں نے اس میں بھی انجوائے کیا لیکن مغل صاحب سے مودبانہ گزارش ہے کہ اپنے صفحات کی تعداد بڑھائیں ابھی کہانی کا مزہ آنا شروع ہوتا اور کہانی ختم ہو جاتی ہے۔ ایچ اقبال کی بھول تماشا کافی اچھی رہی، ثاقب کا کردار اچھا تھا۔ مجھے ویسے بھی پولیس کا اچھا امیج دکھانا اچھا لگتا ہے۔ کئی سالوں سے ہماری پولیس میں بھی مثبت تبدیلیاں دیکھنے کو ملی ہیں۔ پڑھے لکھے لوگ آ رہے ہیں لیکن عوام کا رویہ آج بھی وہی ہے۔ لہولہان رشتے ایک عمدہ تحریر تھی جس طرح کے واقعات اس کہانی میں دکھائے گئے ہیں، وہ حقیقت سے بالکل قریب ہیں، کچھ مہینوں میں اس طرح کے واقعات بالکل عام سی بات ہو گئے ہیں۔ اچھا آخر میں میں ایک درخواست کرنا چاہتی ہوں بات کچھ یوں ہے کہ جاسوسی پڑھتے ہوئے ایک عجیب سے تشنگی رہ جاتی ہے، سوچا کہ یہ سب کیوں تو پتا چلا کہ کاشف زبیر کی تحریر شامل نہیں ہوتی ہے۔ اللہ ان کے درجات بلند کرے۔ ریکویسٹ میری یہ چھوٹا منہ بڑی بات مگر میں چاہتی ہوں کہ آپ ہر دو یا تین ماہ بعد ان کی کوئی تحریر شامل کر لیا کریں۔ شامی اور تیمور والی۔"

کاشف عبید کاوش کی بنگرام سے پہلی کاوش "کورونا وبا کے دنوں سے جاسوسی مسلسل زیر مطالعہ رہتا ہے، خط کافی عرصہ بعد لکھ رہا ہوں۔ وجہ میں خود بھی نہیں جانتا، شاید ٹائم نہیں ملتا یا پھر کوئی نہ کوئی مسئلہ آڑے آ جاتا ہے۔ اب کوشش کروں گا کہ ہر ماہ محبت نامہ لکھ لیا کروں۔ (یہ کام اچھا کریں گے) سرورق بھی اچھا اور کبھی گزارے لائق ہوتا ہے۔ ویسے جے ڈی پی گروپ کے تقریباً تمام سرورق ایک جیسے ہوتے ہیں یہی ایک خوب صورت لڑکی مگر کچھ کچھ تبدیلی کی وجہ سے چاروں شمارے ہر مہینے سرورق بانٹ لیتے ہیں، لڑائی جھگڑا یا پھر بندوق ساتھ لگا ڈ تو جاسوسی، فل میک اپ والی ماڈل پاکیزہ کے حصے میں آ جاتی ہے جبکہ لڑکی کے ساتھ بچے، لڑکا یا پھر کوئی بزرگ شخص لگا ڈ تو سرگزشت ہڑپ لیتا ہے اور دیو مالائی حسن کی لڑکی والا سرورق ہمیشہ سسپنس کے حصے میں رہا ہے، مارچ کا اداریہ اچھا تھا وہی ملکی مسائل، پہلا خط کنول کا اچھا تھا۔ پتا نہیں کیوں لوگ پہلے خط کے چھپنے کے لیے سرتوڑ کوشش کرتے ہیں، ویسے مجھے بھی ایسا شوق نہیں رہا اگر ادارے نے حکمران بنایا تو مہربانی ہو گی...... ہاہاہاہا۔ باقی سب کے خطوط بھی اچھے تھے۔ محمد عثمان خان پہلی بار لاہور سے لکھ رہے تھے۔ بھائی اس خط کے بارے میں آپ نے ہمیں سوشل میڈیا پر بھی بتایا تھا، خیر مبارک باد۔ عہد ساز شخصیت معراج رسول کے بارے میں پڑھ کر اچھا لگا۔ موت ایک اٹل حقیقت ہے موت ایک دن ضرور آنی ہے۔ اللہ ہم سب کا خاتمہ ایمان پر کرے۔ سلسلے وار کہانیوں میں اناگیر ابتدا سے نہیں پڑھی، کوشش کروں گا کہ اگلے ماہ تک ضرور پڑھوں۔ الاؤ ایک بہترین کہانی ہے، سمجھ میں نہیں آ رہا کیوں لوگ اس کہانی کو بھی ختم کرنا چاہتے ہیں۔ چہرہ چور ابتدا سے نامکمل سی مگر موضوع لیے ہوئے اچھی کہانی تھی۔ کایا پلٹ بھی اس ماہ کی اچھی کہانی تھی، خواہش بکواس ترین جبکہ کھوٹ نے دل جیت لیا۔ سلیم کرد صاحب اچھا لکھ رہے ہیں۔ خوفناک حادثہ میں خواہ مخواہ کرداروں کو شامل کر کے ذہنی کوفت دی گئی، خیر کوشش اچھی تھی، للکار ناول آج تک نہیں پڑھا لیکن جوابی کارروائی آخر کار سمجھ میں آ گئی، اچھی کہانی تھی۔ قسط وار ناول ویسے بھی لوگوں کو کچھ خاص پسند نہیں، طاہر جاوید مغل صاحب کو چاہیے کہ للکار کے کرداروں کو لے کر نیا سلسلہ شروع کر دیں کیونکہ ایک دہائی کے بعد بھی لوگ للکار کے سحر کی گرفت سے نہیں نکل سکے۔ سراغ رساں ولی کو ستانے ہمارے دلوں کو جیتنے کی ناکام کوشش کی۔ فہمی فردوس نے دشمن جاں لکھ کر اچھا تاثر دیا۔ پہلا رنگ لہولہان رشتے لکھ کر یعقوب بھٹی صاحب بازی لے گئے، اوائل سے بھی روایتی آخر میں بھی وہی پرانی روایتی تاثر قائم کر کے یعنی انڈیا کا ذکر کر کے کہانی مثالی رہی۔ دوسرے رنگ بھول تماشا میں ایچ اقبال صاحب نے تجسس اور سنسنی آخر تک قائم رکھی۔ باقی کٹ پیس بھی اچھے تھے، مجموعی طور پر شمارہ اچھا رہا، اب انتظار ہے اگلے ماہ کے شمارے کا۔ اب کوشش کروں گا کہ اگلے ماہ خط لکھ کر بھیجوں ویسے مجھے ای میل کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔" (جی آپ شوق سے ای میل کر سکتے ہیں)

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

حرا فہد، کراچی۔ سعید احمد، حیدرآباد۔ شائلہ عاطف، لاہور۔ کاظم مختار، کراچی۔ جنید رشید، کوٹری۔

پسِ سازش

حسام بٹ

زندگی آگے بڑھنے کا نام ہے... اس کی مختلف منازل سے گزرتے وقت دائیں بائیں گہری نگاہ رکھنی پڑتی ہے... گردوپیش کو خاطر میں لائے بغیر اپنی ہی دھن میں چلتے رہنے والے حد سے زیادہ سادہ لوگ اپنے مقصد کو حاصل نہیں کر پاتے... وہ سب ایک سے بڑھ کر ایک جگادری تھے... اور اپنی جیت کے لیے کسی کو بھی قربانی کا بکرا بنانے سے نہیں چوکتے تھے مگر ایک روز ان کی ہر چال الٹی پڑ گئی... خودغرضی... لالچ اور بے ایمانی کے زینوں پر وہ جیت کے انتہائی قریب پہنچ گئے تھے اور تقدیر ان کی تدبیر پر مسکرا رہی تھی "پانچ چوہے گھر سے نکلے، کرنے چلے شکار" کی عملی تفسیر... ایک چونکادینے والی تحریر...

ایک ستم ظریف حرماں نصیب دن کا احوال...... جب کوئی شے اپنی جگہ پر نہیں رہی تھی......

اُس نے آفس میں قدم رکھا اور سبک خرامی سے چلتے ہوئے اپنے کمرے کی جانب بڑھنے لگا۔ اس کے روم سے ملحقہ سیکریٹری کا کیبن تھا۔ جب وہ مذکورہ کیبن کے سامنے پہنچا تو سیکریٹری شہلا نے مترنم آواز میں کہا۔

"گڈ مارننگ سر!"

"مارننگ!" اس نے سر کی خفیف جنبش کے ساتھ زیرلب مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"سر! کوئی رئیس صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔" شہلا نے بتایا۔ "وہ آپ کے روم میں بیٹھے ہیں۔ میں نے انہیں چائے اور پانی سرو کروا دیا ہے۔"

"رئیس صاحب......" اس کے چہرے پر اُلجھن آمیز لکیریں نمودار ہوئیں۔ "کون رئیس......؟"

شہلا کو یہ سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی کہ اس نے جس ملاقاتی کو اپنے باس خلیق الزماں کے کمرے میں بٹھا رکھا ہے، وہ شخص اس کے باس کی یادداشت میں کہیں محفوظ نہیں تھا اسی لیے رئیس کا نام سنتے ہی باس کی آنکھوں میں تذبذب ہلکورے کھانے لگا تھا۔

"سر! رئیس صاحب نے بتایا تھا کہ وہ میڈم کے قریبی رشتے دار ہیں۔"



سیکریٹری نے اپنی پوزیشن کلیئر کرنے کی کوشش کی۔ ''وہ چند روز پہلے ہی پاکستان آئے ہیں اور آپ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں اسی لیے میں نے انہیں وزیٹرز لابی میں بٹھانے کے بجائے......''

''اِٹس او کے۔'' خلیق نے ہاتھ کے اشارے سے شہلا کو مزید بولنے سے روک دیا۔ ''تم نے بہت اچھا کیا جو رئیس صاحب کو میرے روم میں بٹھا دیا۔ میں جب تک رئیس صاحب کے ساتھ ہوں، کسی کو میرے کمرے میں نہیں آنے دینا۔''

''سمجھ گئی سر۔'' وہ فرمانبرداری سے بولی پھر استفساریہ نظر سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ ''سر! آپ کے لیے کافی تو بھجواؤں نا......؟''

''نہیں۔'' وہ دوٹوک لہجے میں بولا۔ ''فی الحال موڈ نہیں ہے۔''

سیکریٹری جلدی سے بولی۔ ''او کے سر۔''

اپنی سیکریٹری سے گفتگو کے دوران میں خلیق مسلسل اس ملاقاتی کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا جو اس وقت اس کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ وہ رئیس نامی کسی شخص کو اپنی یادداشت میں تازہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا لیکن اس نے اپنی اس الجھن کو سیکریٹری پر عیاں نہیں ہونے دیا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ سیکریٹری نے ملاقاتی کے حوالے سے میڈم کا نام لے دیا تھا۔ خلیق میڈم یعنی اپنی بیوی عندلیب سے بہت دبتا تھا۔ عندلیب کے کئی رشتے دار بیرونِ ملک سیٹل تھے جن میں سے زیادہ تر امریکا اور کینیڈا میں تھے۔

''ممکن ہے، رئیس، عندلیب کا کوئی ایسا رشتے دار ہو جس سے وہ تعارف کرانا بھول گئی ہو۔'' یہ سوچتے ہوئے وہ اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا۔ ''یہ فیملی میٹر ہے۔ اچھا ہوا، میں نے سیکریٹری کے سامنے زیادہ حیرت یا اجنبیت کا اظہار نہیں کیا۔''

انسان اس کائنات کا سب سے زیادہ شاطر اور موقع شناس جان دار ہے۔ کوئی اور ذی روح اس کے مقابلے کا خود فریب اور خوش فہم ہو نہیں سکتا۔ دوسروں کو دھوکا دینا تو ایک عام سی بات ہے، یہ حضرت انسان بسا اوقات اپنے آپ کو بھی فریب میں مبتلا کرنے سے نہیں چوکتا۔ ان لمحات میں خلیق بھی کچھ ایسا ہی کر رہا تھا۔ وہ اپنے فیملی میٹر کو سیکریٹری کے سامنے ڈسکس نہ کر کے خود کو تسلی دے رہا تھا جبکہ حقیقت یہ تھی کہ عندلیب پوری طرح اس پر حاوی تھی۔ وہ اپنی بیوی کے سامنے چوں کرنے کی بھی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ اگر رئیس اس کے ساتھ میڈم کا حوالہ نہ لگا ہوتا تو یقیناً وہ سیکریٹری پر خفگی کا اظہار کرتا کہ کسی اجنبی شخص کو اس کے کمرے میں کیوں بٹھایا گیا۔

خلیق جب اپنے کمرے میں داخل ہوا تو رئیس نامی وہ اجنبی ملاقاتی خیر مقدمی انداز میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور خلیق اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد خلیق نے اپنے لہجے میں خوش گواری بھرتے ہوئے کہا۔

''سیکریٹری نے مجھے بتایا ہے کہ آپ عندلیب کے کوئی قریبی رشتے دار ہیں اور حال ہی میں بیرونِ ملک سے تشریف لائے ہیں۔ عجیب اتفاق ہے نا، عندلیب نے بھی مجھ سے آپ کا ذکر نہیں کیا۔''

''اس میں آپ کی بیوی کا کوئی قصور نہیں۔'' اس کے سامنے بیٹھے ہوئے رئیس نامی شخص نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''وہ بے چاری تو مجھے جانتی تک نہیں۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' اس نے حیرت آمیز لہجے میں پوچھا۔ ''جب آپ میری بیوی کے لیے اجنبی ہیں تو میری سیکریٹری نے پھر یہ کیوں کہا کہ آپ عندلیب کے قریبی......''

''آپ کی سیکریٹری بھی بے قصور ہے۔'' رئیس نے اس کی بات کاٹ کر بہ دستور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں نے سیکریٹری کو جو بتایا وہ اس نے آپ تک پہنچا دیا۔ ویری سمپل......''

''پھر...... آپ کون ہیں......'' خلیق نے قدرے تیز آواز میں دریافت کیا۔ ''اور یہاں آپ کی آمد کا مقصد کیا ہے؟''

''آواز نیچی۔'' وہ ''آپ'' سے ''تم'' پر آتے ہوئے سخت لہجے میں بولا۔ ''اس لیے نہیں کہ تمہاری آواز اس کمرے سے باہر چلی جائے گی۔ میں جانتا ہوں کہ یہ کمرا ساؤنڈ پروف ہے۔ میں نے تمہیں دھیما لہجہ اختیار کرنے کو اس لیے کہا ہے کہ مجھے چیخنے چلاّنے والے لوگ بالکل پسند نہیں ہیں۔ ایسے افراد کو شوٹ کرنے میں مجھے بہت مزہ آتا ہے۔''

بات کے اختتام پر اس نے ایک گن نکال کر اپنے سامنے میز پر رکھ دی۔ اس کا سیل فون، چائے کا کپ اور پانی والا گلاس بھی میز پر رکھے ہوئے تھے۔ اس نے پانی کا ایک گھونٹ بھرنے کی زحمت کی تھی اور نہ ہی چائے کی ایک

چسکی لینے کا تکلف۔

قیمتی گن دیکھ کر خلیق کی آنکھوں میں خوف اُمڈ آیا تھا۔ اس پر رئیس کا اعتماد اس کا پتا پانی کر رہا تھا۔ رئیس گہری سانولی رنگت کا اور دبلا پتلا میانہ قد شخص تھا۔ اس کی آنکھوں سے درندگی اور چہرے سے سفاکی مترشح تھی۔ اس کی حرکات و سکنات میں بڑا توازن اور الفاظ میں حاکمیت تھی۔ اس کے پُراعتماد انداز کو دیکھ کر خلیق سمجھ گیا کہ وہ کوئی پیشہ ور مجرم اور بے رحم قاتل تھا۔

''مسٹر......'' خلیق نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''تم یہاں کیوں آئے ہو؟ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ میں تو تمہیں جانتا تک نہیں...... مجھ سے تمہاری کیا دشمنی ہے......؟''

خلیق کے سوالات کو نظر انداز کرتے ہوئے رئیس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا کمرا ساؤنڈ پروف ہے، اسی لیے میں نے گن کی نال پر سائیلنسر فٹ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اگر تم چند منٹ تک میری ہدایات کے مطابق عمل کرتے رہے تو میں تمہاری زندگی کی ضمانت دیتا ہوں، بہ صورت دیگر تمہیں ٹھنڈا کرنے میں، میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کروں گا۔'' لمحاتی توقف کر کے اس شخص نے میز پر سے اپنی گن اور سیل فون اٹھالیا پھر خلیق کے چہرے پر نگاہ جما کر اضافہ کیا۔

''کیا میں سمجھوں کہ تم تعاون کے لیے تیار ہو؟''

خلیق نے میکانکی انداز میں سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے جلدی سے کہا۔ ''ہاں، ہاں...... بالکل!''

رئیس نے اپنے دائیں ہاتھ میں بڑی مستعدی کے ساتھ گن کو تھام رکھا تھا اور خلیق کو اپنی نگاہ میں رکھتے ہوئے وہ بائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے سیل فون کو بھی استعمال کر رہا تھا۔ ڈائلنگ مکمل ہونے کے بعد اس نے فون کو کان سے لگا لیا۔

''ہاں رئیس! کیا رپورٹ ہے؟'' دوسری جانب سے پوچھا گیا۔

اس نے جواب دیا۔ ''آل اِز ویل۔''

''گڈ۔'' دوسری طرف بولنے والے نے ستائشی انداز میں کہا۔ ''فون اُسے دو۔''

رئیس نے سیل فون خلیق کی جانب بڑھاتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''لو، بات کرو۔''

''کک...... کون ہے......؟'' خلیق نے ہاتھ دراز کرتے ہوئے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''وہی...... جس کے تم مقروض ہو......'' رئیس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

خلیق نے لمحاتی تذبذب کے بعد رئیس کے ہاتھ سے سیل فون لے لیا۔ اس دوران میں اس کا ذہن مسلسل اسی سوچ بچار میں مصروف تھا کہ وہ کس کا مقروض ہے؟ ذہن کے کسی گوشے میں اس سوال کا جواب موجود نہیں تھا کیونکہ اپنی یادداشت کے مطابق، وہ کسی کا بھی مقروض نہیں تھا۔

رئیس نے گن کی نال کو خلیق کے سینے پر تان رکھا تھا اور اس کی چیتا آنکھیں، پلکیں جھپکائے بغیر خلیق پر جمی ہوئی تھیں۔ رئیس کے تیور بتاتے تھے کہ اِدھر خلیق نے کوئی قابلِ اعتراض حرکت کی، اُدھر اس کی گن نے آگ اگلنا تھی۔ اس کے بعد خلیق کی زندگی کی ضمانت کوئی نہیں دے سکتا تھا۔

خلیق نے رئیس کے عزائم کو اچھی طرح بھانپ لیا تھا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی کہ وہ اس وقت جس نوعیت کی صورتِ حال سے دوچار ہے، وہاں غلطی کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔ سچویشن کی اسی نزاکت کے پیشِ نظر اس نے بڑی شرافت کے ساتھ سیل فون کو کان سے لگا لیا۔

''ہیلو......'' وہ سہمی ہوئی آواز میں بولا۔

دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ ''خلیق! پہچانا مجھے......؟''

''اوہ......'' وہ ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔ ''نجیب...... تم......!'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

''خوب پہچانا......'' نجیب نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

خلیق نے اضطراری لہجے میں سوال کیا۔ ''نجیب! یہ سب کیا ہے؟ تمہارا ایک آدمی مجھ پر گن تانے بیٹھا ہے......''

''کیا میں نے تم سے پوچھا تھا کہ وہ سب کیا تھا؟'' نجیب نے بے حد زہریلے لہجے میں کہا۔ ''تمہاری تحریر پر نصف درجن افراد نے میرے آدمیوں پر گنز تان لی تھیں...... وہ واقعہ تمہیں یاد ہے نا؟''

''تمہاری غلط فہمی کا میرے پاس کوئی علاج نہیں ہے۔'' خلیق نے ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''ماضی میں تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہوا، وہ تمہارے اعمال کا پھل تھا۔ اس ریڈ میں میرا ہاتھ نہیں تھا۔''

''میں تمہاری بک بک سننے کے موڈ میں نہیں ہوں خلیق۔'' نجیب نامی شخص نے درشت لہجے میں کہا۔ ''ڈیڑھ سال پہلے تمہاری وجہ سے میرا تین کروڑ کا نقصان ہوا تھا۔

اس وقت ڈالر لگ بھگ سو روپے کا تھا، آج کم و بیش ایک سو ساٹھ روپے کا ہے۔ اگر میں سود کو یکسر نظر انداز بھی کر دوں تو آج کے حساب سے اصل زر پانچ کروڑ روپے بن جاتا ہے۔ تم میرے پانچ کروڑ کے مقروض ہو۔ مجھے میری رقم چاہیے۔''

''میں نے کہا نا، اس میں میرا کوئی قصور نہیں......''

''بکواس بند کرو۔'' نجیب نے قطع کلامی کرتے ہوئے دہاڑ سے مشابہ لہجے میں کہا۔ ''میری سیدھی بات تمہاری الٹی کھوپڑی میں نہیں سما رہی نا...... ٹھہرو، میں تمہیں دوسرے طریقے سے سمجھاتا ہوں۔ فون رئیس کو دو۔''

خلیق کے پاس اس کے حکم کی تعمیل کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا لہٰذا اس نے رئیس کا سیل فون اسی کی جانب بڑھا دیا۔

رئیس موبائل فون کو کان سے لگا کر چند سیکنڈ تک ''ہوں، ہاں'' کرتا رہا پھر خلیق کی طرف دیکھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں بولا۔

''اپنی بیوی کو فون لگاؤ۔''

خلیق نے بے ساختہ میز پر رکھے ہوئے ٹیلی فون سیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ قبل اس کے کہ وہ ریسیور کو کریڈل سے جدا کرتا، رئیس نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یہ ڈیڈ ہے۔''

خلیق نے ہراساں نظر سے رئیس کی طرف دیکھا۔

''میں نے تمہارے آفس کی اس لینڈ لائن میں ایک ایسی ٹیکنیکل خرابی پیدا کر دی ہے کہ جسے کوئی ماہر مکینک ہی دور کر سکتا ہے۔'' رئیس نے انکشاف انگیز انداز میں بتایا۔ ''اگر میری بات کا یقین نہیں تو چیک کر لو۔''

خلیق نے ''چیک'' کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور تعاون آمیز لہجے میں بولا۔ ''مجھے تمہاری بات پر یقین ہے۔''

''ویری گڈ!'' رئیس نے تعریفی نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب تم اپنے سیل فون سے گھر کی لینڈ لائن پر کال کرو۔ بات سمجھ رہے ہو نا؟''

خلیق نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا اور جیب میں سے اپنا سیل فون برآمد کر لیا۔ رئیس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تمہیں اپنی بیوی سے صرف ایک سوال کرنا ہے...... کیا عرفانہ کو یونیورسٹی لے کر جانے والا ڈرائیور واپس آ گیا؟''

عرفانہ، خلیق کی اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ مقامی یونیورسٹی میں ایم بی اے کے فائنل ایئر میں تھی۔ رئیس کے منہ سے عرفانہ کا نام سن کر خلیق کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہرانے لگے۔ اس نے متوحش لہجے میں پوچھا۔

''اس سوال کا...... کیا مطلب ہوا......؟''

''تم فون پر اپنی بیوی سے سوال کرو۔'' رئیس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''جواب تمہیں وہیں سے مل جائے گا۔''

''اوکے۔'' خلیق کے لہجے سے بے چارگی جھلکی۔

''ایک سوال کا مطلب ہے، صرف ایک سوال۔'' رئیس نے تنبیہ کرنے والے انداز میں کہا۔ ''زیادہ قصے کہانیاں نہیں...... ہوں؟''

''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے۔'' خلیق نے سہمی ہوئی نظر سے گن بردار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا پھر اپنے گھر کا نمبر ملانے لگا۔

تیسری گھنٹی پر عندلیب نے کال ریسیو کر لی۔ اس دوران میں خلیق نے سوچ لیا تھا کہ بیوی سے کس انداز میں بات کرنا ہے۔ وہ عندلیب سے بہت زیادہ ڈرتا تھا۔ اس کی ترقی اور کاروباری کامیابی کے پیچھے عندلیب کا فنانشل ہاتھ تھا۔ عندلیب ایک صاحبِ ثروت خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ ہر ضرورت کے وقت خلیق کی سسرال والوں نے دل کھول کر اس سے مالی تعاون کیا تھا۔ عام حالات میں بھی عندلیب سے بات کرتے ہوئے اسے اچھی طرح سوچ بچار کرنا پڑتی تھی اور اس وقت تو وہ ایک سنگین صورتِ حال میں گھرا ہوا تھا لہٰذا اسے نہایت ہی نپے تلے انداز میں رئیس کے احکامات کی تعمیل کرنا تھی۔

''ہاں، مجھے خورشید سے کچھ کام ہے۔'' عندلیب کے ''ہیلو'' کے جواب میں اس نے منت ریز لہجے میں کہا۔ ''کیا وہ عرفانہ کو یونیورسٹی پہنچا کر واپس آ گیا ہے؟''

''نہیں۔'' عندلیب نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔ ''میں بھی اسی کا انتظار کر رہی ہوں۔ مجھے بیوٹی پارلر جانا ہے۔ تم فی الحال اپنے ذہن سے خورشید کا خیال نکال دو۔ وہ دو بجے کے بعد فری ہو گا۔ یا تو تم دو بجنے کا انتظار کرو اور یا پھر اپنی ضرورت کسی اور طرح سے پوری کر لو۔''

عندلیب کے حتمی جواب کی روشنی میں اس نے یہ کہتے ہوئے رابطہ موقوف کر دیا۔ ''ٹھیک ہے۔ ٹیک کیئر۔''

خلیق نے بیوی سے بات ختم کرنے کے بعد رئیس کی

طرف دیکھا تو اس نے جذبات سے عاری لہجے میں پوچھا۔
''کیا رہا؟''
''عرفانہ کو یونیورسٹی لے کر جانے والا ڈرائیور خورشید ابھی واپس گھر نہیں پہنچا۔'' خلیق نے بتایا۔
''خورشید کو کال کر کے پتا لگاؤ کہ وہ کہاں ہے؟''
خلیق نے رئیس کے حکم پر خورشید کا نمبر ملایا۔ دوسری جانب گھنٹی بجتی رہی مگر خورشید نے کال اٹینڈ نہیں کی۔ خلیق نے تین چار بار ٹرائی کیا پھر ناکام رہنے کے بعد مایوسی سے بولا۔
''خورشید کال پک نہیں کر رہا۔''
''اپنی بیٹی کو فون کر کے اس کی خیر خبر لو۔'' رئیس نے نیا حکم دیا۔
خلیق نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ایک مرتبہ پھر گن بردار رئیس کے حکم کی تعمیل کی پھر سراسیمہ نظر سے رئیس کو تکتے ہوئے شکستہ لہجے میں بولا۔
''عرفانہ...... کا سیل فون آف...... آ رہا ہے۔''
''ٹھیک ہے، میں ٹرائی کرتا ہوں۔'' رئیس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر اپنا بایاں ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''اپنا سیل فون مجھے دو۔''
''ہو سکتا ہے، عرفانہ کوئی کلاس اٹینڈ کر رہی ہو۔'' خلیق نے اپنا سیل فون رئیس کی جانب بڑھاتے ہوئے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ ''اسی لیے اس نے اپنا موبائل آف کر رکھا ہوگا۔''
''ایسی بات نہیں ہے۔'' رئیس نے معتدل انداز میں کہا۔
خلیق کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا، اس نے اُلجھن زدہ انداز میں کہا۔ ''میں سمجھا نہیں، تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''
رئیس نے خلیق کی پریشانی اور الجھن کو دور کرنا ضروری نہ جانا اور اس کے سیل فون کو آف کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ خلیق کے اضطراب میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ وہ بے بس نظر سے رئیس کو دیکھنے لگا۔
رئیس نے اپنے سیل فون سے کسی کو کال کیا۔ رابطہ ہونے پر اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''عرفانہ سے بات کراؤ...... صرف پندرہ سیکنڈ کے لیے...... اوکے۔''
دوسری جانب سے ''اوکے'' موصول ہونے کے بعد رئیس نے اپنا سیل فون خلیق کو دیتے ہوئے سفاک لہجے میں کہا۔
''لو، اپنی بیٹی سے بات کرو۔ تمہارے پاس صرف پندرہ سیکنڈ کا وقت ہے اور کوئی ہوشیاری نہیں ورنہ میں اس گن کو زحمت دینے کے لیے مجبور ہو جاؤں گا۔'' بات کے اختتام پر رئیس نے بڑے خطرناک انداز میں اپنی گن کو حرکت دی۔
خلیق نے سیل فون کو کان سے لگا کر ''ہیلو'' کہا تو عرفانہ کی سہمی ہوئی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ''پاپا! مجھے چند خطرناک لوگوں نے یونیورسٹی جاتے ہوئے اغوا کر لیا ہے۔ انہوں نے میری آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ کر کسی جگہ پہنچایا ہے۔ میں اس وقت ان کی قید میں ہوں۔ پلیز...... آپ ان کا مطالبہ پورا کر کے مجھے چھڑا لیں۔''
خلیق کا دل کٹ کر رہ گیا۔ ''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں میری جان۔'' اس نے اپنی بیٹی کو تسلی دی۔ ''میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ ان لوگوں نے تمہارے ساتھ کوئی بدتمیزی، کوئی مار پیٹ تو نہیں کی؟''
''ابھی تک تو نہیں۔'' عرفانہ نے خوف زدہ لہجے میں بتایا۔ ''لیکن یہ لوگ مجھے ڈرا رہے ہیں کہ اگر تمہارے باپ نے ہماری بات نہیں مانی تو یہ میرے ٹکڑے کر کے سمندر میں پھینک دیں گے۔''
''میں انہیں ایسا کچھ نہیں کرنے دوں گا۔'' وہ اپنی بیٹی کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں بالکل پریشان نہیں ہونا...... اوکے۔''
دوسری جانب سناٹا اتر آیا۔ خلیق نے اضطراری لہجے میں پکارا۔ ''عرفانہ...... میری جان...... تم بول کیوں نہیں رہی ہو......؟''
''یور ٹائم از اوور۔'' رئیس نے اس کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے سادگی سے کہا۔ ''پندرہ سیکنڈ پورے ہو گئے۔ میرا سیل فون واپس کرو...... شاباش۔''
خلیق، رئیس کے حکم کی تعمیل کرنے کے بعد روہانسے لہجے میں کہا۔ ''یہ تم لوگ ٹھیک نہیں کر رہے ہو...... تمہیں، تمہارے کیے کی سزا ضرور ملے گی۔''
رئیس نے خلیق کے دھمکی دار جملوں کو کمال بے اعتنائی سے جوتے کی نوک پر مارا اور اپنے سیل فون پر کوئی اور نمبر ڈائل کرنے کے بعد موبائل خلیق کی طرف بڑھاتے ہوئے معتدل انداز میں بولا۔
''اس سین کا آخری شاٹ۔ لو، بات کرو۔''
خلیق نے فون کان سے لگایا تو نجیب کی نحوست بھری آواز نے اس کی سماعت پر دنگی ہتھوڑا برسایا۔ ''تمہیں یقین آ گیا نا کہ تمہاری بیٹی اس وقت میرے قبضے میں ہے۔

عرفانہ سے میری کوئی دشمنی نہیں۔ وہ تمہاری بداعمالیوں کی زد میں آگئی ہے۔ اگر تمہیں اپنی بیٹی کی جان اور عزت...... میں نے کیا کہا؟ ہاں...... ''جان'' اور ''عزت''......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گمبھیر سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اگر تمہیں عرفانہ کی جان اور عزت کی سلامتی مقصود ہے تو آج سہ پہر پانچ بجے سے پہلے میرے پانچ کروڑ روپے لوٹا دو۔''

''نجیب! تم میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہو۔'' خلیق کے لہجے میں احتجاج در آیا۔ ''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اس ریڈ میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا...... وہ ایک معمول کی محکمہ جاتی کارروائی تھی۔''

''میں اچھی طرح جانتا ہوں اسی لیے تو یہ قدم اٹھایا ہے۔'' نجیب نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''ایک بات ذہن میں بٹھا لو۔ تم عرفانہ کے اغوا کے بارے میں محکمہ جاتی کارروائی کرنے والے اپنے ان باپوں کو کچھ نہیں بتاؤ گے۔ اگر انہیں اس معاملے کی بھنک بھی پڑی تو......'' اس نے ڈرامائی انداز میں اپنی بات ادھوری چھوڑی پھر سنسنی خیز لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''تم نے تھوڑی دیر پہلے کہا کہ میں تمہارے ساتھ زیادتی کر رہا ہوں۔ ابھی تک تو میں نے ایسا کچھ نہیں کیا لیکن اگر تم نے آج پانچ بجے سے پہلے میرا مطالبہ پورا نہیں کیا یا اس حوالے سے اپنے باپوں کو کچھ بتایا تو میں تمہاری بیٹی کا وہ حشر کروں گا کہ دنیا کی تمام زبانوں کی لغات میں درج لفظ ''زیادتی'' کے معانی عرفانہ کے حسرت ناک انجام کی تشریح نہیں کر پائیں گے۔''

''تم عرفانہ کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤ گے۔'' خلیق نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تمہیں جو چاہیے، وہ میں دوں گا۔''

''پانچ ہزار مالیت والے قدرے استعمال شدہ نوٹ۔'' نجیب کی سرسراتی ہوئی آواز اس کی سماعت تک پہنچی۔ ''استعمال شدہ اس لیے کہ وہ کسی سیریل میں نہ ہوں۔ سو، سو نوٹوں والی پوری سو گڈیاں۔ ہر گڈی میں پانچ لاکھ روپے، سو گڈیوں میں پورے پانچ کروڑ روپے...... پچاس ملین روپے...... سمجھ گئے نا؟''

''ہاں...... سمجھ گیا۔'' خلیق نے لکنت زدہ انداز میں کہا۔ ''لیکن اس اماؤنٹ کو ارینج کرنے کے لیے تم بہت کم...... وقت دے رہے ہو۔ پانچ ہزار والا نوٹ سب سے بڑا نوٹ ہے جو رننگ میں سب سے کم ہوتا ہے۔ اس مالیت کے دس ہزار نوٹ کا بندوبست کرنا ناممکن کی حد تک مشکل ہے۔ تم میری پریشانی کو محسوس کر سکتے ہو۔''

''میں تو یہ محسوس کر رہا ہوں کہ تم ہرگز پریشان نہیں ہو۔'' نجیب نے بے مروتی سے کہا۔ ''کم از کم رقم کا انتظام کرنے کے حوالے سے تو قطعاً نہیں۔ تم اس شہر کے ایک کامیاب امپورٹر ہو۔ چار لیڈنگ بینکوں میں تمہاری ٹریڈنگ کمپنی کے اکاؤنٹس ہیں۔ تم آٹھ سے زیادہ کریڈٹ کارڈز استعمال کرتے ہو اور سب سے بڑی بات یہ کہ تم مارکیٹ میں بیٹھے ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر تمہاری نیت میں کوئی فتور نہ ہو تو تم صرف ایک گھنٹے میں میری مطلوبہ رقم کا بندوبست میرے حسب منشا کر سکتے ہو۔ تمہاری ایک کال پر کوئی بھی پارٹی تمہاری ضرورت پوری کرنے کے لیے سر کے بل کھڑی ہو جائے گی۔ تم اپنے بینکوں کے منیجرز کو فون کر کے اپنی ڈیمانڈ سے آگاہ کرو گے تو ایک گھنٹے سے بھی پہلے یہ اماؤنٹ تمہارے آفس میں پہنچا دیا جائے گا۔ میں جانتا ہوں، تم کتنے بڑے نگر مچھ امپورٹر ہو اور پھر...... تم پر تمہارے اباؤں کا بھی ہاتھ ہے مگر اس ڈیل میں اگر تم نے اپنے اباؤں کو گھسایا تو پھر بھی عرفانہ کی صورت نہیں دیکھ پاؤ گے۔ از اٹ کلیئر؟''

''او کے۔'' خلیق ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہارا مطالبہ پورا کرنے کو تیار ہوں۔''

''رقم کو ایک بیگ میں بھر کر اپنے سب سے زیادہ قابل بھروسا بندے سلیم اختر کو دے دینا۔'' نجیب نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''سلیم کسی ٹیکسی میں ائرپورٹ کی جانب روانہ ہوگا۔ راستے میں کسی جگہ میرے بندے رقم والا بیگ وصول کر کے عرفانہ کو سلیم کے سپرد کر دیں گے۔''

''تم جیسا چاہ رہے ہو، ویسا ہو جائے گا۔'' خلیق نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ ''اور کچھ......؟''

''سلیم جس ٹیکسی میں بیٹھے، اس ٹیکسی کا نمبر اور سلیم کا موبائل نمبر مجھے چاہیے ہوگا۔''

''جب سلیم نوٹوں سے بھرا ہوا بیگ لے کر آفس سے روانہ ہوگا تو میں تمہیں دونوں مطلوبہ نمبر فراہم کر دوں گا۔'' خلیق نے کہا۔ ''تم بھی میری ایک بات ذہن نشین کر لو نجیب کہ عرفانہ کو ایک خراش تک نہیں آنا چاہیے ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔''

''میں جانتا ہوں، تم سے زیادہ برا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔'' نجیب نے زہرخند لہجے میں کہا۔ ''اور میں تم کو بتا چکا

ہوں کہ عرفانہ سے میری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ اگر اسے کوئی گزند پہنچے گی تو اس کی ساری ذمے داری تم پر ہوگی۔''

''میں اپنی ذمے داری کو نبھانے میں کوئی کوتاہی نہیں کروں گا۔''

''ویئس گڈ۔'' نجیب نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''اپنی اکلوتی اولاد سے بے پناہ محبت کرنے والے باپ کو تم جیسا ہی ہونا چاہیے۔ ایک بات ذہن میں رکھنا کہ یہ ''ذمے داری'' تمہیں اپنے اسی کمرے میں رہتے ہوئے نبھانا ہوگی۔ رقم کا انتظام کرنے کے بہانے تم اپنے روم سے باہر قدم نہیں نکالو گے اور کمرے کے اندر رہتے ہوئے تم کسی قسم کی چالاکی یا عیاری سے بھی کام نہیں لو گے۔ اگر تم نے ایسی کوئی بھی حرکت کی تو مجھے خبر ہو جائے گی کیونکہ تمہاری عدم موجودگی میں رئیس نے تمہارے اس روم کو بگ کر دیا ہے۔ دال کے دانے کے برابر ایک انتہائی حساس آڈیو۔ ویڈیو ریکارڈنگ ڈیوائس کو تمہارے روم میں تمہاری سوچ کی پہنچ سے دور ایک خفیہ مقام پر نصب کر دیا گیا ہے۔ تمہاری ایک ایک جنبش، ایک ایک بات کو میں مانیٹر کر رہا ہوں۔ سمجھ رہے ہو نا، میں کیا کہہ رہا ہوں؟''

''ہاں...... سمجھ رہا ہوں۔'' خلیق نے کسی مطیع و فرمانبردار بچے کے مانند کہا۔ ''میں اپنی بیٹی کی سلامتی اور بہ حفاظت واپسی کے لیے تمہاری ہدایات پر عمل کروں گا۔''

''گڈ گائے۔'' نجیب نے اسے شاباشی دی۔ ''ایک نمبر نوٹ کر لو۔ جب رقم کا انتظام ہو جائے تو اس نمبر پر کال کر کے بتا دینا۔ میں اب دوبارہ تم سے بات نہیں کروں گا۔ میرے بندے سچویشن کو بہ طریق احسن ہینڈل کر لیں گے۔''

خلیق نے اضطراری انداز میں اپنی میز پر سے ایک کاغذ اور قلم اٹھا لیا پھر مسکینیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''نمبر لکھواؤ۔''

نجیب نے اسے ایک سیل فون نمبر نوٹ کروا دیا۔

''یہ...... یہ تو...... میری بیوی...... عندلیب کا سیل نمبر ہے۔'' خلیق نے حیرت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

دوسری جانب سے مہیب سناٹا چھا گیا۔ نجیب نے سیلولر رابطہ منقطع کر دیا تھا۔ خلیق نے پریشانی کے عالم میں رئیس کی طرف دیکھا۔ رئیس نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''کیا ہوا؟''

''نجیب نے لائن کاٹ دی ہے۔'' خلیق نے بتایا۔

رئیس ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''سیل فون مجھے دو۔'' اس نے اپنے موبائل فون کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور فوراً کام سے لگ جاؤ۔''

خلیق نے سیل فون رئیس کی جانب بڑھاتے ہوئے چند بذب لہجے میں استفسار کیا۔ ''کون سے کام سے لگ جاؤں؟''

رئیس نے اس کے ہاتھ سے اپنا سیل فون واپس لیتے ہوئے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی پھر خلیق کے چہرے پر نظر جما کر سپاٹ آواز میں بولا۔ ''میں پچھلے پندرہ منٹ سے تمہارے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اپنا قیمتی وقت مجھے دینے کا شکریہ۔ اب میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ میرے جانے کے بعد تم نے اپنی حرکات و سکنات اور گفت و شنید سے ایسا ظاہر کرنا ہے جیسے تمہاری بیوی کا کوئی امریکا پلٹ رشتے دار تم سے فیملی میٹرز ڈسکس کرنے یہاں آیا تھا۔ میری بات سمجھ میں آ رہی ہے نا......؟''

بات مکمل کرتے ہی اس نے گن کو مخصوص انداز میں حرکت دی۔ خلیق بڑی سرعت سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''ہاں، ہاں...... اچھی طرح سمجھ گیا۔''

رئیس نے گن کو پشت پر اپنی جینز میں اُڑسا، ٹی شرٹ کو برابر کر کے لیدر جیکٹ کو سیدھا کیا پھر گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اب تم فون تھماؤ اور پانچ کروڑ روپے ارینج کرنے کے کام سے لگ جاؤ۔''

''تم میرا سیل فون اپنے ساتھ لے کر جا رہے ہو۔'' خلیق پھٹ پڑا۔ ''اس کمرے کے اندر رہتے ہوئے میں باہر کے کسی آدمی سے رابطہ کیسے کروں گا؟''

''لینڈ لائن سے۔'' رئیس نے میز پر رکھے ہوئے ٹیلی فون سیٹ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ کس مرض کی دوا ہے؟''

''مگر تم نے تو اس فون کو خراب کر دیا ہے۔'' خلیق نے اُلجھن زدہ انداز میں کہا۔ ''یہ بات چند منٹ پہلے تم نے ہی مجھے بتائی تھی۔''

''چند منٹ بعد بھی میں ہی تمہیں بتا رہا ہوں کہ تمہارا فون بالکل ٹھیک ہے۔'' رئیس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''میری بات کا یقین نہ ہو تو چیک کر لو۔''

تھوڑی دیر پہلے رئیس نے فون کو خراب کرنے کے ذیل میں خلیق کو دعوت دی تھی کہ وہ اس کی بات کی تصدیق کے لیے چاہے تو فون چیک کر لے مگر خلیق نے چیکنگ کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی لیکن اب کی بار اس نے اپنی تسلی

کی خاطر ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا تھا۔
فون میں لائن کی موجودگی کی مخصوص ٹون سنائی دے رہی تھی۔ اس نے مطمئن انداز میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دی پھر بہ آہستگی ریسیور کو کریڈل کرنے کے بعد ایک اہم سوال کیا۔
''کیا تم نے میرے کمرے کو بگ کر رکھا ہے؟''
رئیس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے اٹل لہجے میں جواب دیا۔ ''بے شک۔''
''میں کس طرح تمہاری بات کا اعتبار کرلوں۔'' خلیق نے چبھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ''تم نے فون خراب کرنے کے حوالے سے ایک سنگین جھوٹ بولا تھا۔''
''تمہیں اس بات پر تو یقین کرنا ہی ہوگا کہ یہ کمرا مکمل طور پر بگ ہے۔'' رئیس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''کیونکہ تم ایسا کرنے پر مجبور کر دیے گئے ہو۔'' وہ جانے کے لیے مڑا اور اپنے عقب میں موجود خلیق کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک لمحے کے لیے بھی اس سفاک حقیقت کو فراموش نہیں کرنا کہ تمہاری جوان اور حسین اکلوتی بیٹی ہمارے قبضے میں، ہمارے رحم و کرم پر ہے۔''
خلیق بے بسی اور بے چارگی کے دوراہے پر کھڑا ایک بوجھل سانس خارج کر کے رہ گیا۔

☆☆☆

مشہور محاورہ ہے ''چور کی داڑھی میں تنکا'' پتا نہیں، اس محاورے کو کسی چور عورت پر بھی فٹ کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ عندلیب کے دل میں چور تھا چنانچہ وہ کافی دیر سے یہی سوچ جارہی تھی کہ آخر خلیق کو خورشید سے کیا کام ہو سکتا ہے؟ اس نے فون کر کے خورشید کے بارے میں کیوں پوچھا؟ کہیں اسے بھی خورشید سے اسی نوعیت کا کام تو نہیں جیسا کام وہ رضا خان سے لے رہی تھی۔
انسان کے اپنے اندر کوئی گڑبڑ ہو تو وہی گڑبڑ اسے دوسروں میں بھی دکھائی دینے لگتی ہے۔ شاید اسی لیے کہا جاتا ہے...... چوروں کو سارے نظر آتے ہیں چور۔ عندلیب کا معاملہ بھی کچھ اسی قسم کا تھا۔
کچھ عرصے سے عندلیب کو خلیق پر یہ شک ہونے لگا تھا کہ وہ دوسری عورتوں میں دلچسپی لینے لگا ہے۔ اپنے شوہر پر نگاہ رکھنے کے لیے اس نے رضا کو اعتماد میں لے لیا تھا۔ رضا، خلیق کا منیجر تھا اور وہ خلیق کے بہت سے کاروباری رازوں سے واقف بھی تھا۔ خلیق اپنے منیجر پر بہت بھروسا کرتا تھا اور یہی منیجر اب عندلیب کے ہاتھوں کا کھلونا بن گیا تھا۔ اس کام کی مد میں عندلیب، رضا کی مالی مدد کرتی رہتی تھی۔ رضا، اپنے باس کے معمولات اور سرگرمیوں کے حوالے سے نہایت پابندی کے ساتھ عندلیب کو رپورٹنگ کرتا رہتا تھا تاہم ابھی تک کوئی ایسا اسکینڈل سامنے نہیں آیا تھا جو عندلیب کی نیندیں حرام کر دیتا۔
رضا کا زیادہ وقت آفس میں گزرتا تھا لہٰذا وہ خلیق کی نگرانی کے لیے ہر لحاظ سے ایک موزوں شخص تھا اور خورشید...... کا زیادہ وقت گھر پر گزرتا تھا اسی سبب نشیب میں پانی بھرنے لگا تھا۔ خلیق کے فون نے عندلیب کے کان کھڑے کر دیے تھے۔ اس کے ذہن میں اس خوف ناک خدشے نے سر ابھارا تھا کہ کہیں خلیق، خورشید کو اس کی نگرانی پر مامور کرنے کا ارادہ تو نہیں رکھتا۔
اس تشویشناک سوچ نے اس کے دل میں ہلچل مچا دی۔ وہ پارلر جانے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ اس کا پرس اور سیل فون سائڈ ٹیبل پر رکھا تھا۔ وہ خورشید کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی کہ اس خیال نے اس کا سکون غارت کر دیا تھا۔ اس نے ریسیور اٹھا کر رضا کا نمبر ڈائل کیا۔ پہلی ہی گھنٹی پر رضا نے اس کی کال ریسیو کرلی اور دھیمے لہجے میں کہا۔
''ہیلو میڈم! آپ کیسی ہیں؟''
''رضا صاحب! میں ٹھیک نہیں ہوں۔'' اس نے بتایا۔
''خیریت......؟'' رضا نے ہمدردی بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''کیا ہو گیا میڈم؟''
''پہلے آپ میرے ایک سوال کا جواب دیں۔'' اس نے کہا۔
''جی میڈم۔''
''کیا ہمارا ڈرائیور خورشید اس وقت آفس میں موجود ہے؟''
''نہیں میڈم۔'' رضا نے بتایا۔ ''میں نے تو اسے نہیں دیکھا۔''
''آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ خورشید آفس کی طرف نہیں آیا۔'' اس نے کریدنے والے انداز میں سوال کیا۔ ''خلیق صاحب کی اس سے ملاقات نہیں ہوئی؟''
''بالکل نہیں میڈم۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''آخر بات کیا ہے؟''
''کوئی خاص بات نہیں۔'' اس نے ٹالنے والے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''آپ کے صاحب کا کیا حال ہے؟''

''خلیق صاحب اپنے کمرے میں بیٹھے ہیں۔'' رضا نے بتایا۔

عندلیب نے استفسار کیا۔ ''کیا وہ اکیلے ہی ہیں؟''

''اب تو وہ اکیلے ہی ہیں۔'' رضا نے جواب دیا۔ ''اس وقت ان کے کمرے میں اور کوئی نہیں ہے۔''

''اب اکیلے ہیں کا کیا مطلب ہوا؟'' عندلیب کے کان کھڑے ہو گئے۔ ''کیا پہلے کوئی ... ان کے پاس تھا؟''

''جی میڈم۔''

''کک...... کون؟'' عندلیب کے استفسار سے اضطراب جھلکتا تھا۔

''آپ کے کوئی عزیز اُن سے ملنے آئے تھے۔''

''میرے عزیز......'' عندلیب نے بے یقینی سے پوچھا۔ ''کون؟''

''انہوں نے اپنا نام رئیس بتایا تھا۔'' رضا وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''دبلے پتلے، درمیانے قد کے اور گہری سانولی رنگت کے مالک تھے۔ خود کو آپ کا رشتے دار بتایا تھا اور یہ بھی کہ وہ حال ہی میں امریکا سے آئے ہیں۔''

''یہ تو ٹھیک ہے کہ میرے خاندان کے کئی افراد امریکا اور کینیڈا میں آباد ہیں لیکن ان میں رئیس نام کا کوئی بھی شخص نہیں ہے۔'' عندلیب نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''اور گہری سانولی یا محض سانولی رنگت تو رہی ایک طرف، میرے خاندان میں تو گندمی رنگ بھی خال خال ہی دکھائی دیتا ہے۔ یہ رئیس والا معاملہ تو مجھے ایک دم گڑبڑ گھوٹالا نظر آرہا ہے۔''

''میڈم! مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے۔'' رضا نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''میں آج تک، پچھلے پندرہ سال میں آپ کے خاندان کے جتنے بھی افراد سے ملا ہوں، وہ سب گورے چٹے اور ماشاء اللہ خوب صورت ہیں۔ رئیس کے جانے کے بعد خلیق صاحب خاصے ڈسٹرب لگ رہے ہیں۔''

''اوہ۔'' عندلیب نے گہری سانس خارج کی اور رازدارانہ انداز میں بولی۔ ''رضا صاحب! کھوج لگانے کی کوشش کریں، یہ رئیس کون تھا اور وہ کس مقصد سے آپ کے صاحب سے ملاقات کرنے آیا تھا؟''

''جی میڈم۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''جو آپ کا حکم...... میں آپ سے بعد میں بات کرتا ہوں...... خلیق صاحب نے شہلا کو اپنے کمرے میں بلایا ہے۔''

''اوہ اچھا۔'' عندلیب کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے کُریدنے والے انداز میں پوچھا۔ ''یہ چھمک چھلو اپنی حدود میں تو ہے نا؟''

''جی میڈم! میں نے شہلا پر بڑی گہری نظر رکھی ہوئی ہے۔'' رضا نے اطمینان دلانے والے انداز میں کہا۔ ''میں نے آفس کی حد تک اس کے اندر ایسے جراثیم نہیں دیکھے کہ خلیق صاحب کے حوالے سے اس پر شک کیا جاسکے۔''

''اور آفس کے باہر؟'' عندلیب نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''وہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔'' رضا نے بڑی سادگی سے کہا۔

''جو اللہ جانتا ہے، وہ آپ کو بھی جاننے کی کوشش کرنا چاہیے۔'' وہ بہ دستور معنی خیز لہجے میں بولی۔ ''آپ کو معلوم ہے نا، کچھ ہی عرصہ پہلے شہلا کو طلاق ہوئی ہے اور کم بخت اچھی شکل وصورت کی مالک بھی ہے۔ ایسی مظلوم مطلقہ اور بیوہ عورتیں بڑی خطرناک ہوتی ہیں رضا صاحب۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا، میرا اشارہ کس جانب ہے؟''

''اچھی طرح سمجھ رہا ہوں میڈم۔'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ ''آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں نے آپ کا نمک کھایا ہے اس لیے پوری طرح آپ سے وفادار ہوں۔ اگر خلیق صاحب اور شہلا کے بیچ مجھے کسی غیر نصابی کشش کے آثار نظر آئے تو میں فوراً آپ کو اطلاع دوں گا۔''

''ویری گڈ!'' عندلیب نے ستائشی انداز میں کہا۔ ''مجھے آپ سے ایسی ہی وفاداری کی توقع ہے...... بے مثال اور لاجواب۔''

''تھینک یو میڈم!'' وہ تشکرانہ انداز میں بولا۔ ''انشاء اللہ! آپ میری کارکردگی سے خوش ہو جائیں گی۔ میں کسی بھی مرحلے پر آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔''

''اوکے...... میں فون رکھ رہی ہوں۔ بعد میں بات کریں گے۔'' اس نے سرسری لہجے میں کہا۔ ''آپ اپنے کام پر توجہ دیں۔''

رضا نے جواباً کہا۔ ''اوکے میڈم۔''

رنگ بدلنے کے لیے بے چارہ گرگٹ خواہ مخواہ ہی بدنام ہے۔ اس معاملے میں وہ حقیر جاندار انسان کا پاسنگ بھی نہیں ہے۔ یہاں پر ''انسان'' سے مراد رضا ایسی فطرت کے انسان ہیں۔ کچھ عرصے سے عندلیب اس سے اپنے شوہر کی جاسوسی کا کام لے رہی تھی اور اس سلسلے میں وہ اس کی مالی مدد ... بھی کر رہی تھی۔ اس وقتی فائدے کی خاطر وہ عندلیب کے ''نمک خوار'' ہونے کا دعوے دار تھا اور اس سے حقِ وفاداری نبھاتے ہوئے وہ اپنے باس کو دھوکا دے

رہا تھا اور اس حقیقت کو یکسر فراموش کر بیٹھا تھا کہ گزشتہ پندرہ سال سے خلیق کا نمک اس کی اور اس کے بیوی بچوں کی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔

''یہ منحوس خورشید کہاں مر گیا۔'' عندلیب نے دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں خود کلامی کی اور ٹیلی فون کے ریسیور کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔

وہ یقیناً خورشید کو کال کر کے اس کے ابھی تک گھر نہ پہنچنے کا سبب جاننا چاہتی تھی۔ اس نے شہر کے ایک معروف اور مہنگے بیوٹی پارلر کا اپائنٹ منٹ لے رکھا تھا۔ اگر وہ مقررہ وقت پر مذکورہ پارلر نہ پہنچ جاتی تو اس کا اپائنٹ منٹ کینسل ہو جانا تھا اور وہ ایسا ہرگز نہیں چاہتی تھی۔ اس نے خورشید کو کھری کھری سنانے کے لیے ریسیور اٹھایا تھا لیکن جب اس نے ریسیور کان سے لگایا تو اس کے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ فون میں مخصوص ٹون موجود نہیں تھی۔ وہ لائن کے وجود سے خالی ''ڈیڈ'' پڑا تھا۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔'' وہ جھنجلا کر رہ گئی پھر ٹیلی فون کے کریڈل کو بار بار ٹیپ کرتے ہوئے بڑبڑائی۔ ''میں نے چند سیکنڈ پہلے ہی تو اسی فون سے رضا کو کال کی تھی۔ اس وقت تو یہ بالکل ٹھیک تھا۔ اب یہ خاموش کیوں ہے؟''

اس نے ٹیلی فون سیٹ کی ان اینڈ آؤٹ کیبل کو ہلا جلا کر بلکہ اچھی طرح جھنجوڑ کر بھی دیکھ لیا مگر اس انسٹرومنٹ نے کسی باڈی کی طرح ایک سانس بھی نہیں لی۔ وہ مکمل طور پر بے جان ہو چکا تھا۔

لینڈ لائن کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد وہ سائڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے اپنے سیل فون کی جانب بڑھی۔ قبل اس کے کہ وہ سیل فون کو اٹھا پاتی، اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ ایک دراز قامت اجنبی اچانک ہی اس کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔

نو وارد کے ہاتھ میں ایک سائیلنسر لگی گن دیکھ کر عندلیب کی سٹی گم ہو گئی۔ گن بردار کی آنکھوں سے درندگی جھلک رہی تھی اور اس نے کسی ماہر شوٹر کے انداز میں سائیلنسر لگی گن کو عندلیب پر تان رکھا تھا۔ وہ وحشت بھری نظروں سے یک ٹک اسے دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

خلیق پچھلے ایک گھنٹے سے اپنے ٹیلی فون سیٹ کے ساتھ مصروف تھا اور اس کی ہنگامی کوشش کے خاطر خواہ نتائج بھی برآمد ہونا شروع ہو گئے تھے۔ سہ پہر کے پانچ بجنے میں ابھی اچھا خاصا وقت باقی تھا۔ نجیب نے کہا تھا کہ اگر وہ چاہے تو محض ایک گھنٹے میں پانچ کروڑ کے کرنسی نوٹ ارینج کر سکتا تھا اور وہ بھی تمام نوٹ پانچ ہزار مالیت والے۔ خلیق اپنی بیٹی عرفانہ سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ وہ عرفانہ کو ایک ذرا سی بھی تکلیف پہنچنے کا روادار نہیں ہو سکتا تھا لہٰذا اسے ہر قیمت پر نجیب کا مطالبہ پورا کرنا تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ یہ کام دو سے تین گھنٹے میں کر گزرے گا۔

شہلا اس کے بلاوے پر کمرے میں آئی تو اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں آج ایک نہایت ہی اہم کام میں مصروف رہوں گا۔ صبح جو رئیس صاحب آئے تھے نا، ان کا کوئی فیملی ایشو ہے جو مجھے کمرے میں بیٹھ کر ہی حل کرنا ہے لہٰذا کوئی بھی غیر ضروری کال میرے پاس نہیں آنا چاہیے۔ آج کی تاریخ میں میری جس جس سے بھی میٹنگ طے ہے، اسے کینسل کر دو۔ میرے کمرے میں صرف وہی شخص قدم رکھے گا جسے میں بلاؤں گا۔ تم سمجھ رہی ہو نا، میں کیا چاہتا ہوں؟''

شہلا کو جب خلیق نے اپنے کمرے میں طلب کیا تھا تو اس کے ذہن میں یہی تھا کہ باس نہیں رئیس کے حوالے سے اسے ڈانٹ نہ پلائے مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''یس سر! میں سمجھ گئی۔''

''صرف نوشاد صاحب ایک ایسے آدمی ہیں جو کسی بھی وقت مجھ سے ملنے کے لیے آ سکتے ہیں۔ میں نے ان سے ایک بھاری پے منٹ منگوائی ہے اس لیے ان کی آمد متوقع ہے۔'' خلیق نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر ان کی کال بھی آئے تو فوراً میرے کمرے میں ٹرانسفر کر دینا۔ نوشاد علی ہر پابندی سے مستثنیٰ ہیں۔''

نوشاد کا تعلق ملک کے ایک حساس ادارے ''اے این ایف'' سے تھا۔ ANF (اینٹی نارکوٹکس فورس) ہر قسم کی منشیات کی نقل و حمل اور اسمگلنگ کے خلاف ہمہ وقت سرگرم عمل رہتی تھی۔ خلیق کا ''اینٹی نارکوٹکس فورس'' سے کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا۔ بس، نوشاد سے اس کی پرانی یاد اللہ تھی۔ نوشاد ''اے این ایف'' میں انسپکٹر لیول پر تھا۔ تھوڑی دیر پہلے فون پر بات کرتے ہوئے نجیب نے خلیق کے جن باپوں اور اباؤں کا طعنہ دیا تھا تو اس کا اشارہ ANF کی جانب ہی تھا۔ نجیب کو اس بات کا یقین تھا کہ خلیق کی ANF کے کسی ذمے دار شخص سے میل ملاقات ہے مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ مذکورہ شخص کون ہے اور اس کا نام کیا ہے اسی لیے وہ

اپنی سیکریٹری کے سامنے نوشاد کا نام بے خوف وخطر لے رہا تھا اور اس کے حوالے سے ایسا تاثر دیا تھا کہ نوشاد کوئی ایسی تگڑی پارٹی ہے جس سے اس نے موٹی رقم مانگی ہے۔

''اوکے سر۔'' شہلا نے فرمانبرداری سے کہا۔''میں آپ کی پرائیویسی اور آرام کا پورا خیال رکھوں گی۔''

''ٹھیک ہے، اب تم جاؤ۔'' خلیق نے معتدل انداز میں کہا۔''اور سلیم صاحب کو میرے پاس بھیج دو۔''

''سر! آپ کے لیے چائے یا کافی بھجواؤں؟'' شہلا نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

ایک لحہ سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا۔''کافی ٹھیک رہے گی۔''

شہلا کمرے سے نکلی تو خلیق، سلیم کے بارے میں سوچنے لگا۔ سلیم اس کے اسٹاف کا سب سے پرانا آدمی تھا۔ بائی دا فربہی بدن کے مالک سلیم کی عمر پچپن کے آس پاس تھی۔ خلیق، سلیم پر بہت بھروسا کرتا تھا اور کمپنی کے کیش کے معاملات سلیم ہی کے ہاتھ سے ہوا کرتے تھے۔ خلیق کی ٹریڈنگ کمپنی خوردنی تیل کی امپورٹ کیا کرتی تھی۔ جس سے ایڈیبل آئل یعنی کوکنگ آئل تیار کیا جاتا تھا۔ ان کی زیادہ تر امپورٹ سنگاپور، ملائیشیا، انڈونیشیا اور خلیجی ممالک سے تھی۔ علاوہ ازیں بعض افریقی ملک بھی اس میں شامل تھے۔ کھانے کا تیل ایک مین آئٹم تھا۔ خلیق کی کمپنی اس کے ساتھ ہی بعض دوسری اشیا بھی امپورٹ کرتی تھی۔ اس سلسلے میں خلیق کو بیرونِ ملک دورہ بھی کرنا پڑتا تھا اور کئی جگہ پر تو وہ اپنے معتمدِ خاص سلیم کو بھیج دیا کرتا تھا۔ اس حوالے سے سلیم پر اس کے اعتماد کا گراف بہت ہائی تھا۔ پیسوں اور کاروباری اونچ نیچ کے معاملات میں وہ سلیم پر آنکھیں بند کر کے بھروسا کرسکتا تھا لیکن اس وقت ایک موہوم سا نکتہ کسی خار کے مانند اس کی سوچ کو لہولہان کر رہا تھا...... نجیب نے پانچ کروڑ روپے کی ڈیلیوری کے لیے سلیم ہی کا نام کیوں تجویز کیا تھا؟

اس سوال نے تھوڑی دیر کے لیے خلیق کو ذہنی اُلجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ سلیم اس کا برسوں کا آزمایا ہوا تھا۔ کروڑوں روپے کی ادائیاں اس کے ہاتھ سے ہوئی تھیں۔ خلیق اس کی نیت اور کردار پر شک نہیں کرسکتا تھا لہٰذا اس نے بڑے حتمی انداز میں خود کو تسلی دی۔

''یہ نجیب کی کوئی خطرناک چال ہے۔ وہ سلیم کی وفاداری کو میری نظر میں مشکوک کرنا چاہتا ہے۔ اس نے رقم کی ڈیلیوری کے لیے خاص طور پر سلیم کا نام اس لیے چنا ہے تاکہ میں یہ سوچنے لگوں کہ عرفانہ کے اغوا کے سلسلے میں کہیں

عملی مظاہرہ

ٹائپسٹ کی ملازمت کے لیے امیدوار کا انتخاب ہو رہا تھا۔ ایک امیدوار سے انٹرویو کرنے والے نے پوچھا۔

''آپ ٹائپنگ کے علاوہ اور کیا کام جانتے ہیں؟''

امیدوار۔''مذاق کرنا۔''

انٹرویو نگار۔''کیا آپ عملی مظاہرہ کرنا پسند کریں گے؟''

امیدوار۔''کیوں نہیں۔'' امیدوار نے یہ کہا اور دفتر کے باہر آکر لائن لگا کر بیٹھنے والے دیگر امیدواروں سے کہا۔

''آپ سب حضرات جاسکتے ہیں کیونکہ میرا انتخاب کرلیا گیا ہے۔''

داؤد خیل سے ریاست خان کا مذاق

سلیم، نجیب کے ساتھ ملا ہوا تو نہیں ہے۔'' اس نے ایک فوری فیصلے کے تحت رف پیڈ اور قلم اٹھا لیا اس دوران میں بے آواز خود کلامی کا عمل بھی جاری رہا۔''میں کسی بھی قیمت پر نجیب کی اس چال کو کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔'' یہ سوچتے ہوئے اس نے پیڈ کو میز پر رکھنے کے بجائے گود میں رکھا اور قلم سے اس پر کچھ تحریر کرنے لگا۔

خلیق کا انداز اتنا زیادہ احتیاط بھرا تھا کہ اگر واقعتاً اور حقیقتاً اس کے کمرے کو رئیس نے بگ کر رکھا تھا تو اس کی تحریر خفیہ کیمرے کی آنکھ سے اوجھل رہے۔ وہ رئیس کے اس خیال سے اتفاق کرتا تھا کہ کمرے کو بگ کرنے کے معاملے میں یقین کرنے کے سوا اس کے پاس اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ اس کی دکھتی ہوئی رگ کو نجیب نے دبا رکھا تھا۔ وہ اپنی لاڈلی بیٹی عرفانہ کو معمولی سی تکلیف میں بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اب رئیس نے اس کے کمرے میں کوئی آڈیو، ویڈیو ریکارڈنگ ڈیوائس کو لگایا تھا یا نہیں، اس چکر میں پڑے بغیر اس نے اپنے ذہن میں یہ بات بٹھالی تھی کہ اس کا کمرا بگ کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا اسے اپنی حرکات وسکنات اور گفت شنید میں اس امر کا لحاظ رکھنا تھا کہ نزدیک یا دور

کہیں بیٹھا ہوا نجیب اسے دیکھ اور سن رہا ہے۔
شہلا سے بات چیت کے دوران میں بھی یہ نکتہ اس کے پیشِ نظر تھا۔ اسی لیے نوشاد کا ذکر کرتے ہوئے اس نے کسی بھاری رقم کا تذکرہ بھی کیا تھا تاکہ نجیب تک یہ اطلاعات پہنچتی رہیں کہ خلیق اس کا مطالبہ پورا کرنے کے لیے بڑی شدومد سے سرگرمِ عمل ہے اور یہ ایک حقیقت بھی تھی۔ سلیم کو بھی اس نے اسی مقصد سے اپنے پاس بلایا تھا۔
ایک اور اہم بات بھی خلیق کے ذہن میں گھوم رہی تھی اور وہ یہ کہ رقم کا بندوبست ہو جانے کے بعد نجیب نے جس نمبر پر اطلاع دینے کو کہا تھا وہ اس کی بیوی عندلیب کا سیل فون نمبر تھا۔ اس بات کے دو مطلب نکلتے تھے۔ نمبر ایک، اس گھناؤنے کھیل میں عندلیب بھی نجیب کے ساتھ ملی ہوئی تھی۔ نمبر دو، نجیب کے کسی بندے نے عندلیب اور اس کے سیل فون کو اپنے قبضے میں کر رکھا تھا جیسا کہ تھوڑی دیر پہلے رئیس نے اس کے ساتھ کیا تھا اور جاتے ہوئے اس کا سیل فون بھی وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔
خلیق اول الذکر امکان پر کسی بھی طور یقین نہیں کر سکتا تھا۔ عندلیب سے اتنی گری ہوئی حرکت کی اسے امید نہیں تھی۔ وہ کسی بھی حال میں نجیب کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی لہٰذا آخر الذکر امکان قابلِ غور تھا یعنی نجیب کے کسی بندے نے عندلیب کو بے بس کر کے اس کے سیل فون پر قبضہ کر لیا تھا۔
وہ اپنی بیوی کے لیے فکرمند ہو گیا۔ عندلیب سے اس کی آخری بات گھریلو ڈرائیور خورشید کے حوالے سے ہوئی تھی اور یہ بات بھی اس نے رئیس کے ایما پر کی تھی۔ اس کے ذہن کو گہری تشویش نے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اسے فی الفور اپنی بیوی کی خیریت دریافت کرنا چاہیے۔
اس نے عندلیب کو کال کرنے کے لیے جیسے ہی ٹیلی فون کی جانب ہاتھ بڑھایا، سلیم اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے ریسیور اٹھانے کا ارادہ ترک کیا اور اپنے معتمدِ خاص کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔
''بیٹھیں سلیم صاحب۔''
سلیم کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا اور گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''کیا حکم ہے سر......؟''
''ایک پارٹی کو آج سہ پہر پانچ بجے سے پہلے ایک بھاری رقم ادا کرنا ہے۔'' خلیق نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانا شروع کیا۔ ''اور وہ بھی کیش کی صورت میں اور...... یہ ڈلیوری آپ کے ہاتھ سے ہوگی۔''
خلیق دانستہ بہ آوازِ بلند بات کر رہا تھا کہ نجیب کو صاف سنائی دے کہ وہ رقم کے بندوبست کے لیے کتنا زیادہ سیریس ہے۔ سلیم سے کس انداز میں بات کرنا تھی، یہ اس نے پہلے سے اچھی طرح سوچ لیا تھا۔
''میرے ہاتھ سے ڈلیوری کا مطلب تو یہ ہوا کہ پارٹی پے منٹ لینے ہمارے آفس نہیں آئے گی؟'' سلیم نے سوالیہ نظر سے اپنے باس کی طرف دیکھا۔
''آپ کا اندازہ درست ہے سلیم صاحب۔'' خلیق نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''اور یہ ڈلیوری دینے آپ جائیں گے۔''
''کتنا اماؤنٹ ہے؟'' سلیم نے ایک اہم سوال کیا۔ ''اور مجھے یہ رقم کہاں ڈلیور کرنا ہوگی؟''
''پانچ کروڑ......'' خلیق نے سرسراتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''اور رقم کو ائرپورٹ کے نزدیک کسی مقام تک پہنچانا ہوگا۔''
''پانچ کروڑ روپے کے کرنسی نوٹ تو کسی بڑے سوٹ کیس ہی میں بند کیے جا سکتے ہیں۔ یہ ایک غیر معمولی رقم ہے سر......'' سلیم نے اُلجھن زدہ لہجے میں کہا۔ ''آپ نے کسی پارٹی سے ایسی کون سی ڈیل کر لی ہے۔ آپ تو ہر چھوٹی بڑی رقم چیک کے ذریعے ادا کرنے کے قائل ہیں پھر یہ کیش پے منٹ اور وہ بھی پانچ کروڑ روپے...... میں سمجھنے سے قاصر ہوں سر۔ آپ نے ایسا کیا خرید لیا ہے؟''
''اس ڈیل کے بدلے میں مجھے جو کچھ ملے گا، وہ پانچ، دس کروڑ کیا، میرے لیے دس، بیس ارب سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔'' خلیق نے قدرے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''اس معاملے کو سب سے چھپا کر رکھنا ہے اسی لیے پے منٹ کے سلسلے میں کسی بینک کو انوالو نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک خفیہ مشن ہے جس کی تفصیل میں آپ کو پانچ بجے کے بعد بتاؤں گا، جب آپ رقم ڈلیور کر کے واپس میرے پاس آئیں گے اور جہاں تک اس رقم کے حجم کا تعلق ہے تو......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔
''پارٹی کی ڈیمانڈ ہے کہ پوری رقم پانچ ہزار مالیت کے استعمال شدہ کرنسی نوٹوں کی شکل میں ہو۔ میں سمجھتا ہوں، ایک اسٹینڈرڈ سائز کے سفری بیگ میں اس رقم کو بہ آسانی رکھا جا سکتا ہے۔ صرف ایک سو گڈیاں ہی تو ہوں گی۔''
''آپ نے بجا فرمایا کہ ایک سو نوٹوں کی گڈیوں کو کسی معقول سائز کے سفری بیگ میں بہ سہولت فٹ کیا جا سکتا

ہے۔" سلیم نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تین، چار گھنٹے میں آپ پانچ ہزار مالیت والے دس ہزار استعمال شدہ کرنسی نوٹ کہاں سے ارینج کریں گے۔ مجھے تو یہ ممکن دکھائی نہیں دے رہا سر......"

خلیق کی نظر میں سلیم کی بات بے وزن نہیں تھی تاہم اس نے انکشاف انگیز لہجے میں جواب دیا۔ "میں نے بندوبست کرلیا ہے۔ بس آپ کو جاکر رقم اٹھانا ہے۔"

"ویری سوری تو سے سر......" وہ ہونٹ بھینچتے ہوئے بولا۔ "مجھے تو بالکل یقین نہیں آرہا۔"

"جب آپ پانچ ہزار والے نوٹوں کی ایک سو گڈیوں کو سفری بیگ کے اندر رکھ کر اس کی زپ بند کریں گے تو آپ کو یقین آجائے گا۔" اس نے پُراعتماد لہجے میں کہا پھر ایک بند لفافہ سلیم کی جانب بڑھا دیا۔

مذکورہ بند لفافے کے آگے پیچھے ایک لفظ بھی درج نہیں تھا۔ تھوڑی دیر پہلے خلیق نے رف پیڈ کو اپنی گود میں رکھ کر جو کچھ تحریر کیا تھا، وہ سب اس لفافے کے اندر محفوظ تھا۔ سلیم نے لفافے کو اپنے ہاتھوں میں الٹ پلٹ کر دیکھا پھر اُلجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

"یہ کیا ہے سر؟"

"اس لفافے کے اندر ایک پرچہ ہے جس پر میں نے چھ افراد کے نام لکھے ہیں۔" خلیق اپنے معتمدِ خاص کو تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے بتانے لگا۔ "ان میں سے دو بینک منیجرز ہیں اور باقی چار مارکیٹ کی پارٹیاں ہیں۔ آپ ان چھ افراد کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ میری ان سب سے بات ہو گئی ہے۔ میں نے ہر نام کے آگے ایک مخصوص اماؤنٹ بھی لکھ دیا ہے۔ آپ اپنے حساب سے کوئی مضبوط اور محفوظ سفری بیگ خریدیں اور رقم کی کلیکشن کا کام شروع کر دیں۔ میں نے ان لوگوں کو فرداً فرداً بتا دیا ہے کہ رقم اٹھانے آپ آرہے ہیں۔ جب پورے پانچ کروڑ روپے آپ کے پاس جمع ہوجائیں تو مجھے لینڈ لائن پر فون کر کے بتادیجیے گا۔ تب میں آپ کو گائیڈ کروں گا کہ مذکورہ رقم سے بھرے ہوئے سفری بیگ کو کب اور کہاں پہنچانا ہے۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا......؟"

"یس سر! آپ کی بات تو میری سمجھ میں آگئی ہے۔" وہ متذبذب لہجے میں بولا۔ "لیکن آپ کافی بدلے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ میں نے آج سے پہلے آپ کو اس انداز کی گفتگو کرتے کبھی نہیں سنا۔"

"بات آپ کی سمجھ میں آگئی ہے، بس یہی کافی ہے۔" خلیق نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "آپ اپنے مشن پر فوکس کریں سلیم صاحب! فروعی معاملات کے بارے میں سوچ کر اپنی توانائی ضائع نہ کریں۔"

"اوکے سر۔" وہ فرمانبرداری سے بولا۔ "میں یہ سمجھ پایا ہوں کہ کام کی تکمیل پر مجھے آفس کا رخ نہیں کرنا۔ آپ کی ہدایات کے مطابق، اس بیگ کو آپ کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچانا ہے......اور کچھ؟"

"فی الحال اور کچھ نہیں۔" خلیق نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "ایک بات ذہن میں رہے کہ یہ ایک ٹاپ سیکرٹ مشن ہے۔ میں آپ کو جن چھ افراد کے پاس بھیج رہا ہوں، ان میں سے اگر کوئی آپ سے یہ سوال کرے کہ مجھے اتنی بھاری رقم کی ضرورت کیوں پیش آگئی تو آپ اس سلسلے میں اپنی مکمل لاعلمی ظاہر کریں گے۔"

"اور یہی حقیقت بھی ہے سر۔" سلیم نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "میں واقعتاً نہیں جانتا کہ آپ یہ رقم کس مقصد کے حصول کے لیے اکٹھا کر رہے ہیں۔ آپ نے ابھی تک مجھے کچھ بھی نہیں بتایا۔"

"سب بتادوں گا لیکن مشن کی تکمیل کے بعد۔" خلیق نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "وقت کم اور مقابلہ سخت ہے لہٰذا آپ فوراً روانہ ہوجائیں۔"

"اوکے سر۔" سلیم ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

"مجھے آپ کے فون کا انتظار رہے گا۔" خلیق نے کہا۔

وہ پُریقین لہجے میں بولا۔ "میں جلد ہی آپ کو خوش خبری سناؤں گا سر۔ آپ کو زیادہ دیر تک میرا انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔"

سلیم کے رخصت ہونے کے بعد خلیق نے گردن اٹھا کر نجیب سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "تم دیکھ اور سن رہے ہونا کہ میں کتنی جان فشانی اور مستعدی سے اپنی ذمے داری پوری کرنے میں لگا ہوا ہوں۔ امید ہے تم بھی اپنے وعدے کا پاس کرو گے...... پانچ کروڑ وصول کرتے ہی تم عرفانہ کو سلیم کے حوالے کردو گے۔"

خلیق نے سلیم کو فی الحال اتنا ہی بتایا تھا کہ رقم سے بھرا ہوا بیگ اسے ایک جگہ پر پہنچانا تھا۔ جب سلیم ٹیکسی میں بیٹھ کر ائرپورٹ کی سمت روانہ ہوجاتا تو تب وہ اسے یہ بھی بتا دیتا کہ اس رقم کے بدلے میں ایک اہم ہستی کو ساتھ بھی لانا

27

ہے۔

خلیق نے اپنے معتمدِ خاص کو جو معلومات فراہم کی تھیں ان سے سلیم کی تشفی نہیں ہوئی تھی۔ آفس سے نکلنے کے بعد اس کے ذہن میں ایک ہی جملہ بڑے تسلسل کے ساتھ چکرا رہا تھا۔ ''خلیق صاحب کسی بہت بڑے وبال میں پھنس گئے ہیں۔''

اُس کا ذہن ایسا سوچنے میں حق بجانب تھا۔

☆☆☆

عندلیب کا سیل فون چند فٹ کے فاصلے پر، سائڈ ٹیبل پر اس کے پرس کے ساتھ رکھا ہوا تھا لیکن یکا یک وہ جس نوعیت کی صورتِ حال میں گھر گئی تھی، اس نے عندلیب کی مت مار دی تھی، اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو کر رہ گئی تھی۔ گن بردار کی دہشت نے اسے گویا پتھر کا بت بنا دیا تھا۔ اسے اپنے پاؤں من من وزنی محسوس ہو رہے تھے۔ سائڈ ٹیبل پر رکھا ہوا سیل فون کوسوں دور دکھائی دے رہا تھا۔ بالآخر اس نے ہمت کر کے گن بردار سے پوچھ ہی لیا۔

''کک...... کون ہو...... تم...... تم اندر کیسے...... گھس آئے......؟'' اس کے لہجے سے وحشت بھرا خوف جھلک رہا تھا۔ ''کیا چاہتے ہو تم......؟''

''او میڈم! ذرا بریک پر پاؤں رکھو۔'' دراز قامت گن بردار نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تفتیشی افسر بننے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہارے چوکیدار کو اناغفیل کرنے کے بعد اس کمرے تک پہنچا ہوں۔ مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہارا سچا خیر خواہ ہوں اور بس، تم سے تھوڑا تعاون چاہتا ہوں۔''

''تم نے چوکیدار صفدر علی کے ساتھ کیا کیا ہے؟'' وہ سہمی ہوئی آواز میں مستفسر ہوئی۔

''بتایا تو ہے نا، میں نے اسے سکون کی نیند سُلا دیا ہے۔'' گن بردار نے آگے بڑھ کر سائڈ ٹیبل کے اوپر سے عندلیب کا سیل فون اٹھا لیا اور اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''جب تک میں یہاں موجود ہوں، چوکیدار ہمیں ڈسٹرب نہیں کرے گا۔''

''تم میرے سچے خیر خواہ کیسے ہو سکتے ہو؟'' عندلیب نے قدرے بہادر بنتے ہوئے پوچھا۔ ''تم نے تو مجھ پر گن تان رکھی ہے اور...... وہ بھی سائیلنسر لگی ہوئی۔''

''تم جیسے صاحبِ ثروت لوگ اپنی حفاظت کے لیے سیکیورٹی گارڈز رکھتے ہیں۔'' گن بردار نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''وہ سیکیورٹی گارڈز آپ لوگوں کے سچے خیر خواہ ہوتے ہیں اور ان کے پاس بھی گنز ہوتی ہیں۔''

''لیکن وہ سیکیورٹی گارڈز اپنے مالکوں پر تمہاری طرح گنز کو تانتے نہیں ہیں؟'' عندلیب نے چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔

پچھلے ایک منٹ سے وہ گن بردار کے ساتھ ہم کلام تھی اور اس دوران میں اس نے عندلیب کو کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ اس بات نے عندلیب کے اندر کافی حوصلہ پیدا کر دیا تھا۔ اس امر کا اسے یقین ہو گیا تھا کہ گن بردار اسے قتل کرنے کے ارادے سے بنگلے میں نہیں گھسا تھا۔ اگر اس کا ایسا کوئی پروگرام ہوتا تو وہ اب تک اسے شوٹ کر چکا ہوتا۔

''تم پر گن تاننا فی الحال میری مجبوری ہے کیونکہ تم میری مالک ہو اور نہ میں تمہارا ملازم۔'' گن بردار نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم مجھ سے تعاون کرو گی تو میں اپنی گن کو تم پر سے ہٹا دوں گا۔ بہ صورت دیگر مجھے اس گن کے بل پر تمہیں قابو کرنا پڑے گا۔''

''تعاون والی بات تم نے پہلے بھی کی تھی۔'' عندلیب نے چونکتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم مجھ سے کس قسم کا تعاون چاہتے ہو۔ میں اپنے تجربے کی بنا پر کہہ سکتی ہوں کہ تم چور، ڈاکو، لٹیرے یا قاتل تو ہرگز نہیں ہو۔ اگر تم ایسے ہوتے تو مکالمے بازی میں وقت برباد کرنے کے بجائے فوراً مدعا کی بات کرتے۔ یا تو مجھے گولی سے اُڑا دیتے اور یا پھر مجھ سے پوچھتے کہ میں نے دولت، زیورات اور دوسری قیمتی اشیا کہاں چھپا کر رکھی ہوئی ہیں۔''

گن بردار چند لمحات تک گہری اور ٹٹولتی ہوئی نظر سے عندلیب کو تکتا رہا پھر ستائشی انداز میں بولا۔ ''میڈم! تم صرف حسین ہی نہیں بلکہ مردم شناس اور جہاندیدہ عورت بھی ہو۔ تم نے میرے بارے میں بالکل درست اندازہ قائم کیا ہے۔ میں واقعتاً چور، ڈاکو یا لٹیرا نہیں ہوں اور نہ ہی میں تمہیں قتل کرنے کی نیت سے یہاں آیا ہوں۔''

''پھر...... پھر تمہاری آمد کا مقصد کیا ہے؟'' عندلیب نے پُراعتماد لہجے میں جواب مانگا۔ ''تم یہاں کیوں آئے ہو......؟''

گن بردار کے بولنے سے پہلے عندلیب کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ وہ سیل فون اس وقت گن بردار کے ہاتھ میں تھا۔ عندلیب کو بہ دستور گن کے نشانے پر رکھتے ہوئے

اس نے آنے والی کال کے نمبر کو دہرایا پھر عندلیب سے سوال کیا۔

''یہ کس کا نمبر ہے؟''

''یہ میرے شوہر کا نمبر ہے۔'' عندلیب نے بتایا۔ ''وہ آفس سے لینڈ لائن پر مجھے کال کر رہا ہے۔''

''اوکے۔'' گن بردار نے بڑے رسان سے کہا پھر کال اٹینڈ کرتے ہوئے، سیل فون کو کان سے لگا کر سپاٹ آواز میں بولا۔ ''ہیلو!''

دوسری جانب خلیق ہی تھا۔ عندلیب کے سیل فون پر کسی اجنبی مرد کی آواز سن کر اس نے قدرے سخت لہجے میں سوال کیا۔ ''تم کون ہو...... میری بیوی کا موبائل فون تمہارے پاس کیسے پہنچا؟''

''میرا نام کامران ہے۔'' گن بردار نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ''میں رئیس کا سیکنڈ پارٹ ہوں اور اس وقت تمہارے بنگلے پر موجود ہوں۔ تمہاری بیوی میری گن کے نشانے پر ہے اور...... تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔''

''عندلیب سے میری بات کراؤ۔'' خلیق نے برہمی سے کہا۔

''نجیب نے تمہیں یہ سیل نمبر اس لیے نہیں دیا تھا کہ تم اس نمبر پر اپنی بیوی سے گپیں لڑاتے رہو۔'' کامران نے ڈانٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ''یہ نمبر تمہیں اس وقت ڈائل کرنا ہے جب پیسوں کا بندوبست ہو جائے اور ہاں...... تمہاری خوب صورت بیوی میری تحویل میں بالکل محفوظ ہے۔ یہ عورت اس وقت تک محفوظ اور زندہ سلامت رہے گی جب تک تم شرافت کے ساتھ ہمارے احکامات کی تعمیل کرتے رہو گے۔ سمجھ گئے نا؟''

''ہاں!'' خلیق کی بے بسی میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔ ''سمجھ گیا۔''

''شاباش!'' گن بردار کامران نامی اس دراز قامت شخص نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''جب تک تم اس نمبر پر کال کر کے رقم کے حوالے سے گرین سگنل نہیں دے دیتے، میں تمہارے بنگلے پر موجود رہوں گا اور ظاہر ہے، اس دوران میں تمہاری بیوی میرے قبضے میں رہے گی۔''

بات مکمل کرتے ہی کامران نے لائن کاٹ دی پھر عندلیب کی طرف دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں استفسار کیا۔ ''میڈم! تم رضا کارانہ طور پر مجھ سے تعاون کرنے کو تیار ہو یا میں کوئی دوسرا راستہ اختیار کروں؟''

''میں نے اب تک کون سی سرکشی دکھائی ہے۔'' عندلیب نے پوچھا۔ ''جو تمہیں کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑے گا اور...... وہ دوسرا راستہ ہے کیا؟''

''ابھی تک تو تم نے بڑی شرافت کا مظاہرہ کیا ہے۔ اگر تم نے یہی رویہ اپنائے رکھا تو میں دوسرا راستہ اختیار کرنے کا خیال دل سے نکال دوں گا۔'' وہ پوری قطعیت سے بولا۔ ''اور وہ دوسرا راستہ یہ ہے کہ مجھے مجبوراً تمہیں کسی کرسی پر کس کر باندھنا پڑے گا اور تمہارے منہ میں کوئی کپڑا بھی ٹھونسنا ہوگا۔''

''اس کی نوبت نہیں آئے گی۔'' عندلیب نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں تمہیں کسی شکایت کا موقع نہیں دوں گی لیکن مجھے اجازت دو کہ میں تم سے چند باتیں کر سکوں، میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں کامران......''

آخری جملہ اس نے گن بردار کو اس کے مبینہ نام سے مخاطب کرتے ہوئے ادا کیا تھا۔ کامران نے گن کی نال کو جھکانے کے بعد تحکمانہ انداز میں کہا۔

''ادھر صوفے پر آرام سے بیٹھ جاؤ۔''

عندلیب نے اس کے حکم کی تعمیل کر دی۔

کامران نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''کیا پوچھنا چاہتی ہو؟''

کامران کے منہ سے نجیب اور رئیس کا نام سن کر عندلیب کے ذہن میں ہلچل مچ گئی تھی۔ نجیب... کو تو وہ بڑی اچھی طرح جانتی تھی اور رئیس کا نام اس نے آج پہلی بار سنا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے خلیق کے منیجر نے عندلیب کو بتایا تھا کہ صبح رئیس نامی کوئی شخص صاحب سے ملنے آفس آیا تھا۔ اس نے خود کو عندلیب کا کوئی امریکا پلٹ قریبی رشتے دار بتایا تھا۔ منیجر رضا کے مطابق، رئیس کے جانے کے بعد خلیق صاحب بہت ڈسٹرب ہو گئے تھے۔

''کیا تم اور رئیس نجیب کے لیے کام کرتے ہو؟'' عندلیب نے کامران کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سوال کیا۔

''ہاں۔'' اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

''میرے شوہر سے رقم کا مطالبہ کس سلسلے میں کر رہے ہو؟''

''کیا خلیق نے تمہیں اس بارے میں ابھی تک کچھ نہیں بتایا؟'' کامران نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

"نہیں۔" وہ اٹل لہجے میں بولی۔ "میں تو بیوٹی پارلر جانے کے لیے تیار بیٹھی تھی اور ڈرائیور کا انتظار کر رہی تھی کہ تم ٹپک پڑے۔ میں واقعی کچھ نہیں جانتی...... ہاں، کافی دیر پہلے خلیق کا فون آیا تھا اور اس نے خورشید کے بارے میں پوچھا تھا۔ بس......"

"کیا خورشید وہی ڈرائیور ہے، جس کا تم انتظار کر رہی تھیں؟" کامران نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ "اور یہی ڈرائیور تمہاری اکلوتی بیٹی کو یونیورسٹی چھوڑنے اور لانے بھی جاتا ہے؟"

"ہاں، ہاں......" وہ بڑی سرعت سے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔ "مجھے بتاؤ، آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ خورشید ابھی تک واپس کیوں نہیں آیا، وہ اتنا لیٹ تو کبھی نہیں ہوا۔ میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ تم سب جانتے ہو۔ کامران! مجھے بھی بتاؤ...... پلیز۔"

"اگر ابھی تک تمہارا ڈرائیور واپس نہیں آیا تو تم فون کر کے اس کی تاخیر کا سبب جان سکتی ہو۔" کامران نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس کے پاس موبائل فون تو ہوگا نا؟"

"ہاں، ہاں......" عندلیب نے اثبات میں جواب دیا۔ "میں نے ڈرائیور، چوکیدار اور خانساماں تینوں کو موبائل فون دلوا رکھے ہیں۔"

"خانساماں......" کامران نے آنکھیں سکیڑ کر عندلیب کی طرف دیکھا اور قدرے اُلجھن زدہ لہجے میں بولا۔ "مجھے تو اس بنگلے میں تمہارے چوکیدار کے سوا اور کوئی بندہ بشر دکھائی نہیں دیا۔ کیا تمہارا باورچی سودا سلف لینے مارکیٹ گیا ہوا ہے؟"

"افتخار حسین نے آج چھٹی کی ہے۔" وہ اپنے خانساماں کی بابت کامران کو بتاتے ہوئے بولی۔ "اس کا بیٹا بیمار ہے۔ وہ کل صبح ڈیوٹی پر آئے گا۔"

"تمہارے چوکیدار کو "لوری سنانے" کے بعد میں نے اس کا سیل فون اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔" کامران نے ایک پُرسکون سانس خارج کرنے کے بعد کہا۔ "تم اپنے ڈرائیور کو فون کرو تاکہ معلوم ہو کہ وہ اب تک واپس کیوں نہیں آیا۔"

"مم...... میں...... فون کیسے...... کروں؟" وہ سٹپٹائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"کیوں...... اس میں "کیسے" والی کون سی بات ہے؟" کامران نے تعجب خیز نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"ابھی تک میں نے تمہارے ہاتھ پاؤں کو کسی جکڑ بندی کے حوالے تو نہیں کیا۔"

"تم نے میرا سیل فون اپنے قبضے میں کر رکھا ہے۔" وہ بیزاری سے بولی۔ "اور اس کم بخت لینڈ لائن میں اچانک کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے۔" بات کے اختتام پر اس نے ٹیلی فون سیٹ کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔

"تمہارے اس کم بخت فون کی خرابی کا ذمے دار میں ہوں۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا اور ایک کرسی کھینچ کر عندلیب سے چند فٹ کی دوری پر بڑے اطمینان سے بیٹھ گیا۔ "میں نے تمہارے بنگلے میں داخل ہونے کے بعد پہلا کام یہی کیا تھا۔ ٹیلی فون کے تار کاٹنے کے بعد میں نے چوکیدار کو لمبا لٹایا پھر تمہارے اس کمرے کا رخ کیا تھا۔ بہرحال، تم اپنا سیل فون استعمال کر سکتی ہو مگر اسی حد تک جس کی میں اجازت دوں۔" اس نے عندلیب والا موبائل فون اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لو اپنے ڈرائیور سے رابطہ کرو۔"

سائیلنسر لگی گن بہ دستور کامران کے ہاتھ میں تھی اور وہ ایک دم ریڈ الرٹ بھی دکھائی دیتا تھا تاہم اب اس نے عندلیب کو گن کے نشانے پر نہیں لے رکھا تھا مگر اس کی حرکات و سکنات اور چہرے کے تاثرات سے جھلکتی مستعدی بڑے واضح انداز میں اس امر کا اعلان کر رہی تھی کہ ضرورت پڑنے پر وہ پلک جھپکتے میں عندلیب کو موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا۔ عندلیب ایک تعلیم یافتہ عاقل و بالغ عورت تھی۔ وہ بہ خوبی یہ اندازہ قائم کر چکی تھی کہ اگر اس نے کوئی سنگین غلطی نہیں کی تو کامران کی جانب سے اس کی جان کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا اور وہ کسی حماقت کا ارادہ بھی نہیں رکھتی تھی۔

عندلیب نے اپنے سیل فون سے چار پانچ مرتبہ خورشید سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر اس سعی میں اسے کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ بالآخر جھنجلاہٹ بھرے لہجے میں اس نے کامران سے کہا۔

"وہ فون اٹینڈ نہیں کر رہا۔"

"اپنی بیٹی کو کال کرو۔" کامران نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

"عرفانہ اس وقت یونیورسٹی میں ہے۔ وہ کوئی کلاس لے رہی ہوگی۔ اسے فون کرنا ٹھیک نہیں۔" عندلیب ایک ہی سانس میں بول گئی پھر اُلجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔ "تم عرفانہ کو کال کرنے کے لیے کیوں کہہ رہے ہو؟"

''جو کہا ہے، وہ کرو۔'' وہ سنسناتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''تمہاری بیٹی اس وقت کوئی کلاس نہیں لے رہی بلکہ وہ تو آج یونیورسٹی پہنچی ہی نہیں۔''

''یہ...... یہ تم کیا...... کہہ رہے ہو......؟'' وہ بکھری ہوئی آواز میں بولی۔ ''گھر سے تو...... وہ یونیورسٹی ہی...... گئی تھی......''

کامران نے سائیلنسر لگی گن کو اپنے ہاتھ میں مخصوص حرکت دیتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''میں نے تمہیں عرفانہ کو کال کرنے کے لیے کہا ہے۔ کیا تم نے سنا نہیں؟''

''کرتی ہوں۔'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی پھر بڑی سرعت سے اپنی بیٹی کا نمبر ملانے لگی۔

اس دوران میں کامران یک ٹک عندلیب کو دیکھے جا رہا تھا اور اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ عندلیب کیا جواب دے گی۔ بالکل ویسے ہی جیسے رئیس کو یقین تھا کہ خلیق عرفانہ سے رابطے میں ناکامی کے بعد اس سے کیا کہے گا۔ عرفانہ کو ایک مربوط اور پرفیکٹ منصوبے کے تحت اغوا کیا گیا تھا اور اس مشن کے تمام کردار بڑی جان دار پرفارمنس کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

''اس کا نمبر سوئچ آف کر رہا ہے۔'' عندلیب نے بے بسی سے کہا۔

''تمہارا سیل فون ایک دم کچرا ہے میڈم!'' کامران نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اس سے نہ تو تم اپنے ڈرائیور سے رابطہ کر سکتی ہو اور نہ ہی بیٹی کی خیر خبر لے سکتی ہو۔ لاؤ، یہ فون مجھے دے دو۔'' اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ ''میں اپنے فون سے تمہاری عرفانہ سے بات کرواتا ہوں۔''

''تو عرفانہ تمہارے پاس ہے۔'' عندلیب نے چونکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''تھوڑی دیر پہلے تم نے خلیق کو جو پیسوں کا بندوبست کرنے کے لیے کہا ہے تو وہ...... اسی سلسلے کی کڑی ہے...... کیا تم نے اور رئیس نے نجیب... کے ایما پر میری بیٹی کو اغوا کیا ہے اور اس کی رہائی کے عوض بھاری تاوان کا مطالبہ کر رہے ہو؟''

''میڈم! تمہارا دماغ تو بڑا زبردست چلتا ہے۔'' کامران نے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور معنی خیز لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''کیا تم ہمارے گروپ کو جوائن کرنا پسند کرو گی؟ تمہارے جیسے ذہین لوگوں کی ہمیں اشد ضرورت ہے۔''

''فضول باتیں نہیں کرو۔'' وہ جھلاہٹ بھرے انداز میں بولی۔ ''میں نے جو پوچھا ہے، اس کا جواب دو......''

''تمہارے تمام تر اندازے ایک دم درست ہیں میڈم۔'' وہ بڑی سفاکی سے بولا۔ ''ڈیڑھ سال پہلے تمہارے شوہر نے ہمارے باس پر جو قرض چڑھا دیا تھا، یہ اس کا جواب ہے۔ نجیب... اپنے دشمنوں کو بھی معاف نہیں کرتا۔''

''عرفانہ سے میری بات کراؤ......'' وہ اضطراری لہجے میں بولی۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے کہا تھا کہ اپنے فون سے عرفانہ سے میری بات کراؤ گے۔ تم نے کہا تھا نا......؟''

''ہاں، کہا تھا۔'' وہ اپنے سیل فون کو آپریٹ کرتے ہوئے بولا۔ ''اور میں جو کچھ کہتا ہوں پھر اس سے پھرتا نہیں ہوں۔ میری یہ خوبی تم اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔''

اسی دوران میں دوسری جانب اس کا رابطہ ہو گیا تھا۔ اس نے نہایت ہی نپے تلے الفاظ میں کہا۔ ''عرفانہ کی ماں لائن پر ہے۔ اس سے بات کراؤ مگر صرف دس سیکنڈ...... اوکے۔''

بات کے اختتام پر کامران نے اپنا سیل فون عندلیب کی جانب بڑھا دیا۔ عندلیب نے مذکورہ سیل فون کو اپنے کان سے لگاتے ہوئے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔

''ہیلو عرفانہ...... میری بچی...... تم کہاں ہو......؟''

''مما! میں نہیں جانتی کہ مجھے ان لوگوں نے کہاں رکھا ہوا ہے۔'' عرفانہ نے روہانسی آواز میں بتایا۔ ''لیکن میں ٹھیک ہوں۔ آپ فکر نہیں کریں...... پاپا ان لوگوں کا مطالبہ پورا کرنے کے لیے پیسوں کا انتظام کر رہے ہیں۔ یہ لوگ پانچ بجے تک مجھے چھوڑ دیں گے۔''

''کیا تمہاری اپنے پاپا سے بات ہو چکی ہے؟'' عندلیب نے پوچھا۔

دوسری طرف سے عرفانہ نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا۔

''تم بول کیوں نہیں رہی ہو میری بچی؟'' عندلیب نے تیز آواز میں استفسار کیا۔ ''میں نے پوچھا ہے، خلیق سے تمہاری بات ہوئی ہے؟''

''او میڈم!'' کامران نے عندلیب کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''دس سیکنڈ گزرنے میں کوئی دیر تھوڑی لگتی ہے۔ بیٹی سے بات کرنے کا وقت کب کا پورا ہو چکا۔ اب تم میرا سیل فون واپس کر دو۔ یہ تمہارے کسی کام کا نہیں رہا۔''

''دیکھو۔'' وہ سیل فون کامران کو دیتے ہوئے بولی۔ ''تم لوگوں کو جو چاہیے، خلیق اس کا بندوبست کر دے گا۔ عرفانہ کا ایک بال بھی بانکا نہیں ہونا چاہیے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''تمہاری ممتا کا احساس نہیں ہوتا تو میں اس وقت عرفانہ سے تمہاری بات نہ کراتا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''تمہیں پتا چل گیا نا کہ عرفانہ بالکل ٹھیک ہے۔ اب تم شانت ہو کر بیٹھ جاؤ اور جہاں تک تمہارے شوہر کا معاملہ ہے تو......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''خلیق کے پاس فرار کا کوئی راستہ ہے ہی نہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ آج سہ پہر پانچ بجے سے پہلے ہماری مطلوبہ رقم کا انتظام کر لے گا۔''

''تم لوگوں نے عرفانہ کی رہائی کے لیے خلیق سے کتنی رقم کا مطالبہ کیا ہے؟'' عندلیب نے پوچھا۔

''صرف پانچ کروڑ روپے۔''

''اوہ...... یہ تو بہت بڑی رقم ہے اور تم اس کے لیے ''صرف'' کا لفظ استعمال کر رہے ہو؟'' عندلیب نے حیرت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ وہ اتنی دیر سے کامران کے ساتھ بات کر رہی تھی اس لیے اس کا خوف جاتا رہا تھا۔ اب اس کی جگہ گہری تشویش نے لے لی تھی۔ اس نے حوصلے کے دامن کو مضبوطی سے تھام کر پیش آمدہ حالات کا سامنا کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس فیصلے کے بعد وہ خود کو خاصا پُراعتماد محسوس کرنے لگی تھی۔

''تمہاری بات میں وزن ہے میڈم!'' وہ ہونٹوں پر بڑی زہریلی مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن میں سمجھتا ہوں، عرفانہ کی جان اور عزت کی سلامتی اور بہ حفاظت واپسی کے مقابلے میں یہ رقم کچھ زیادہ اہمیت کی حامل نہیں ہے۔''

''تمہارا باس نجیب بہت ہی کمینہ انسان ہے۔'' عندلیب نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''چند سال پہلے تک وہ خلیق کے لیے ایک معمولی کلیئرنگ ایجنٹ کے طور پر کام کرتا تھا۔ آج اس کی اتنی جرأت ہو گئی کہ اس نے ہماری بیٹی کو ہی اغوا کرا دیا؟''

''یہ ٹھیک ہے کہ باس آج سے پانچ سال پہلے تمہارے شوہر کے لیے کام کرتا تھا۔'' کامران نے اس کی بات کا بُرا منائے بغیر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن اس آفس میں نجیب کے ساتھ بہت ساری زیادتیاں اور ناانصافیاں کی گئی تھیں لہٰذا اس نے تمہارے شوہر کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس کا یہ فیصلہ بالکل درست اور بروقت تھا۔ تمہارے شوہر کے آفس کو خیرباد کہنے کے بعد اس نے ذاتی بزنس شروع کیا اور آج وہ اس شہر کا ایک معروف اور کامیاب امپورٹر اینڈ ایکسپورٹر ہے لیکن تمہارے شوہر سے اس کی ترقی دیکھی نہ گئی اور ڈیڑھ سال پہلے اس نے ایک سوچی سمجھی اور گہری سازش کے تحت...... نجیب کو تین کروڑ روپے کا نقصان پہنچا دیا تھا۔ یہ پانچ کروڑ روپے باس اسی مد میں وصول کر رہا ہے تاکہ پرانا حساب بے باق کیا جا سکے۔''

''لگتا ہے، نجیب... نے تم لوگوں کو حقائق سے بہت دور رکھا ہوا ہے۔'' عندلیب نے کڑوے لہجے میں کہا۔ ''ابھی تم نے جو تقریر کی ہے، اس میں رتی بھر بھی صداقت نہیں پائی جاتی۔''

''اچھا۔'' کامران نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا اور عجیب سے لہجے میں پوچھا۔ ''پھر حقیقت کیا ہے میڈم؟''

''حقیقت یہ ہے کہ......'' وہ بڑے مستحکم انداز میں بولی۔ ''نجیب نے خلیق کی ٹریڈنگ کمپنی کو نہیں چھوڑا تھا بلکہ اسے آفس سے نکال دیا گیا تھا اور اس برطرفی و برخاستگی کا سبب تھا بدعنوانی۔ نجیب نے خلیق کی کمپنی کے اندر سے لے کر کسٹم ہاؤس تک اتنے گھپلے کیے تھے کہ اس کا آفس سے وابستہ رہنا خلیق کی کمپنی کے لیے انتہائی نقصان دہ اور شرمندگی کا باعث تھا اور ابھی جو تم نے نجیب کی ترقی کا قصیدہ پڑھا ہے نا...... تو اس کا احوال بھی سن لو......'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھمی پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے زہرخند لہجے میں بولی۔

''نجیب ''امپورٹ ایکسپورٹ'' کے نام پر ایک سیاہ دھبّا ہے۔ ان ٹاٹلو کی آڑ میں وہ کوئی اور ہی دھندا کر رہا ہے۔ ہماری مصدقہ معلومات کے مطابق، نجیب اسمگلنگ کے مذموم کاروبار میں ملوث ہے۔ $C_{17}H_{21}NO_4$ اور $C_{21}H_{23}NO_5$ اس کے بنیادی آئٹم ہیں۔''

''کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔'' کامران نے نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے، تم نے کیمسٹری کی کلاس شروع کر دی ہے۔''

''ہاں کیونکہ میں نے علم کیمیا میں ماسٹر ڈگری لے رکھی ہے۔'' عندلیب نے بڑے فخر سے بتایا پھر وضاحت کرتے ہوئے کامران کے علم میں اضافہ کرنے لگی۔ ''یہ

C17 H21 NO4 ایک زوداثر ڈرگ کوکین ہے جبکہ C21 H23 NO5 فارماسیوٹیکل کی زبان میں ڈایا مارفین اسمگلنگ کی دنیا میں براؤن شوگر کہلاتی ہے۔ تمہارا باس ان ڈرگز کی اسمگلنگ میں ملوث ہے۔ اس نوعیت کی منشیات کی اسمگلنگ انسان کو بڑی تیزی سے امیر بنا دیتی ہے۔ تمہارے باس نجیب..... کی روز افزوں دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کے پیچھے بھی اسی گندے کاروبار کا ہاتھ ہے۔ ہم نے تو سنا ہے، وہ عنقریب پانی کا جہاز بھی خریدنے والا ہے۔''

''او میڈم! تم نے جتنی بھی بکواس کی، وہ ہمارے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی۔'' کامران نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''دھن کالا ہو یا گورا، ہمیں اس کی پروا نہیں ہوتی۔ ہم صرف اپنے فائدے پر نظر رکھتے ہیں۔ ہاں، تمہاری یہ بات بالکل درست ہے کہ نجیب ایک بڑا شپ خریدنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اسی سلسلے میں فنڈز میں کچھ کمی محسوس ہو رہی تھی لٰہذا اس نے سوچا کہ تمہارے شوہر سے ڈیڑھ سال پرانا قرض واپس لے لیا جائے۔ اب اگر نجیب، خلیق سے یہ کہتا کہ تم نے ڈیڑھ سال پہلے میرا تین کروڑ کا مال پکڑوایا تھا۔ آج کے حساب سے وہ پانچ کروڑ روپے بنتے ہیں۔ میں پانی کا جہاز خریدنے والا ہوں چنانچہ میری رقم ادا کر دو تو تمہارا شوہر پھوٹی کوڑی بھی دینے کو تیار نہ ہوتا لٰہذا خلیق سے پانچ کروڑ نکلوانے کے لیے ہمیں مجبوراً عرفانہ کو اغوا کرنا پڑا۔''

''تم خود اپنی زبان سے اس حقیقت کا اعتراف کر رہے ہو کہ نجیب... ایک ڈرگ ڈیلر اور منشیات کا اسمگلر ہے۔'' عندلیب نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔ ''نجیب کا ڈیڑھ سال پہلے جو ''مال'' پکڑا گیا تھا یقیناً وہ کوئی اناج یا کھانے پینے کی کوئی دوسری جنس نہیں تھی۔ وہ صد فیصد کوئی ممنوعہ غیر قانونی چیز ہی تھی۔ ANF والے نارکوٹکس کے خلاف ہی کام کرتے ہیں اور اس ریڈ میں میرے شوہر کا ہاتھ نہیں تھا۔''

''ایسی ہی بک بک تمہارے شوہر نے صبح نجیب کے سامنے بھی کی تھی جب وہ دونوں ٹیلی فون پر بات کر رہے تھے۔'' وہ بیزاری سے بولا۔ ''تم اس بارے میں سوچ کر اپنے ذہن کو مت تھکاؤ کہ ہم ڈرگز ایکسپورٹ کرتے ہیں یا حاجیوں کے لیے جائے نماز، تسبیحات، ٹوپیاں اور دیگر متبرک اشیا پاکستان سے سعودی عرب بھیجتے ہیں۔ تمہیں اس بات سے بھی کوئی غرض نہیں رکھنا چاہیے کہ ہم اچھے انسان ہیں یا بُرے..... تمہارا فوکس صرف اور صرف اس پوائنٹ پر ہونا چاہیے کہ تمہاری لاڈلی بیٹی اس وقت ہمارے رحم و کرم پر ہے اور اس کی آزادی پانچ کروڑ روپے کے ساتھ مشروط ہے۔ دعا کرو کہ آج سہ پہر پانچ بجے سے پہلے تمہارا شوہر ہماری مطلوبہ رقم ہم تک پہنچانے میں کامیاب ہو جائے۔ اسی میں تم لوگوں کی بہتری ہے۔ بہ صورت دیگر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

کامران کے آخری جملے نے عندلیب کو اندر باہر سے لرزا کر رکھ دیا۔ گن بردار کے الفاظ میں بے پناہ سفاکی اور سنگینی چھپی ہوئی تھی۔ وہ چند لمحات تک سہمی ہوئی نظر سے اس انسان نما شیطان کو تکتی رہی پھر بڑے اعتماد سے بولی۔

''مجھے یقین ہے، خلیق تمہارا مطالبہ ضرور پورا کر دے گا۔ وہ عرفانہ سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ وہ عرفانہ کو خراش تک نہیں آنے دے گا۔''

''ہمیں بھی اس سے یہی امید ہے۔'' کامران نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس کی اب تک کی کوششوں سے یہی لگتا ہے کہ آئندہ ایک سے دو گھنٹے کے اندر وہ رقم کا انتظام کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس کی سرگرمیوں کی اپ ڈیٹس، ٹیکسٹ میسجز کی صورت میں مسلسل میرے پاس آ رہی ہیں۔''

''میں واش روم استعمال کرنا چاہتی ہوں۔'' عندلیب نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

کامران نے چونک کر شک زدہ نظر سے اسے گھورا پھر سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''کیا تمہارے ذہن میں کسی مہم جوئی کا کیڑا کلبلا رہا ہے؟''

''نن...... نہیں۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میں واقعتاً واش روم جانے کی ضرورت محسوس کر رہی ہوں۔''

عندلیب اس وقت جس کمرے میں گن بردار کامران کے ساتھ موجود تھی، وہ اپنی ترتیب کے لحاظ سے ایک سٹنگ روم تھا اور اس کے ساتھ اٹیچڈ باتھ کی سہولت موجود تھی۔ کامران اپنی جگہ سے اٹھا اور عندلیب کو اپنی نگاہ میں رکھتے ہوئے اس نے بڑی ماہرانہ مستعدی کے ساتھ واش روم کا دروازہ کھول کر اندر کا تنقیدی جائزہ لیا۔

مذکورہ ملحقہ باتھ روم میں داخلی دروازے کے علاوہ پہلو والی دیوار میں ایک چھوٹی سی سلائڈنگ ایلومینیم ونڈو بنی ہوئی تھی جو یقیناً وینٹی لیشن کے مقصد کو پورا کرنے کی غرض سے دیوار میں رکھی گئی تھی۔ اس ونڈو کا سائز اتنا چھوٹا تھا کہ

اس کے توسط سے واش روم میں تازہ ہوا کی آمدورفت تو ممکن تھی مگر ایسا سوچنا سراسر حماقت ہوتی کہ اس کھڑکی کے ذریعے عندلیب فرار ہونے کی کوشش کرے گی۔ اپنا اطمینان کرنے کے بعد کامران واپس پلٹا پھر وارننگ دینے والے انداز میں بولا۔

''ٹھیک ہے، تم واش روم استعمال کرسکتی ہو مگر کوئی ہوشیاری اور چالاکی نہیں۔ ایسی کوئی بھی کوشش دردناک موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوگی اور یہ موت...... یہاں سے نمٹنے کے بعد سیدھی اس مقام پر پہنچے گی جہاں تمہاری بیٹی کو رکھا گیا ہے۔ اس کا اگلا نشانہ عرفانہ ہوگی۔''

''عرفانہ کے اندر ہم دونوں میاں بیوی کی جان ہے۔'' وہ صوفے سے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے زخمی لہجے میں بولی۔ ''وہ ہمارے جگر کا ٹکڑا ہے لیکن بدقسمتی سے اس وقت تم لوگوں نے ہماری شہ رگ پر اپنے منحوس، خون آشام اور غلیظ پنجے گاڑ رکھے ہیں۔ ایسی نازک صورتِ حال میں ہم بھلا کوئی سنگین غلطی کیسے کرسکتے ہیں؟''

''گڈ گرل......'' وہ ٹھوس انداز میں بولا۔ ''اسی انداز میں سوچنے میں تمہاری بھلائی ہے۔ واش روم جاؤ اور دروازہ بند نہیں کرنا۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وہ تیز نظر سے اُسے گھورتے ہوئے بولی۔ ''میں دروازہ کھلا چھوڑ کر کیسے واش روم استعمال کرسکتی ہوں؟''

''میں نے یہ نہیں کہا کہ دروازہ کھلا چھوڑ دو۔ میں نے کہا ہے، دروازہ بند نہیں کرنا۔'' وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ''میرا مطلب یہ تھا کہ دروازے کو اندر سے لاک نہیں کرنا یا کنڈی نہیں لگانا۔ تم دروازہ بھیڑ سکتی ہو۔''

''اور تم اس دوران میں اپنی کرسی سے نہیں اٹھو گے۔'' عندلیب نے کامران کی جانب انگلی اٹھا کر تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

کامران اُسے واش روم جانے کی اجازت دینے کے بعد دوبارہ اسی کرسی پر جا بیٹھا تھا جہاں سے اٹھ کر اس نے واش روم کی اندرونی کیفیت کا جائزہ لیا تھا۔ وہ ایک ٹانگ کے اوپر دوسری ٹانگ چڑھاتے ہوئے طنزیہ فرمانبرداری سے بولا۔

''سمجھ گیا میڈم!''

عندلیب واش روم کے دروازے پر پہنچی تو اسے اپنے عقب میں کامران کی معنی خیز آواز سنائی دی۔

''مجھے خلیق کی حالت پر بڑا ترس آرہا ہے۔''

عندلیب نے پلٹ کر دیکھا اور پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

''وہ کیوں؟''

''میڈم! کیا میری طرح خلیق بھی تمہاری بات کو فوراً سمجھ جاتا ہے؟'' وہ بدستور معنی خیز انداز میں بولا۔

''تم آخر کہنا کیا چاہ رہے ہو؟'' وہ ہڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''کچھ نہیں...... تم واش روم جاؤ۔'' کامران نے پچکارنے والے انداز میں کہا۔ ''مجھے تمہاری صحبت میں تھوڑا سا وقت گزارنے کے بعد بہ خوبی اس بات کا اندازہ ہوگیا ہے کہ تم حد سے زیادہ خود پسند اور حاکمانہ مزاج کی مالک ہو۔ بے چارے خلیق نے تمہاری شوہری بہ الفاظ دیگر تمہاری چاکری میں پچھلے پچیس سال جتنی بے بسی، بے کسی، لاچاری اور بے عزتی میں گزارے ہوں گے وہ یا تو خلیق جانتا ہے یا پھر اس کا خدا۔ میں تو محض اندازہ ہی لگا سکتا ہوں۔''

عندلیب نے کامران کی تیکھی اور نکیلی باتوں کا جواب دینے کے بجائے واش روم میں داخل ہوکر غضب ناک انداز میں دروازہ بند کردیا۔ اس کے انداز سے حددرجہ برہمی ٹپک رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا، اس نے دروازہ بند کرنے کے بجائے ''دھاڑ'' سے کامران کے منہ پر دے مارا ہو۔

☆☆☆

دوپہر کا ایک بج چکا تھا۔ نجیب کی دی ہوئی مہلت ختم ہونے میں ابھی چار گھنٹے باقی تھے۔ اب تک سلیم کے توسط سے خلیق نے رقم کے حصول کے لیے جتنی کوششیں کی تھیں، ان کے مثبت نتائج برآمد ہونا شروع ہوگئے تھے۔ سلیم مسلسل اس سے رابطے میں تھا۔ اسے امید تھی کہ ایک گھنٹے کے اندر یعنی دو بجے تک وہ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرلے گا۔ صورتِ حال کافی اطمینان بخش تھی۔

انٹرکام کی گھنٹی بجی تو اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔ دوسری جانب اس کا منیجر رضا تھا۔ ''ہاں رضا! کیا بات ہے؟'' اس نے نارمل انداز میں پوچھا۔

''سر! میں دو بجے تک نکل جاؤں گا۔ سوچا، آپ کو انفارم کردوں۔''

''تم دو بجے کہاں جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟''

''سر! آپ کو بتایا تو تھا......''

''کیا بتایا تھا؟'' خلیق پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''سر! چند روز پہلے ہماری بات ہوئی تھی۔'' وہ یاد

دلانے والے انداز میں بولا۔ ''آج میری بیوی اور بیٹا ساؤتھ افریقا جارہے ہیں۔ انہیں جہاز پر چڑھانا ہے۔ وہ گھر میں تیار بیٹھے ہیں۔ شام کی فلائٹ ہے۔ انہیں ساڑھے چار بجے اِن ہونا ہے۔ میں گھر پہنچ کر انہیں پک کروں گا اور پھر ائرپورٹ کی جانب روانہ ہوجاؤں گا۔''

''ہاں، ہاں...... مجھے یاد آگیا۔'' خلیق اپنی پیشانی کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ''تم نے مجھ سے ذکر کیا تھا مگر آج صبح سے اتنی زیادہ مصروفیت ہے کہ ذہن سے نکل گیا اور فوری طور پر یاد نہیں آسکا۔ تم چاہو تو ابھی چھٹی کرلو۔ دو بجنے کا انتظار کیوں کررہے ہو۔ اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ جتنا زیادہ وقت گزار لوگے، اتنا ہی اچھا ہے۔ تم نے بتایا تھا کہ وہ لوگ دو ماہ کے لیے جارہے ہیں۔''

''جی سر! ابھی تک تو یہی پروگرام ہے۔'' رضا نے بتایا۔ ''ویسے ان کا ویزا تین کا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ چھ ماہ تک وہاں رک سکتے ہیں۔''

''اللہ سب کو تمہارے جیسے لائق اور فرمانبردار داماد دے۔'' خلیق نے خلوصِ دل سے دعا دی۔ ''میں بھی بیٹی کا باپ ہوں۔ دعا کرنا عرفانہ کو بھی تمہارے داماد جیسا قابل اور سلجھا ہوا شوہر ملے۔ میں اس کی طرف سے بہت فکرمند رہتا ہوں۔''

''آپ پریشان نہ ہوا کریں سر۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''آپ نے آج تک کسی کے ساتھ بُرا نہیں کیا تو عرفانہ بی بی کے ساتھ بھی ہمیشہ اچھا ہی ہوگا۔ آپ کی مصروفیت کو دیکھتے ہوئے میں نے انٹرکام پر آپ سے بات کی ہے تاکہ آپ ڈسٹرب نہ ہوں ورنہ میں آپ کے کمرے میں حاضر ہوجاتا۔''

''تم نے بالکل ٹھیک کیا۔'' خلیق نے جلدی سے کہا۔ ''بس ایک مسئلے میں اُلجھا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر میں سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

''سر! اللہ آپ کی مشکل آسان کرے۔'' وہ ہمدردی بھرے لہجے میں بولا۔ ''ویسے اگر مناسب سمجھیں تو بتادیں، آپ کی اُلجھن کا سبب کیا ہے؟''

''دوسروں کے کرتوتوں سے نمٹنے اور انہیں نمٹانے میں لگا ہوا ہوں۔'' خلیق نے غلط بیانی کا سہارا لیتے ہوئے اکتاہٹ آمیز انداز میں کہا۔ ''صبح تمہاری میڈم کا ایک رشتے دار رئیس مجھ سے ملنے آیا تھا۔ اس کے بھائی نے ایک خطرناک ایکسیڈنٹ کردیا ہے۔ اس کی کار کے نیچے کچلا جانے والا بچہ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ بچے کے والدین اور دیگر لوگوں نے رئیس کے بھائی کے لیے بڑی مصیبت کھڑی کردی ہے۔ قصور اس کا نہیں، بچے کا ہے۔ وہ اچانک ہی دوڑتے ہوئے اس کی کار کے سامنے آگیا تھا۔ رئیس کے بھائی نے یکایک بریک تو لگائے مگر کار کی رفتار اتنی زیادہ تھی کہ وہ بچہ موقع پر ہی جاں بحق ہوگیا۔'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا تو رضا نے بظاہر اس کی سنائی ہوئی کہانی پر یقین کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''سر! یہ تو بڑی تشویش ناک صورتِ حال ہے۔ قصور چاہے اس بچے کا تھا لیکن ہمارے ملک کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ میں سمجھتا ہوں، اس وقت عوام اور پولیس، سب کی ہمدردیاں اس بچے کے لواحقین کے ساتھ ہوں گی اور ہر کوئی رئیس صاحب کے بھائی کو مجرم اور قاتل گردان رہا ہوگا۔''

''بالکل ایسا ہی ہے رضا۔'' خلیق نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں نے سچویشن کو ہینڈل کرلیا ہے۔ پولیس کو بیچ میں رکھ کر جاں بحق ہونے والے بچے کے لواحقین کو ایک بھاری رقم ادا کردی جائے گی۔ اس سلسلے میں مصالحت کرانے والی پولیس کی جیب بھی گرم کردی گئی ہے۔ آج شام سے پہلے تمام معاملات سیٹل ہوجائیں گے خیر......'' وہ لمحے بھر کو رکا پھر معتدل انداز میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم گھر جاؤ اور اگر کوئی ضرورت ہو تو اکاؤنٹ سے لے لینا۔''

''تھینک یو سر۔'' رضا نے تشکرانہ انداز میں کہا۔

رضا آفس سے نکل کر اپنی گاڑی میں بیٹھا تو ڈرائیونگ کے دوران میں اس کا ذہن اپنے باس خلیق کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ خلیق نے رئیس کے کسی بھائی کے ایکسیڈنٹ کی جو کہانی اسے سنائی تھی، وہ اسے ہضم نہیں ہوئی تھی کیونکہ میڈم عندلیب کے بیان کے مطابق، رئیس نامی کوئی شخص اس کا دور و نزدیک کا رشتے دار نہیں تھا اور یہاں پر تمام کھیل میڈم اور اس کے عزیز رئیس پر رکھ کر کھیلا جارہا تھا۔ غیر مطمئن رضا نے اس حوالے سے عندلیب سے بات کرنے کا فیصلہ کرنے کے بعد گاڑی کو سڑک کے کنارے روک دیا اور عندلیب کو فون کرنے میں مصروف ہوگیا۔

دوسری جانب سیل فون کی گھنٹی بجتی رہی لیکن عندلیب نے اس کی کال پک نہیں کی۔ وہ بار بار میڈم سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد مسلسل ناکامی کے پیشِ نظر اس نے جھنجلاہٹ آمیز انداز میں اپنے سیل فون

کو جیب میں رکھا اور گاڑی کو آگے بڑھا دیا۔
رضا کا تعلق ایک خاص کمیونٹی سے تھا جن کے ہاں لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی جلدی کر دی جاتی تھی۔ لڑکی اٹھارہ سے بائیس سال کے درمیان اور لڑکا بیس سے پچیس برس کے بیچ شادی شدہ ہو جاتا تھا۔ رضا کی صرف دو اولادیں تھیں۔ ایک بیٹی سلمٰی اور دوسرا بیٹا فیصل۔ سلمٰی کی عمر بائیس سال تھی اور وہ فیصل سے بڑی تھی۔ سلمٰی کی شادی ہاشم نامی ایک شخص سے ہوئی تھی جو ساؤتھ افریقا میں کسی اچھی جاب پر تھا۔ سلمٰی کو اس نے اپنے ساتھ ہی رکھا ہوا تھا۔ فیصل کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ رضا کی بیوی خدیجہ ایک روایتی گھریلو عورت تھی اور اب یہ دونوں ماں بیٹا ساؤتھ افریقا جا رہے تھے۔
خلیق اپنی اب تک کی کارکردگی سے پوری طرح مطمئن تھا۔ اسے یقین تھا کہ کچھ ہی دیر کے بعد وہ اس آسیب سے مکمل نجات حاصل کر لے گا جس نے صبح سے اسے بُری طرح جکڑ رکھا تھا۔ انٹرکام کی گھنٹی بجی تو اس نے ریسیور اٹھالیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔
''ہاں۔''
دوسری طرف اس کی سیکریٹری شہلا تھی۔ شہلا نے بتایا۔ ''سر! توقیر صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔ کہہ رہے ہیں انہیں نوشاد صاحب نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔''
خلیق کی رگوں میں، خون کی گردش میں ایک دم تیزی آگئی۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ''ٹھیک ہے توقیر صاحب کو میرے کمرے میں بھیج دیں۔''
خلیق کی ترکیب کامیاب رہی تھی۔ اس نے جب سلیم کو پیسے اکٹھے کرنے روانہ کیا تھا تو ایک بند لفافہ اسے تھما دیا تھا اور زبانی یہ بتایا تھا کہ اس لفافے کے اندر ان افراد کے نام اور اماؤنٹ لکھی ہوئی ہے جہاں سے اسے پیسے کلیکٹ کرنا ہیں اور یہ بھی کہا تھا کہ سلیم ان تمام افراد کو اچھی طرح جانتا ہے۔
خلیق نے کسی غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا۔ اس لفافے کے اندر واقعتاً ایک پرچے پر چھ افراد کے نام اور ان کے نام کے ساتھ ایک مخصوص اماؤنٹ درج تھا لیکن اس پرچے کے علاوہ مذکورہ لفافے کے اندر ایک چھوٹا سا بھورا لفافہ بھی رکھا ہوا تھا جسے خلیق نے اچھی طرح بند کر کے اس پر لکھ دیا تھا۔ ''اس بھورے لفافے کو فی الفور نوشاد صاحب تک پہنچایا جائے۔ اس کے بعد دوسرے کام کو شروع کیا جائے۔''
سلیم، خلیق کے دوست نوشاد کو اچھی طرح جانتا تھا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ نوشاد کا تعلق کسی حساس ادارے سے ہے۔ بہرحال اس نے منی کلیکشن والے مشن کا آغاز کرنے سے پہلے مذکورہ براؤن لفافہ نوشاد تک پہنچا دیا تھا۔
خلیق نے بھورے لفافے میں بند تحریر کے ذریعے نوشاد کو صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا اور نوشاد سے مخفوظ مدد کی اپیل کی تھی۔ خلیق نے بڑے واضح الفاظ میں نوشاد کو یہ باور کرا دیا تھا کہ اس کے نزدیک پانچ کروڑ روپے کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس کی پہلی اور آخری خواہش یہی ہے کہ عرفانہ کو کوئی گزند نہ پہنچے اور وہ صحیح سلامت اس تک پہنچ جائے۔ باقی نوشاد قانونی کارروائی کے نام پر نجیب.... اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے، اس کی خلیق کو قطعاً کوئی پروا نہیں تھی۔
یہ تمام تر خیالات ایک سیکنڈ میں خلیق کے ذہن سے گزرے اور اسے یہ سمجھ لینے میں کوئی وقت محسوس نہیں ہوئی کہ توقیر کی آمد عرفانہ کی بازیابی کے سلسلے ہی کی ایک کڑی ہے۔
توقیر مضبوط کاٹھی کا مالک ایک دراز قامت شخص تھا۔ اس کے چہرے سے گہری سنجیدگی اور بُردباری مترشح تھی۔ اس نے جب خلیق سے مصافحہ کیا تو خلیق کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا ہاتھ کسی آہنی شکنجے میں جکڑا گیا ہو۔ اس جسمانی تعارف نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا کہ توقیر کا تعلق بھی فورس ہی سے ہے۔
توقیر اپنے ساتھ ایک پھولا ہوا بیگ بھی لے کر آیا تھا۔ اس نوعیت کے سفری بیگ کی فرمائش بھی خلیق ہی کی تھی تاکہ حالات کی تصویر میں حقیقت کا رنگ بھرا جا سکے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد توقیر نے مذکورہ بیگ کو خلیق کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔
''سر! آپ نے نوشاد صاحب سے کچھ رقم منگوائی تھی۔ آپ کی امانت اس بیگ کے اندر موجود ہے۔ آپ تسلی سے چیک کر لیں۔''
خلیق نے ''اوکے'' کہتے ہوئے مذکورہ بیگ اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ اس وقت اپنی کرسی پر براجمان تھا اور توقیر کا لایا ہوا بیگ اس کے انتہائی نزدیک میز کے کنارے پر رکھا تھا۔ بادی النظر میں یہی محسوس ہوتا تھا کہ خلیق نے اس بیگ کو گود لے رکھا ہے۔ اس تاثر کو مزید گہرا بنانے کے لیے اس نے بہ آہستگی بیگ کی زپ کھولتے ہوئے خود کو بیگ کے

اوپری حصے پر اس طرح جھکا لیا کہ اس کے بازوؤں اور سر نے کھلے ہوئے بیگ کو مکمل طور پر ڈھانپ دیا تھا۔ اگر واقعتاً اس کمرے میں کوئی خفیہ کیمرا نصب تھا تو اس کیمرے کی آنکھ بیگ کے اندر کا احوال قطعاً نہیں جان سکتی تھی۔ دور و نزدیک کہیں بیٹھا نجیب... صرف یہی دیکھ سکتا تھا کہ خلیق بیگ کے اندر ہاتھ ڈال کر نوٹوں کی گڈیوں کو گننے میں مصروف ہے۔

خلیق کی آنکھوں کے سامنے، بیگ کے شکم میں ردی اخبارات کو بڑے سلیقے اور طریقے سے جما کر بھرا گیا تھا اور ان اخبارات کے اوپر ایک تحریر شدہ کھلا پرچہ بھی رکھا ہوا تھا۔ خلیق اپنے ہاتھوں کو مصروفِ حرکت رکھ کر، رقم گننے کی اداکاری کرتے ہوئے اس پرچے کی تحریر کو پڑھنے لگا۔ وہ کھلی چٹھی نوشاد کی طرف سے تھی۔ اس نے خلیق کو مخاطب کیے بغیر لکھا تھا۔

''میں نے آپ کا بھیجا ہوا تفصیلی پرچہ بڑی توجہ سے پڑھا ہے۔ میرا تجربہ تو یہ بتاتا ہے کہ آپ کے کمرے کو بگ نہیں کیا گیا۔ یہ نجیب کی ایک چال ہے تاکہ آپ اس کے خلاف جانے کا خیال دل میں نہ لاسکیں۔ بہرحال تمہیں محتاط رہنا ہوگا۔ آپ کو فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اپنی ایک ٹیم کو نجیب کی آبزرویشن کے لیے روانہ کردیا ہے۔ ایک گھنٹے تک مجھے مکمل رپورٹ موصول ہوجائے گی کہ نجیب نے آج کہاں کہاں، کیا کیا، کیا ہے۔ اس کی نقل و حمل کو آپ کے فراہم کردہ ٹھوس ثبوت کی روشنی میں چیک کر کے یہ جاننے میں آسانی ہوجائے گی کہ نجیب کا آئندہ کا کیا پروگرام ہے۔ ضرورت پڑنے پر کسی بھی وقت ہم آپ کی بیٹی کی بہ حفاظت واپسی کے بعد نجیب کو اٹھالیں گے۔ آپ پورا اطمینان رکھیں کہ آپ کی بیٹی صحیح سلامت آپ تک پہنچ جائے گی اور پانچ کروڑ روپے کی خطیر رقم بھی کہیں نہیں جائے گی۔ علاوہ ازیں میں نے نجیب کو چھاپنے کا بھی ٹھیک ٹھاک بندوبست کر رکھا ہے۔ آپ کو حوصلے سے کام لینا ہے، باقی سب میں سنبھال لوں گا۔ توقیر میرا خاص آدمی ہے۔ یہ آپ کی بلڈنگ کے باہر نیچے سڑک کی دوسری جانب ایک ٹیکسی ڈرائیور کی حیثیت سے موجود رہے گا۔ اس کی ٹیکسی کا نمبر یہ ہے...... اگر آپ رقم کو نجیب کے بندوں تک پہنچانے کے لیے توقیر کی خدمات سے کام لیں گے تو مجھے اپنے آپریشن میں بڑی آسانی ہوجائے گی۔''

نوشاد کی تحریر نے خلیق کے کلیجے میں ٹھنڈک اتار دی تھی۔ وہ نوشاد کے منصوبے سے پوری طرح مطمئن ہوگیا تھا۔ اس نے ایک گہری اور آسودہ سانس خارج کرنے کے بعد اپنے سامنے بیٹھے ہوئے توقیر کی جانب دیکھا اور بڑے اعتماد سے بولا۔

''میں نے رقم کو اچھی طرح گن کر اپنی تسلی کر لی ہے۔ نوشاد صاحب انتہائی کڑے وقت میں میرے کام آئے ہیں۔ میں تہِ دل سے ان کا شکر گزار ہوں۔ آپ میرے دلی جذبات کو ان تک پہنچا دیجیے گا۔ باقی میں بعد میں فون پر ان سے بات کرلوں گا۔''

''اوکے سر۔'' توقیر ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور الوداعی مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے اجازت دیں۔ اب میں چلتا ہوں۔''

خلیق نے اب کی بار بڑی احتیاط کا مظاہرہ کرتے ہوئے صرف اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو مصافحے کے لیے استعمال کیا۔ توقیر سے کیے ہوئے تعارفی ابتدائی مصافحے کی دکھن ابھی تک اس کے ہاتھ کی ہڈیوں میں ڈیرا ڈالے بیٹھی تھی۔ وہ اس بات کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا کہ توقیر اپنے ہاتھ کی فولادی گرفت میں اس کے ہاتھ کا کچومر نکال دے۔

توقیر کے جانے کے بعد خلیق نے اپنی لینڈ لائن سے سلیم کا سیل فون نمبر ڈائل کیا۔ رابطہ ہونے پر اس نے اپنے معتمدِ خاص سے پوچھا۔

''سلیم صاحب! آپ کا کام کہاں تک پہنچا؟''

''سر پانچ مہم سر کرچکا ہوں اور چھٹی مہم کے بیچوں بیچ ہوں۔'' اس نے رپورٹ پیش کرنے والے انداز میں بتایا۔ ''زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹا مزید لگے گا۔ آپ حکم کریں سر، مجھے اس قیمتی بیگ کی ڈلیوری کے لیے کدھر کا رخ کرنا ہے؟''

''جب آپ کا کام مکمل ہوجائے تو آپ سیدھے میرے پاس آفس آجائیں۔'' خلیق نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔ ''باقی کا پروگرام میں آپ کو یہیں پر بتاؤں گا۔''

''اوکے سر...... جو آپ کا حکم۔'' سلیم نے فرمانبرداری سے کہا۔

''خلیق نے ریسیور کریڈل کرنے کے بعد دیوار گیر کلاک کی جانب دیکھا۔ دوپہر کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ اس حساب سے سلیم کو کم و بیش دو بجے آفس پہنچ جانا چاہیے تھا۔ خلیق کے آفس میں ڈیڑھ بجے سے ڈھائی بجے تک نماز ظہر اور لنچ وغیرہ کا وقفہ ہوتا تھا۔ یہ بھی اچھا تھا کہ سلیم رقم لے کر ایسے وقت آفس میں پہنچے گا جب دیگر اسٹاف لنچ میں

مصروف ہوگا چنانچہ وہ بہ آسانی سلیم کو پانچ کروڑ روپے والے بیگ کے ساتھ، توقیر کی "ٹیکسی" میں نجیب کے بتائے ہوئے مقام کی جانب روانہ کرسکے گا۔

نجیب نے کسی مخصوص جگہ پر پہنچنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ بس، یہ ہدایت دی تھی کہ جب اس کی مطلوبہ رقم کا بندوبست ہوجائے تو خلیق اپنی بیوی عندلیب کے سیل فون پر کال کرکے اس امر کی اطلاع دے اور سلیم کو رقم کے ساتھ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر ائرپورٹ کی طرف جانے کو کہے۔ نجیب نے سلیم کا موبائل نمبر اور ٹیکسی کا نمبر بھی بتانے کی تاکید کی تھی اور کہا تھا کہ اس کے بندے سلیم سے رابطہ کرکے اسے بتا دیں گے کہ رقم اور مغوی کا تبادلہ کس مقام پر ہوگا۔

خلیق نے اپنی لاڈلی بیٹی کو بہ حفاظت واپس لانے کے لیے کسی نہ کسی طور پر پانچ کروڑ روپے کا انتظام کرلیا تھا۔ اگرچہ یہ ایک خطیر رقم تھی لیکن عرفانہ کے مقابلے میں اس کی نظر میں ان روپوں کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ بہر حال، نوشاد نے جو منصوبہ ترتیب دیا تھا وہ "سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے" کی عملی تفسیر کا عکاس تھا۔ اس خیال نے خلیق کے دل و دماغ کو شانت کردیا کہ آئندہ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں وہ عرفانہ کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے گا۔

بیٹی اور باپ کا رشتہ بڑا قدیم اور بڑا عظیم ہے۔ اس تعلق کی نزاکتوں اور لطافتوں کو سمجھنے اور محسوس کرنے کے لیے راکٹ سائنس کی ہرگز ضرورت نہیں...... بس، ایک بیٹی کا باپ ہونا ہی کافی ہے۔

☆☆☆

عندلیب فریش ہوکر واش روم سے باہر نکلی اور اس نے فریج کی جانب قدم بڑھا دیے۔ ایک قدِ آدم فریج کمرے کی دیوار کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ کامران نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

"او میڈم! کدھر چل پڑیں۔ ادھر صوفے پر جاکر بیٹھو۔"

"مجھے شدید پیاس محسوس ہورہی ہے۔" عندلیب نے جواب دیا۔ "ایک گلاس ٹھنڈا پانی پینا چاہتی ہوں۔"

"اور اگر تم نے فریج کے اندر سے کوئی خطرناک گن برآمد کرکے مجھ پر تان لی تو......؟" کامران نے مذاق کے انداز میں کہا۔

"ہم شریف لوگ ہیں، گھر میں کبھی اسلحہ جمع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔" عندلیب نے پُراعتماد انداز میں کہا۔ "ہماری کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے جو خطرناک ہتھیاروں کو اپنی زندگی کا حصہ بنالیں اور پھر...... فریج بھی کوئی گن چھپانے کی جگہ ہے۔"

"اچھا، اچھا...... زیادہ فلسفہ نہیں جھاڑو۔" کامران نے عندلیب کو اپنی سائیلنسر لگی گن کی رینج میں رکھتے ہوئے ڈانٹ آمیز انداز میں کہا۔ "جلدی سے پانی پی کر صوفے پر آجاؤ۔"

"اگر تمہیں یہ خدشہ ہے کہ میں فریج میں سے گن نکال کر تمہیں گولی ماردوں گی تو......" عندلیب نے مڑ کر ڈرامائی انداز میں کامران کی طرف دیکھا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔ "تو میں فریج کو ہاتھ بھی نہیں لگاتی اور صوفے پر آکر بیٹھ جاتی ہوں۔ تم خود اپنے ہاتھ سے مجھے پانی پلادو۔"

"او میڈم! زیادہ زبان نہیں چلاؤ......" وہ خطرناک انداز میں غرایا۔ "میں تمہارا نوکر نہیں ہوں۔ چلو، جلدی سے پانی پی کر واپس آجاؤ۔ مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔"

عندلیب نے اس کے آخری جملے پر کسی قسم کا ردِعمل ظاہر کرنے کے بجائے معتدل لہجے میں پوچھا۔ "کیا تم بھی پانی پیو گے؟"

"نو...... تھینکس۔" وہ بیزاری سے بولا۔

"ڈر رہے ہونا...... کہ کہیں میں پانی میں زہر ملا کر نہ تمہیں پلادوں۔" عندلیب نے اس کی طرف دیکھے بغیر چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تم سے ڈرتی ہے میری جوتی۔" وہ بپھرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اپنی بکواس کو فل اسٹاپ لگاؤ اور ادھر آکر میرے سامنے صوفے پر بیٹھ جاؤ۔ تمہیں ایک لمحے کے لیے بھی اس سنگین حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ تمہاری بیٹی اس وقت ہمارے قبضے میں ہے۔ تمہاری یہ اسمارٹ نیس عرفانہ کے لیے کوئی بھی مشکل کھڑی کرسکتی ہے۔ لہٰذا "بولڈ اینڈ بیوٹی فل" بننے کا خیال دل سے نکال دو...... سمجھیں؟"

"سمجھ گئی۔" عندلیب نے معتدل انداز میں جواب دیا اور پانی پینے کے بعد خالی گلاس کو فریج کے اوپر ہی چھوڑ دیا پھر وہ بڑے اعتماد سے چلتے ہوئے صوفے پر آبیٹھی اور کامران کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "پوچھو، کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

کامران نے پوچھا۔ "یہ کون ہے؟" بات کے اختتام پر اس نے اپنے سیل فون سے کھیلتے ہوئے ایک موبائل نمبر دہرا دیا۔

ایک لمحہ سوچنے کے بعد عندلیب نے جواب دیا۔ "یہ

رضا کا سیل نمبر ہے۔"

"رضا......!" کامران کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی پھر اس نے عندلیب کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ "یہ رضا کیا بیچتا ہے؟"

"یہ خرید وفروخت کا کام نہیں کرتا۔" عندلیب نے زچ کرنے والے انداز میں جواب دیا۔ "بے چارہ نوکری پیشہ ہے۔"

"میرا مطلب یہ تھا کہ رضا کون ہے اور کیا کرتا ہے؟" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "یہ تمہیں کس حوالے سے جانتا ہے۔ تمہارا اس رضا کے ساتھ کیا کنکشن ہے؟"

عندلیب اچھی خاصی مردم شناس تھی۔ کامران سے گفتگو کے دوران میں وہ مسلسل اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ بھی لے رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کامران یہ تمام سوالات کسی دلچسپی کے بغیر محض وقت گزاری کے لیے کر رہا ہو۔ اس نے کامران کے استفسار کے جواب میں کہا۔

"رضا میرے شوہر کے آفس میں کام کرتا ہے۔ یہ وہاں منیجر ہے مگر تم اس کے بارے میں کیوں چھان بین کر رہے ہو۔ سب خیریت تو ہے نا......؟"

"جب تم واش روم میں تھیں تو یہ رضا تمہیں فون کر رہا تھا۔" کامران وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اس بندے نے پانچ چھ بار ٹرائی کیا ہے۔ مجھے بتاؤ، رضا تم سے بات کرنے کے لیے اتنا بے تاب کیوں تھا؟"

"مجھے کیا معلوم۔" وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "اگر تمہارا جاننا بہت ضروری ہے تو تم اسے کال کر کے خود ہی پوچھ لو۔"

"اگر ضرورت محسوس ہوئی تو اس سے کانٹیکٹ بھی کر لوں گا۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ "فی الحال تو میں تمہاری رائے جاننا چاہتا تھا۔"

"رضا کی فیملی آج سہ پہر میں ساؤتھ افریقا جا رہی ہے۔" عندلیب نے بتایا۔ "ہو سکتا ہے، اسی سلسلے میں اسے کچھ پیسوں کی ضرورت ہو اس لیے وہ مجھے فون کر رہا ہو۔"

"سبحان اللہ!" کامران نے استہزائیہ انداز میں کہا پھر عندلیب کے چہرے پر نگاہ جما کر عجیب سے لہجے میں بولا۔ "رضا تمہارا ملازم ہے یا تمہارے شوہر کا؟"

"ظاہر ہے، وہ خلیق...... کا ملازم ہے۔" عندلیب نے جواب دیا۔ "وہ خلیق کی کمپنی میں منیجر کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ میرا اس سے کیا لینا دینا۔"

"رضا تمہارے شوہر کی ٹریڈنگ کمپنی میں ملازم ہے لیکن ضرورت کے وقت مالی مدد کے لیے تمہاری طرف دیکھتا ہے۔" کامران نے طنز میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس پر تم یہ کہتی ہو کہ...... تمہارا اس سے کیا لینا دینا...... بہت خوب۔"

کامران کی گفتگو کا انداز عندلیب کو بُری طرح چبھ رہا تھا۔ اس نے خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ "تم نے مجھے اندازہ لگانے کے لیے کہا تھا اور میں نے موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر اپنا خیال ظاہر کر دیا۔ تم خواہ مخواہ بات کو طول دے رہے ہو۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ......" کامران نے شک بھری نظر سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "رضا کو تم سے کوئی اور ہی کام ہو۔"

کامران کے مبہم اور معنی خیز استفسار پر عندلیب نے بگڑے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"میڈم......" وہ بے ہودہ انداز میں بولا۔ "تم حسین ہو، دلکش ہو، جاذبِ نظر ہو۔ اگر تم اپنی بیٹی کے ساتھ کھڑی ہو جاؤ تو اس کی بڑی بہن نظر آؤ گی۔ رضا اپنے دل میں تمہارے لیے پسندیدگی کے جذبات بھی تو رکھ سکتا ہے۔ تم میری بات اچھی طرح سمجھ رہی ہو...... ہیں نا؟"

"تم نے ٹھیک کہا۔" وہ قہرناک نظر سے اُسے گھورتے ہوئے بولی۔ "میں واقعی تمہاری بات کو بہت اچھی طرح سمجھ گئی ہوں اور اس "سمجھ" نے واشگاف الفاظ میں مجھے بتایا ہے کہ اپنے گرو نجیب کی طرح تم خبیث اور بدنیت شخص ہو۔ تم لوگوں کے غلیظ ذہن میں کوئی مثبت اور پاکیزہ سوچ پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔"

"آہا...... ہاہاہا......" وہ بڑے بھونڈے انداز میں قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ "میڈم!" اس نے سائیلنسر لگی گن کو عندلیب کی جانب سیدھا کرتے ہوئے سنسناہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ "تم گاہے بگاہے میرے اور میرے باس کے لیے بڑے گھٹیا الفاظ استعمال کر رہی ہو۔ اس وقت میں اپنے باس کے احکامات کے سامنے مجبور ہوں کہ پانچ کروڑ روپے کے بدلے تمہیں اور تمہاری بیٹی کو صحیح سلامت واپس کرنا ہے اس لیے میں تمہاری بدزبانی کو برداشت کر رہا ہوں۔ اگر کسی اور موقع پر تم نے ایسی بکواس کی ہوتی تو قسم سے میں تمہیں چیر کر رکھ دیتا...... تم مجھے جانتی نہیں ہو۔"

بات کے اختتام پر کامران کے لہجے میں کسی جنگلی

درندے ایسی سفاک غراہٹ شامل ہو گئی تھی۔ کامران کی غضب ناکی پر عندلیب ڈرنے یا سہمنے کے بجائے اور زیادہ پُراعتماد ہو گئی۔ یہ بات اچھی طرح اس کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ کامران اینڈ کو پانچ کروڑ روپے حاصل کرنے سے پہلے اسے اور اس کی بیٹی عرفانہ کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے تھے۔ اس خوش گوار خیال نے اس کے حوصلے کو مہمیز کیا اور وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولی۔

''یہ تمہاری غلط فہمی ہے کامران......''

''کیا کہنا چاہ رہی ہو؟'' وہ غصیلے لہجے میں بولا۔

''میں نے تمہاری ایک سنگین غلط فہمی کا ذکر کیا ہے۔''

''کون سی غلط فہمی؟'' اس نے عجیب سے لہجے میں سوال کیا۔

''یہی کہ میں تمہیں جانتی نہیں ہوں۔''

''تو تم مجھے جاننے کا دعویٰ کر رہی ہو؟''

عندلیب نے معتدل انداز میں کہا۔ ''ہاں...... یہی حقیقت ہے۔''

''تم...... تم میرے بارے میں...... کیا جانتی ہو؟'' وہ غیظ بھری نگاہ سے اسے گھورتے ہوئے بولا۔

''چھوڑو......'' اس نے بے اعتنائی سے کہا۔ ''رہنے دو۔''

''نہیں رہنے دے سکتا۔ تمہیں بتانا ہوگا۔'' وہ ضدی لہجے میں بولا۔ ''میں سننا چاہتا ہوں۔ تم میرے بارے میں کیا جانتی ہو؟''

''میں تو سنا دوں گی مگر تم برداشت نہیں کر پاؤ گے۔'' عندلیب نے اس کی جانب انگلی اٹھا کر معنی خیز انداز میں کہا۔

''مجھ میں بڑا حوصلہ، بڑی برداشت ہے۔'' وہ اپنی چھاتی کو ٹھونکتے ہوئے بولا۔ ''تم کہو...... کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''میں تو صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ......'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ''مجھے تمہاری ولدیت پر شک ہے۔''

''کیا بک رہی ہو؟'' وہ ایک دم ہتھے سے اُکھڑ گیا۔ ''تم...... تم میری ماں کو گالی دے رہی ہو...... میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔''

''تھوڑی دیر پہلے رضا کے حوالے سے تم بھی تو مجھے گالی دے رہے تھے۔'' وہ زہرخند لہجے میں بولی۔ ''میں بھی تو کسی کی ماں ہوں...... کیا تم نے عرفانہ کی ماں پر کیچڑ نہیں اچھالی تھی؟''

''میڈم! تم حد سے آگے بڑھ رہی ہو۔'' وہ زخمی سانپ کے مانند پھنکارا۔ ''میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔''

''تمہارے پاس میرے کسی سوال کا جواب ہے بھی نہیں۔'' وہ حقارت بھری نظر سے گن بردار کو تکتے ہوئے بولی۔ ''کیونکہ تمہارا شمار اِس معاشرے کے اُن مرد نما ہیجڑوں میں ہوتا ہے جن کی غیرت صرف اپنے خون کے لیے جوش مارتی ہے، دوسروں کے خون کو وہ محض سامانِ عیاشی سمجھتے ہیں۔''

''تم نے مجھے ہیجڑا کہا......'' وہ چیخ سے مشابہ آواز میں بولا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر گن کو خطرناک انداز میں لہراتے ہوئے چلّایا۔ ''میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔''

ان لمحات میں عندلیب کو واقعتاً اس سے خوف محسوس ہوا۔ کامران کے چہرے پر بے رحمی اور درندگی نے قبضہ جما رکھا تھا۔ عندلیب کو لگا جیسے وہ اپنی بے عزتی سے مغلوب ہو کر گولی چلا دے گا۔ اس احساس نے کہ وہ کہیں اپنی دھمکی کو عملی جامہ نہ پہنا ڈالے، عندلیب سہم کر معذرت خواہانہ انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

کامران جوشِ جذبات میں اٹھ کر کھڑا تو ہو گیا تھا لیکن قبل اس کے کہ وہ کوئی سنگین قدم اٹھاتا، عندلیب کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ عندلیب کا سیل فون کامران کی کسٹڈی میں تھا۔ اس نے فون کی اسکرین پر نگاہ ڈالی پھر عندلیب کی جانب دیکھتے ہوئے برہمی سے بولا۔

''تمہارے نصف بدتر کی کال ہے۔''

عندلیب نے اس کی اطلاع پر کسی قسم کا ردِعمل ظاہر نہیں کیا اور گہری سنجیدگی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ کامران نے کال...اٹینڈ کرتے ہوئے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

''ہاں، بولو......''

''رقم کا بندوبست ہو گیا ہے۔'' خلیق نے اُسے بتایا۔

کامران نے ایک جانب گردن جھکا کر عندلیب والے سیل فون کو اپنے کان اور کندھے کے بیچ اچھی طرح دبوچنے کے بعد جیب سے اپنا سیل فون برآمد کرتے ہوئے خلیق سے کہا۔

''ٹیکسی کا نمبر بتاؤ۔''

خلیق نے اس کی ہدایت کی تعمیل کر دی۔

کامران نے اپنے سیل فون کے ''رائٹ میسج'' میں خلیق کے بتائے ہوئے ٹیکسی نمبر کو کمپوز کیا اور پوچھا۔

''تمہارے معتمدِ خاص کا سیل نمبر کیا ہے؟''

خلیق نے اسے سلیم کا موبائل نمبر بتا دیا۔

کامران نے اس معلومات کو بھی کمپوز کر لیا اور اس کے بعد سب سے اہم سوال کیا۔ ''تمہارا آدمی رقم لے کر کتنی دیر میں آفس سے نکلے گا؟''

''پندرہ سے بیس منٹ میں۔'' خلیق نے بتایا۔

''یہ پندرہ بیس منٹ کی تاخیر کس خوشی میں۔'' کامران نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''جب رقم کا انتظام ہو گیا ہے تو تمہارا بندہ فوراً ائرپورٹ کی طرف روانہ کیوں نہیں ہو رہا؟''

''بات دراصل یہ ہے کہ میں نے تمہاری مطلوبہ رقم ارینج تو کر لی ہے لیکن سلیم ابھی وہ رقم لے کر میرے پاس پہنچا نہیں ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اس نے مجھے بتایا ہے کہ ٹھیک دس منٹ کے بعد وہ آفس پہنچ جائے گا اسی لیے میں نے تمہیں ٹیکسی کے روانہ ہونے کا ٹائم پندرہ سے بیس منٹ بتایا ہے۔''

''رقم ابھی تمہارے ہاتھ میں نہیں آئی اور تم نے ٹیکسی پہلے سے لا کر کھڑی کر دی ہے۔'' کامران نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''تم تو ہماری توقعات سے کچھ زیادہ ہی تیز جا رہے ہو۔''

''تمہیں تو پتا ہی ہے، اس شہرِ تیز رفتار میں ٹیکسی آسانی سے نہیں ملتی۔'' خلیق نے اپنی پوزیشن کلیئر کرتے ہوئے کہا۔ ''اسی لیے میں نے پہلے سے ایک ٹیکسی کا بندوبست کر دیا ہے تاکہ جب سلیم یہاں آئے تو پھر اسے ائرپورٹ کی طرف روانہ ہونے میں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' کامران نے اکھڑے لہجے میں کہا۔ ''جب سلیم رقم لے کر روانہ ہو تو مجھے بتا دینا۔''

''ہاں، ہاں کیوں نہیں۔'' وہ جلدی سے بولا پھر اضطراری لہجے میں پوچھا۔ ''تم لوگ اپنے وعدے کے مطابق، تاوان وصول کرنے کے بعد میری بیٹی کو چھوڑ دو گے نا؟''

''ہمیں اپنا وعدہ اچھی طرح یاد ہے۔'' کامران نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن عرفانہ کی آزادی تمہارے وعدے کے ایفا سے مشروط ہے۔ اگر تمہارا بندہ ہم تک پورے پانچ کروڑ روپے پہنچا دے گا تو تسلی کرنے کے بعد اسی وقت ہم عرفانہ کو اُس کے سپرد کر دیں گے۔ یہ سیدھا سیدھا ''ایک ہاتھ دو، ایک ہاتھ لو'' والا معاملہ ہے۔''

اپنی بات مکمل کرنے کے بعد کامران نے لائن کاٹ دی۔ اسے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ خلیق اس کے بعد اور کیا کیا کہہ رہا تھا۔ وہ خلیق کی سننے کے بجائے ایک ضروری کام میں مصروف ہو گیا۔

اس نے سب سے پہلے خلیق کی فراہم کردہ معلومات کو ٹیکسٹ میسج کی صورت میں رئیس کو سینڈ کیا پھر اس کے نمبر پر کال کی۔ اس دوران میں وہ ایک لمحے کے لیے بھی عندلیب کی جانب سے غافل نہیں ہوا تھا۔ اس نے عندلیب کو اپنی گن کے نشانے پر رکھا ہوا تھا۔ جلد ہی رئیس نے اس کی کال پک کر لی۔

''تمہارا ٹیکسٹ مجھے مل گیا ہے۔'' رئیس نے کہا۔ ''کیا میں مشن پر روانہ ہو جاؤں؟''

''مشن پر روانہ ہونے کا وقت تو ہو گیا ہے لیکن ہم پہلے پلان بی پر عمل کریں گے۔'' کامران نے بتایا۔ ''اگر کسی وجہ سے ہمارا پلان بی کامیاب نہیں ہو سکا تو پھر پلان اے کو آزمائیں گے۔''

''سمجھ گیا۔'' رئیس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''مطلب یہ کہ رقم کو خلیق کے آفس میں پہنچنے سے پہلے ہی اڑانا ہے۔''

عندلیب بڑی توجہ سے کامران کو فون پر بات کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ لائن پر دوسری طرف کون ہے اور وہ نامعلوم شخص کامران کی باتوں کے جواب میں کیا کہہ رہا ہے؟ وہ صرف کامران کو دیکھ اور سن رہی تھی۔

''تم بالکل ٹھیک سمجھے ہو۔'' کامران نے تائیدی انداز میں کہا۔

''پلان بی پر عمل کرنے کے لیے میرے پاس کتنا وقت ہے؟''

''صرف آٹھ منٹ۔'' کامران نے بتایا پھر پوچھا۔ ''تم اِس وقت کہاں ہو؟''

''میں لوکیشن سے ایک منٹ کی دوری پر ہوں۔''

''سواری کو اپنی منزل پر پہنچنے کے لیے سات سے آٹھ منٹ لگیں گے۔'' کامران نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''تمہیں جو بھی کرنا ہے، اس سے پہلے ہی کرنا ہے۔ بہ صورت دیگر ہمیں پلان اے آزمانا پڑے گا۔''

''اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔'' رئیس نے ٹھوس

لہجے میں کہا۔

’’آل دی بیسٹ۔‘‘ یہ کہتے ہوئے کامران نے رابطہ منقطع کر دیا۔

پلان اے کے مطابق انہیں سلیم سے پانچ کروڑ روپے اس وقت وصول کرنا تھے جب وہ رقم کے ساتھ آفس سے نکل کر ایک ٹیکسی کے ذریعے ائرپورٹ کی جانب رواں دواں ہوتا۔ راستے میں وہ کسی مناسب جگہ پر اسے روک کر اس سے پانچ کروڑ روپے لے لیتے۔ پلان بی کے مطابق سلیم کے آفس پہنچنے سے پہلے ہی انہوں نے رقم سے بھرا ہوا بیگ اڑا لینا تھا۔ انہوں نے سلیم کی موومنٹ پر بھی گہری نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ پلان بی پر عمل کرنے کی نوبت اسی صورت میں آتی جب خلیق کوئی ہوشیاری اور چالاکی دکھا کر ان کے پلان اے کی راہ میں کوئی رکاوٹ کھڑی کرنے کی حماقت کرتا اور ایسا ہو چکا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے کامران کی خلیق سے جو ٹیلی فونک مختصر گفتگو ہوئی تھی، اس سے کامران کھٹک گیا تھا۔ ٹیکسی کو قبل از وقت بلا کر آفس کے نیچے کھڑا کر دینا کسی گہری چال کی جانب اشارہ کرتا تھا۔ کامران کو شک ہوا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے اسی لیے اس نے پلان بی کو پہلے آزمانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دونوں ہی پلانز کے نتیجے میں انہوں نے رقم وصول کرتے ہی عرفانہ کو سلیم کے حوالے نہیں کرنا تھا بلکہ اسے بتایا جاتا کہ انہوں نے عرفانہ کو فلاں مقام پر قید کر رکھا ہے۔ اس حوالے سے اگر سلیم کوئی چون و چرا کرتا اور عرفانہ کو حاصل کیے بغیر وہ رقم والا بیگ انہیں دینے کو تیار نہ ہوتا تو وہ بہ زور اسلحہ سلیم کو ایسا کرنے پر مجبور کر دیتے۔ وہ عرفانہ کو کوئی نقصان پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ انہیں بس پانچ کروڑ روپے کی بھاری رقم سے غرض تھی۔

رئیس سے گفتگو سے پہلے کامران کی دماغی حالت خاصی زیروزبر ہو رہی تھی۔ عندلیب کی تیز و تند تیکھی اور زہریلی باتوں نے اس کے غیظ و غضب کو ساتویں آسمان تک پہنچا دیا تھا۔ قریب تھا کہ وہ خود پر کنٹرول کو کھو کر کوئی ایسی الٹی سیدھی حرکت کر بیٹھتا جو اُن کے اسکرپٹ سے لگّا نہیں کھاتی ہو۔ بہرحال، اب اس کے حواس پوری طرح قابو میں تھے کیونکہ آٹھ دس منٹ کے بعد انہیں وہ حاصل ہونے والا تھا جسے پانے کے لیے وہ لوگ پچھلے ایک ماہ سے ہوم ورک کر رہے تھے۔ گویا اب وہ اپنی منزل سے محض ایک قدم کے فاصلے پر کھڑے تھے۔ گوہرِ مقصود پانے کی ایک الگ ہی انوکھی سی خوشی ہوتی ہے۔ یہی مسرت اس وقت کامران کے پورے وجود کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھی۔ وہ جب بولا تو اس کی ٹون ہی بدلی ہوئی تھی۔

’’میڈم! کہا سنا معاف کرنا۔‘‘ اس نے عندلیب کی جانب دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ ’’تم نے بلاوجہ مجھے غصہ دلا دیا تھا اور میں غصے میں خواہ مخواہ پتا نہیں، کیا کیا بولتا چلا گیا۔ بہرحال......‘‘ لحاتی توقف کر کے اس نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

’’چند منٹ میں پانچ کروڑ کی رقم ہمارے ہاتھ لگنے والی ہے۔ اس کے بعد ہم تمہاری بیٹی کو رہا کر دیں گے۔‘‘

’’میں نہیں جانتی کہ ابھی فون پر تم نے کس سے بات کی ہے۔‘‘ عندلیب نے سوچتی ہوئی نظر سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ’’لیکن یہ میں اچھی طرح سمجھ گئی ہوں کہ رقم کی وصولی کے لیے تم لوگوں نے اپنے پروگرام میں ہنگامی تبدیلی کر لی ہے۔‘‘

’’تم نے بالکل ٹھیک سمجھا ہے۔‘‘ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ’’میڈم! تم بہت ذہین عورت ہو۔‘‘

عندلیب نے کامران کی زبان سے اپنی ستائش کو نظرانداز کرتے ہوئے سوال کیا۔ ’’پہلے تو تم رقم وصول کر کے عرفانہ کو سلیم کے سپرد کرنے والے تھے اور اب کیا کرنے کا ارادہ ہے؟‘‘

’’دیکھو میڈم! تمہاری بیٹی کو ہم نے ایک محفوظ مقام پر چھپا رکھا ہے۔‘‘ وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ’’اور اس کی نگرانی پر ہمارا ایک چاق و چوبند بندہ مامور ہے۔ اس نے ہر لحاظ سے عرفانہ کا خیال رکھا ہوا ہے۔ ہم رقم کی وصولی کے لیے پلان اے پر عمل کرتے یا پلان بی پر، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دونوں ہی صورتوں میں ہینڈ ٹو ہینڈ ہم عرفانہ کو خلیق کے حوالے نہ کرتے بلکہ سلیم کو یہ بتا دیا جاتا کہ عرفانہ کو ہم نے کہاں قید کر رکھا ہے۔ آپ لوگوں کو خود جا کر وہاں سے عرفانہ کو نکالنا تھا اور بالکل ایسا ہی ہوگا۔ جب رقم ہمارے ہاتھ لگ جائے گی تو ہم عرفانہ کی نگرانی پر مامور اپنے بندے کو وہاں سے ہٹا دیں گے اور اس کے تھوڑی دیر بعد ہی خلیق کو اس مقام کے بارے میں بتا دیا جائے گا۔‘‘

’’یہ تو چیٹنگ ہے۔‘‘ عندلیب نے برہمی سے کہا۔ ’’خلیق کے ساتھ تو آپ لوگوں کا ’’ایک ہاتھ دو، ایک ہاتھ لو‘‘ کی بنیاد پر معاملہ طے ہوا تھا......؟‘‘

’’کیا کریں میڈم! اس دھندے میں تھوڑی بہت

چیٹنگ تو کرنا پڑتی ہے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔''اور جب سامنے والی پارٹی پتے چھپا کر کھیل رہی ہو تو چیٹنگ بہت ضروری ہو جاتی ہے۔''

''خلیق نے تو اب تک تم لوگوں کی ہدایات پر من و عن عمل کیا ہے۔'' عندلیب نے شاکی نظر سے اپنی بیٹی کے اغوا کنندہ کی طرف دیکھا۔ ''پھر یہ وعدہ خلافی کیوں؟ اس نے تو تمہارے مطالبے کو پورا کرنے کے لیے پانچ کروڑ روپے بھی ارینج کر لیے ہیں۔''

''ہم جو بھی کر رہے ہیں، وہ ہماری سیفٹی کا تقاضا ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ویسے تمہارا شوہر اتنا بھی سیدھا نہیں ہے جتنا تم اُسے سمجھتی ہو۔ اس کی ایک چالاکی نے ہمیں اپنا پلان تبدیل کرنے پر مجبور کیا ہے۔''

''میں سمجھی نہیں۔'' وہ اُلجھن زدہ نظر سے گن بردار کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''آخر تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟''

''میں جو کہنا چاہ رہا ہوں، اسے سمجھنا تمہارے لیے ضروری نہیں ہے۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''تم اس سلسلے میں اپنے ذہن کو تھکانے کے بجائے میری خاطر تواضع کرو۔ میں چند منٹ میں تمہاری جان چھوڑ کر یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

''خاطر تواضع سے تمہاری کیا مراد ہے......؟'' عندلیب نے چونکتا نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''ارے میڈم! میرے بارے میں ایسا ویسا مت سوچو۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''میں کردار کا بُرا ہوں مگر نیت کا ہرگز نہیں، تم اپنے ہاتھ سے مجھے ایک گلاس ٹھنڈا پانی پلا دو۔ بس یہی کافی ہے۔''

کامران کی وضاحت پر عندلیب نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کی پھر صوفے سے اٹھ کر فریج کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ''تم نے میرے ہاتھ سے پانی پینے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ اگر میں نے پانی میں کچھ ایسا ویسا ملا دیا تو......؟''

''تم ایسا نہیں کر سکتیں۔'' وہ عندلیب پر نگاہ رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہاری ایک ایک جنبش کو واچ کر رہا ہوں۔ اگر تم کوئی الٹی سیدھی حرکت کرو گی تو فوراً میری نظر میں آجائے گی۔ تم میری نگاہ بچا کر کچھ بھی نہیں کر سکتی ہو اور سب سے بڑی بات یہ کہ تم ایک سمجھ دار عورت ہو......'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''جب تک تمہاری بیٹی اپنے قبضے میں ہے، تم کوئی بھی ایسا قدم اٹھانے کے بارے میں نہیں سوچ سکتی ہو جو عرفانہ کی رہائی کے معاملے کو کھٹائی میں ڈال دے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''نہیں۔'' اس نے فریج کے پاس پہنچ کر اٹل لہجے میں جواب دیا۔ ''میں واقعتاً عرفانہ کی وجہ سے مجبور ہو گئی ہوں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تم لوگوں نے میرے ہاتھ پاؤں باندھ کر مجھے کلی طور پر بے بس کر دیا ہو اور یہی حال خلیق کا بھی ہے۔ بیٹی کی محبت نے اسے تمہارے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا ہے۔ وہ عرفانہ کی رہائی کے بدلے تمہیں پانچ کروڑ روپے تاوان دینے کے لیے تیار ہو گیا ہے۔ خیر...... اب تو چند منٹ کی اذیت باقی ہے۔ رقم وصول کرنے کے بعد تم لوگ ہماری بیٹی کو آزاد کر دو گے۔ ہیں نا......؟''

''بے شک! یہی حقیقت ہے۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''تمہاری بیٹی اسی وقت تک ہماری کسٹڈی میں ہے جب تک پانچ کروڑ روپے وصول نہیں ہو جاتے۔ اس کے بعد ہماری راہیں جدا ہو جائیں گی۔''

عندلیب نے فریج کا دروازہ کھول کر اندر جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ''جوس پیو گے یا پانی ہی پلا دوں؟''

''اگر تمہارے فریج میں جوس موجود ہے تو پھر پانی کا آرڈر کینسل کر دو۔'' کامران نے کہا۔

''تم تو'' آرڈر کینسل کر دو'' ایسے کہہ رہے ہو جیسے کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہو اور میں کوئی ویٹریس ہوں۔'' عندلیب نے خفگی آمیز انداز میں کہا۔ ''کون سا جوس پیو گے؟''

''تمہارے فریج میں کون کون سے جوس رکھے ہیں؟'' کامران نے پوچھا۔

''پائن ایپل اور ریڈ گریپس!''

''مجھے سرخ انگور بہت زیادہ پسند ہیں۔'' وہ توانا لہجے میں بولا۔ ''تم ریڈ گریپس کا جوس لے آؤ۔''

عندلیب نے فریج کے اندر ہاتھ ڈال کر ایک انٹرنیشنل برانڈ کے ریڈ گریپس جوس والا ڈبا باہر نکالا پھر فریج کے اوپر رکھے ہوئے گلاس میں جوس انڈیلتے ہوئے بولی۔

''یہ بہت زیادہ ٹھنڈا نہیں ہے۔ میں نے تمہاری آمد سے تھوڑی دیر پہلے ہی اسے فریج میں رکھا تھا۔''

''ہلکا ٹھنڈا بھی چلے گا۔'' وہ اپنے سیل فون کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''بس جلدی سے لے آؤ۔''

عندلیب نے جوس والے ڈبے واپس فریج میں

رکھنے کے بعد جوس سے بھرے ہوئے گلاس کو اٹھایا اور کامران کے نزدیک ایک چھوٹی میز پر رکھ دیا۔ اس کے بعد وہ دوبارہ اسی صوفے پر جا کر بیٹھ گئی جہاں سے اٹھ کر وہ فریج کی طرف گئی تھی۔

کامران نے جوس سے بھرا ہوا گلاس اٹھالیا اور اسے ایک ہی سانس میں اپنے معدے میں اتار دیا پھر خالی گلاس کو عندلیب کی جانب بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"کیا ایک اور گلاس مل سکتا ہے؟"

عندلیب نے معنی خیز لہجے میں استفسار کیا۔ "پینے کے لیے......؟"

"ظاہر ہے، جوس پینے ہی کی چیز ہے۔" وہ عجیب سی نظر سے عندلیب کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں اس سے وضو تھوڑی کروں گا۔"

"وضو کرنے والے لوگ بہت عظیم ہوتے ہیں۔" عندلیب نے اُس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کڑوے لہجے میں کہا۔ "تم جیسے خارش زدہ کتوں کے نصیب میں ایسی سعادت کہاں......!"

"کیا...... بک...... رہی ہو......" وہ طیش کے عالم میں بولا پھر گلاس، گن اور سیل فون کی پروا کیے بغیر اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام لیا اور انتہائی بے بسی سے چلایا۔ "یہ...... یہ...... میرے سر کو کیا...... ہو رہا ہے...... یوں محسوس ہو رہا ہے...... یکایک میرا دماغ سکڑنے لگا ہے...... میں...... میں...... میں......!"

وہ کسی لاچار اور بیمار بکرے کے مانند "میں، میں" کرتے ہوئے تھرتھرایا اور اگلے ہی لمحے کرسی سمیت پیچھے کو الٹ گیا پھر دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامے تھامے وہ کسی ذبح کیے ہوئے جانور کے انداز میں تڑپنے لگا۔

☆☆☆

وال کلاک نے دو بجنے کا اعلان کیا تو خلیق کی دھڑکن میں اضافہ ہو گیا۔ سلیم کو دو بجے تک آفس پہنچ جانا تھا۔ خلیق کی بے تاب نگاہ بار بار اپنے کمرے کے دروازے کی جانب اٹھ جاتی تھی کیونکہ اسی دروازے... سے سلیم نے نوٹوں سے بھرے ہوئے بیگ کے ساتھ اندر داخل ہونا تھا۔ اس کے بعد عرفانہ تک رسائی کا راستہ صاف ہو جاتا۔ وہ اپنی بیٹی کے حصول کی خوشی سے معمور سلیم کی آمد کا انتظار کر رہا تھا کہ انٹر کام کی مخصوص گھنٹی بج اٹھی۔

اس نے فوراً سے پیشتر ریسیور اٹھالیا۔ دوسری جانب اس کی سیکریٹری تھی۔ شہلا نے بتایا۔ "سر! نوشاد صاحب آئے ہیں۔"

"نوشاد صاحب......!" بے ساختہ اُس کے منہ سے نکلا۔

وہ سلیم کے آنے کی توقع کر رہا تھا اور نوشاد کی آمد کا تو دور دور تک کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ سیکریٹری کی فراہم کردہ اطلاع نے اسے گہری تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔

"یس سر!" شہلا نے اس کی بے ساختگی کے جواب میں کہا "اور وہ فوری طور پر آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"ہاں، ہاں...... ضرور۔" وہ جلدی سے بولا۔ "انہیں فوراً میرے کمرے میں بھیج دیں۔"

"او کے سر!" سیکریٹری فرمانبرداری سے بولی۔

خلیق نے اپنی سیٹ سے اٹھ کر نوشاد کا استقبال کیا۔ رسمی علیک سلیک کے دوران میں خلیق نے واضح طور پر محسوس کیا کہ نوشاد کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ہے۔

"آپ کی بھیجی ہوئی رقم مجھ تک پہنچ گئی ہے۔" خلیق نے بہ آواز بلند کہا۔ "اس بروقت تعاون کے لیے میں آپ کا تہِ دل سے شکرگزار ہوں۔"

"اگر آپ یہ سب مجھے سنا رہے ہیں تو اس کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ میری طرح آپ بھی اچھی طرح یہ بات جانتے ہیں کہ میرے بھیجے ہوئے بیگ کے اندر ردی اخبارات بھرے ہوئے تھے۔" نوشاد نے گمبھیر انداز میں کہا۔ "اور اگر آپ اپنے اس تشکرانہ کلام کو نجیب تک پہنچانے کے متمنی ہیں تو آپ کی یہ کوشش بے سود ہے۔ آپ کی آواز نجیب تک نہیں پہنچ رہی۔"

"یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے...... ہیں......" خلیق پر اچانک حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔

"خلیق صاحب! میرا اندازہ صد فیصد درست ہے۔" نوشاد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ کا یہ ساؤنڈ پروف کمرا بگ نہیں کیا گیا۔"

"تو اس کا مطلب...... یہ ہوا کہ نجیب نے میری لگام کس کر رکھنے کے لیے مجھ سے غلط بیانی کی تھی۔" خلیق نے اُلجھن زدہ لہجے میں کہا۔ "تا کہ میں اس کے انتظامات سے خوف زدہ ہو کر اس کے خلاف کسی قسم کی کوئی چال نہ چلوں اور جلد از جلد اس کے لیے پانچ کروڑ کا بندوبست کر دوں؟"

"ایسا کچھ بھی نہیں ہے خلیق صاحب!" نوشاد نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "آپ کو شدید نوعیت کی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

نوشاد کے لہجے سے جھلکتی گمبھیرتا نے خلیق کو پریشانی

میں ڈال دیا۔ اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔ ''کیسی غلط فہمی نوشاد صاحب؟ آخر آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟''

''یہی غلط فہمی کہ نجیب اللہ نے آپ کی بیٹی کو اغوا کرایا ہے۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' خلیق نے بگڑے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''کیا آپ مجھے یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ عرفانہ کے اغوا میں نجیب کا ہاتھ نہیں ہے۔''

''بالکل! میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔'' نوشاد نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''یہ ممکن نہیں کہ نجیب ... آپ کی بیٹی کے اغوا میں ملوث ہو۔''

''آپ یہ بات اتنے وثوق سے کس طرح کہہ رہے ہیں؟''

''میرے پاس اپنے بیان کی سچائی کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے خلیق صاحب!'' نوشاد نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''میں ہوا میں لٹھ نہیں گھما رہا۔''

''آپ کس ثبوت کی بات کر رہے ہیں؟'' خلیق نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میری مصدقہ معلومات کے مطابق گزشتہ رات نجیب کو ہارٹ اٹیک آیا تھا۔'' نوشاد نے خلیق کے چہرے پر نظر جما کر بتایا۔ ''میں نے نجیب ... پر جو آبزرویشن بٹھائی تھی، اس ٹیم نے مجھے جو رپورٹ دی ہے اسی کے سبب مجھے فوری طور پر آپ کے پاس آنا پڑا ہے۔''

''انہوں نے آپ کو کیا رپورٹ دی ہے؟'' خلیق نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔

''پچھلی رات سے نجیب اللہ شہر کے ایک انتہائی مہنگے پرائیویٹ اسپتال کے آئی سی یو میں پڑا ہے۔ جدید ترین مشینیں اس کے جسم کے مختلف حصوں کے ساتھ منسلک ہیں۔ میری اطلاعات کے مطابق، اس اسپتال میں آنے کے بعد سے اب تک نجیب نے اپنی زبان سے ایک لفظ ادا نہیں کیا۔''

''او مائی گاڈ......'' خلیق نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ ''یہ کیا ماجرا ہے...... میں نجیب کی آواز کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ وہ ایک طویل عرصے میری ٹریڈنگ کمپنی کے لیے بطور کلیئرنگ ایجنٹ کام کرتا رہا ہے۔ میں کیسے دھوکا کھا سکتا ہوں۔ اس نے صبح فون پر مجھ سے بات کی ہے اور...... آپ کہہ رہے ہیں کہ وہ نجیب نہیں، کوئی اور شخص تھا۔''

''بالکل! میرا یہی مطلب ہے خلیق صاحب۔'' نوشاد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کوئی ایسا شخص جو آپ کے اور نجیب کے بارے میں مکمل معلومات رکھتا ہے۔ وہ آپ دونوں کی چپقلشوں کا احوال بھی جانتا ہے۔ یہ رئیس اور اس کے دوسرے اغوا کار ساتھی اس ماسٹر مائنڈ شخص کے اشاروں پر ناچ رہے ہیں جس نے فون پر آپ سے نجیب بن کر بات کی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بلا کا نقال بھی ہے اسی لیے آپ کو ایک لمحے کے لیے بھی شک نہیں ہوا کہ وہ نجیب نہیں، کوئی اور ہے۔''

''مم...... مگر ایسا شخص...... کون ہو سکتا ہے؟'' خلیق نے تشویشناک لہجے میں دریافت کیا۔

''میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ وہ بندہ آپ کے بہت قریب ہے۔'' نوشاد نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''اسے آپ کے اور آپ کی فیملی کے روزمرہ کے معمولات کی خبر ہے اسی لیے اس نے بڑی شاطرانہ منصوبہ بندی کے ساتھ آپ کی بیٹی کو یونیورسٹی جاتے ہوئے راستے میں اغوا کر کے کسی نامعلوم خفیہ مقام پر چھپا دیا۔ عرفانہ کے ڈرائیور خورشید کی تاحال کوئی خبر نہیں ہے۔ یا تو ان لوگوں نے آپ کے ڈرائیور خورشید کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے یا پھر اسے گہری بے ہوشی میں پہنچا دیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے، خورشید بھی اس وقت انہی کی قید میں ہو۔ آپ اس بات پر بھی غور کریں، رئیس نے صبح آپ سے ملاقات کرنے کے لیے کس طرح آپ کی وائف کے نام کا کارڈ کھیلا ہے۔ اغوا کاروں کے سرغنہ نے بڑی کامیابی کے ساتھ آپ کو یہ تاثر دیا ہے کہ اس آپریشن کے پیچھے نجیب ... کا ہاتھ ہے۔ اس نے ڈیڑھ سال پرانا حساب چکانے کے لیے آپ کی بیٹی کو اغوا کرلیا ہے۔''

''آپ کی باتیں میری سمجھ میں آرہی ہیں نوشاد صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اگر نجیب ... کو دل کا دورہ پڑا ہے اور وہ کلام کے قابل نہیں ہے تو پھر یقیناً عرفانہ کو کسی اور شخص ... نے اغوا کرایا ہے لیکن میں اس مردود کو ڈھونڈوں کہاں......؟'' بات کے اختتام پر وہ روہانسا ہو گیا۔

''اپنے سرکل پر نگاہ دوڑائیں۔'' نوشاد نے مشورتاً کہا۔ ''میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ گھناؤنا کھیل کھیلنے والا یہ مکار شخص آپ کے بہت نزدیک ہے۔''

''نوشاد صاحب! آپ جانتے ہیں، میں سوشل نہیں

ہوں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میری دنیا گھر سے آفس اور آفس سے گھر تک محدود ہے۔ میں اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی ہوں۔''

''اس حساب سے آپ کے دو سرکل ہوئے۔'' نوشاد نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ایک گھر اور دوسرا دفتر...... آپ ان دونوں مقامات پر پائے جانے والے افراد پر غور کریں اوران میں سے اغوا کار کو پکڑنے کی کوشش کریں۔''

''نوشاد صاحب۔'' وہ اپنے ہونٹوں پر زخمی مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔ ''ہماری تین افراد کی فیملی ہے۔ میں، میری بیوی اور میری بیٹی۔ عرفانہ اغوا ہو چکی ہے اور میں اور عندلیب ناقابلِ بیان ذہنی اذیت سے گزر رہے ہیں۔''

''اور آپ کے تین گھریلو ملازمین......'' نوشاد نے کُریدنے والے انداز میں کہا۔ ''ڈرائیور خورشید، خانساماں افتخار حسین اور چوکیدار صفدر علی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

''نوشاد صاحب! چوکیدار صفدر علی کو بے ہوش کرنے کے بعد رئیس کے کسی ساتھی نے عندلیب کو میرے ہی گھر میں گن پوائنٹ پر یرغمال بنا رکھا ہے۔'' خلیق وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''خانساماں افتخار حسین آج چھٹی پر ہے اور ڈرائیور خورشید جیسا کہ آپ جانتے ہیں، عرفانہ کے ساتھ ہی غائب ہے۔ اگر ان تین افراد میں سے کوئی عرفانہ کے اغوا میں ملوث ہوتا تو عرفانہ ضرور کوئی اشارہ دیتی۔ جن لوگوں نے بھی یہ کام کیا ہے، وہ عندلیب، عرفانہ اور میرے لیے قطعی اجنبی ہیں۔ ویسے بھی خورشید، افتخار اور صفدر کے پاس اتنا دماغ نہیں کہ ان میں سے کوئی پانچ کروڑ روپے کا گیم کھیل سکے۔ صبح جس بھی کمینے نے نجیب بن کر مجھ سے فون پر بات کی تھی اور جس طرح مجھے یہ خطیر رقم ارینج کرنے کے احکامات دیے تھے، اس پلاننگ سے وہ جرائم کی دنیا کا کوئی منجھا ہوا کھلاڑی لگتا تھا۔''

''ٹھیک ہو گیا خلیق صاحب!'' نوشاد نے بڑی رسانیت سے کہا۔ ''اب آپ اپنے آفس کے اسٹاف پر فوکس کریں اور مجھے بتائیں کہ ان میں سے کون آپ کے سب سے زیادہ قریب ہے۔ کوئی بھی ایسا شخص جو آپ کے نجی اور کاروباری تمام معاملات کی مکمل جانکاری رکھتا ہو......؟''

ایک لمحہ سوچنے کے بعد خلیق نے جواب دیا۔ ''ایسے دو افراد ہیں۔''

''کون دو افراد؟'' نوشاد نے دریافت کیا۔

''سلیم اور رضا۔'' خلیق نے جواب دیا۔ ''مگر یہ دونوں میرے بھروسے کے آدمی ہیں۔ یہ برسوں سے میرے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ ان میں سے کسی نے بھی ایک پیسے کی ہیرپھیر نہیں کی۔ میں ان پر اندھا اعتماد کرتا ہوں۔''

اعتمادِ نابینا کے دعوے دار خلیق کو یہ خبر نہیں تھی کہ اس نے ابھی نوشاد کے سامنے اپنے جن دو قابلِ بھروسا بندوں کا نام لیا تھا، ان میں سے ایک اپنے مالی فائدے کی خاطر اس کے بارے میں عندلیب کو رپورٹنگ کر کے اس کے اعتماد کا خون کر رہا تھا۔ کسی بھی بزنس کے اندر ''باس'' اور ''میڈم'' دو ایسے کردار ہوتے ہیں کہ اسٹاف ممبرز کی وفاداریاں کسی پینڈولم کے مانند اِدھر سے اُدھر ہوتی رہتی ہیں۔ رضا جو کچھ بھی کر رہا تھا وہ کوئی نیا یا انوکھا نہیں تھا تاہم اس کا یہ فعل غیر اخلاقی ہونے کے ساتھ ہی نمک حرامی کے زمرے میں بھی آتا تھا۔

''میں جب آپ کے کمرے کی طرف آ رہا تھا تو میں نے رضا کی سیٹ کو خالی دیکھا ہے۔'' نوشاد نے کہا۔ ''کیا آپ کا منیجر آج چھٹی پر ہے؟''

''نہیں، وہ صبح سے آفس میں موجود تھا۔'' خلیق نے بتایا۔ ''وہ ایک بجے گھر گیا ہے۔''

''خیریت...... وقت سے پہلے اُسے گھر جانے کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟'' نوشاد نے چونکتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''رضا خان تو عموماً چھٹی ٹائم کے بعد بھی لیٹ سٹنگ کیا کرتا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔'' خلیق نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''آج اُسے گھر پر ایک ضروری کام تھا۔''

''اگر آپ کوئی حرج محسوس نہ کریں تو کیا میں اس کے ''ضروری کام'' کے بارے میں پوچھ سکتا ہوں؟''

''رضا کی بیوی اور بیٹا آج شام کی فلائٹ سے ساؤتھ افریقا جا رہے ہیں۔'' خلیق نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''رضا کی بیٹی بیاہ کر ساؤتھ افریقا گئی ہوئی ہے۔ اس کا شوہر ہاشم وہاں کسی کمپنی میں جاب کرتا ہے۔ رضا کی بیوی اور بیٹا انہی لوگوں سے ملنے جا رہے ہیں اور رضا انہیں ائرپورٹ چھوڑنے گیا ہے۔''

''ہوں۔'' نوشاد نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر ٹٹولنے والے انداز میں استفسار کیا۔ ''کیا آپ کو رضا کی فیملی کے ساؤتھ افریقا جانے کا پہلے سے علم تھا یا اس نے آج

اچانک ہی آپ کو بتا کر جلدی چھٹی کرلی؟‘‘

’’نوشاد صاحب! میں اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں کہ رضا کی ذات کے حوالے سے آپ کے ان تفتیشی سوالات کے پیچھے کون سی حکمت پوشیدہ ہے۔‘‘ خلیق نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ’’لیکن مجھے یقین ہے کہ رضا عرفانہ کے اغوا کے معاملے میں کسی بھی زاویے سے ملوث نہیں ہوسکتا۔ رہا سوال رضا کی فیملی کے ساتھ افریقا جانے کا تو......‘‘ لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

’’وہ آج اچانک ہی چھٹی لے کر نہیں گیا۔ اس نے کافی دن پہلے مجھے اپنے اس پروگرام سے آگاہ کردیا تھا بلکہ اس کی بیوی اور بیٹے کے ٹکٹ میں نے ہی اپنے ٹریول ایجنٹ سے بنوا کر دیے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں، رضا پر اس حوالے سے شک کرنا ٹھیک نہیں ہوگا۔‘‘

’’آپ کا سمجھنا بجا خلیق صاحب۔‘‘ وہ بڑے اطمینان سے بولا۔ ’’لیکن میں جس محکمے میں ہوں وہاں تفتیش کی گاڑی شک کے پیٹرول ہی سے چلتی ہے اور انفارمیشن کی مدد سے ہم اپنے ٹارگٹ تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ جب تک ہمارا ٹارگٹ نجیب تھا تو ہم کسی اور انداز میں اپنی منزل کی جانب گامزن تھے مگر اب صورت حال یکسر بدل گئی ہے لہٰذا تفتیش کی گاڑی آگے بڑھنے کے لیے پہلے گیئر میں بہت زیادہ پیٹرول کھا رہی ہے۔ مطلب...... شک کا تناسب کئی گنا بڑھ گیا ہے۔‘‘

’’میں سمجھ رہا ہوں۔‘‘ خلیق نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

نوشاد نے دیوار گیر کلاک پر نگاہ ڈالی اور پوچھا۔ ’’آپ کا وہ معتمدِ خاص سلیم اختر رقم لے کر کب تک یہاں پہنچ جائے گا؟‘‘

’’اس نے دو بجے کا بتایا تھا۔‘‘

’’مگر اب تو سوا دو ہو رہے ہیں۔‘‘ نوشاد نے کہا۔ ’’وہ آیا کیوں نہیں ابھی تک؟‘‘

’’لگ بھگ پونے دو بجے میری اس سے بات ہوئی تھی اور اس نے بتایا تھا کہ دس منٹ بعد وہ آفس میں ہوگا۔‘‘

’’لیکن وہ آفس میں نہیں ہے۔‘‘ نوشاد نے تشویش بھرے انداز میں کہا پھر تصدیق طلب انداز میں پوچھا۔ ’’اغوا کنندگان نے رقم کی وصولی کے لیے آپ کو پانچ بجے تک کا وقت دیا ہوا ہے نا؟‘‘

’’ہاں......‘‘ خلیق نے مختصر جواب دیا۔

’’اس کا مطلب ہے، وہ لوگ پانچ بجے سے پہلے آپ کو تنگ نہیں کریں گے؟‘‘ نوشاد نے سوالیہ نظر سے خلیق کی طرف دیکھا۔

’’طے تو یہی ہوا تھا لیکن مجھ سے ایک غلطی ہوگئی ہے۔‘‘

’’کیسی غلطی؟‘‘ نوشاد نے فکرمند لہجے میں استفسار کیا۔

’’جب سلیم نے مجھے یہ خوش خبری سنائی کہ وہ ٹھیک دو بجے پانچ کروڑ روپے لے کر آفس پہنچ جائے گا تو مجھے خود پر قابو نہیں رہا اور میں نے یہی بات آگے پاس کردی۔‘‘ خلیق، نوشاد کو اپنی حماقت کی تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے بولا۔ ’’میں نے فون کرکے اغوا کنندگان کو بتا دیا کہ بس، پندرہ بیس منٹ میں سلیم ان کی مطلوبہ رقم کے ساتھ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر ائرپورٹ کی جانب روانہ ہونے والا ہے۔‘‘

’’یہ غلطی نہیں، غلطان ہے خلیق صاحب! قانون کی زبان میں اسے ’’رونگ مین مسٹیک‘‘ کہا جاتا ہے۔‘‘ نوشاد اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہوتے ہوئے افسوس بھرے لہجے میں بولا۔ ’’جب تک رقم آپ کے ہاتھ نہیں لگ جاتی، آپ کو ان لوگوں سے رابطہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آپ نے اس معاملے کو بہت زیادہ پیچیدہ کردیا ہے۔‘‘

’’بس، جذبات میں مجھے خود پر اختیار نہیں رہا تھا۔‘‘ وہ ندامت آمیز انداز میں بولا۔ ’’بیٹی سے ملنے کی خوشی نے مجھے عقل سے پیدل کردیا تھا نوشاد صاحب! پلیز، آپ سچویشن کو سنبھال لیں۔‘‘

’’میں سچویشن کو ٹیکل کرنے کے لیے ہی یہاں آیا ہوں خلیق صاحب۔‘‘ وہ ایک پریشان حال باپ کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ’’آپ میرے دوست ہیں۔ اس بُرے وقت میں، میں آپ کی مدد نہیں کروں گا تو پھر اور کون کرے گا۔ آپ حوصلہ رکھیں اور میں جو کچھ پوچھوں، اس کا اچھی طرح سوچ سمجھ کر جواب دیں...... اوکے؟‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔

’’آپ نے اغوا کنندگان کو کتنے بجے فون کیا تھا؟‘‘

’’اس وقت دو بجنے میں دس بارہ منٹ باقی تھے۔‘‘

نوشاد نے استفسار کیا۔ ’’اس طرف سے کیا جواب آیا تھا؟‘‘

’’کال ریسیو کرنے والے نے برہمی سے کہا تھا کہ جب سلیم رقم کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ کر آفس سے روانہ ہو تو

تب فون کر کے بتانا۔'' خلیق نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''تب وہ کہیں راستے میں سلیم سے رقم وصول کر کے عرفانہ کو اس کے حوالے کر دیں گے۔''

''آپ جو اعداد و شمار بتا رہے ہیں اس کے حساب سے تو سلیم کو زیادہ سے زیادہ دو بج کر دس منٹ تک یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے تھا۔'' نوشاد نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے، ان کی طرف سے فون آنے والا ہے کیونکہ اب تو دو بج کر بیس منٹ ہو رہے ہیں۔''

''ہاں، میں آپ کی بات سے متفق ہوں۔''

''لیکن پریشانی کی بات یہ ہے کہ سلیم ابھی تک یہاں کیوں نہیں پہنچا۔'' نوشاد نے کمرے میں اِدھر سے اُدھر بے چینی سے ٹہلتے ہوئے کہا۔ ''اس سے پہلے کہ اغوا کنندگان کا فون آجائے، آپ سلیم کو کال کر کے پوچھیں کہ وہ کہاں رہ گیا ہے۔''

''جی، ٹھیک ہے۔ میں سلیم کو فون کرتا ہوں۔'' وہ جلدی سے بولا۔

اس کے بعد خلیق نے سلیم سے رابطہ کرنے کی کوشش کا آغاز کیا۔ اس دوران میں نوشاد نے کمرے میں چہل قدمی جاری رکھی۔ خلیق کی کوشش بار آور نہ ہو سکی۔ بالآخر اس نے اپنے خیر خواہ کو مخاطب کرتے ہوئے کمزور سے لہجے میں کہا۔

''نوشاد صاحب! سلیم کال پک نہیں کر رہا۔''

''مطلب بیل جا رہی ہے؟'' نوشاد نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

''ہاں۔'' خلیق نے اثبات میں جواب دیا۔

''فون آن ہے تو پھر وہ کال اٹینڈ کیوں نہیں کر رہا؟'' نوشاد نے خود کلامی کے انداز میں کہا پھر ایک فوری خیال کے تحت اس نے پوچھا۔ ''آپ نے اغوا کنندگان کو کوئی اور معلومات تو فراہم نہیں کی ہیں نا؟''

''نہیں۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''بس انہیں سلیم کا موبائل نمبر اور ٹیکسی کا نمبر بتا دیا ہے۔ صبح نجیب نے...... مطلب نجیب کی آواز میں بات کرنے والے شخص نے یہی ہدایت کی تھی کہ جب رقم کا انتظام ہو جائے تو مجھے یہ سب کرنا ہے۔''

''خلیق صاحب! آپ نے تو کھوتا کھوہ میں ڈال دیا ہے۔'' نوشاد نے نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے اضطراری لہجے میں کہا۔ ''آپ کی سادگی کوئی بہت بڑا طوفان لانے والی ہے۔ آپ سلیم کا نمبر ٹرائی کرتے رہیں۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

بات کے اختتام پر وہ کمرے کے دروازے کی جانب مڑا تو خلیق نے فکرمندی سے پوچھا۔ ''آپ...... کہاں جا رہے ہیں؟''

''میں ایک فون کر کے ابھی آتا ہوں واپس آپ کے پاس۔'' وہ یہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

خلیق دوبارہ سلیم سے رابطہ کرنے میں مصروف ہو گیا۔

نوشاد باہر آنے کے بعد رضا کی سیٹ پر آ بیٹھا پھر اس نے اپنی جیب سے سیل فون برآمد کیا اور ایک نمبر ڈائل کرنے لگا۔ وہ چاہتا تو کمرے کے اندر رہتے ہوئے بھی اپنے سیل فون کا استعمال کر سکتا تھا لیکن یہ اس کے پیشے کا تقاضا تھا کہ بعض معاملات کو خفیہ رکھا جائے۔

دوسری بیل پر کال ریسیو کر لی گئی۔ رسمی ہیلو ہائے کے بعد نوشاد نے کہا۔ ''آفیسر ابھی اور اسی وقت اس شہر میں ہنڈی اور حوالے کا کام کرنے والے تمام افراد کو ہدایت کر دی جائے کہ اگر ان کے پاس ایک کروڑ یا اس سے زیادہ اماؤنٹ والا کوئی کلائنٹ آئے تو پروسس کرنے سے پہلے وہ ہمیں فوری اطلاع دیں اور ہماری کلیرنس کے بغیر معاملے کو آگے نہ بڑھائیں۔''

''سر! آپ تو جانتے ہیں کہ وہ لوگ اس نوعیت کا تعاون کرنے کے لیے بہ آسانی تیار نہیں ہوں گے، پولیس کا نام سنتے ہی وہ بدک جائیں گے۔'' دوسری جانب بات کرنے والے آفیسر نے بڑے احترام سے کہا۔ ''لوگ تو ان کے پاس جاتے ہی اسی لیے ہیں کہ وہ ان کے راز کو راز رکھتے ہیں کیونکہ ہنڈی اور حوالے سے رقم بھیجنے والے وہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنے معاملات کو زمانے بھر کی نظر میں خفیہ رکھنا چاہتے ہیں ورنہ منی ٹرانسفر کے اور کئی قانونی ذرائع تو مارکیٹ میں موجود ہیں لیکن عموماً وہ لوگ ان قانونی ذرائع کو استعمال نہیں کرتے جن کے پاس کالا دھن ہوتا ہے۔''

''میں یہ سب اچھی طرح جانتا ہوں۔'' نوشاد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ ہمارا ڈومین نہیں ہے اس لیے آپ کو زحمت دے رہا ہوں۔ انہیں کھلی آفر کریں کہ اگر مطلوبہ بندے تک ہماری رسائی ہو گئی تو انہیں ون پرسنٹ بطور انعام دیا جائے گا۔ آپ انہیں بتائیں کہ یہ سب ''آف دی ریکارڈ'' ہے کیونکہ اس کے ساتھ نیشنل سیکیورٹی کا معاملہ جڑا ہوا ہے۔ وہ ضرور ہم سے تعاون کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ انہیں سمجھائیں کہ تمام کارروائی انہیں ملوث کیے بغیر نہایت ہی خاموشی سے عمل میں لائی جائے گی۔''

''او کے سر۔'' دوسری جانب سے کہا گیا۔ ''مجھے امید ہے انعام کے لالچ میں وہ ہماری مدد کرنے کو تیار ہو جائیں گے۔ یہ لوگ کمیشن کے لیے ہی تو دھندا کرتے ہیں۔''

سیلولر گفتگو کے دوران میں نوشاد غیر ارادی طور پر رضا کی میز پر رکھی ہوئی چیزوں سے بھی کھیل رہا تھا۔ ایک آدھ بار اس نے منیجر صاحب کی میز کی درازوں کو کھول کر اندر جھانکا بھی۔ ان حرکات میں اس کا ارادہ شامل نہیں تھا۔ اس نے دوسری کال اپنے خاص آدمی توقیر کو ملائی۔

''یس سر!'' توقیر نے پہلی گھنٹی پر ہی کال پک کرلی۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' نوشاد نے پوچھا۔

''سبجیکٹ کا انتظار کر رہا ہوں سر۔''

''ایک اَپ سیٹ ہو گیا ہے۔'' نوشاد نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''تمہیں لوکیشن تبدیل کرنا ہوگی۔''

''جو حکم سر۔''

''جسٹ ڈس پلیس، ناٹ موو۔''

''سمجھ گیا سر۔'' وہ معتدل انداز میں بولا۔

نوشاد نے رابطہ موقوف کرنے کے بعد سیل فون کو اپنی جیب میں رکھا اور خلیق کے کمرے کی سمت بڑھ گیا۔ دونوں مرتبہ اس نے اتنے دھیمے لہجے میں بات کی تھی کہ اس کی آواز اسی تک محدود رہی تھی۔ ویسے بھی اس وقت وہ جہاں بیٹھا ہوا تھا، اس کے آس پاس کوئی بندہ بشر موجود نہیں تھا۔ آفس کا اسٹاف، میٹنگ روم میں لنچ اُڑا رہا تھا۔

☆☆☆

کامران دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامے سٹنگ روم کے فرش پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ جب وہ دھڑام سے زمین بوس ہوا تو اس کے ہاتھ سے سائیلنسر لگی گن، سیل فون اور جوس والا گلاس چھوٹ کر اِدھر اُدھر جا گرے۔ ان لمحات میں کامران کو ان چیزوں کی کوئی پروا نہیں رہی تھی۔ اس کے سر میں ہونے والی تکلیف نے اسے بے حال کر رکھا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کھوپڑی کے اندر اس کا دماغ بڑی تیزی سے سکڑ رہا ہو۔

عندلیب اپنی جگہ سے اٹھی پھر سائیلنسر لگی گن کو اپنے قبضے میں کرنے کے بعد اس نے کامران کے نزدیک جا کر استہزائیہ انداز میں کہا۔

''تم اس خطرناک گن کی مدد سے مجھ پر حاوی ہو گئے تھے نا۔ بتاؤ، اب میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں؟''

''حرام زادی! تو نے جوس کے اندر کیا ملایا تھا؟'' وہ تکلیف کی شدت سے کراہتے ہوئے بولا۔ ''میرے سر میں قیامت برپا ہے۔''

عندلیب نے اس کی بدکلامی کو نظرانداز کرتے ہوئے بڑی معصومیت سے کہا۔ ''میں نے جوس میں تو کچھ نہیں ملایا البتہ......''

''کیا البتہ......؟'' وہ آنکھیں دکھاتے ہوئے چلّایا۔

''میں نے تو ''کچھ'' کے اندر جوس ڈال کر تمہیں پلایا ہے۔'' اور یہ ''کچھ'' گلاس میں پہلے سے موجود تھا۔''

''کیا بکواس کر رہی ہو۔'' وہ سٹپٹائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''تمہارا یہ ''کچھ'' آخر ہے کیا بلا......؟''

''یہ بلا نہیں، زہر ہے......'' وہ سنسناتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''ایک سریع الاثر زہر، بھول گئے...... تھوڑی دیر پہلے ہی تو بتایا تھا کہ میں نے کیمسٹری میں ماسٹرز کر رکھا ہے۔''

''لعنت ہو تم پر اور تمہاری کیمسٹری پر۔'' وہ اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے نفرت بھرے انداز میں بولا۔ ''مجھے تمہاری ایجوکیشن سے کوئی سروکار نہیں ہے۔''

''مگر مجھے تو ہے۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ''سروکار بھی اور فخر بھی...... اسی لیے ماسٹرز کرنے کے بعد میں پی ایچ ڈی کی تیاری میں مصروف ہوں اور ریسرچ میرا خاص شوق ہے۔ اس وقت جو خطرناک زہر تمہارے دماغ کے خلیات کو سکیڑنے میں مصروف ہے، وہ میں نے As، (آرسینک/سنکھیا) اور ہائیڈرارجیرم یعنی Hg (پارے) پر مختلف تجربات کرنے کے بعد تیار کیا ہے۔ یہ زہر اپنی اثرپذیری میں پوٹاشیم سائنائڈ کا سیکنڈ کزن ہے۔ اس بے رنگ، بے ذائقہ اور بے بو زہر کا ایک قطرہ کسی بھی انسان کے دماغ کو صرف دس منٹ کے اندر سکیڑ کر ایک اخروٹ کے سائز کا بنا دیتا ہے۔ اس کے بعد موت اس متاثرہ شخص کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ تم نے مجھے عرفانہ سے بات کرنے کے لیے صرف دس سیکنڈ دیے تھے نا۔ میری دریادلی دیکھو کہ میں تمہیں مرنے کے لیے دس منٹ دے رہی ہوں جس میں سے ایک منٹ گزر چکا ہے۔ تمہارے پاس نو منٹ بچے ہیں۔ چیخو، چلّاؤ یا تڑپو، پھڑکو...... اس سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔''

''تم جھوٹ بول رہی ہو......'' وہ درد بھرے لہجے میں بولا۔ ''جب تم جوس گلاس میں انڈیل رہی تھیں تو میری نگاہ تم پر ہی لگی ہوئی تھی۔ میں نے تو تمہیں گلاس میں کوئی زہر ڈالتے ہوئے نہیں دیکھا۔''

''تھوڑی دیر پہلے تم مجھے ذہین، سمجھ دار اور ہوشیار

عورت کے خطابات دے چکے ہو۔'' عندلیب نے اس کے نزدیک، فرش پر تھوڑا فاصلہ رکھ کر اکڑوں بیٹھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''جب میں نے پانی پینے کے بعد خالی گلاس کو فریج کے اوپر رکھا تھا تو اسی وقت ایک قطرہ زہر کا گلاس کے اندر ٹپکا دیا تھا تاکہ بہ وقت ضرورت کام آئے اور دیکھ لو...... میری یہ پیش بندی بڑا ٹھیک ٹھاک کام کررہی ہے...... تم مرنے والے ہو کامران۔''

''تمہارا بیڑا غرق ہو سؤر کی بچی! یہ تم نے کیا کر ڈالا......؟'' وہ اپنے دماغ کی تکلیف کو سہتے ہوئے مغلظات بکنے لگا۔ ''کمینی عورت! یہ تم نے بہت برا کیا ہے......''

''میں نے برا کیا ہے......؟'' وہ اس کی یاوہ گوئی کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''اور وہ جو تم پچھلے تین گھنٹے سے گن کے بل بوتے پر میرے ساتھ کررہے ہو، وہ تو بڑا نیک کام ہے نا؟ تم نے اور تمہارے ساتھیوں نے ہماری بیٹی کو اغوا کر کے ہم میاں بیوی کو جس ذہنی اذیت سے گزارا ہے اور گزار رہے ہو، اس کا کچھ اندازہ ہے تمہیں؟''

موت کو اپنے انتہائی قریب پا کر کامران کی ساری اکڑفوں ہوا ہو گئی تھی۔ وہ کسی حقیر، مریل کیچوے کے مانند منت ریز لہجے میں بولا۔ ''مجھے معاف کر دو بہن......''

''واہ وا......'' عندلیب نے تمسخر اڑانے والے انداز میں کہا۔ ''چند لمحے پہلے تک تو میں حرام زادی، سؤر کی بچی اور کمینی عورت تھی۔ یہ اتنی جلدی تم نے میرا اسٹیٹس کیسے چینج کر دیا؟''

''مجھے احساس ہو گیا ہے کہ میں غلط تھا......'' وہ درد کی شدت کو برداشت کرتے ہوئے گڑگڑایا۔ ''تم نے یہ خطرناک زہر تیار کیا ہے تو تمہارے پاس اس کا کوئی توڑ بھی ہو گا...... پلیز، مجھے بچا لو...... تمہیں تمہاری بیٹی کا واسطہ......!''

''ہاں...... میرے پاس اس زہر کا تریاق موجود ہے۔'' وہ گمبھیر انداز میں بولی۔ ''لیکن میں صرف ایک شرط پر تمہیں وہ تریاق انجیکٹ کر سکتی ہوں۔''

''میں تمہاری ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔'' وہ باقاعدہ رونے لگا۔ ''خدارا، مجھے بچا لو...... میں زندگی بھر تمہارا احسان مند رہوں گا۔ پلیز، جلدی سے وہ اینٹی ڈوٹ میرے جسم میں انجیکٹ کر دو۔''

عندلیب دوبارہ فریج کے پاس گئی۔ اس نے فریج کھولا۔ مذکورہ زہر اور اس کا اینٹی ڈوٹ فریج کے اندر ایک مخصوص میڈیکل کٹ میں رکھا ہوا تھا۔ اس کٹ کو عندلیب کے سوا اور کوئی ہاتھ بھی نہیں لگاتا تھا۔ اس نے کٹ کھول کر ایک ڈسپوزیبل سرنج میں دو ملی لیٹر کا ایک انجکشن بھرا پھر فریج کو بند کر کے وہ کامران کے قریب آگئی اور دوا بھری سرنج اسے دکھاتے ہوئے معنی خیز انداز میں بولی۔

''اینٹی ڈوٹ آگیا......''

''پلیز...... اب جلدی سے تم یہ انجکشن مجھے لگا دو۔'' کامران نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔ ''مجھے مرنے سے بچا لو۔ وقت بڑی تیزی سے گزر رہا ہے۔''

''تمہارے مرنے میں ابھی پانچ منٹ باقی ہیں کامران۔'' وہ انجکشن والی سرنج کو اس کی آنکھوں کے سامنے حرکت دیتے ہوئے بولی۔

''تو کیا تم آخری منٹ کے شروع ہونے کا انتظار کررہی ہو؟'' وہ دماغی تکلیف کی شدت سے بے حال ہوتے ہوئے برہمی سے بولا۔ ''جب تم نے اینٹی ڈوٹ کا انجکشن تیار کر لیا ہے تو پھر انتظار کس بات کا......؟''

''تمہاری زبان کے کھلنے کا انتظار......'' عندلیب نے بے رحمی سے کہا۔ ''بتاؤ، میری عرفانہ کو تم لوگوں نے کہاں رکھا ہے؟''

''تمہاری بیٹی بالکل محفوظ ہے......'' وہ کمزوری آواز میں بولا۔ ''تم مجھے مرنے سے بچا لو۔ میں تمہیں عرفانہ کی لوکیشن سے آگاہ کر دوں گا۔ میرا یقین کرو...... میں اپنی مری ہوئی ماں کی قسم کھاتا ہوں۔''

''ذلیل انسان......'' وہ دانت کچکچاتے ہوئے بولی۔ ''تمہاری ماں نے یہ سوچ کر تمہیں جنم نہیں دیا تھا کہ بڑے ہو کر تم جرم زادے بن جاؤ گے۔ اولاد جنتے وقت کسی بھی ماں کی ایسی خواہش نہیں ہوتی۔ تم اپنی زندگی کی بھیک مانگنے کی خاطر، اپنی مرحوم ماں کی قسم کھا کر اس کی روح کو تکلیف تو نہ پہنچاؤ۔''

''ٹھیک ہے، میں اپنی قسم واپس لیتا ہوں۔'' وہ خوشامدانہ انداز میں بولا۔ ''اب تم جلدی سے مجھے انجکشن لگا دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ انجکشن کی سوئی باہر نکلنے سے پہلے ہی میں تمہیں عرفانہ کے بارے میں سب کچھ بتا دوں گا۔''

''کیا تم نے مجھے اتنا ہی بے وقوف سمجھ رکھا ہے کہ میں تمہارے وعدے کا اعتبار کر لوں گی۔'' عندلیب نے زہرخند لہجے میں کہا۔ ''اس اینٹی ڈوٹ کا محلول اسی وقت تمہارے خون میں اترے گا جب تم مجھے عرفانہ کے بارے میں سب

کچھ ٹھیک بتا دو گے اور اس نیک کام کے لیے تمہارے پاس صرف ڈیڑھ منٹ بچا ہے۔ یہ نوے سیکنڈ اگر تم نے منہ میں گھنگنیاں ڈال کر گزار دیے تو پھر جان سے گزر جاؤ گے۔ آگ، پانی، ہوا، مٹی اور زہر سے آنے والی موت بڑی دردناک ہوتی ہے کامران۔ اب بال تمہاری کورٹ میں ہے۔''

موت کی اپنی ہی ایک ہیبت ہوتی ہے۔ یہ بڑے سے بڑے شاہ زور کا پتا پانی کر دیتی ہے۔ کامران ان لمحات میں اسی سفاک موت سے چند سیکنڈ کی دوری پر درد کی شدت سے تڑپ رہا تھا۔ زندگی سب کو عزیز ہوتی ہے۔ اس نے بھی مالی نقصان کی پروا کیے بغیر زندہ رہنے کا فیصلہ کر لیا...... چاہے یہ زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہی کیوں نہ ہو۔

''تم سرنج کی سوئی... میرے بدن میں داخل کرو۔'' وہ شکست خوردہ انداز میں بولا۔''میں تمہیں عرفانہ کا پتا ٹھکانا بتا رہا ہوں۔''

کامران کی آواز سے نقاہت ٹپک رہی تھی اور آنکھوں میں بھی موت کے سائے لہرانے لگے تھے۔ عندلیب کو یہ سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ کامران کی زندگی کا چراغ گل ہونے کا وقت آن پہنچا تھا۔ ایسی حالت میں اس کی طرف سے کسی خطرناک اور ضرر رساں ردِعمل کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی تاہم پھر بھی انتہائی محتاط انداز اختیار کرتے ہوئے اس نے کامران کی رگ تلاش کر کے سرنج کی نیڈل اس کے اندر داخل کر دی لیکن پسٹن کو پش کرنے سے پہلے دوٹوک لہجے میں کہا۔

''کامران! میرا انگوٹھا سرنج کے پسٹن پر ہے۔ تم بکنا شروع کرو گے تو میں پسٹن کو دبا کر اس اینٹی ڈوٹ کو تمہارے خون میں دھکیلنے کا آغاز کروں گی۔ تمہارے پاس صرف چالیس سیکنڈ ہیں۔ اگر اب بھی تم نے میرے بار بار پوچھے گئے سوال کا جواب نہیں دیا تو میں تمہیں مرنے کے لیے چھوڑ دوں گی۔''

''وہ......وہ......وہ......'' کامران کی بند زبان کا قفل کھل گیا۔''عرفانہ...... کو ہم نے...... شیخ صاحب...... کے بنگلے......'' اس کی آواز معدوم ہوتے ہوتے یک دم تھم گئی۔

اس کے ساتھ ہی اس کے بدن کو ایک خوفناک جھٹکا لگا اور اگلے ہی لمحے اس کی گردن ایک جانب کو ڈھلک گئی۔ اس گردن کے اوپر نظر آنے والے کامران کے سر کا سائز تو بالکل پہلے جیسا ہی تھا۔ اس میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی دکھائی نہیں دیتی تھی تاہم اس کھوپڑی کے اندر پایا جانے والا دماغ بُری طرح سکڑ کر اخروٹ کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ اس کا وقت پورا ہو گیا تھا۔

عندلیب نے ایک بوجھل گہری سانس خارج کی اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنا سیل فون قبضے میں کیا اور خلیق کے آفس کا نمبر ملانے لگی تاکہ اسے بنگلے کی صورتِ حال سے آگاہ کر سکے۔ قبل اس کے کہ اس کی ڈائلنگ مکمل ہوتی، کامران کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے اپنی کال کو کٹ کیا اور اضطراری انداز میں فرش پر پڑی ہوئی کامران کی باڈی کی جانب بڑھی۔

کامران اپنے فون کو جیب میں رکھتا تھا۔ عندلیب نے سیل فون کو اس کی جیب میں سے نکال کر اسکرین پر نگاہ دوڑائی۔ وہاں صرف کیپٹل آر لکھا ہوا نظر آرہا تھا۔ عندلیب کے دماغ نے چیخ کر کہا، یہ رئیس کی کال ہوگی۔ اس نے بڑے اعتماد سے کال کو ریسیو کیا تاہم زبان سے ایک لفظ ادا نہیں کیا۔ یہ بات اس نے خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ کامران کے سیل فون پر جب بھی کسی کی کال آتی تھی تو وہ ''ہیلو'' وغیرہ کہنے کا تکلف نہیں کرتا تھا اور خاموشی سے، دوسری جانب بولنے والے کی بات سنتا تھا پھر اگر ضروری ہوتا تھا تو مختصر الفاظ میں بات چیت کو نمٹا دیتا تھا۔

عندلیب کی حکمتِ عملی کامیاب رہی۔ وہ تو خاموش رہی۔ تاہم دوسری جانب لائن پر موجود شخص نے کامران کو مخاطب کیے بغیر یہ پیغام دینے کے بعد کال اینڈ کر دی۔

''کام ہو گیا ہے۔ ہم اپنے ہیڈ کوارٹر کی طرف جارہے ہیں۔ عدنان کو لڑکی کے پاس سے بلا لیا گیا ہے۔ تم بھی فوراً ہیڈ کوارٹر پہنچو۔''

عندلیب نے کامران والے سیل فون کو آف کرنے کے بعد سائڈ ٹیبل پر رکھا اور ایک بار پھر اپنے شوہر کے آفس کا نمبر ملانے میں مصروف ہو گئی۔

☆☆☆

نوشاد نے کمرے میں داخل ہونے کے بعد خلیق سے پوچھا۔''سلیم سے رابطہ ہوا؟''

''نہیں۔'' خلیق نے مایوسی بھرا جواب دیا۔''اب تو اس کا نمبر سوئچ آف آرہا ہے۔''

''خلیق صاحب! گیم کا پاسا پلٹ چکا ہے۔'' نوشاد نے گمبھیر انداز میں کہا۔''اب آپ اپنے معتمدِ خاص سے بھی بات نہیں کر سکیں گے۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں۔'' اس کی آنکھوں میں اُلجھن بھری حیرت تیرنے لگی۔''آخر آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟''

''میں آپ کو حالات کی جو تصویر دکھانا چاہتا ہوں، اس کے دو پہلو ہیں۔'' وہ خلیق کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''پہلو نمبر ایک۔ آپ نے اغوا کنندگان کو سلیم اور ٹیکسی کے حوالے سے جو معلومات فراہم کی تھیں، ان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان لوگوں نے رقم کو آپ کے آفس تک پہنچنے سے پہلے اُڑا لیا ہے۔ اس صورت میں انہوں نے سلیم کو یا تو قتل کر دیا ہے اور یا پھر بے ہوش کر کے کہیں پھینک دیا ہے اور پہلو نمبر دو یہ ہے......'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے دوٹوک انداز میں بولا۔

''خلیق صاحب! عین ممکن ہے، آپ کا معتمدِ خاص اس گھناؤنی سازش کا حصہ ہو۔ اس صورت میں بھی وہ بھی پلٹ کر آپ کے پاس نہیں آئے گا۔''

''میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ سلیم مجھے دھوکا دے گا۔'' وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ''البتہ آپ نے جو دوسرا امکان ظاہر کیا ہے، وہ میری سمجھ میں آ رہا ہے۔''

''صورت کوئی بھی رہی ہو لیکن آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔'' نوشاد نے تشفی بھرے لہجے میں کہا۔ ''پانچ کروڑ روپے کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی۔ میں نے آپ کی خاطر ایسا بندوبست کر دیا ہے کہ وہ لوگ اس رقم کو جب بھی ملک کے اندر یا بیرونِ ملک حرکت میں لائیں گے تو مجھے اطلاع مل جائے گی، پھر رقم بردار کو قابو کرنا میرے لیے ہرگز مشکل نہیں ہوگا۔''

''مجھے رقم کی کوئی پروا نہیں نوشاد صاحب!'' خلیق کی آواز میں نمی اتر آئی۔ ''اگر ایسی بات ہوتی تو میں صرف ڈھائی گھنٹے کے اندر اتنی بڑی رقم کبھی ارینج نہ کرتا۔ مجھے صرف اپنی بیٹی کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ پتا نہیں، عرفانہ کس حال میں ہوگی...... اس نے کچھ کھایا پیا بھی ہے یا ابھی تک ان شیطانوں کی قید میں بھوکی پیاسی بیٹھی ہے۔''

بات کے اختتام پر اس کا لہجہ مکمل طور پر بھیگ چکا تھا۔ نوشاد نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ''خلیق صاحب! آپ فکر نہ کریں۔ میں کچھ کرتا ہوں۔ انشاء اللہ آپ کی بیٹی کو کچھ نہیں ہوگا۔''

''آپ کیا کریں گے؟'' وہ گھائل نظر سے اپنے دوست کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اگر وہ لوگ رقم حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں تو پھر وہ ہم سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ ہم عرفانہ تک کیسے پہنچیں گے نوشاد صاحب؟''

''اگر اغوا کنندگان آپ سے رابطہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کریں گے تو کیا ہوا، ہم ان سے کانٹیکٹ کریں گے۔'' نوشاد نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''آپ اپنے گھر کا نمبر ملائیں جہاں آپ کے بقول، ان کے ایک ساتھی نے عندلیب بھابی کو یرغمال بنا رکھا ہے۔''

''وہ خبیث انسان بنگلے کے اندر داخل ہونے کے بعد چوکیدار کو بے ہوش کرنے کے علاوہ ٹیلی فون کا تار بھی کاٹ چکا ہے۔'' خلیق نے بتایا۔ ''میرے گھر کی لینڈ لائن ڈیڈ پڑی ہے۔''

''آپ نے یہ بھی بتایا تھا کہ عندلیب بھابی کا سیل فون بھی اسی اغوا کار کے قبضے میں ہے۔'' نوشاد نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور آپ کو پابند کر دیا گیا تھا کہ آپ نے رقم کا بندوبست ہو جانے کے بعد اسی نمبر پر اطلاع دینا ہے۔''

''جی...... یہی طے ہوا تھا۔'' خلیق نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

''مجھے نہیں امید کہ اب وہ لوگ آپ سے کبھی رابطہ کریں۔'' نوشاد نے حتمی انداز میں کہا۔ ''ہمیں خود ہی عرفانہ کو تلاش کرنا ہے۔ جب تک عرفانہ کا سراغ نہیں مل جاتا، آپ کے بنگلے پر کسی قسم کی ہنگامی کارروائی نہیں کی جا سکتی۔ ہم نہیں جانتے، وہ کل کتنے افراد ہیں۔ اگر آپ کے بنگلے پر ریڈ کیا گیا تو اس سے وہ لوگ عندلیب بھابی کو کوئی نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہم عرفانہ سے بہت دور ہو جائیں گے۔''

''پھر کیا کریں؟'' اس نے بے بسی سے کہا۔ ''میں عرفانہ اور عندلیب میں سے کسی کو بھی نقصان پہنچتے نہیں دیکھ سکتا۔''

''آپ کو کچھ نہیں کرنا۔ بھابی اور عرفانہ کی حفاظت میری ذمے داری ہے۔'' نوشاد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ عندلیب بھابی کا نمبر مجھے دیں۔''

''وہ سیل فون تو اغوا کار کے قبضے میں ہے۔''

''مجھے اسی نامراد سے بات کرنا ہے۔'' نوشاد نے اپنا سیل فون نکالتے ہوئے کہا۔ ''ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں عندلیب کا کوئی عزیز بن کر اس کے سامنے آؤں گا۔ رئیس نے آپ کے ساتھ جو چال چلی تھی، اسے لوٹانے کا وقت آ گیا ہے۔ اگر رئیس، عندلیب بھابی کا کوئی امریکا پلٹ رشتے دار ہو سکتا ہے تو میں کیوں نہیں؟''

''گڈ آئیڈیا۔'' خلیق نے ستائشی نظر سے اپنے

خیر خواہ کی جانب دیکھا پھر اپنی بیوی کا سیل نمبر اُسے بتا دیا۔
نوشاد نے مذکورہ نمبر ڈائل کرنے کے بعد سیل فون کان سے لگالیا پھر خلیق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بھابی کا نمبر بزی آرہا ہے۔''
''ہوسکتا ہے، وہ منحوس اغوا کار اپنے کسی ساتھی سے بات کررہا ہو۔'' خلیق نے خیال آرائی کی۔
نوشاد نے کہا۔ ''اور یہ بھی ممکن ہے، وہ آپ ہی کو کانٹیکٹ کرنے کی کوشش میں ہو۔''
اِدھر نوشاد کی بات ختم ہوئی، اُدھر خلیق کی میز پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ خلیق نے فون سیٹ کی جانب سہمی ہوئی نظر سے دیکھا۔
''کال اٹینڈ کریں۔'' نوشاد نے حوصلہ دلانے والے انداز میں کہا۔ ''اور فون کا اسپیکر آن کردیں۔''
خلیق نے اپنے دوست کے حکم کی تعمیل کی۔ اگلے ہی لمحے اسپیکر پر عندلیب کی آواز ابھری۔ وہ بڑے جذبات و جوش میں بول رہی تھی۔
''خلیق! تم ان کُتوں کو ایک روپیا نہیں دینا۔ میں نے کامران کو ختم کردیا ہے اور...... مجھے پتا چل گیا ہے کہ انہوں نے عرفانہ کو کہاں رکھا ہے۔''
''بھابی! میں نوشاد بات کررہا ہوں۔'' نوشاد نے ریسیور اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ ''آپ پیسوں کی فکر نہ کریں۔ یہ بتائیں، آپ خیریت سے ہیں؟''
''میں ٹھیک ہوں بھائی۔'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''میں نے اس موذی کامران کو زہر دے کر مار ڈالا ہے۔ اس کی لاش اِدھر فرش پر پڑی ہے......''
''آپ کسی بھی چیز کے لیے پریشان نہ ہوں۔ میں سب سنبھال لوں گا۔'' نوشاد نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''آپ کو عرفانہ کے بارے میں کیا پتا چلا ہے؟''
''آپ اُن کو اپنے ساتھ لے کر فوراً گھر آجائیں۔'' عندلیب نے کہا۔ ''پھر میں آپ کو سب کچھ بتاتی ہوں۔''
''ٹھیک ہے، ہم آرہے ہیں۔'' نوشاد نے یہ کہتے ہوئے رابطہ ختم کردیا۔
ٹھیک بیس منٹ کے بعد خلیق، نوشاد کی معیّت میں اپنے گھر پہنچ گیا پھر وہاں کے حالات کو سنبھالنے میں نوشاد کو کوئی دقت محسوس نہ ہوئی۔ عندلیب صرف اتنا جان پائی تھی کہ عرفانہ کو کسی شیخ صاحب کے بنگلے پر رکھا گیا تھا۔ وہ تین گھنٹے تک جس اعصاب کشیدہ صورتِ حال سے گزری تھی اس میں فوری طور پر وہ سمجھ نہیں پائی تھی کہ کامران کے آخری الفاظ ''عرفانہ...... کو ہم نے...... شیخ صاحب...... کے بنگلے......'' کا کیا مطلب تھا لیکن جب اس نے یہ معاملہ اپنے شوہر اور اس کے دوست کے سامنے رکھا تو ان کے ذہن کو عرفانہ تک رسائی حاصل کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی۔
شیخ احمد کا بنگلا، خلیق کے بنگلے کے عقب میں واقع تھا۔ شیخ صاحب ان دنوں اپنی پوری فیملی کے ساتھ عمرہ کرنے گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے تمام ملازمین کو بھی دو ہفتے کی چھٹی دے دی تھی۔ اغوا کنندگان کا ہوم ورک بڑا جاندار تھا۔ انہوں نے عرفانہ کی آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ کر ایک ایسی جگہ پر پہنچا دیا تھا جہاں تک کسی کا وہم و گمان بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔
☆☆☆
وہ چاروں ایک اپارٹمنٹ میں موجود تھے۔ مذکورہ اپارٹمنٹ ایک ایسی بلڈنگ میں تھا جو ابھی آباد ہونا شروع ہوئی تھی۔ اس عمارت کے اسّی فیصد اپارٹمنٹ مکینوں سے خالی تھے کیونکہ تعمیراتی کام آخری مراحل میں تھا۔ یہ رہائشی پراجیکٹ شہر کے مضافات میں بنایا گیا تھا۔ ان چار افراد میں ایک صاحبِ خانہ تھا اور باقی تین اس کے لیے کام کرنے والے، اس کے ساتھی۔ صاحبِ خانہ کی حیثیت ان کے لیے ایک باس ایسی تھی۔ انہوں نے اپنے باس کے احکامات کی تعمیل کرتے ہوئے آج ایک بہت لمبا ہاتھ مارا تھا۔ پانچ کروڑ روپے کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی اور اس کے حصول کے لیے وہ انسانی زندگیوں سے بھی کھیل گئے تھے۔ تاہم اس مشن میں ان کا ایک ساتھی بھی کام آگیا تھا۔ وہ سب اس کی موت پر رنجیدہ تھے۔
رئیس نے کہا۔ ''باس! میں کامران کے ساتھ آج رات کی ایک فلائٹ سے ملائیشیا جانے والا تھا لیکن افسوس کہ اب مجھے اکیلے ہی سفر کرنا ہوگا اور وہ بھی بوجھل دل کے ساتھ۔''
''زندگی اور موت اس کھیل کا حصہ ہے۔'' باس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''کامران کی موت کا مجھے بھی بہت دکھ ہے۔ اس نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ اپنی اننگز کھیلی ہے مگر نائن ٹی نائن پر وہ عندلیب کی ایک یارکر بال پر کلین بولڈ ہوگیا۔ ایسے مشن پر کھانے پینے کے معاملات میں بڑی احتیاط برتنا چاہیے اور...... کھانے پینے پر یاد آیا کہ میں نے اس کامیابی کی خوشی میں آپ لوگوں کے لیے خصوصی اہتمام

کر رکھا ہے لیکن سب سے پہلے رقم کی تقسیم، جشن اس کے بعد۔''

سب نے اپنے باس کی تجویز پر صاد کیا۔ عدنان نے کہا۔

''باس! رقم کے بٹوارے کے حوالے سے یہ طے ہوا تھا کہ مجھے، رئیس اور کامران کو ایک ایک کروڑ ملیں گے۔ باقی کے دو کروڑ آپ رکھیں گے۔ ایم سکندر آپ کا پرانا بندہ ہے۔ آپ اسے اپنے دو کروڑ میں سے جتنا چاہیں، دے دیں۔ ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''اگر باس مجھے ایک روپیا بھی نہ دیں تو میں تب بھی خوش ہوں۔'' پستہ قامت اور دھان پان ایم سکندر نے کہا۔ ''میرے پاس جو کچھ بھی ہے، وہ باس ہی کا دیا ہوا ہے۔''

ایم سکندر کسی بھی شخص کی آواز کی نقالی کرنے کا ماہر تھا۔ وہ باس کی دریافت تو تھا مگر وہ اسے صرف دو ماہ سے جانتا تھا لیکن اس نے عدنان، رئیس اور کامران کو یہی بتایا تھا کہ ایم سکندر اس کے ساتھ کافی عرصے سے کام کر رہا ہے۔ یہ جھوٹ اس نے دانستہ بولا تھا اور اس حوالے سے ایم سکندر کو بھی اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ وہ باس کو کسی میجک شو پروگرام میں ملا تھا جہاں وہ لوگوں کی آواز کی ہو بہو نقالی کر کے انہیں ورطۂ حیرت میں ڈال دیا کرتا تھا۔ باس خلیق والے پروجیکٹ پر کافی دنوں سے کام کر رہا تھا۔ جب ایم سکندر سے اس کی ملاقات ہوئی تو اس نے اسے نجیب کا کردار ادا کرنے کے لیے منتخب کر لیا تھا۔

''عدنان! میں تمہاری بات کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔'' باس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں بہت اصول پسند انسان ہوں۔ جب یہ طے ہو گیا کہ میں دو کروڑ اپنے پاس رکھوں گا تو پھر میں ایک روپیا بھی زائد نہیں لوں گا۔ کامران، رئیس اور تم ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہو اور تم لوگوں نے میرے ساتھ یہ پہلا مشن کیا ہے۔ مجھے کامران کی موت کا رنج ہے مگر افسوس کہ میں اسے واپس نہیں لا سکتا۔ آپ نے اور رئیس نے بھی سخت محنت کی ہے۔ میں چاہوں گا کہ کامران والے ایک کروڑ بھی تم دونوں میں تقسیم کر دیے جائیں۔ یہ آپ دونوں کا حق ہے۔ آپ دونوں کو ڈیڑھ کروڑ، ڈیڑھ کروڑ ملنا چاہئیں۔''

''یہ تو آپ کا بڑا پن ہے باس۔'' عدنان نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں ایک دو روز میں دبئی جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ آپ کا کیا پروگرام ہے...... آئندہ آپ سے کب اور کہاں ملاقات ہو سکے گی؟''

''مجھے کہاں جانا ہے۔'' باس نے بے پروائی سے کہا۔ ''یہ شہر مجھے کہیں جانے ہی نہیں دیتا۔ آپ لوگوں کو میں یہی مشورہ دوں گا کہ چار ماہ کے لیے ملک سے باہر چلے جاؤ اور خوب عیش کرو۔ جب تک میں خود آپ سے رابطہ نہ کروں، مجھ سے ملنے کی کوشش نہیں کرنا۔ آپ کے کانٹیکٹ نمبرز میرے سیل فون میں محفوظ ہیں۔ میں جب کوئی نیا مشن ڈیزائن کروں گا تو آپ دونوں سے رابطہ کروں گا۔''

''ویسے باس! آپ بڑے زبردست اداکار ہیں۔'' رئیس نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''آپ کے آس پاس سانس لینے والے افراد کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا کہ آپ خطروں کے کھلاڑی ہیں۔ میں آپ کی عظمت کو سیلیوٹ کرتا ہوں۔''

''بھولا پن اور معصومیت صرف بچوں پر ہی زیب دیتا ہے کیونکہ وہ ہر قسم کی منافقت سے پاک ہوتے ہیں۔'' باس نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''اگر کسی میچور انسان کے اندر یہ خوبیاں نظر آئیں تو فوراً اسے پیشتر محتاط ہو جاؤ۔ اس قسم کے خصائل والے بالغ افراد میں سے اکثریت دھوکے باز ہوتی ہے۔''

''باس! میں نے آپ کی بات کو پلّے باندھ لیا ہے۔'' ایم سکندر نے پرجوش انداز میں کہا۔

''دبئی پہنچ کر میری اس بات کو اپنے پلّے سے کھول کر کہیں پھینک تو نہیں دو گے؟'' باس نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''دبئی......'' ایم سکندر نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''میں دبئی کب جا رہا ہوں باس؟''

''عدنان کے ساتھ میں تمہیں بھی دبئی جانے والے جہاز پر چڑھانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔'' باس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''عدنان کا تو ویزا لگا ہوا ہے۔ تم کل صبح اپنا پاسپورٹ مجھے دے دینا۔ میں اپنے ٹریول ایجنٹ سے کہہ کر تمہارا بندوبست بھی کروا دیتا ہوں۔''

''جو حکم باس۔'' ایم سکندر نے فرمانبرداری سے کہا۔

اس کے بعد باس نے پانچ کروڑ روپے سے بھرا ہوا بیگ کھول لیا اور تین کروڑ مالیت کے نوٹ بیگ کے اندر سے باہر نکال کر انہیں دو ڈھیریوں میں بانٹ دیے۔ پھر وہ اندرونی کمرے میں سے دو چھوٹے بیگ اٹھا لایا اور ہر ایک بیگ میں ڈیڑھ کروڑ روپے کے کرنسی نوٹ ڈال کر ایک بیگ رئیس کو اور دوسرا عدنان کو دینے کے بعد باری باری ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تم لوگ خوش تو ہو نا؟''

''بہت زیادہ خوش۔'' رئیس نے فرطِ جذبات سے کہا۔

عدنان بولا۔ ''باس! اس دھندے میں ایسی شفاف ایمان داری کا مظاہرہ کر کے آپ نے زندگی بھر کے لیے ہمیں خرید لیا۔ آپ ہماری خوشی کے ٹھکانے کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔''

''تو پھر اسی خوشی میں اپنی کامیابی کا جشن منایا جائے؟'' باس نے ان تینوں کے چہروں کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں ضرور...... کیوں نہیں۔'' وہ یک زبان ہو کر بولے۔

''یہ اپارٹمنٹ میں نے یہاں کے چوکیدار کی مٹھی گرم کر کے چند روز کی رہائش کے لیے لے لیا تھا لہٰذا یہاں پر باقاعدہ کسی بھی چیز کا بندوبست نہیں ہے۔'' باس نے کہا۔ ''میں نے آپ لوگوں کی خاطر تواضع کے لیے تھوڑا باربی کیو اور کچھ پینے کو منگوا لیا تھا۔ اسی دال دلیا سے گزارا کرنا ہوگا۔ ایک آدھ روز میں، میں اس اپارٹمنٹ کو خیرباد کہہ دوں گا۔''

''باس! آپ ہمیں سادہ پانی بھی پلا دو گے تو ہم خوش ہو جائیں گے۔'' ایم سکندر نے کہا۔ ''ہم آپ کی خوشی میں خوش ہیں۔''

''سادہ پانی کا بھی انتظام ہے۔'' باس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اب کسی کی مرضی کہ وہ اسے سادہ نہ رہنے دے...... جو دل چاہے، اس میں ملا دے......''

باس کی اس بات پر وہ تینوں بھی اس کے ساتھ ہی قہقہے مار کر ہنسنے لگے۔ اس کے بعد وہ حسبِ ضرورت کھانے اور پینے پر ٹوٹ پڑے۔ باس نے اپنے لیے ایک الگ سے کرنچ برگر منگوایا تھا۔ یہ بات وہ پہلے ہی ان پر واضح کر چکا تھا کہ آج کل وہ پرہیزی ہائی جینک کھانے پر چل رہا ہے۔ چند روز پہلے اسے شدید نوعیت کا فوڈ پوائزن ہو گیا تھا۔ تب سے وہ باربی کیو سے پرہیز کر رہا تھا۔ ان میں سے کسی نے بھی اپنے باس کی اس احتیاط پسندی کا نوٹس لیا تھا اور نہ ہی اس پر کوئی تبصرہ کیا تھا۔ پانچ ہزار والے نوٹوں کی گڈیوں کے تصورات نے انہیں ایسی چھوٹی موٹی باتوں پر توجہ دینے کے قابل ہی کب چھوڑا تھا۔

☆☆☆

شہر کے مرکزی کاروباری علاقے میں شام اتر آئی تھی بلکہ زیادہ مناسب ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ رات اپنا سفر شروع کر چکی تھی۔ ایسے ہی میں وہ نوٹوں سے بھرا ہوا ایک بیگ اٹھائے کھلونوں کی ایک دکان میں داخل ہوا۔ مذکورہ دکان ایک پرانی بوسیدہ سی عمارت میں واقع تھی۔ تاہم رقبے کے لحاظ سے وہ کافی کشادہ دکان تھی جس کے نوے فیصد حصے پر مالک دکان سیٹھ کریم نے ہر سائز اور ہر نسل کے کھلونوں کو ڈسپلے کر رکھا تھا اور دو سیلزمین گاہکوں کی خدمت کے لیے ہر وقت حاضر رہتے تھے۔ دکان کے باقی دس فیصد حصے میں سیٹھ کریم نے اپنا آفس بنا رکھا تھا جو دکان کے عقبی حصے میں واقع تھا۔ وہ اپنا زیادہ تر وقت اسی آفس میں گزارتا تھا۔ اس نے آفس کے اندر کمپیوٹر سسٹم بھی لگا رکھا تھا جہاں پر وہ بیٹھا یا تو پرانی موویز دیکھتا رہتا تھا یا پھر وڈیو گیمز سے دل بہلایا کرتا تھا۔ سیٹھ کریم اپنا کھانا، پانی اور چائے وغیرہ گھر ہی سے لے کر آتا تھا۔ اس کی عمر ستر سے متجاوز تھی۔

جب بیگ بردار شخص اس کی دکان میں داخل ہوا تو وہ اپنے آفس میں موجود تھا۔ مذکورہ شخص سیدھا سیٹھ کریم کے پاس پہنچ گیا۔ سیٹھ کریم اسے دیکھتے ہی کھل اٹھا۔ اسے اپنے آفس میں بٹھانے کے بعد دروازہ بند کر دیا۔ آفس کا دروازہ بند ہونے کا مطلب دونوں سیلزمین اچھی طرح جانتے تھے کہ...... اب انہیں کسی بھی قیمت پر...... سیٹھ کو ڈسٹرب نہیں کرنا۔

''سر! آپ کافی عرصے کے بعد آئے ہو۔'' سیٹھ کریم نے اپنے ملاقاتی سے کہا۔ ''سب خیریت تو ہے نا؟''

''سب ٹھیک ہے کریم صاحب۔'' اس شخص نے جواب دیا۔ ''دیر سے ضرور آیا ہوں لیکن سارے گلے شکوے دور کر دوں گا۔''

''اوہ اچھا......'' سیٹھ کریم اپنے چہرے پر کاروباری مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔ ''حکم کرو سر...... ہم تو آپ جیسے کرم فرماؤں کی خدمت کے لیے ہی ادھر بیٹھے ہیں۔''

اس شخص نے بیگ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ پیسے بھجوانا ہیں۔''

سیٹھ کریم کی ساری عمر پیسوں کو گنتے اور ان سے کھیلتے ہوئے گزری تھی۔ بیگ کے سائز کو دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا لیکن اس نے دلی کیفیت کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''سر! کتنی رقم ہے؟''

''پورے پانچ کروڑ۔'' اس شخص نے معتدل انداز میں بتایا۔

سیٹھ کریم نے اپنا سیل فون اٹھا کر کان سے لگایا اور

غصیلے لہجے میں بولا۔ ''میں اس وقت ایک کلائنٹ کے ساتھ میٹنگ میں ہوں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تمہارے لیے چنا چاٹ لے کر آنا ہے۔''

''لگتا ہے، آپ کی بیوی ہے؟'' اس شخص نے پوچھا۔

''ہاں سر...... صبح سے تین بار یاد دلا چکی ہے اپنی چنا چاٹ کے بارے میں۔'' سیٹھ کریم نے جھنجلاہٹ بھرے انداز میں کہا۔ ''اس عمر میں انسان ایسا ہی ہو جاتا ہے۔ مجھ سے پانچ سال بڑی ہے مگر چٹوراپن ابھی گیا نہیں۔ ٹھہریں...... '' اس نے دوبارہ اپنا سیل فون اٹھالیا۔ ''میں اس بیماری کو آف کر دیتا ہوں ورنہ میری بیوی ہمیں سکون سے بات نہیں کرنے دے گی۔''

سیل فون کے مختلف بٹن دبانے کے بعد اس نے فون کو ایک طرف اپنی میز پر رکھ دیا پھر اپنے کلائنٹ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں اپنے سیل فون کو ہمیشہ سائیلنٹ موڈ پر رکھتا ہوں ورنہ تو میری بیوی گھنٹیاں بجا بجا کر میرا دماغ ہی خراب کر دے گی، خیر، اب تو میں نے فون کو آف ہی کر دیا ہے۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس خارج کی پھر سنجیدہ لہجے میں دریافت کیا۔

''پانچ کروڑ روپے کہاں بھیجنے ہیں؟''

''جوہانسبرگ۔''

''اوکے...... جوہانسبرگ۔'' اس نے ایک کاغذ پر اماؤنٹ اور شہر کا نام لکھا پھر پوچھا۔ ''کس کرنسی میں؟''

''ظاہر ہے، یو ایس ڈی۔'' کلائنٹ نے ٹھوس انداز میں کہا۔

''پھر لگ بھگ ایک منٹ تک ان کے بیچ روپے، امریکی ڈالر اور جوہانسبرگ میں کرنسی ایکسچینج ریٹ پر بات ہوتی رہی۔ اس دوران میں سیٹھ کریم مسلسل کیلکولیٹر کا استعمال بھی کر رہا تھا۔ بالآخر یہ طے پا گیا کہ اپنا کمیشن وغیرہ سب شامل کر کے ان پانچ کروڑ پاکستانی روپوں کے بدلے میں کتنے لاکھ یو ایس ڈی (امریکی ڈالر) جوہانسبرگ میں وصول کیے جاسکیں گے۔ جب کلائنٹ نے گوہیڈ دے دیا تو سیٹھ کریم نے وہ پرچہ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''سر! اس پر وصول کنندہ کا نام اور اس کی آئی ڈی بھی درج کر دیں۔''

کلائنٹ نے مذکورہ معلومات کاغذ پر درج کر دیں۔

اس کے بعد سیٹھ کریم اپنے سسٹم کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ کلائنٹ بڑی بے صبری سے اس کا انتظار کرنے لگا۔

سیٹھ نے ایک منٹ کی کوشش کے بعد معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

''سر! انٹرنیٹ کنکشن ذرا پرابلم کر رہا ہے۔ آپ کو چند منٹ انتظار کرنا ہوگا۔ میں آپ کے لیے چائے نکالتا ہوں۔''

بات کے اختتام پر سیٹھ کریم نے اپنے تھرماس میں سے دو کپ میں چائے انڈیلی۔ ایک کپ اس نے اپنے کلائنٹ کی طرف بڑھا دیا اور دوسرا کپ اپنے سامنے رکھ لیا پھر جوش بھرے لہجے میں بولا۔

''سر! انٹرنیٹ کنکشن کا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ آپ چائے پییں۔ تب تک میں آپ کا منی ٹرانسفر پراسس کر کے آپ کے لیے پاس کوڈ نکالتا ہوں۔''

کلائنٹ نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کی اور چائے کا کپ اٹھا کر اس کی چسکیاں لینے لگا۔ چائے نیم گرم تھی لہٰذا سیٹھ کریم کا کام ختم ہونے سے پہلے ہی اس نے چائے ختم کر ڈالی۔ پھر چند سیکنڈ بعد ہی کلائنٹ کو اپنے ہوش و حواس پر قابو نہیں رہا اور وہ گردن ایک طرف ڈال کر انٹا غفیل ہو گیا۔

کلائنٹ کی جانب سے اطمینان حاصل کرنے کے بعد سیٹھ کریم نے اپنے سیل فون کو آن کیا اور ایک نمبر پر کال کر کے اطلاع دی۔

''سر کام ہو گیا ہے۔''

''تمہارا میسج ہمیں مل گیا تھا سیٹھ۔'' دوسری جانب بات کرنے والے نے کہا۔ ''ہم ٹھیک دو منٹ کے بعد تمہاری دکان پر ہوں گے۔''

''سر! آپ کو اپنا وعدہ یاد ہے نا......؟''

''بالکل یاد ہے۔'' اس شخص نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''سیٹھ! آج تم نے جو ٹرانزیکشن کی ہے اس کا ایک فیصد، وعدے کے مطابق تمہارا حق بنتا ہے۔ ہم پارٹی سے تمہیں پورے پانچ لاکھ دلوائیں گے۔''

''تھینک یو سر......'' سیٹھ کریم کی باچھیں کھل گئیں۔

☆☆☆

اگلی صبح خلیق نے جو پہلی کال ریسیو کی وہ نوشاد کی تھی۔ اس کی آواز میں ایک خاص قسم کی چہک پائی جاتی تھی۔ اس نے خلیق کو بتایا۔

''مبارک ہو، آپ کے پانچ کروڑ کو ڈوبنے سے بچا لیا گیا ہے۔''

''کب...... کیسے؟'' خلیق حیرت کے سمندر میں غوطہ

زن تھا۔ ”مجھے بتائیں، یہ سب کیوں کر ممکن ہوا؟“

”عرفانہ بی بی کو اغوا کرنے والا ماسٹر مائنڈ شخص پانچ کروڑ روپے کی خطیر رقم کو جوہانسبرگ بھیجنے کے لیے کل شام ایک حوالے والے کے پاس پہنچا تھا۔“ نوشاد نے بتایا۔ ”میں نے جو جال پھیلا رکھا تھا، بدقسمتی سے اغوا کار کا قدم اس جال کے اندر پڑ گیا۔ بس، پھر اسے قابو کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔“

”جوہانسبرگ تو ساؤتھ افریقا کا سب سے زیادہ آبادی والا شہر ہے۔“ خلیق نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”رضا کی بیٹی سکینہ اسی شہر میں رہتی ہے۔ ابھی رضا کی بیوی اور بیٹا بھی جوہانسبرگ ہی گئے ہیں...... کہیں آپ......“

”نہیں خلیق صاحب۔“ وہ خلیق کے تمام تر اندیشوں کی نفی کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ کا منیجر رضا اس معاملے میں ملوث نہیں ہے۔“

”سلیم کی بھی ابھی تک کوئی خبر نہیں ملی......“ خلیق نے ایک اور خدشے کی جانب اشارہ کیا۔

نوشاد اس کی بات کی تہ میں پہنچ گیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”سلیم کا بھی آپ کی بیٹی کے اغوا سے کوئی لینا دینا نہیں۔“

”پھر...... پھر...... وہ کون ہے جس نے میرے ساتھ یہ گھناؤنا کھیل کھیلا۔“ خلیق کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ”آپ مجھے بتاتے کیوں نہیں ہیں؟“

”بتا رہا ہوں خلیق صاحب۔“ نوشاد نے متحمل انداز میں کہا۔ ”آپ کی بیٹی کے اغوا کی سازش کے پیچھے جس شخصیت کا ہاتھ ہے، اس کا نام ہے شہلا...... آپ کی سیکریٹری۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں نوشاد صاحب۔“ خلیق نے ہیجانی لہجے میں کہا۔ ”وہ بے چاری تو ایک مظلوم اور بے ضرر عورت ہے۔ ابھی چند ماہ پہلے تو اس کی طلاق ہوئی ہے۔ وہ میرے پاس پچھلے ایک سال سے کام کر رہی ہے۔ میں نے اس کے اندر کوئی منفی رجحان نہیں دیکھا۔“

”یہی تو اس کا ہنر ہے خلیق صاحب۔“ نوشاد نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ”وہ مطلقہ نہیں بلکہ شادی شدہ شوہر والی ہے۔ اس کے شوہر کا نام ہارون ہے جسے ہم نے پانچ کروڑ روپے کے ساتھ کل رات ہی پکڑ لیا تھا۔ یہ ساری کہانیاں ہارون کی زبانی ہی کھلی ہیں۔ دونوں میاں بیوی بڑے خطرناک جرائم پیشہ افراد ہیں۔ سال میں صرف ایک واردات کرتے ہیں۔ اس بار آپ ان کا نشانہ بن گئے۔ ان لوگوں نے بھاڑے کے چار غنڈوں کو اپنے ساتھ ملا کر یہ واردات کی تھی جن میں سے کامران آپ کے بنگلے میں زہریلا جوس پینے سے مارا گیا۔ باقی تین افراد ریکس، عدنان اور ایم سکندر کی لاشیں ہمیں ہارون کی نشاندہی پر شہر کے مضافات میں واقع ایک زیر تعمیر عمارت کے اندر سے ملی ہیں۔ ہارون نے انہیں زہریلا کھانا کھلا کر موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور خود پورے پانچ کروڑ روپے جوہانسبرگ بھیجنے کے لیے ایک حوالے والے کے پاس پہنچا تھا۔ یہ سب کچھ تفتیش کے دوران میں ہارون نے اپنی زبان سے قبول کیا ہے۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ہارون یہ پانچ کروڑ روپے اپنی بیوی شہلا کی آئی ڈی پر جوہانسبرگ بھجوانا چاہتا تھا۔“

”یہ کیسے ممکن ہے نوشاد صاحب۔“ خلیق کی حیرت سہ چند ہو گئی۔ ”کل سہ پہر میں جب ہم دونوں آفس سے نکلے تو شہلا اپنے کیبن میں موجود تھی۔“

”بے شک، وہ اس وقت آپ کے آفس میں موجود تھی۔“ نوشاد نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اب وہ جوہانسبرگ میں بیٹھی ہوئی ہے۔ پلاننگ کے مطابق، ہارون نے اسے جانے والے جہاز پر چڑھا دیا تھا۔ اس کا پاسپورٹ، ویزا اور ٹکٹ سب تیار تھا اور وہ بھی کنفرم ٹکٹ۔ ابوظہبی میں تین گھنٹے گزارنے کے بعد اسے دوسرے جہاز میں بیٹھ کر جوہانسبرگ کے لیے روانہ ہونا تھا۔ میں ہارون کے منصوبے کی داد دیتا ہوں۔ اس نے بڑی پرفیکٹ پلاننگ کر رکھی تھی۔ میں آج رات میں آپ کی طرف چکر لگاؤں گا پھر آپ کو پانچ چوہوں کی کہانی سناؤں گا۔“

”یہ کہانی تو میں نے بچپن میں سنی اور پڑھی تھی۔“ خلیق نے کہا۔ ”جس میں پانچ چوہے شکار پر نکلتے ہیں۔“

”یہ بھی کچھ ایسی ہی کہانی ہے خلیق صاحب۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ”ان پانچ اغوا کنندگان چوہوں میں سے چار زہرخورانی کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ صرف پانچواں چوہا یعنی ہارون ابھی زندہ ہے۔ کہانی کے مطابق، آخری چوہا شادی کر لیتا ہے لیکن ہمارے کیس کا پانچواں چوہا پہلے سے شادی شدہ ہے۔ بس، اس کی بیوی کو جوہانسبرگ سے واپس لانا ہے پھر مزہ آئے گا اس کھیل میں۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ خلیق ایک گہری طویل اور آسودہ سانس خارج کرتے ہوئے بولا پھر زیرلب گنگنانے لگا۔

”پانچ چوہے گھر سے نکلے، کرنے چلے شکار......“



محفوظ طریقہ

تنویر ریاض

وارداتیں ہوتی ہیں اور ہوتی رہیں گی... جرم کرنے والا کتنی ہی ہوشیاری اور چالاکی سے اپنا کام انجام دے لے... مشاہداتی اور تجربہ کار سراغ رساں کی نگاہیں اس سقم کو کھوج لیتی ہیں... کتابوں اور رسائل کے کاروبار سے وابستہ شخص کے قتل کا معمّا...

محفوظ اور پائیدار طریقہ کار اختیار کرنے والے مجرم کا قصہ......

جب بوفورڈ ہنسا کر جوتوں کی کمپنی میں چالیس سال ملازمت کرنے کے بعد ریٹائر ہوا تو اسے انگوٹھیوں، کم قیمت کے زیورات، سستی دکانوں سے ملنے والی آرائشی چیزوں، پرانی کتابوں اور نمائشی اشیا جمع کرنے کا شوق ہو گیا۔ وہ اس علاقے کے ایک اسٹوڈیو اپارٹمنٹ میں گزشتہ چالیس سال سے رہ رہا تھا اور وہاں ایسی دکانیں کافی تعداد میں موجود تھیں جہاں اس کے مطلب کی اشیا آسانی سے مل جاتی تھیں۔ اس کا بیشتر وقت ٹی وی سوپ دیکھنے، پودوں کو پانی



دینے اور اپنے شوق کی چیزوں کو ترتیب دینے میں گزرتا اور جب وہ اکتاہٹ محسوس کرنے لگتا تو مزید چیزوں کی تلاش میں نکل جاتا۔

موسم خواہ کیسا بھی ہو وہ ایک موٹی اونی ٹوپی اور چھتری کے بغیر گھر سے باہر نہ نکلتا۔ وہ اپنا سر گرم رکھنے کے لیے ٹوپی استعمال کرتا اور چھتری لپیٹ کر بغل میں داب لیتا۔ دراصل وہ بہت ہی بور شخص تھا لیکن اسے یہ بات معلوم نہیں تھی۔

اس روز دکانوں کے اردگرد بہت کم لوگ نظر آرہے تھے۔ شاید اس کی وجہ سڑکوں پر جمی ہوئی ایک انچ برف کی تہ یا تیز چلنے والی سرد ہوا ہو۔ ہنساکر نے بھی فیصلہ کرلیا کہ وہ صرف بیکن اسٹریٹ تک جاکر وہاں سے واپس آجائے گا۔

اس نے پرانی کتابوں کی دکان کے دروازے پر لگی ہوئی گھنٹی بجائی لیکن دکان کے مالک نے کوئی جواب نہ دیا جو غالباً کچن میں کچھ کھا رہا ہوگا۔ یہ دکان ایک پرانے مکان میں واقع تھی جس کی دیواروں پر لکڑی کے شیلف لگا کر بک اسٹور میں تبدیل کردیا گیا تھا۔ اس کا اندرونی حصہ انتہائی بے ترتیب تھا۔ فرش کا بڑا حصہ گرد آلود تھا اور اس پر کتابوں کا ڈھیر، کارٹن اور پھٹے ہوئے شاپنگ بیگز پڑے ہوئے تھے۔ یہ بدنظمی گاہکوں کی ایک مخصوص کلاس کو اپیل کرتی تھی اور ہنساکر کا تعلق بھی اسی کلاس سے تھا۔

کتابوں کے رسیا دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی وہاں رکھی ہوئی کتابوں کے عنوان بہ آوازِ بلند پڑھنے اور ان پر بڑبڑاتے ہوئے تنقیدی تبصرہ کرنے سے اپنے آپ کو نہ روک سکا، اگر دکان کا مالک انہیں سن لیتا تو اس کی نظر میں بھی یہ کتابیں بے وقعت ہوجاتیں۔

بالآخر اسے کتابوں کی نئی کھیپ مل گئی۔ ان میں ایک کتاب اس کے ذوق کے مطابق تھی۔ وہ ہمیشہ ایسی نایاب کتابوں کی تلاش میں رہتا تھا۔ اس پر مصنفہ کے دستخط بھی تھے۔ اس نے کتاب کی قیمت دیکھی اور اسے لے کر کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔

اس نے کئی بار کھنکھار کر مالک کو بلانا چاہا لیکن اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تو وہ کتابوں کی الماریوں کے درمیان سے گزرتا ہوا کچن کی طرف بڑھا۔ جیسے ہی وہ کھلے ہوئے دروازے پر آیا، اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ دکان کا مالک فرش پر اوندھا پڑا ہوا تھا۔ اس نے اپنے فطری ردِعمل پر قابو پایا اور ٹیلی فون کی تلاش میں دکان کے سامنے والے حصے کی طرف گیا۔

☆☆☆

پٹرول مین ٹائرون پیٹی فورڈ کتابوں کی دکان بیک ورڈز، پر پہنچا تو اس نے بوفورڈ ہنساکر کو دکان کے بیرونی دروازے کے باہر کھڑے دیکھا۔ کچن میں سرسری طور پر دیکھنے کے بعد اس نے ایمبولینس کے لیے فون کیا اور ہنساکر کا بیان بھی لے لیا۔ اس نے اپنے بیان میں مرنے والے کو دکان کے مالک کیتھ لاپورٹ کے نام سے شناخت کیا۔ اس سے اس کی زیادہ واقفیت نہیں تھی اور نہ ہی وہ اس کی فیملی یا سماجی رابطوں کے بارے میں جانتا تھا۔ البتہ ایک نوجوان عورت جس کا نام وہ نہیں جانتا، کبھی کبھی سہ پہر میں دکان پر کام کرنے آتی تھی۔ پیٹی فورڈ نے ہنساکر کا میڈیکل کارڈ دیکھ کر اسے جانے کی اجازت دے دی پھر اس نے دکان کا دروازہ بند کیا اور اس پر 'بند ہے' کی تختی لگادی۔

کورونر آفس کو اطلاع دینے کے بعد اس نے یہ دیکھنے کے لیے عمارت کی تلاشی لی کہ وہاں لاش کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے۔ پہلی منزل کی تمام کھڑکیاں پوری طرح بند تھیں۔ ایک مقفل دروازہ جو کچن سے عقبی پورچ میں کھلتا تھا کو کہ اس پر برف کی تہ جم چکی تھی لیکن اس پر کسی کے قدموں کے نشان نہیں تھے۔ سیڑھیوں کے اوپر کی جگہ کلاسکس، کھیلوں کی کتابوں، تفریح اور آرٹ کے لیے مخصوص تھی لیکن وہاں بھی گراؤنڈ فلور کی طرح بے ترتیبی نظر آرہی تھی۔ تہ خانے میں پنگ پانگ کی دو میزوں پر سیکڑوں کی تعداد میں میگزین اور رومانی ناول رکھے ہوئے تھے۔ میزوں کے نیچے ٹوٹے ہوئے سیمنٹ بلاک، اوزاروں اور آلات کے پارٹس اور فالتو سامان سے بھرے ہوئے پلاسٹک کے سیاہ تھیلے رکھے ہوئے تھے۔

پوری عمارت میں پیٹی فورڈ کو کوئی ماپ، جھاڑو یا کوڑے دان نظر نہیں آیا۔ وہ حیران تھا کہ خراب روشنی، ناکافی حرارت اور مارکیٹنگ کے اصولوں کو نظرانداز کر کے کوئی دکان کیسے چل سکتی ہے۔

دروازے پر دستک ہوئی اور کورونر کا انویسٹی گیٹر نک اسٹیمی مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کے سامان میں ایک لیپ ٹاپ، فیلڈ کٹ اور ڈیجیٹل کیمرا شامل تھا۔ پیٹی فورڈ اسے اس جگہ لے گیا جہاں لاش پڑی ہوئی تھی۔ اسٹیمی نے ایک بہت موٹے آدمی کو مردہ حالت میں دیکھا جو فرش پر اوندھے منہ لیٹا ہوا تھا۔ کاؤنٹر اور کچن کی میز پر جار، ڈبوں،

کارٹن اور مصالحہ جات کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ گیس کے چولھے پر ایک برتن رکھا ہوا تھا جس میں مختلف اجزا کا آمیزہ ہلکی آنچ پر گرم ہو رہا تھا۔ سنک میں پلیٹیں، پیالیاں اور اسٹیل کے برتن بڑی تعداد میں جمع ہو گئے تھے۔

اسٹیمی نے لاش کی کئی تصویریں لیں اور اپنے سیل فون کے ذریعے انہیں کورونر ڈاکٹر لوڈوک کو بھیج دیا۔ اس نے فوراً اسے فون کیا۔ ''ڈرائیونگ لائسنس کے مطابق اس کی عمر سینتیس سال ہے۔ وہ یہاں سے ایک بلاک کے فاصلے پر کورنیل کے ایک اپارٹمنٹ میں رہتا تھا۔ اس کا جسم ٹھنڈا اور اکڑا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کی موت بارہ سے چوبیس گھنٹوں کے درمیان ہوئی ہے۔ مجھے یہاں کوئی خون، خراش، گولی کا سوراخ یا چاقو کا زخم نظر نہیں آیا۔ نہ ہی ہاتھا پائی، سوئی کا نشان یا منشیات کا سامان دیکھا گیا۔ اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ اس کی موت معدے کی خرابی یا زہر خورانی کی وجہ سے ہوئی۔ کیونکہ میں تم سے ایک انتہائی غلیظ جگہ سے بات کر رہا ہوں۔''

''نک۔'' لوڈوک نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر سے کھیلنا بند کرو اور ایک منٹ کے لیے میری بات سنو۔ ہوسکتا ہے کہ تم کوئی ایسا کیس دیکھ رہے ہو جو گردن توڑ بخار یا باہر سے آنے والی کسی وبا کی ابتدائی شکل ہو۔ اس لیے دستانے، گاؤن، ماسک اور شوکور استعمال کرو۔''

''اس کے علاوہ اگر تم نے وہاں گوشت یا ڈیری کی مصنوعات دیکھی ہیں تو ان کے بھی نمونے حاصل کرلو اگر تمہیں زہر خورانی کا شبہ ہے۔ میں اس کی تصویر دیکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ اس کا وزن ایک سو پچاس کلو کے لگ بھگ ہے۔ اگر ہمارے عملے کے لوگ اسے نہیں اٹھا سکتے تو سٹی ایمبولینس کے لیے فون کرو گو کہ وہ چار گنا مہنگی ہے لیکن کم از کم ... ہم اپنا کام صحیح طریقے سے انجام دے سکیں گے۔ جیسے ہی لاش مردہ خانے پہنچے تو مجھے بتانا تاکہ میں ویلنٹائن کو بلاؤں۔''

پٹرول مین کو کسی دوسری جگہ جانا پڑ گیا۔ اسٹیمی حفاظتی لباس پہن کر لاش کا بغور جائزہ لے رہا تھا کہ اچانک ہی عقبی دروازہ کھلا اور ایک لڑکی سیاہ لمبی جیکٹ اور اسی رنگ کی چست پتلون پہنے ہوئے کچن میں داخل ہوئی۔ جب اس کی سانس قابو میں آئی تو اسٹیمی نے اس سے شناخت پوچھی۔ اس نے اپنا نام سارہ فرینکلن بتایا اور یہ کہ وہ اس دکان کی اکلوتی ملازمہ ہے۔ وہ ہفتے میں چھ دن دوپہر ڈھائی بجے سے اسٹور بند ہونے تک یہاں کام کرتی ہے۔ اسٹیمی کے اندازے کے مطابق بیس اور پچیس کے درمیان ہوگی۔

''اس کی موت کیسے واقع ہوئی؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ معلوم ہونا ابھی باقی ہے۔''

اسٹیمی لاش کے پاس سے ہٹ گیا اور اس نے اپنا ماسک اتار دیا۔ ''تم نے آخری بار اسے کب زندہ دیکھا؟''

''کل شام تقریباً چھ بجے۔ اس نے برف باری کی پیش گوئی ہونے کی وجہ سے مجھے جلدی گھر بھیج دیا تھا۔''

''کیا اس وقت وہ بالکل ٹھیک تھا؟''

''ہاں۔''

''کیا اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟''

''نہیں، وہ اس اسٹول پر بیٹھا ہوا برتن میں کچھ پکا رہا تھا۔'' اس نے اپنی جیکٹ کی زپ کھولی اور اسے کرسی کی پشت پر لٹکا دیا۔ ''مجھے پیاس لگ رہی ہے دیکھتی ہوں شاید کچھ مل جائے۔'' اس نے جواب کا انتظار کیے بغیر فریج کھولا اور سوڈا کا ایک کین نکال لیا۔

''کیا تم عام طور پر یہیں کھانا کھاتی ہو؟'' اسٹیمی نے پوچھا۔

''میں کبھی یہاں نہیں کھاؤں گی چاہے بھوک سے میرا دم ہی نہ نکل جائے۔''

''تم یہاں کتنے عرصے سے کام کر رہی ہو؟''

''کئی برس ہو گئے۔''

''تمہارے علاوہ اس اسٹور کی چابی کس کے پاس ہوتی ہے؟''

''صرف لاپورٹ کے پاس۔''

''تم اسے کتنا جانتی تھیں؟''

''کچھ زیادہ نہیں۔''

''کیا وہ گزشتہ چند ماہ کے دوران ملک سے باہر بھی گیا؟''

''میں نہیں سمجھتی کہ وہ .... کبھی اس شہر سے بھی باہر گیا ہو۔ میرا مطلب ہے کہ اس کے پاس تو اپنی کار بھی نہیں تھی۔''

''کیا وہ کسی ڈاکٹر کے زیر علاج تھا؟''

سارہ نے جواب میں کندھے اچکا دیے۔ ''کیا وہ منشیات کا عادی تھا؟'' ایک بار پھر اس نے کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔

''تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ اب اس اسٹور کا مالک کون ہوگا؟''

''میں صرف یہ جانتی ہوں کہ اس نے یہ عمارت شولز انٹرپرائز، سے لیز پر لی تھی لیکن......''
کوئی دروازے پر زور زور سے دستک دے رہا تھا۔ اسٹیمی نے سارہ کو لاش سے دور رہنے کی ہدایت کی اور دروازہ کھولنے چلا گیا۔ اس عورت نے بھی سارہ جیسا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے علاوہ ان دونوں میں کوئی مشابہت نہیں تھی۔ عورت موٹی اور پستہ قد تھی۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ وہ تیزی سے اندر آگئی۔
''مجھے افسوس ہے میڈم۔'' اسٹیمی نے اس عورت سے کہا۔ ''اسٹور بند ہے۔ یہاں ایک موت ہوگئی ہے۔''
''اوہ، کون مرگیا؟''
''اس دکان کا مالک، کیتھ لاپورٹ۔''
''اسے کیا ہوا تھا؟''
''ابھی اس کی تحقیقات ہو رہی ہے۔ اس وقت تک اسٹور......''
''میں پیر کے روز اپنا کچھ سامان یہاں چھوڑ گئی تھی۔ کیا میں وہ لے سکتی ہوں؟''
''کیسا سامان؟''
''ظاہر ہے کہ کتابیں ہی ہوں گی۔ یہ کوئی جیولری اسٹور تو ہے نہیں۔ کیا میں اندر آسکتی ہوں؟''
اسٹیمی ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور اس عورت کو اندر آنے کے لیے راستہ دے دیا، ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کر دی کہ لاپورٹ کی موت کی تحقیقات مکمل ہونے تک اس دکان پر کورونر آفس کا کنٹرول رہے گا۔
''اوہ یقیناً اور اس کے بعد مجھے اس دکان کے وارثوں سے اپنی کتابوں کا بیگ واپس لینے کے لیے ریاست سے رجوع کرنا پڑے گا۔''
''کیا تم جانتی ہو کہ اس دکان کے وارث کون ہیں؟''
''مجھے نہیں معلوم۔ صرف اتنا جانتی ہوں کہ اس نے وصیت میں اپنا سب کچھ کسی سماجی تنظیم کے لیے چھوڑا تھا۔ کیا تمہیں اپنا کارڈ دے سکتی ہوں؟''
ہیلینا پروگیشی! مرڈر گیلور کے کاروباری نام سے انٹرنیٹ پر جاسوسی اور پُراسرار ناول بیچتی تھی۔ اس نے لاپورٹ کو تین روز پہلے دیکھا جب اس نے چھ کتابیں خریدیں اور بعد میں لے جانے کا کہہ کر چلی گئی۔
جب اسٹیمی کچن میں واپس آیا تو سارہ کی جیکٹ اور پرس نظر نہیں آیا اور وہ خود بھی غائب ہوگئی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ اس کے پاس ابھی تک دکان کی چابی تھی۔

رات گئے کیتھ لاپورٹ کی لاش کا پوسٹ مارٹم ہوا۔ اس کا وزن ضرورت سے زیادہ تھا اور اسے کافی عرصہ پہلے دل کا عارضہ ہوا تھا لیکن اس کی موت دل کا دورہ پڑنے، فالج یا شریان میں خون جمنے سے نہیں ہوئی تھی۔ فارنسک پیتھالوجسٹ ڈاکٹر ویلنٹائن کو شدید سوزش معدہ اور آنتوں کے جڑ جانے کے شواہد ملے جس کا مطلب تھا کہ پیٹ کے اندرونی اعضا نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ اس نے کلچرل ٹیسٹ اور کیمیائی تجزیہ کے لیے جسم کے سیال مادوں بشمول صفرا اور ریڑھ کی ہڈی کے پانی کے نمونے بھی لے لیے۔
گوکہ ٹاکسی کولوجی اسکریننگ سے معلوم ہوگیا تھا کہ اس کے جسم میں منشیات نہیں تھی لیکن ویلنٹائن کو کیمیائی زہر کے اثرات کا شبہ تھا۔ اگلی صبح پوسٹ مارٹم کے نمونوں اور میک ورڈز کے کچن سے حاصل کردہ نصف درجن خوراک کے نمونے فارنسک لیبارٹری میں پہنچا دیے گئے۔ اس کے علاوہ اسٹیمی نے سراغ رساں سارجنٹ فرنز ڈولنگر سے بھی فون پر رابطہ کیا۔
''ڈاکٹر ویلنٹائن کے خیال میں یہ قدرتی موت نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اور کورونر تم لوگوں کو شامل کرنے کے لیے لیبارٹری رپورٹس کا انتظار نہیں کرسکتا جو تین ہفتے بعد ملیں گی۔ کیا تم آج کسی وقت مجھے اس بُک اسٹور پر مل سکتے ہو تاکہ سرسری نظر سے دیکھ لو کہ مجھ سے کچھ رہ تو نہیں گیا؟''
اسٹیمی خود بھی ایک تجربہ کار اور بہت قابل سراغ رساں تھا لیکن کورونر آفس میں کام کرنے کی وجہ سے اسے جرائم کے کیس کی تحقیقات کرنے کا بہت کم موقع ملتا تھا۔
''ٹھیک ہے۔'' ڈولنگر نے کہا۔ ''لیکن اگر یہ ممکنہ طور پر قتل کا کیس ہے تو بہتر ہوگا کہ ہم کسی ثبوتوں کے ماہر کو بھی بلا لیں۔''
''مجھے ڈر تھا کہ تم یہی کہو گے۔ کیا آفیسر کیسٹرل کو بلایا جاسکتا ہے جو ان دنوں چھٹیوں پر ہے؟''
''معاف کرنا، کیا تمہیں کسی پر شک ہے؟''
''ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے تو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں ہوا کہ لاپورٹ کا وارث کون ہے۔ میں نے کل دو گھنٹے اس کے اپارٹمنٹ کی تلاشی لی۔ اس کا کوئی پولیس ریکارڈ نہیں ہے لیکن اس کی دکان کو دیکھ کر لگتا ہے کہ اس کی آڑ میں منشیات کی سپلائی ہوتی ہے۔''
سہ پہر سے پہلے ہی ڈولنگر اور لیفٹیننٹ کیسٹرل، اسٹیمی کے ساتھ کتابوں کی دکان پر پہنچ گئے۔ توقع کے مطابق

کیسٹرل نے دکان کے ناقص حفاظتی انتظامات کی شکایت کی اور حقیقت بھی یہی تھی کہ لاش کے ہٹائے جانے سے پہلے وہاں دو عورتیں آئی تھیں۔

کیسٹرل نے سب سے پہلے اس جگہ پر توجہ دی جہاں سے لاش ملی تھی اور ڈولنگر، اسٹیمی کے ساتھ پہلی منزل کے کمرے دیکھنے چلا گیا۔ ان میں سے ایک کمرے کی دیوار کے ایک حصے میں دروازہ کھلنے کی وجہ سے شیلف نہیں لگائے گئے تھے لیکن اس جگہ کو خالی نہیں چھوڑا گیا اور وہاں ایک فریم شدہ غلے کے کھیت کی تصویر لٹکا دی گئی تھی۔ ڈولنگر نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا تو اس کے اوپر تھوڑا سا پلاستر اکھڑا ہوا تھا اور فوراً ہی وہاں ایک لکڑی کا تختہ نظر آ گیا۔

اس تصویر کو اتارنے کے بعد انہیں اس کے پیچھے دس مربع انچ کا ایک بورڈ دکھائی دیا جس کے اوپر ٹیپ لگا ہوا تھا اور اس کے پیچھے پانچ عدد گتے کے کارٹن رکھے ہوئے تھے جن پر مادام شو سلمنگ ٹی، کا لیبل لگا ہوا تھا جبکہ بقیہ عبارت چینی زبان میں تھی۔ ہر کارٹن میں دس پیکٹ تھے جن میں سے چائے کے بجائے ویڈ کی خوشبو آ رہی تھی۔

''یہ ہیروئن یا اس کی کوئی چھپی ہوئی شکل نہیں ہے۔'' ڈولنگر نے تبصرہ کیا۔ ''لیکن پیکٹ پر انگریزی میں عبارت نہ ہونے کی وجہ سے میرا اندازہ ہے کہ ہمارے ملک میں اس کی فروخت غیر قانونی ہے۔''

''اگر وہ یہ چائے پیتا رہا ہے تو اس کے لیے اچھا نہیں تھا۔'' اسٹیمی نے کہا۔

''گزشتہ رات تین مرد اور ایک لڑکی اس کی لاش کو یہاں سے گھسیٹ کر لے گئے۔''

انہوں نے ان کارٹن کو پلاسٹک کے دو تھیلوں میں ڈال کر سیل کر دیا اور اسٹیمی نے ان پر تاریخ لکھ کر اپنے دستخط کر دیے گو کہ وہ اس طرح کی چیزوں کے ملنے کے بارے میں پوری طرح چوکس تھے لیکن محتاط طریقے سے تلاشی لینے کے باوجود انہیں کچھ نہیں ملا۔

کیسٹرل کچن میں کھڑا، انہیں دو چیزیں دکھانے کے لیے انتظار کر رہا تھا۔ ان میں سے ایک اس کے لیپ ٹاپ اسکرین پر کچن رینج کی تصویر تھی اور دوسرا کسی چیز کا ٹکڑا جو رینج کی چمنی کے اندر کی طرف چپکا ہوا تھا۔

''پھر ہمیں کیا ملا؟'' ڈولنگر نے پوچھا۔

کیسٹرل کے ہاتھ میں ایک شفاف تھیلی میں کاغذ کا پھٹا ہوا پیکٹ تھا جس پر لکھی ہوئی عبارت بہ آسانی پڑھی جا سکتی تھی۔ ''صفائی کے لیے'' مجھے یہ کھڑکی کے ساتھ رکھے ہوئے کوڑے دان میں سے ملا۔ کسی نے چمنی کے اوپر لگی ہوئی اسٹین لیس اسٹیل کی پٹی کو کھرچ کر صاف کیا اور اس پیکٹ کو کوڑے میں پھینک دیا لیکن کسی وجہ سے انہوں نے اس محلول کو نکال لیا۔ کم از کم میں اسے تلاش نہیں کر سکا۔''

''ٹوائلٹ میں بہا دیا ہوگا۔'' ڈولنگر نے کہا۔

''یہ ہو سکتا ہے۔'' کیسٹرل نے تسلیم کیا۔ ''لیکن انہوں نے اس محلول کو پیکٹ سمیت ہی کوڑے میں کیوں نہیں پھینکا؟''

''ایک اور سوال کہ صرف دھات کی پٹی ہی کیوں صاف کی اور چمنی کے باقی حصے کو چھوڑ دیا جس پر گریس اور مٹی کی تہ جمی ہوئی ہے؟''

''میں اس کا جواب دیتا ہوں۔'' اسٹیمی نے کہا۔ ''یہ برتن کس نے دھویا؟ یہ اسی پوزیشن میں ہے جو تصویر میں دکھائی گئی ہے۔ لیکن گزشتہ روز یہ ایک تہائی بھرا ہوا تھا اور اب بالکل صاف نظر آ رہا ہے۔''

''تم نے کل کس وقت یہ تصویر کھینچی تھی؟'' ڈولنگر نے پوچھا۔

''یہاں سے جاتے وقت جب مردہ خانے کے عملے نے لاش کو ہٹا دیا۔ میں نے لاپورٹ کی چابی اپنی جیب میں رکھ لی اور دوسری چابی اس کی ملازمہ سارہ فرینکلن کے پاس ہے۔''

ایک گھنٹے بعد یہ ٹیم منتشر ہو گئی۔ کیسٹرل اپنے نمونے اور چائے لے کر لیبارٹری چلا گیا اور دونوں سراغ رساں سارہ فرینکلن کے اپارٹمنٹ کی جانب روانہ ہو گئے۔ اس نے کوئی اعتراض کیے بغیر اسٹور کے عقبی دروازے کی چابی اسٹیمی کو دے دی اور یہ بھی بتا دیا کہ اسٹیمی سے بات کرنے کے بعد وہ اسٹور نہیں گئی تھی۔ جب اس سے چائے کے بارے میں پوچھا گیا تو وہ انجان بن گئی۔

''ہم اس امکان پر غور کر رہے ہیں کہ لاپورٹ کو قتل کیا گیا ہے۔'' ڈولنگر نے اس سے کہا۔ ''مجھے بتاؤ کہ کیا حالیہ دنوں میں اس کا کسی کے ساتھ کوئی تنازع ہوا تھا؟''

''بالکل! سڑک کے پار کتابوں کی دکان کے مالک سے اس کا جھگڑا چل رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی شکل سے نفرت کرتے تھے۔ وہ اپنا آدھا وقت دکان کے سامنے والی کھڑکی سے ایک دوسرے کو دیکھ کر منہ بناتے ہوئے گزارتے تھے۔''

''کیا یہ محض کاروباری رقابت تھی یا اس سے بھی بڑھ کر کوئی گہری بات تھی؟''

''میں تو یہی کہوں گی کہ کوئی گہری بات تھی۔ میرا خیال ہے کہ کیتھ پہلے بھی کوائن کے لیے کام کیا کرتا تھا۔''

''تم نے کیا نام بتایا؟''

''اس کتب فروش کا نام میتھیو کوائن ہے۔ اس کا سائن بورڈ عمارت کے سامنے والے حصے میں پوری لمبائی پر لگا ہوا ہے۔''

''کیا تمہاری موجودگی میں کوائن کبھی لاپورٹ کے اسٹور پر آیا؟''

''دو مرتبہ، وہ ایک دبلا پتلا طویل قامت شخص ہے اور چہرے پر کھچڑی داڑھی ہے۔''

اسٹیمی کو باربر شاپ جانا تھا لیکن اس نے ڈولنگر کے ساتھ بیکن اسٹریٹ جانے کے لیے اپنا پروگرام ملتوی کر دیا۔ میتھیو کوائن کی دکان ایک صاف ستھری لائبریری کی طرح تھی اور وہاں گرد کا نام بھی نہ تھا۔ سارہ نے اس کا جو حلیہ بتایا وہ ہوبہو ویسا ہی تھا۔ البتہ اس نے کوائن کے ڈائمنڈ ائرنگ کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔

اس نے لاپورٹ کے ساتھ اپنی دیرینہ عداوت کو نہیں چھپایا۔ ''پانچ سال پہلے بیک ورڈز میرا اسٹور اور وہ میرا منیجر تھا۔ جب مجھے اس عمارت میں جگہ مل گئی تو اس نے وہ دکان مجھ سے لے لی اور اسے خود چلانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اسے دکان کا نام استعمال کرنے کی اجازت دے دی اور کتابوں کا سارا اسٹاک اس کے ہاتھ فروخت کر دیا، اس نے ان کی قیمت ادا کرنے کے لیے بینک سے قرض لیا اور پھر ہر ایک سے کہا کہ میں نے اسے لوٹ لیا ہے۔ مرتے دم تک وہ یہی رونا روتا رہا...... اس کی موت کیسے واقع ہوئی؟''

''ہم لیبارٹری رپورٹس کا انتظار کر رہے ہیں۔'' ڈولنگر نے کہا۔ ''یہ بتاؤ کہ اس کے ساتھ تمہاری عداوت کتنی گہری تھی؟''

''ہم دونوں کے کام کرنے کا انداز بالکل مختلف تھا۔ اس کی ناقص کارکردگی اور نااہلی کی وجہ سے مجھے اس کو فارغ کر دینا چاہیے تھا۔ میں نے تم دونوں کو وہاں جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ اسٹور میدانِ جنگ کا منظر پیش کر رہا ہے۔ بہرحال میں نے اسے قتل نہیں کیا۔''

''کیا کاروباری لحاظ سے یہ مناسب ہے کہ ایک ہی سڑک پر دو بک اسٹور آمنے سامنے ہوں؟'' اسٹیمی نے پوچھا۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ عام طور پر گاہک باری باری دونوں دکانوں پر جاتے ہیں اور جہاں سے انہیں اپنے مطلب کی کتاب مل جائے اسے خرید لیتے ہیں۔ آج کل اصل مقابلہ انٹرنیٹ سے ہے۔''

اسٹیمی کو یاد آ گیا کہ ہیلینا پروگاشی بھی ویب سائٹ پر جاسوسی ناول فروخت کرتی ہے۔ اس نے کہا۔ ''آن لائن بک اسٹورز؟''

''میں نے بھی اپنی تقریباً دو تہائی کتابیں آن لائن کر دی ہیں لیکن مقابلہ بہت سخت ہے۔ اس وقت تقریباً پچاس سے زائد ویب سائٹ ایسی ہیں جہاں سے آپ گزشتہ سال کی بہترین کتابیں صرف ایک ریڈ سینٹ میں خرید سکتے ہیں۔''

''حیرت ہے کہ لوگ ایک پینی میں کتابیں بیچ رہے ہیں؟''

''وہ بڑی تعداد میں کتابیں خریدتے ہیں اور معمولی منافع کے ساتھ بیچ دیتے ہیں، اس میں محنت زیادہ اور آمدنی کم ہے لیکن کم از کم یہ سڑکوں پر پرس چھیننے یا گیس اسٹیشن لوٹنے سے بہتر ہے۔''

''تمہارے پاس کہاں سے کتابیں آتی ہیں؟''

''آدھی سے زیادہ کتابیں میں اپنی دکان پر ان لوگوں سے خرید لیتا ہوں جو انہیں پڑھ چکے ہوتے ہیں یا ان کے گھر میں رکھنے کی جگہ نہیں ہوتی۔ باقی کتابیں، پبلشرز اور لائبریریوں کی کلیئرنس سیل سے مل جاتی ہیں۔ میں وقتاً فوقتاً پرانی کتابوں کے بازار بھی جاتا رہتا ہوں۔ جب لاپورٹ کی کتابوں کا نیلام ہوگا تو ممکن ہے کہ میں اپنی بہت سی کتابیں وہاں سے لے لوں۔''

کوائن کو معلوم نہیں تھا کہ لاپورٹ کی کتابوں کا قانونی مالک اب کون ہوگا۔ اگر اس کی فیملی میں کوئی فرد موجود تھا تو کوائن نے اس کے بارے میں کبھی نہیں سنا۔

ڈولنگر نے اسٹیمی کو کورونرز آفس چھوڑا جب وہ اپنے دفتر پہنچا تو اسے کیسٹرل کا پیغام ملا۔ اس نے بیک ورڈز سے ملنے والے کارٹن پر درج چینی عبارت کا ترجمہ کروالیا تھا۔ ان پیکٹوں میں اولونگ چائے کے علاوہ جنسنگ، جٹاماسی، تمباکو کے پتے، چاند بیج، برایونی، جنتیانا اور چھبیلی شامل تھی۔ یہ چائے وزن کم کرنے کے علاوہ بخار، ریاح، استقا اور کمزوری میں مفید تھی۔

اس کے اجزاء میں سے کوئی ایک بھی ڈرگ انفورسمنٹ ایجنسی کی ممنوعہ فہرست میں نہیں تھا لیکن ان میں سے کچھ کی زیادہ خوراک خطرناک ہو سکتی تھی۔ اس چائے کا

کیمیائی تجزیہ مقامی لیبارٹری میں ہوگا۔

کیسٹرل اور اسٹیمی نے کچن میں جو کچھ دریافت کیا۔ اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ لاپورٹ کی موت طبعی نہیں بلکہ اس میں کوئی انسانی ہاتھ ملوث ہے اس کے علاوہ اس سے یہ بھی معلوم ہو رہا تھا کہ کسی فرد کی اس عمارت میں لامحدود رسائی ہے۔ کیونکہ بیرونی اور عقبی دروازے کی چابیاں مختلف تھیں۔

سارہ نے بتایا تھا کہ لاپورٹ نے یہ عمارت شولر انٹرپرائز، سے لیز پر لی تھی لیکن اس کمپنی نے رابطہ کرنے پر بتایا کہ وہ صرف اصلی مالک میتھیو کوائن کے لیزنگ ایجنٹ ہیں جس کے پاس غالباً دونوں دروازوں کی ڈپلیکیٹ چابیاں ہو سکتی ہیں کیونکہ کیس ختم ہونے تک کورونر کے پاس اس پراپرٹی کا کنٹرول تھا۔ اس لیے اسٹیمی کو سرکاری خرچ پر دو نئے تالے خریدنا پڑے۔

لاپورٹ کے کلچرل میں بہتر گھنٹے بعد بھی کسی بیکٹیریا کی افزائش نہیں ہوئی۔ اس کی لاش ابھی تک کورونر کے سردخانے میں تھی جبکہ اسٹیمی اس کے وارثوں کو تلاش کر رہا تھا۔

اس دوران ڈونلگر نے لاپورٹ کے نامکمل اور بے ترتیب حسابات کا معائنہ کرنے اور اسٹور کے کوڑے دان میں جمع کچرے کو چھاننے میں کئی گھنٹے لگا دیے۔ وقفے وقفے سے مایوس گاہک بیرونی دروازے کے شیشے سے اندر جھانکتے۔ ڈونلگر نے انہیں اندر آنے کی دعوت دی اور ان سے پوچھا کہ وہ لاپورٹ کے بارے میں کیا جانتے ہیں۔

لاپورٹ کے کمپیوٹر سے اسے شولر کو دیے جانے والے کرائے کی رسیدیں مل گئیں لیکن مادام شو، کی چائے کا کوئی ریکارڈ نظر نہیں آیا اور نہ ہی قتل کی دھمکی یا قاتل کی دشمنی کا کوئی ثبوت ملا۔ لاپورٹ کے ٹیلی فون ریکارڈ سے بھی کوئی کام کی بات معلوم نہ ہو سکی۔ اس کی ویب سائٹ میں سیکڑوں کتابوں کے نام حروف تہجی کے اعتبار سے درج تھے اور ان کے ساتھ مصنف کا نام بھی دیا گیا تھا۔

اس کے برعکس ہیلینا پروگاشی کی ویب سائٹ بڑی پرکشش تھی۔ اس نے اپنے اسٹاک کو مختلف کیٹیگریز میں بانٹ رکھا تھا اور کسی کتاب کی قیمت بھی آٹھ ڈالر سے کم نہ تھی۔ جب ڈونلگر نے اس کی سائٹ تک رسائی حاصل کی۔ اسی روز اسٹیمی نے ہیلینا کی درخواست ڈونلگر تک پہنچائی کہ اس کی جو کتابیں بیک ورڈز، میں رہ گئی تھیں وہ اسے دے دی جائیں۔ اسٹیمی نے اس کی سفارش کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ کم از کم اس کے پاس اسٹور کی چابی نہیں ہے۔

”یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تالے بدلنے کے بعد اس کی چابی کارآمد نہ رہی ہو۔“ ڈونلگر نے کہا۔ ”میں کل صبح وہاں جاؤں گا تو اس کی کتابیں بھی تلاش کرلوں گا۔“ اسٹیمی نے ہیلینا کا پتا اور فون نمبر دے دیا۔

ڈونلگر کو یہ کتابیں ایک عقبی کمرے میں مل گئیں۔ انہیں ایک شاپنگ بیگ میں پیک کر کے رکھ دیا گیا تھا اور اس پر سیاہ مارکر سے پروگوشی کا نام بھی لکھا ہوا تھا۔ ڈونلگر نے پیکٹ کھول کر کتابوں کا معائنہ کیا۔ ان جاسوسی ناولوں کی تعداد چھ تھی اور ان میں سے ہر ایک کی قیمت تین یا چار ڈالر تھی۔

ہیلینا نے جو پتا بتایا۔ وہ وہاں سے ایک بلاک کے فاصلے پر تھا۔ اس لیے ڈونلگر نے اسے فون کرنے کے بجائے خود ہی کتابیں پہنچانے کا فیصلہ کیا۔ وہ دراصل ایک ہوٹل ہیکن تھا۔ جہاں سارا ناشتا ملتا تھا۔ ڈونلگر کافی پینے کے ارادے سے اس ہوٹل میں داخل ہوا اور کاؤنٹر کے نزدیک ہی ایک میز پر بیٹھ گیا۔

”کافی؟“

اس نے سارہ فرینکلن کو پہچان لیا۔ ”تمہیں دوسری ملازمت مل گئی؟“

”میں یہاں صبح کے اوقات میں دو سال سے کام کر رہی ہوں۔ تمہیں چینی اور کریم بھی چاہیے؟“

”دونوں، کیا یہ ریسٹوران ہیلینا پروگاشی کا ہے؟“

”ہاں، وہ اوپر ہے۔ تم اس سے ملنا چاہتے ہو؟“

”میرے پاس اس کا کچھ سامان ہے۔“

”میں اسے بلاتی ہوں یا تم خود اوپر جاؤ گے؟“

”پہلے ناشتا کرلوں۔“ ڈونلگر نے کہا۔

اس کے بعد وہ سیڑھیاں چڑھ کر اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس نے اپنا تعارف کروایا اور ہیلینا کو اس کی کتابیں دے دیں۔

”تمہاری بڑی مہربانی آفیسر۔“ اس نے کتابیں اپنے کمپیوٹر کے برابر میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا پولیس کو معلوم ہوا کہ کیتھ کی موت کیسے ہوئی؟“

”ہم لیبارٹری رپورٹس کا انتظار کر رہے ہیں۔“

”اخبار کا کہنا ہے کہ شاید اسے قتل کیا گیا ہے؟“

”اس کا امکان ہے۔ تم اسے کس حد تک جانتی

تھیں؟‘‘

’’وہ اس اسٹور سے پوری طرح فائدہ نہ اٹھا سکا۔ وہاں کی بے ترتیبی کی وجہ سے گاہکوں کو اپنی مطلوبہ کتابیں تلاش کرنے میں دشواری ہوتی تھی۔ اس کے برعکس میتھیو کوائن کا اسٹور صاف ستھرا اور وہاں گاہک کو اپنی پسند کی کتاب تک آسانی سے رسائی ہو سکتی ہے۔ اس کے سامنے کے چار شیلف معیاری کتابوں سے بھرے ہوئے ہیں جنہیں وہ برسوں سے آن لائن فروخت کر رہا ہے۔‘‘

’’تو تم اور وہ پارٹنر ہو؟‘‘

’’صرف اس حد تک کہ میں نے اسے اپنی ویب سائٹ کرائے پر دے رکھی ہے۔‘‘

’’اور لاپورٹ اس تصویر میں کہاں فٹ ہوتا ہے؟‘‘

’’کہیں بھی نہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ میٹ کے پاس ابھی تک بیک ورڈز کی چابی ہے۔ وہ کبھی بھی رات کے وقت وہاں جا کر جاسوسی کر سکتا ہے۔‘‘

’’تاکہ کچھ کتابیں چوری کرے؟‘‘

’’نہیں، وہ ایسا آدمی نہیں ہے۔ شاید تمہیں یہ بات معلوم نہ ہو لیکن وہ اس عمارت کا مالک ہے۔‘‘

’’تم نے بتایا کہ اس کے پاس ایک چابی تھی۔‘‘

’’ہاں، وہ اب بھی اس کے پاس ہے لیکن اب وہ بیکار ہو گئی ہے کیونکہ تم نے وہاں کے تالے بدل دیے ہیں۔‘‘

’’تو کوائن رات میں وہاں جا کر لاپورٹ کا اسٹاک دیکھا کرتا تھا۔ اسے کس چیز کی تلاش تھی؟‘‘

’’وہ، صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ لاپورٹ کے پاس کون سی نئی کتابیں آئی ہیں، اس نے ان کی کیا قیمت مقرر کی ہے اور کون سی کتابیں فروخت نہیں ہو رہی ہیں۔‘‘

’’اس سے تو یہ لگتا ہے کہ وہ ناجائز فائدہ اٹھا رہا تھا۔‘‘

’’بالکل ایسا ہی ہے اور اسی وجہ سے میں نے بعض اوقات کیتھ کو اجازت دی کہ وہ بھی میری ویب سائٹ دیکھ لے کہ میٹ نے وہاں کون سی کتابیں اسٹور کی ہیں اس طرح میں ڈبل ایجنٹ ہو گئی۔‘‘

لاپورٹ کی موت کے نو دن بعد ڈولنگر کو فارنسک لیبارٹری کی کیمسٹ فلورا مائیک کا فون موصول ہوا۔ ’’میرے پاس تمہارے کچھ سوالوں کا جواب ہے اور وہ یہ کہ چینی چائے نے ہماری پوری تحقیق کا رخ بدل دیا۔‘‘

’’وہ کیسے؟‘‘

’’تم جانتے ہو کہ جو پروڈکٹس ایجنسی سے چوری چھپے بیچی جا رہی ہیں جن میں ملاوٹ ہوتی ہے۔ ان میں گھاس پھوس اور زہریلے پودے شامل ہیں۔ ہم نے کرومیٹوگرافی کے ذریعے مرنے والے کے خون اور معدے کے اجزاء میں ایکونائٹ دریافت کی ہے جو کہ زہریلا مادہ ہے۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔ یہ بتاؤ کہ لاپورٹ نے اس چائے کی کتنی پیالیاں پی ہوں گی جو اس کی موت کا سبب بنیں؟‘‘

’’یہ ایک دلچسپ سوال ہے۔ تم نے جو نمونہ بھیجا ہے۔ وہ بھیڑیوں کے ایک غول کو مارنے کے لیے کافی ہے۔‘‘

’’اگر کسی کو قتل کرنا ہو تو یہ چائے کہاں سے ملے گی؟‘‘

’’یہ پودا امریکا میں نہیں ہوتا لیکن اس کے بیج کسی بھی گارڈن اسٹور سے مل جائیں گے۔ اس سے بھی زیادہ آسان بات یہ ہے کہ کسی کیمیکل سپلائی ہاؤس کو خالص انکلائیڈ کا آرڈر دے دیا جائے۔‘‘

’’کیا نسخہ کے بغیر یہ ممکن ہے؟‘‘

’’ہاں، اب یہ فارماکوپیا میں نہیں ہے لیکن لیبارٹری ریسرچ میں اسے استعمال کیا جاتا ہے۔‘‘

اس گفتگو کا لب لباب یہ تھا کہ قاتل نے کوکنگ رینج کی چمنی کی پٹی پر کسی ایسے میٹریل کی تہ لگا دی جس میں ایکونائٹ شامل تھا۔ جب لاپورٹ نے چائے کا پانی گرم کیا تو اس سے نکلنے والی بھاپ، ٹھنڈی ہوئی اور اس کے قطرے دوبارہ برتن میں گرے اور اپنے ساتھ زہر بھی لے کر آئے۔ جس کسی نے بھی یہ کیا وہ لاپورٹ کے کچن اور اس کے چائے بنانے کی عادت سے واقف تھا۔

حالانکہ ڈولنگر اس طرح کے معاملات میں تنہا کام کرنے کو ترجیح دیتا تھا لیکن یہ کیس مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ اس لیے اس نے اب تک کی تحقیقات کی رپورٹ مرتب کرنے کے بعد اسے اپنے باس لیفٹیننٹ اوبرن کو بھیج دیا۔ وہ اس کیس میں ہونے والی پیش رفت سے باخبر تھا کیونکہ ڈولنگر ہر روز صبح میں اسے رپورٹ دیا کرتا۔ وہ تمام مواد کا جائزہ لینے کے بعد آگے کی حکمتِ عملی مرتب کرنے کے لیے ڈولنگر کے ساتھ بیٹھ گیا۔

لاپورٹ کی موت حادثہ یا خودکشی نہیں بلکہ ایکونائٹ کے زہر کی وجہ سے ہوئی۔ سارہ فرینکلن کا کہنا تھا کہ بدھ کی شام چھ بجے وہ بالکل بھلا چنگا تھا۔ اسٹیمی نے اسے اگلے روز دو بجے مردہ پایا۔ اس کا مطلب ہے کہ اس کی موت بدھ کی رات کسی وقت ہوئی اور بک

اسٹور رات بھر کھلا رہا۔

کوکنگ رینج کی چمنی پر زہر رکھنے یا اسے ہٹانے کا کام وہی کر سکتا تھا جو رات میں کاروباری اوقات کے بعد بھی اسٹور میں آسکتا ہو۔ صرف میتھ کوائن اور سارہ فرینکلن کے پاس اسٹور کی چابیاں تھیں۔ ایک اندازہ یہ بھی تھا کہ ہیلینا پروگاشی جو کوائن کی پارٹنر اور سارہ کی مالکن تھی وہ بھی اسٹور میں داخل ہو سکتی تھی۔ ان تینوں کا کوئی مجرمانہ ریکارڈ یا مشکوک روابط نہیں تھے۔

اوبرن اور ڈولنگر نے اپنی تحقیقات کا آغاز بیک ورڈز سے کیا۔ وہ سامنے والے دروازے سے اسٹور میں داخل ہوئے۔ ڈولنگر ہیٹر آن کرنے چلا گیا اور اوبرن سیلز کاؤنٹر پر کھڑا ہو کر دکان کی حالت دیکھنے لگا۔ کئی منٹ گزر گئے جب ڈولنگر واپس نہیں آیا تو اوبرن نے اندر جا کر دیکھا۔ وہ کچن میں اپنے سروس ریوالور پر ہاتھ مار رہا تھا۔

''کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں۔'' ڈولنگر بولا۔ ''ہم نے اس بک اسٹور کا چپّا چپّا دیکھ لیا لیکن قاتل کا کوئی سراغ نہیں ملا۔''

''کیوں نہ ہم ایک مرتبہ لاپورٹ کا اپارٹمنٹ بھی دیکھ لیں۔ ہو سکتا ہے وہاں سے کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔''

''اسٹیمی دو ہفتے پہلے اس جگہ کو چیک کر چکا ہے لیکن وہاں سے اسے کچھ نہیں ملا۔''

''وہ اس کے وارث کا کھوج لگا رہا تھا۔ اس وقت قتل کا شبہ سامنے نہیں آیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں ٹک کو فون کر کے اپارٹمنٹ کی چابی حاصل کرنی چاہیے۔''

ڈولنگر نے وسط شہر کی جانب بڑھنا شروع کیا جبکہ اوبرن نے مناسب سمجھا کہ وہ اسٹیمی کو اپنی آمد کے بارے میں بتا دے۔ ''ٹک، میں اب فرٹز کے ساتھ لاپورٹ کی موت کی تحقیقات کر رہا ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تم ہمیں اس کے اپارٹمنٹ کی چابی دے دو۔''

''میں خود بھی فرٹز کو فون کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ لاپورٹ کا مالک مکان اپنے بقایاجات کی وصولی کے لیے اس کی ذاتی اشیا نیلام کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔''

وہ دونوں اسٹیمی کے دفتر گئے۔ اوبرن نے پوچھا۔ ''لاپورٹ کے وارثوں کا کچھ پتا چلا؟''

''نہیں، اگر وہ مقامی ہوتے تو اب تک سامنے آجاتے۔ ہم نے اسی لیے کل اخبار میں اشتہار بھی دے دیا کہ شاید وہ اس شہر میں اجنبی ہو۔ تمہاری تحقیقات کہاں تک پہنچی؟''

''ابھی کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔'' اوبرن نے جواب دیا۔

''اسٹیمی نے کافی کی دعوت دی لیکن انہوں نے معذرت کر لی اور چابی لے کر روانہ ہو گئے۔

اسٹیمی نے اس سے پہلے لاپورٹ کے اپارٹمنٹ کی جو تلاشی لی۔ وہاں ایسے کوئی آثار نظر نہیں آئے اور نہ ہی ایسا کوئی نشان ملا جس سے ظاہر ہوتا کہ اس کے بعد وہاں کوئی اور بھی آیا تھا۔ ڈولنگر نے لاپورٹ کے حسابات کا دوبارہ جائزہ لیا جن سے پتا چلا کہ وہ معاشی مشکلات کا شکار تھا۔ اس کی جیب تقریباً خالی تھی اور چائے کی ناجائز تجارت سے بھی اسے خاطر خواہ فائدہ نہیں ہو رہا تھا۔

اس کے اپارٹمنٹ کی حالت بتا رہی تھی کہ لاپورٹ تنہائی اور غربت کا شکار تھا۔ وہاں انہیں کوئی تصویر، کارڈز، خطوط یا یادگاری اشیا نظر نہیں آئیں۔ بیک ورڈز، کے کچن کے برعکس یہ اپارٹمنٹ کسی ون اسٹار موٹیل کے کمرے کی طرح آراستہ اور سجا ہوا تھا۔

بہرحال ان کی تلاش رنگ لائی اور انہیں ایک خفیہ جگہ نظر آگئی۔ جسے دیوار کے ساتھ ایک پرانی میز لگا کر چھپایا گیا تھا لیکن فرش پر پڑے ہوئے نشانات سے لگ رہا تھا کہ اس میز کو اکثر و بیشتر ہٹایا اور واپس اپنی جگہ پر رکھا جاتا ہے۔ اس میز کو کھسکانے پر دیوار میں ایک چوڑی اور کم گہری دراز نظر آگئی۔ اس میں اسٹیمی کی دی ہوئی دو سو چالیس ڈالر کی رسید کے علاوہ کاغذات کا ایک بنڈل رکھا ہوا تھا۔ وہ اسے لے کر سٹنگ روم میں آگئے جہاں نسبتاً بہتر روشنی تھی۔

اس بنڈل میں اخبارات کے کئی تراشے بھی تھے جن میں بیک ورڈز، کی حالیہ تاریخ بیان کی گئی تھی۔ پہلی خبر دکان کی چھت کے بارے میں تھی جو چار برس قبل شدید بارش کی وجہ سے گر گئی تھی اور دکان کے مالک کوائن کا کہنا تھا کہ اس میں ہزاروں کتابوں کا نقصان ہوا۔

چند ماہ بعد یہ کاروبار سڑک کے پار ایک نئی جگہ پر منتقل ہو گیا۔ ایک اور خبر نئی انتظامیہ کے تحت بیک ورڈز کو دوبارہ کھولنے کے بارے میں تھی۔ باقی کاغذات فوٹو کاپیوں کے دو سیٹ پر مشتمل تھے۔ ایک سیٹ میں کتابوں کی ایک طویل فہرست تھی۔ اس میں ہر کتاب کے ساتھ مصنف کا نام، کتاب کی حالت اور قیمت درج تھی۔ زیادہ تر

کتابیں غیر ملکی زبانوں بالخصوص فرانسیسی اور جرمن میں تھیں اور ان میں ہر ایک کی قیمت پچاس سے سو ڈالر کے درمیان تھی۔ ان کاغذات کا بغور معائنہ کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ نقصانات کے کلیم کی کاپیاں تھیں جو ایک انشورنس کمپنی میں داخل کیا گیا تھا۔

دوسرا سیٹ ان پرنٹ آؤٹ پر مشتمل تھا جو میتھیو کوائن موجودہ آن لائن کیٹلاگ کو ڈاؤن لوڈ کر کے نکالے گئے تھے۔ ان میں سے اکثر کتابوں پر کراس کا نشان لگا ہوا تھا۔ فوراً ہی معلوم ہوگیا کہ یہ وہی کتابیں ہیں جن کے ضائع ہونے کا کلیم داخل کیا گیا ہے۔

اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ کوائن نے جھوٹا کلیم داخل کیا ہے اور لاپورٹ کے قبضے میں اس ثبوت کی موجودگی یہ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ کوائن کو بلیک میل کر رہا تھا اور یہی اس کے قتل کا محرک بنا۔

''منظر نامہ کچھ یوں ہے۔'' ڈولنگر نے کہا۔ ''کوائن نے لاپورٹ کو ان کتابوں کے نقصان کا کلیم بھرنے کے لیے کہا جو اس کی آن لائن فہرست میں موجود تھیں۔ ممکن ہے کہ لاپورٹ بھی جانتا ہو کہ یہ کتابیں درحقیقت ضائع نہیں ہوئی تھیں اور شاید اسے اس پر شبہ ہو۔ اس لیے اس نے اس کلیم کی ایک کاپی اپنے پاس رکھ لی تاکہ ضرورت پڑنے پر کام آسکے۔''

اوبرن نے کہانی کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اس دوران کوائن نے ان کتابوں کو پروگاشی کی ویب سائٹ پر ٹرانسفر کر دیا جو اس نے کرائے پر لے رکھی تھی۔ شاید اسے بھی پوری کہانی کا علم نہیں تھا ورنہ وہ لاپورٹ کو یہ کتابیں دیکھنے کی اجازت نہ دیتی۔''

ڈولنگر نے انشورنس ایجنسی کو فون کیا اور اس کا رابطہ ہائیس کنخارو سے ہوگیا جو کوائن کے کلیم کو دیکھ رہا تھا۔ پہلے تو کنخارو کو یقین نہیں آیا کہ کوئی شخص اسے اس طرح دھوکا دے سکتا ہے لیکن اس نے کلیم کا ریکارڈ دیکھنے اور کوائن کی ویب سائٹ تک رسائی حاصل کرنے کے بعد... پوری طرح معاملے کی تہ تک پہنچنے پر آمادہ ہوگیا۔

ایک گھنٹے بعد وہ دونوں اس کے دفتر میں بیٹھے صلاح مشورہ کر رہے تھے۔ حکمت عملی پر اتفاق ہو جانے کے بعد اوبرن اور ڈولنگر عدالت کی جانب روانہ ہوئے۔ راستے میں ہی اوبرن نے اپنے لیپ ٹاپ پر حلف نامہ تیار کر لیا حالانکہ اس وقت ایک ہی سخت گیر مجسٹریٹ ڈیوٹی پر تھی جو کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر سرچ وارنٹ جاری کرنے سے انکار کرسکتی تھی۔

اگلے روز صبح دس بجے کنخارو، کوائن کے اسٹور کے باہر فٹ پاتھ پر پہنچ گیا جہاں اوبرن اور ڈولنگر پہلے سے موجود تھے۔ وہ تینوں دکان میں داخل ہوئے۔ کوائن صرف ڈولنگر کو پہچانتا تھا لیکن ان کے اکڑے ہوئے چہرے دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ یہ لوگ اسے کوئی تمغا دینے نہیں آئے ہیں۔ وہ انہیں اپنے دفتر میں لے گیا اور دروازہ بند کر دیا۔

پہلا حملہ کنخارو نے کیا۔ اس نے کوائن کو وہ دستاویزات دکھائیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے ان کتابوں کے نقصان کے عوض انشورنس ایجنسی میں دس ہزار ڈالر کا جھوٹا کلیم داخل کیا جبکہ وہ کتابیں ابھی تک اس کے قبضے میں ہیں اور حال ہی میں اس نے اپنی ویب سائٹ پر انہیں فروخت کے لیے پیش کیا ہے۔

''ہوسکتا ہے کہ غلطی سے ایسا ہوا ہو۔'' کوائن نے کمزور لہجے میں کہا۔

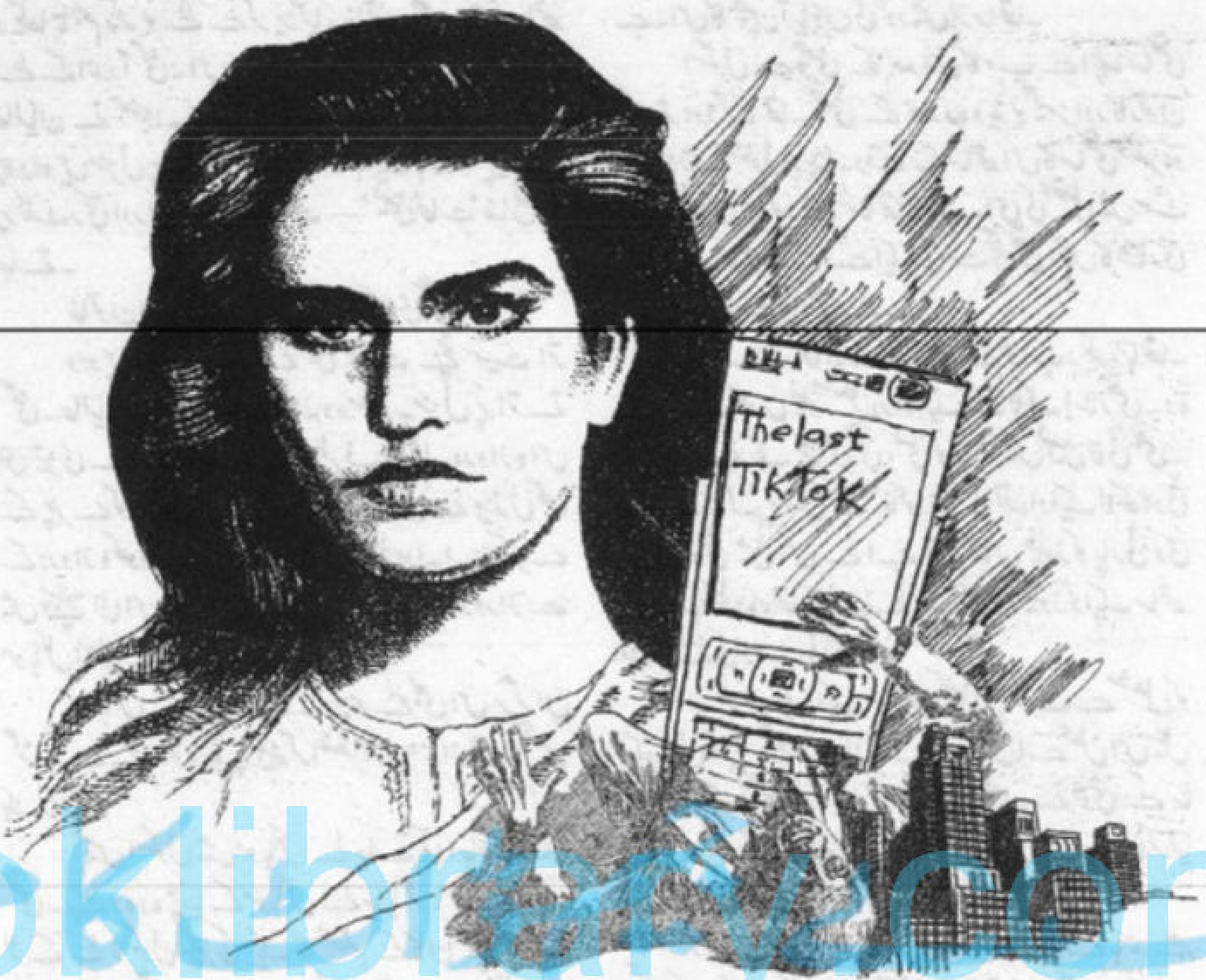
''یہ ہرگز غلطی نہیں ہے۔'' کنخارو نے سختی سے کہا۔ ''تم نے اس نقصان کے عوض کلیم داخل کیا جو تم نے برداشت ہی نہیں کیا۔ یہ صریحاً فراڈ ہے اور کمپنی اس سلسلے میں قانونی چارہ جوئی کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ یہ افسران بھی تم سے کچھ کہنا چاہیں گے۔''

''میں تمہیں فراڈ کے جرم میں گرفتار کر رہا ہوں۔'' ڈولنگر نے کہا۔ ''تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو۔''

''ہم تمہیں گاہکوں کو فارغ اور اسٹور بند کرنے کے لیے چند منٹ دے رہے ہیں۔'' اوبرن نے کہا۔ ''پھر تمہیں ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن جانا ہوگا۔ ہمارے پاس اس اسٹور، تمہارے گھر، کار اور کمپیوٹر کی تلاشی کا وارنٹ ہے۔''

اسی روز سہ پہر میں انشورنس کمپنی کے دو کلرکوں نے کوائن کے کمپیوٹر کی چھان بین شروع کر دی۔ لاپورٹ کے برعکس اس نے ہر چیز کا ریکارڈ محفوظ کیا ہوا تھا۔ اس میں بیلجیم کی ایک دوا ساز کمپنی سے سو گرام ایکونائٹ کی خریداری کی رسید بھی شامل تھی۔ اس واضح ثبوت کے بعد کوائن کے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اسے اعتراف کرنا پڑا کہ اس نے لاپورٹ کو راستے سے ہٹانے کے لیے ایکونائٹ استعمال کی تھی کیونکہ اس کے خیال میں یہ ایک محفوظ طریقہ تھا۔





ٹک ٹاک اسٹار

کبیر عباسی

مشہور ہونا کون نہیں چاہتا... نئی نسل تو شدید تمنائی ہے کہ اس کے پیچھے ہر آن ایک خلقت کا ہجوم ہو... چاہے اس شہرت کا سبب عزت ہو یا رسوائی... مگر وہ تو شیدائی ہے... نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے جذبات سے وابستہ ایک انوکھی کہانی... وہ اپنی زندگی میں شہرت کی رعنائی چاہتا تھا...

پہچان کی خاطر خود کو برباد کرنے والوں کا قصۂ جاں سوز......

عالیان... بلڈنگ میں داخل ہوتے ہی تیزی سے لفٹ کی جانب بڑھا۔ اس کے انداز سے بے چینی ہویدا تھی۔ لفٹ کے پاس ایک خاتون اپنے چار پانچ سالہ بچے کا ہاتھ پکڑے کھڑی تھی۔ وہ عالیان کو دیکھ کے خوش اخلاقی سے مسکرائی مگر عالیان نے دھیان نہ دیا۔ اس کا تو سارا دھیان تیزی سے نیچے آتی لفٹ پر تھا۔ لفٹ کا دروازہ کھلتے ہی وہ تیزی سے اس کی جانب لپکا۔ اندر سے ایک ادھیڑ عمر مرد باہر نکل رہا تھا۔ اس نے عالیان کی طرف ناگواری سے

دیکھا تاہم کچھ بولنے سے گریز کیا۔ خاتون بھی بچے کو ساتھ لے کے اندر آ گئی۔ اس نے دسویں منزل کا بٹن پریس کیا۔ عالیان نے جھنجلائے ہوئے انداز میں اسے دیکھا۔ اسے چودھویں منزل پر جانا تھا۔ اب کم از کم ایک بار دسویں منزل پر لفٹ رکتی اور اس کے چند لمحات ...... 'قیمتی لمحات' ضائع ہو جاتے۔

خاتون اب بچے کو ساتھ لپٹائے کھڑی تھی۔

دسویں منزل کے آتے ہی عورت بچے سمیت اتر گئی۔ عالیان کو سکون محسوس ہوا۔ وہ مطلوبہ منزل پر اترتے ہی تیزی سے اپنے اپارٹمنٹ کی طرف بڑھا۔ دروازہ اس کے چہرے کو دیکھتے ہی ان لاک ہو گیا۔ اس نے ہینڈل گھما کے دروازہ کھولا اور تیزی سے اندر داخل ہوا۔ اپنے کمرے میں پہنچتے ہی اس نے اسکول بیگ بیڈ پر پھینکا اور دراز سے موبائل نکال کے آن کیا۔

موبائل کے آن ہونے کے چند لمحے بھی اس پر گراں گزر رہے تھے۔ وہ بیڈ پر بیٹھ کر اضطراری انداز میں ٹانگیں ہلانے لگا۔

انہیں اسکول میں موبائل لے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ پہلے وہ وہ چھپا کے موبائل لے جایا کرتا تھا۔ پھر ایک لڑکے نے اسکول ٹیچر کی ایک طالبعلم کے کان کھینچتے ہوئے ویڈیو بنا کے سوشل میڈیا پر پوسٹ کر دی تو ان پر موبائل کے حوالے سے خاصی سختی ہونے لگی۔ اب اکثر ان کے لباس اور بیگ کی تلاشی لی جاتی تھی جس کی بنا پر وہ موبائل گھر رکھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

موبائل آن ہوتے ہی اس نے بے چینی سے اپنی مطلوبہ "ایپ" پر "ٹیپ" کیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

☆☆☆

عالیان ملک کے سب سے بڑے شہر میں ایک کثیر المنزلہ عمارت کے ایک اپارٹمنٹ میں اپنے والدین کے ساتھ مقیم تھا۔ اس کی عمر پندرہ سال تھی۔ وہ شہر کے ایک معروف پرائیویٹ اسکول میں کلاس نہم کا طالب علم تھا۔ صحت کمزور تھی، اور رنگت زرد مگر آنکھیں سیاہ اور چمک دار تھیں۔

اس کے پاپا ڈاکٹر تھے جبکہ ماما ایک ملٹی نیشنل کمپنی کی مقامی شاخ میں برانچ منیجر تھیں۔ وہ دونوں انتہائی مصروف رہتے تھے۔ عالیان اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ اس کے باوجود اس لاڈ پیار سے محروم تھا جو عموماً اکلوتی اولاد کو ملتا ہے۔ اس کا بچپن آیاؤں کی گود میں گزرا تھا۔

اسکول سے چھٹی کے بعد اس کا سب سے اچھا ساتھی کمپیوٹر ہوا کرتا تھا۔ چھٹی کے بعد وہ ویڈیو گیمز اور کارٹون موویز میں مشغول رہتا۔ وقت کے ساتھ اس کا ساتھی مختصر ہو کے پہلے اس کی گود میں سمٹا تھا اور اب اسی کی ہتھیلی میں سمٹ جاتا تھا۔ کچھ عرصہ قبل اسے ایک نئی لت لگی تھی، جس کا شکار نئی نسل کی اکثریت ہو چکی ہے۔

وہ ٹک ٹاکر تھا اور اسٹار بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس کی ایک کلاس فیلو مشعل رانا ایک ٹک ٹاک اسٹار تھی۔ وہ خوبصورت مگر نک چڑھی تھی، کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ جب ٹک ٹاک پر اس کے "فالورز" کی تعداد ایک لاکھ ہوئی تو اس خوشی میں اس نے اپنے تمام کلاس فیلوز کو پارٹی دی تھی۔ یہ پہلی بار تھا کہ اس نے سب کلاس فیلوز کو ایک ساتھ منہ لگانے کی زحمت کی تھی۔

اگلے ہی دن ایک موبائل کمپنی کی طرف سے مشعل کو ایک سیل فون تحفے میں ملا تھا۔ بدلے میں اسے محض اس سیل فون کی ایک تشہیری ویڈیو بنانی تھی جو اس نے خوشی سے بنا دی تھی۔ یہی تو اس کا پہلا ٹارگٹ تھا۔ جو اس نے حاصل کر لیا تھا۔ اس نے تحفے کی تشہیر بھی کھل کر کی تھی۔

اس کے بعد تو اس کے جو کلاس فیلوز مارے باندھے کبھی کبھار ٹک ٹاک استعمال کرتے تھے۔ وہ بھی دن رات نت نئے ٹک ٹاک بنانے لگے تھے۔ عالیان بھی اس کام میں پیش پیش تھا لیکن سر توڑ کوشش کے باوجود تاحال وہ زیادہ نام نہیں کما سکا تھا۔ انہی دنوں کورونا کی وجہ سے اسکول بند ہو گئے تھے۔ ان کی آن لائن کلاسز جاری تھیں لیکن اس کے باوجود اس کے پاس اب کچھ کرنے کو کوئی خاص کام باقی نہیں تھا۔ وہ دن رات ٹک ٹاک میں ہی مشغول رہتا۔ اس کے کلاس فیلوز بھی پوری طرح اس مشغلے میں گم ہو چکے تھے۔ ان کے درمیان کانٹے کا مقابلہ جاری تھا۔

لڑکیوں کے فالورز کی تعداد میں تو تیزی سے اضافہ ہو ہی رہا تھا۔ اس کے دو دوست بھی پچاس ہزار سے زائد فالورز کی لسٹ میں آ گئے تھے لیکن اس کے فالورز کی تعداد ابھی بمشکل دو ہزار ہوئی تھی۔ اس نے گانے گائے، پیروڈی کی، ڈانس کیا، غرض تحائف دے کے اپنی کلاس فیلو لڑکیوں کو بھی اپنی ویڈیوز میں ایڈ کیا لیکن اس کے باوجود اس کے فالورز میں اضافہ نہیں ہو رہا تھا۔ اب تو اس نے طے کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے اس نے ایک دن ٹک ٹاک اسٹار ضرور بننا ہے۔

رات کو اس نے اپنا ایک نئی ٹک ٹاک شیئر کیا تھا۔ صبح تک اس پر اس کی توقع سے اچھا رسپانس آچکا تھا۔ بیس سے زائد لوگ اس کی ویڈیو شیئر کر چکے تھے، اور اس کی ویڈیو کے ناظرین ہزار سے زائد ہو چکے تھے۔ کمنٹس کم تھے لیکن لائکس بھی سیکڑے کے حدود کراس کر چکے تھے۔ اس کی پہلی ویڈیو اس قدر کامیابی سمیٹ پائی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اس وقت تک اس کی ویڈیو کم از کم دو ہزار سے زائد لوگ دیکھ چکے ہوں گے مگر خلافِ توقع اس کی ویڈیو بمشکل سو کے قریب لوگ ہی مزید دیکھ سکے تھے اور لائکس بھی صرف دس بارہ ہی مزید آئے تھے۔ اس نے جھنجلا کے فون بیڈ پر پھینکا اور سر ہاتھ میں پکڑ کر بیٹھ گیا۔

اسی لمحے اس کے دروازے پر دستک ہوئی۔

''کم اِن۔'' اس نے شکستہ انداز میں کہا۔

دروازے پر ان کے گھر کی منتظم زرتاج کھڑی تھی۔

''آپ فریش ہو جاؤ۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔'' وہ اسے اسکول یونیفارم میں ملبوس دیکھ کے بولی۔

''مجھے نہیں کھانا۔ بھوک نہیں ہے۔'' اس نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔

''اوکے۔ ایز یو وش۔'' زرتاج نے کندھے اچکائے۔ ''جب بھوک لگے تو مجھے بتا دینا۔''

''بات سنیں۔'' وہ اچانک بولا۔ دروازہ بند کرتے کرتے وہ رکی۔

''میں نے نئی ٹک ٹاک پوسٹ کی ہے۔ وہ تو شیئر کر دیں۔''

''ایسے ہی...... '' زرتاج اسے عجیب سے انداز میں دیکھتے ہوئے مسکرائی۔

''بھاڑ میں جاؤ تم۔'' وہ چلایا۔ زرتاج نے زور سے دروازہ مارا اور باہر نکل گئی۔

ہر شخص ہی یہاں سوداگر ہے۔ اس نے جھنجلا کے سوچا۔ اس کے دوست بھی اس کی ویڈیوز اسی شرط پر شیئر کرتے تھے کہ وہ بھی ان کی ویڈیو شیئر کرے گا۔ ان کی شرط تو وہ مان لیتا تھا لیکن زرتاج کی شرط...... ہونہہ...... ہرگز نہیں۔

زرتاج پینتیس چھتیس سالہ عورت تھی اور اُن کے گھر گزشتہ...... چھ ماہ سے کام کر رہی تھی۔ گھر کے انتظام و انصرام کی ذمّے داری اسی کی تھی۔ وہ ایک ہاسٹل میں تنہا مقیم تھی۔

وہ بُرے قماش کی عورت تھی۔ اس نے پہلے پہل عالیان کو اپنی فحش اداؤں سے رجھانے کی کوشش کی تھی لیکن عالیان نے اسے نظر انداز کر دیا۔ نئی نسل کا نمائندہ ہونے کے باعث وہ بچپن سے ہی مرد و عورت کے رشتے سے پوری طرح آگاہ تھا۔ لیکن اپنی ماں کی عمر کی عورت میں اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کا اندازہ تھا کہ اس کا گریز دیکھ کے وہ خود پیچھے ہٹ جائے گی لیکن وہ باز آنے کے بجائے اس کے پیچھے ہی پڑ چکی تھی۔

اس کی بے ہودہ حرکتوں کی وجہ سے عالیان اسے سخت ناپسند کرتا تھا۔ پہلے وہ اس سے بات کر لیتا تھا۔ زرتاج بھی اس کی ضروریات کا خیال رکھتی تھی لیکن اس کے بعد اس سے بے پروائی برتنے لگی۔ اب وہ بھی زیادہ تر موبائل میں ہی مشغول رہتی تھی۔

عالیان نے سوچا تھا کہ اپنے پاپا کو اس کی حرکتوں کے متعلق بتا دے لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ اس کی بات کا یقین نہیں کریں گے۔ یہی سمجھیں گے کہ وہ اس سے جان چھڑانے کے لیے اس پر الزام دھر رہا ہے۔ وہ اگر اس کی بات کا یقین کر بھی لیتے تو بھی وہ جانتا تھا کہ وہ اس کی وجہ سے نئی ملازمہ تلاش کرنے کے جھنجٹ میں نہیں پڑیں گے۔ اس وجہ سے اس کی حرکات کا ذکر کسی سے کیا ہی نہیں۔

زرتاج گھر میں موجود ہوتی تو اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا۔ اب تو وہ اپنے کمرے سے باہر نکلتا ہی نہیں تھا۔ دوستوں سے اس کی اتنی بنتی نہیں تھی۔ سب اسے خود غرض لگتے تھے۔ اس وجہ سے وہ کہیں جاتا ہی نہیں تھا۔ اسکول سے آ کے سیدھا کمرے میں گھس جاتا اور سیل فون کی دنیا میں گم ہو جاتا۔

☆☆☆

عالیان کو بیڈ پر لیٹے سوچوں میں گم جانے کتنی دیر ہو گئی۔ اب اسے بھوک ستا رہی تھی۔ وہ کسلمندی سے انداز میں اٹھا اور واش روم میں گھس گیا۔ ٹراؤزر اور ٹی شرٹ پہن کر وہ باہر نکلا تو زرتاج لیونگ روم میں صوفے پر بیٹھی موبائل میں مشغول تھی۔

''کھانا لگائیں۔'' وہ ناراض سے انداز میں کہتے ہوئے ڈائننگ ٹیبل پر جا بیٹھا۔ زرتاج بھی کچھ کہے بغیر کھانا لینے چلی گئی۔ جب تک وہ کھانا لاتی، عالیان اداس سے انداز میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اُسے آج کسی بھی چیز میں دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

زرتاج اس کے سامنے کھانا رکھ کر ادھر ہی بیٹھ گئی۔ عالیان خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔

''جو دوسروں کو خوش نہیں کرتے، وہ خود بھی پریشان رہتے ہیں۔'' زرتاج نے کچھ لمحے بعد خاموشی توڑی۔ عالیان اسے خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کا جملہ جیسے اس کے سر سے گزر گیا تھا۔

''یہ دیکھو میرے ٹک ٹاک پر بیس ہزار سے زائد فالورز ہیں اور یہ سب ایک ماہ کے اندر ہی بنے ہیں۔'' وہ موبائل اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ اس کا انداز جتانے والا تھا۔

عالیان نے نیم دلی سے اُس کے ہاتھ سے موبائل تھاما۔ وہ سچ کہہ رہی تھی۔

زرتاج نے ہاتھ بڑھا کے ایک ویڈیو چلائی۔ ''یہ دیکھو میری ویڈیو۔ یہ میں نے کل ہی پوسٹ کی تھی اور دس ہزار سے زائد لوگ دیکھ چکے ہیں۔''

وہ گھٹیا سی شاعری تھی تاہم زرتاج کا شعر پڑھنے کا انداز بہت اچھا تھا۔ وہ زیادہ خوبصورت تو نہیں تھی لیکن ''فلٹرز'' نے اسے بے انتہا خوبصورت بنا دیا تھا۔ عالیان کو علم تھا کہ وہ ٹک ٹاک بناتی ہے لیکن اس نے اسے فالو نہیں کیا تھا نہ کبھی اس کی ویڈیو دیکھی تھی۔ آج پہلی بار وہ اس کی ویڈیو دیکھ رہا تھا اور متاثر نظر آ رہا تھا۔ زرتاج اسے بغور دیکھ رہی تھی۔

پھر ایک دن ٹی وی پر ایک پروگرام دیکھا جس میں مختلف سوشل میڈیا پلیٹ فارمز کے اسٹارز کا گیم شو چل رہا تھا تو میری دلچسپی بڑھی اور میں نے بھی ویڈیوز بنانا شروع کر دیں۔'' وہ جان گئی تھی کہ عالیان کی کمزوری ٹک ٹاک ہے اور وہ اس موضوع پر لازمی دلچسپی لے گا۔

''ہاں، میں نے بھی وہ پروگرام دیکھا تھا۔ اگلے ایسے پروگرام میں آپ مجھے بھی ٹک ٹاک اسٹار کے روپ میں دیکھیں گی۔''

''دو ہزار فالورز کے ساتھ۔'' وہ ہنسی۔

عالیان کی رنگت متغیر ہوئی۔ اس کی بدلتی رنگت دیکھ کر زرتاج نے جلدی سے بات بدلی۔

''خیر میں نے تمہاری ویڈیوز دیکھی ہیں۔ کافی ٹیلنٹ ہے تم میں۔'' اس کے انداز میں ستائش تھی۔ ''لیکن تم جانتے ہو جتنی بھی اچھی ویڈیو ہو مقبول ٹک ٹاکرز جب اسے شیئر نہیں کرتے۔ اس کی Reach نہیں بڑھتی۔ نہ ہی فالورز بنتے ہیں۔''

''میں جانتا ہوں۔ میری ایک کلاس فیلو کے لاکھوں فالورز ہیں۔ اور دوستوں کے بھی ہزاروں فالورز ہیں۔ مگر وہ سارے کمینے ہیں۔ منتیں کرائے بغیر، کچھ کھائے بغیر شیئر کرتے ہی نہیں۔ جیلس ہیں میرے ٹیلنٹ سے کہ میں ان سے زیادہ مقبول نہ ہو جاؤں۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو مگر تم بھی تو کسی کے کام نہیں آتے۔'' عالیان نے چونک کے اسے دیکھا۔ اس کی نظروں میں ناگواری تھی۔ زرتاج اس کے تاثرات دیکھ کے تیزی سے بولی۔ ''میرا مطلب ہے تم بھی تو کسی کی ٹک ٹاک شیئر نہیں کرتے۔''

''مجھے اس کی ضرورت نہیں۔'' اس نے ناگوار سے انداز میں کہتے ہوئے کرسی گھسیٹی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میرا ٹیلنٹ مجھے آگے بڑھائے گا۔'' وہ یہ کہہ کے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ زرتاج اُسے غصے سے جاتا دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

اگلے دن عالیان کلاس میں پہنچا تو سارے لڑکے لڑکیاں مشعل کی طرف متوجہ تھے۔ وہ فخریہ انداز میں سب کو بتا رہی تھی کہ سوشل میڈیا اسٹارز کا ایک گیم شو ہونے جا رہا ہے جس میں اسے بھی آفر آئی ہے۔ کوئی اسے رشک اور کوئی حسد سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی ساتھی لڑکیاں اس سے ٹریٹ کا تقاضا کر رہی تھیں۔

''ہے...... مشعل! بہت مبارک ہو۔'' عالیان بلند آواز میں بولا۔

''تھینکس۔'' اس نے رسمی انداز میں کہا۔

''ہم تمہارے فیلوز ہیں یار۔ تم ہمیں فالو کیوں نہیں کرتیں؟''

''مشعل کو لوگ فالو کرتے ہیں۔ مشعل کسی کو فالو نہیں کرتی۔'' وہ نخوت سے بولی۔

''مشعل اسٹار ہے وہ کیوں کسی کو فالو کرے گی۔'' ایک اور لڑکی اس کی طرف دیکھتے ہوئے ناگواری سے بولی۔

''ابھی نہ کرو۔ ایک دن تم سب مجھے فالو کرو گے۔ میری ویڈیو ڈھونڈ ڈھونڈ کے دیکھا کرو گے۔''

سب لوگ قہقہے لگانے لگے۔

''ہے...... اتنے عرصے میں کوئی ڈھنگ کی ویڈیو بنا نہیں سکے۔ چلے ہو اسٹار بننے۔'' زین نے طنز کیا تو عالیان کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ اسی لمحے کلاس میں ٹیچر داخل ہوئی تو سب اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ عالیان کا خون کھول رہا تھا۔ وہ زین کی پشت پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔

آج تمہارا ستارہ اوپر ہے اس لیے اتنا اترا رہے ہو۔

کل میں تم سے اوپر ہوں گا۔ پھر تم مجھے حسرت سے دیکھا کرو گے۔ اس نے دل ہی دل میں اپنے عزم کا اعادہ کیا۔

☆☆☆

زین کا طنز عالیان کے ذہن میں بار بار گردش کر رہا تھا۔ وہ بار بار مٹھیاں بھینچتا اور اس کی پشت کو غصے سے دیکھتا رہا۔ وہ کوئی ایسا آئیڈیا سوچنا چاہتا تھا جس پر اس کی بنائی گئی ویڈیو فوری وائرل ہو جائے مگر اسے کوئی آئیڈیا سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

لگتا ہے مجھے زرتاج کی بات مان لینی چاہیے۔ اچانک اسے خیال آیا۔ غصے میں انسان کے لیے مشکل فیصلے بھی آسان ہو جاتے ہیں۔ آج سے قبل اسے جس زرتاج سے گھن آتی تھی، آج اسے اس کی بات مان لینا انتہائی آسان لگ رہا تھا۔ وہ جوں جوں اس پر سوچتا جا رہا تھا۔ اس کا ارادہ پختہ ہوتا جا رہا تھا۔

یہ شوبز اسٹارز بھی تو اس مقام پر پہنچنے کے لیے کیا کیا نہیں کرتیں۔ میں اگر ایسا کچھ کرتا ہوں تو آخر اس میں اتنی برائی کیا ہے۔ کچھ پانے کے لیے سمجھوتے تو کرنا پڑتے ہیں۔ وہ خود کو سمجھا رہا تھا۔ دلائل دے رہا تھا، قائل کر رہا تھا۔ جب انسان خود کو قائل کرنے پر اتر آئے تو قائل کر ہی لیتا ہے۔ اس نے بھی خود کو قائل کر لیا۔ آخر کار اس نے فیصلہ کر لیا۔ اپنا تن اپنی خواہش کے ہاتھ بیچنے کے لیے۔

☆☆☆

وہ گھر پہنچا تو زرتاج لیونگ روم میں ایک صوفے پر بیٹھی تھی۔

''ہیلو۔'' اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ زرتاج نے اسے حیرت سے دیکھا۔ آج کئی دن بعد اس نے گھر واپسی پر زرتاج کو ہیلو کہا تھا۔

''زہے نصیب، آج تو عالیان بابا بڑے ''موڈ'' میں لگ رہے ہیں۔'' اس نے موڈ پر زور دے کر کہا۔

عالیان نے اسے بغور دیکھا۔ وہ لطف لینے والے انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اسے بھوک نظر آئی۔ وہ نظریں چرا کے بولا۔ ''کھانا لگائیں۔ میں فریش ہو کے آتا ہوں۔''

گو کے وہ پختہ فیصلہ کر چکا تھا مگر اس کے باوجود اس کا دل اس کے فیصلے میں اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ کپڑے تبدیل کرتے ہوئے بھی وہ کشمکش کا شکار رہا۔

وہ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا تو زرتاج کھانا لگا چکی تھی۔ وہ خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔ اس کی خاموشی دیکھ کے زرتاج بھی اسے نظر انداز کر کے موبائل میں مگن ہو گئی۔

''آپ نے یہ سب کیسے کر لیا؟'' یکدم اس نے پوچھا۔

''یہ سب...... مطلب؟'' اس کی آنکھوں میں نا سمجھی کی کیفیت تھی۔

''یہی...... ٹک ٹاک پر چند دن میں بیس ہزار سے زائد فالورز۔''

''اوہ۔'' زرتاج ہنسی۔ ''میں کچھ اور ہی سمجھی تھی۔ خیر، میں انسٹاگرام بہت عرصے سے استعمال کر رہی ہوں۔ وہاں میرے لاکھ سے زائد فالورز ہیں۔ میں ٹک ٹاکس وہاں شیئر کرتی ہوں۔ اس وجہ سے اتنی تیزی سے فالورز بڑھے ہیں۔''

''آپ میری ٹک ٹاک اپنے انسٹا پر شیئر کریں گی نا۔'' اس نے نظریں چُراتے ہوئے استفسار کیا۔

''اس کا جواب تم جانتے ہو۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ چند لمحے اسے بغور دیکھتا رہا پھر یکدم بولا۔ ''مجھے آپ کی شرط منظور ہے۔''

زرتاج کے چہرے پر بے یقینی کے تاثرات پھیلے پھر وہ یکدم اٹھی اور عالیان کی پشت پر آ گئی۔ اس نے اپنے بازو اس کے گرد حمائل کیے اور جھک کے اس کے گال چومنے لگی۔ عالیان کا جسم تپنے لگا۔

''پہلے آپ میری ویڈیو شیئر کریں گی۔'' وہ بمشکل کسمسا کے الگ ہوا اور ہانپتے ہوئے بولا۔

وہ ہنسی۔ ''بے فکر رہو۔ دیکھنا آج کے دن تم کہاں سے کہاں پہنچ جاؤ گے۔'' اس کے انداز میں معنی خیزی تھی۔ عالیان ایک گہرا سانس لے کے رہ گیا۔

☆☆☆

ہمارے ہاں عورتوں کو ہر جگہ کتنی آسانی ہے۔ سوشل میڈیا پر ''مجھے بخار ہے'' کی پوسٹ لگائیں تو پورا ملک ایسے تشویش کا شکار ہو جاتا ہے جیسے ملک کے تمام مسائل اس ایک عورت کے بخار سے ہی جڑے ہیں اور لڑکا مرنے کی پوسٹ لگائے تو کوئی پوچھتا نہیں۔ کوئی رسپانس دے بھی تو ہنسنے کا دے گا یا طنزیہ کمنٹ ہی کرے گا۔ نوکری پر ہزاروں لڑکوں کے مقابلے میں چند لڑکیوں نے اپلائی کیا ہو تو لڑکیوں کو زیادہ آسانی سے نوکری مل جاتی ہے۔ اور تو اور وہ کسی مرد کو حاصل کرنا چاہیں تو ان کے لیے کتنا آسان ہے۔ جس کا چاہیں ریپ کریں کوئی شکایت تک نہیں کر سکتا۔ کرے تو اسی

کی جگ ہنسائی ہوتی ہے۔ اور لڑکیاں بازار میں صرف کسی کی طرف غصے سے دیکھ لیں تو لوگ اس بے چارے کو مرنے مارنے پر اتر آتے ہیں۔ عالیان بیڈ پر لیٹا یہ سب سوچ رہا تھا اور کڑھ رہا تھا۔

زرتاج سے اپنی چھوٹی سے بات منوانے کے لیے اسے اپنا تن من اس کے حوالے کرنا پڑا تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ پہلی بار اسے اپنا آپ یوں کسی کے حوالے کرنا پڑے گا۔ اس نے تو اپنے خواب میں کسی ''لور'' کا چہرہ بسا رکھا تھا۔ جس کے حوالے وہ اپنا آپ کرتا تو خوشی کی معراج پالیتا۔ یوں شرمندگی اور پچھتاوے کے احساس سے زمین میں نہ گڑ رہا ہوتا۔

زرتاج کے ویڈیو شیئرڈ کرنے سے اس کے ناظرین میں خاصا اضافہ ہوا تھا لیکن جانے کیوں اسے خوشی نہیں ہو رہی تھی۔ اسے اپنا آپ مردہ سا محسوس ہو رہا تھا۔ اگر کوئی احساس تھا تو بس احساسِ زیاں...... وہ اس زیاں کا احساس لیے سو گیا۔

اگلی صبح اٹھ کے اس نے ٹک ٹاک کھولا تو ایک بُری خبر اس کی منتظر تھی۔ ٹک ٹاک غیر معینہ عرصے کے لیے بین ہو چکا تھا۔ وہ ٹھنڈی آہ بھر کے رہ گیا۔

اُس دن اسکول میں آن لائن کلاس تھی۔ کلاس شروع ہونے میں ابھی خاصا وقت باقی تھا۔ اس نے اسکول کا واٹس ایپ گروپ کھولا تو وہاں بھی یہی خبر ''ٹاپ ٹرینڈ'' بنی ہوئی تھی۔ زیادہ تر اس کے فیلوز مایوس اور جھنجلائے ہوئے تھے لیکن اسٹارز اس خبر کو بھی انجوائے کر رہے تھے۔

''ٹک ٹاک بین ہونے کے بعد ایک رات میں دس ہزار لوگوں نے مجھے وی پی این سے کنیکٹ ہو کے فالو کیا ہے۔'' مشعل فخریہ انداز میں کہہ رہی تھی۔

''میم آپ تو اسٹار ہیں۔ آپ کو بین سے فائدہ ہی ہوا۔ نقصان تو ہمارا ہوا۔ اتنی محنت سے بنائی گئی ہماری ویڈیوز ایسے ہی سڑ رہی ہیں۔'' کسی دل جلے نے دل کے پھپھولے پھوڑے۔

''ہاہاہا......'' مشعل نے قہقہہ لگایا۔ ''میں نے تو ٹک ٹاک بین ہوتے ہی وی پی این سے کنیکٹ ہو کے حکومت اور لوگوں کی دقیانوسیت کے بارے میں ایک ویڈیو لگا دی تھی۔ دھڑا دھڑ وہ ویڈیو شیئر ہو رہی ہے۔''

انہیں باتوں میں مگن چھوڑ کے اس نے بے دلی سے فون ایک طرف ڈال دیا۔ اپنا آپ بیچ کر بھی اسے بدلے میں کچھ نہیں ملا تھا۔ وہ مایوس نہ ہوتا تو کیا کرتا۔

وہ کمرے سے باہر نکلا تو زرتاج اس کا لٹکا ہوا منہ دیکھ کے ہنسنے لگی۔ اس وقت دوسری ملازمہ صفائی کر رہی تھی۔ اس لیے وہ اس سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''لگتا ہے ٹک ٹاک بین کی خبر سن لی ہے آپ نے۔''

عالیان نے غصے سے اُسے دیکھا۔ ''ہماری حکومت کے پاس کرنے کو اور کچھ نہیں ہوتا تو ایسے الٹے سیدھے کام کر کے سمجھتے ہیں ہم نے بڑا تیر مار لیا۔'' اس نے لفظ چبا چبا کے کہا۔ اس کے تاثرات دیکھ کے زرتاج کی ہنسی نہیں رک رہی تھی۔ بمشکل وہ اپنی ہنسی پر قابو پا کے بولی۔

''فکر مت کریں عالیان۔ چند دن میں بین ہٹ جائے گا اور اب تو وہ لوگ بھی ٹک ٹاک یوز کرنے لگیں گے جنہوں نے کبھی ٹک ٹاک کا پہلے نام بھی نہیں سنا تھا۔ یہ سمجھو مارکیٹنگ ٹرک ہے۔'' اس نے ملازمہ سے نظر بچا کے عالیان کو آنکھ ماری۔ عالیان کا موڈ اس قدر آف تھا کہ یہ خبر بھی اس کی تسلی کا باعث نہیں بن سکی۔

''میں پارک میں جاگنگ کرنے جا رہا ہوں۔'' وہ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ پارک میں بھی اس کی اضطرابی کیفیت برقرار رہی۔ اس کا دل آج کسی چیز میں نہیں لگ رہا تھا۔

وہ واپس آیا تو اس کا ناشتا تیار تھا۔ اس نے نیم دلی سے ناشتا کیا اور کمرے میں گھس گیا۔ ملازمہ کے جانے کے بعد زرتاج نے اس کے دروازے پر دستک دی تو اس نے دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا۔ ''میں کلاس لے رہا ہوں۔''

اس کا موڈ دیکھ کے زرتاج نے اسے مزید تنگ نہیں کیا۔ 'آئندہ میں اس بڈھی کھوسٹ سے بچ کے رہوں گا۔' اس نے دل ہی دل میں سوچا لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ اس کی بھول ہے۔

رات کو اس نے اسکول کا واٹس ایپ گروپ کھولا تو مشعل فخریہ انداز میں اپنی ویڈیو کی بابت بات کر رہی تھی۔ بہت سے سوشل میڈیا چینلز اور چند ٹی وی چینلز نے ٹک ٹاک بین ہونے پر ٹک ٹاکرز کے تبصرے لیے تھے۔ مشعل کی ویڈیو اور تبصرہ بھی ایک چینل نے دکھایا تھا۔ کچھ دیگر کلاس فیلوز کے تبصرے سوشل میڈیا چینلز کی زینت بنے تھے۔ اگر اس سب میں کسی کو توجہ کے لائق نہیں سمجھا گیا تھا تو وہ عالیان تھا۔ ایک ناکام ٹک ٹاکر...... جسے کسی چھوٹے سے سوشل میڈیا چینل نے بھی گھاس نہیں ڈالی تھی۔ وہ سب اپنے کارنامے فخریہ انداز میں شیئر کر رہے تھے اور عالیان کے اندر دھواں بھرتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

چند دن بعد ٹک ٹاک سے بین ہٹ گیا۔ کورونا کی وجہ سے اسکول ایک بار پھر بند ہو گئے تھے۔ اب پورا دن وہ گھر میں بند رہتا۔ زرتاج نے ایک بار پھر اسے اپنے چنگل میں پھنسالیا تھا۔ زرتاج کے تعاون سے وہ چند ہفتوں میں بیس ہزار سے زائد فالورز رکھنے لگا تھا۔ بدلے میں وہ بھی زرتاج کی توقعات کو پورا کر رہا تھا۔ اب تو اس کا احساس زیاں بھی کہیں کھو گیا تھا۔

وہ خوش رہنے لگا تھا۔ اپنی کلاس میں لڑکوں میں تیسرا بڑا ٹک ٹاکر بن گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ جلد وہ اسٹار بن جائے گا۔ اس کی منزل قریب تھی۔

انہی دنوں ٹک ٹاک پر ایک مقابلے کا اعلان ہوا۔ ایسے مقابلے دوسرے ممالک میں ہو چکے تھے لیکن پاکستان میں ٹک ٹاک انتظامیہ کی طرف سے یہ پہلا انعامی مقابلہ تھا۔ اس مقابلے میں شرکت کرنے کے لیے ایک مخصوص ہیش ٹیگ کے ساتھ لوگوں کو اپنی ویڈیوز پوسٹ کرنا تھیں۔ ایپ کی انتظامیہ نے کم سے کم ایک ملین ویڈیوز اس ہیش ٹیگ کے ساتھ لینا تھیں۔ اگر اتنے لوگ مخصوص تاریخ تک ایک ملین ویڈیوز پوسٹ کرتے تو ٹاپ ٹین کے لیے انعامات تھے۔ پہلا انعام ایک ہزار ڈالر تھا۔ ٹک ٹاک پر تمام ٹک ٹاکرز اس مقابلے کی تشہیر کر رہے تھے۔

اس مقابلے نے عالیان کے اندر نئی ترنگ بھر دی تھی۔ وہ اگر کوئی اچھوتی ویڈیو بنانے میں کامیاب رہتا تو ایک ہی جست میں کہاں سے کہاں پہنچ سکتا تھا۔ یہ اس کے لیے نادر موقع تھا۔ گولڈن چانس...... یہ بھلا وہ کیسے مس کر سکتا تھا۔

زرتاج اس مقابلے کے لیے زیادہ پُرجوش نہیں تھی لیکن عالیان کا جوش دیکھ کے وہ اسے نت نئے آئیڈیاز دینے لگی۔ لیکن عالیان کے دل کو کوئی بھی آئیڈیا نہیں چھو رہا تھا۔ دوسرے لوگ جو ویڈیوز پوسٹ کر رہے تھے، وہ عالیان دن بھر دیکھتا رہتا تھا۔ وہ روٹین کی ویڈیوز تھیں۔ ان میں کچھ ہٹ کے نہیں تھا۔ عالیان کچھ ہٹ کے بنانا چاہ رہا تھا۔ ایک ایسی ویڈیو جو دیکھنے والوں کے دلوں کو تسخیر کر لے۔ انہیں حیران کر دے۔ وہ بے اختیار تالیاں بجانے پر مجبور ہو جائیں۔ ان کے انگوٹھے بے اختیار لائک اور کمنٹس کی طرف بڑھنے لگیں۔ دھڑا دھڑ اس کی ویڈیو شیئر ہونے لگیں تبھی وہ اتنی توجہ پا سکتا تھا جس کا وہ متلاشی تھا۔ دن رات وہ ایسے آئیڈیئے کی کھوج میں لگا رہتا تھا۔

آخر کار اُسے رات خواب میں ایک آئیڈیا آ گیا۔ یہ ایسا ہی آئیڈیا تھا جیسا وہ چاہتا تھا۔ دلوں کو تسخیر کر لینے والا۔ دماغ کو جھنجوڑ دینے والا۔

وہ دن رات اس کی مشق میں لگ گیا۔ اس ویڈیو کے لیے اسے جسمانی فٹنس کی ضرورت تھی۔ اس کا دبلا پتلا جسم پہلے سے خوب لچک دار تھا مگر وہ اسے مزید لچک دار بنانا چاہتا تھا۔ جیسا کہ اس ویڈیو کی ڈیمانڈ تھی۔ اس نے اپنی لائنز پہلے سے لکھ رکھی تھیں۔ وہ آئینے کے سامنے انہیں دہراتا رہتا۔ پوری دل جمعی سے۔ مکمل تاثرات کے ساتھ۔ اس پر اسے عبور حاصل ہو چکا تھا۔ وہ مصنوعی ماحول پیدا کر کے کئی بار اس پر ریہرسل کر چکا تھا۔ اب فائنل ویڈیو بنانے کا وقت آ گیا تھا۔ اس کے لیے اسے کسی کے تعاون کی ضرورت تھی۔

زرتاج کے تعاون کی...... ہاں...... اس سے بڑھ کے اس کا معاون کون ہو سکتا تھا۔ وہ بھی تو اتنے عرصے سے اس کے ساتھ تعاون کر رہا تھا۔ اب اس کی اصل قیمت

مرحومین کا شعبہ

اخباری نمائندے نے ایک مشہور ادیب کا طویل انٹرویو لیا۔ جب وہ جانے لگا تو اس نے پوچھا۔ ”بھائی یہ کب چھپے گا؟“

اخباری نمائندہ۔ ”یہ تو آپ پر منحصر ہے، جناب کیونکہ میرے پاس مرحومین کا شعبہ ہے۔“

دو ادیب

پہلا ادیب۔ ”اس قوم کا اللہ حافظ ہے۔“

دوسرے ادیب۔ ”کیوں بھئی کیا ہوا؟“

پہلا ادیب۔ ”غضب خدا کا، میں نے تحریریں چوری کرنے کی مذمت میں ایک مضمون چھپوایا۔ کسی نے وہی مضمون چوری کر کے اپنے نام سے دوسرے رسالے میں چھپوا لیا۔“

پہلا ادیب ہکا بکا رہ گیا۔

عبادت کاظمی کی کارروائی

چکانے کا وقت آ گیا تھا۔ اس کے لیے اسے زرتاج کو منانا تھا۔ ہر صورت منانا تھا اور اسے ماننا ہی تھا۔ ہر صورت...... ماننا ہی تھا۔

☆☆☆

زرتاج ویڈیو بنانے کے لیے تیار تھی مگر اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ پتا نہیں اس کی وجہ جوش تھا یا خوف۔ خیر وجہ کوئی بھی تھی۔ وہ اس کام کی حامی بھر چکی تھی۔ اس کا سامنا ایسے دیوانے سے پہلی بار پڑا تھا۔ وہ یہ کام کرنے کے لیے ہرگز تیار نہ ہوتی مگر عالیان کی جنونی ضد نے اسے ہرا دیا تھا اسی لیے وہ رات کے اس پہر اپنے ہاسٹل سے دور عالیان کی بتائی ہوئی جگہ پر موجود تھی۔ کسی کو اس کی یہاں موجودگی کا علم نہیں تھا اور نہ چاہتی تھی کہ کبھی کسی کو علم ہو۔

''آر یو ریڈی میم؟'' عالیان نے اس سے پوچھا۔ اس کے انداز میں انوکھا اعتماد تھا۔ ایک ایسے فنکار کا سا اعتماد جو اپنے فن پر مکمل عبور رکھتا ہو۔

زرتاج نے نروس سے انداز میں ''اوکے'' کیا۔ یکلخت جانے اسے کیا ہوا کہ وہ بھاگ کے عالیان سے لپٹ گئی۔ وہ اسے چومنے لگی۔ عالیان ساکت کھڑا تھا۔ زرتاج نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''پلیز...... ایسا مت کرو۔'' وہ سسکی۔

عالیان نے اسے بازوؤں سے پکڑ کے الگ کیا۔

''آپ کو ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ بے فکر رہیں۔ ویسا ہی ہوگا جیسا میں چاہتا ہوں۔'' اس نے سکون سے کہا۔

''اگر ایسا نہ ہوا تو......'' اس کی آواز انجانے خوف سے لرز رہی تھی۔

''یہ ممکن نہیں۔ آج تو میں جو چاہوں۔ خدا مجھے دے گا۔'' اس کے انداز میں عجیب سا اعتماد تھا۔ زرتاج کو کسی قدر تسلی ہوئی۔

''چلیں۔ آپ اپنی جگہ پر جائیں۔ لائٹ، کیمرا سب اوکے کریں۔''

زرتاج نے لائٹس آن کیں اور عالیان کا سراپا اس روشنی میں مرکوز کیا۔ عالیان اچھل کے دیوار پر چڑھ گیا۔ زرتاج کا دل خشک پتے کی طرح کانپنے لگا۔ عالیان اس کی کیفیت سے بے خبر پورے اعتماد سے آٹھ انچ کی دیوار پر کھڑا تھا۔ اس کے بال، اس کی کھلی شرٹ ہوا سے لہرا رہی تھی۔ شرٹ کے اندر سے اس کا عریاں لچک دار بدن کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ اس روپ میں وہ کسی اور ہی دنیا کا فرد لگ رہا تھا۔ اس نے انگوٹھے سے 'اسٹارٹ' کا اشارہ دیا۔

زرتاج نے نروس سے انداز میں عالیان کا موبائل کیمرا آن کیا۔ بیپ کی آواز ہوئی اور وہ اپنی لائنز بولنے لگا۔

''میں اس وقت بیس منزلہ عمارت کی چھت کی باؤنڈری وال پر کھڑا ہوں۔ میرا جسم ہوا کے زور سے خشک ٹہنی کی طرح لچک رہا ہے۔ لچک رہا ہے...... لچک رہا ہے......'' اس کی آواز بھراتی جا رہی تھی اور اس کا دبلا پتلا جسم رقص کے انداز میں لہراتا جا رہا تھا۔ زرتاج سانس روکے ویڈیو بنا رہی تھی۔ پس منظر میں تیز ہوا اسے خود سے سرگوشیاں کرتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بھی جیسے اس دیوانے کی دیوانگی سے منع کرنے کا کہہ رہی تھی۔ اس نے اپنے کان بند کر لیے۔

دو سو فٹ سے زائد بلندی پر عالیان ایک آٹھ انچ کی دیوار پر کھڑا رقص کر رہا تھا۔ پہلے وہ آہستہ آہستہ تھرک رہا تھا مگر اب اس کے رقص میں تیزی آتی جا رہی تھی۔ زرتاج دم سادھے یہ انوکھا منظر دیکھ رہی تھی۔ پس منظر میں نیچے دور تک ٹمٹماتی روشنیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ منظر اسے بہت پیارا لگا کرتا تھا مگر اس وقت ان روشنیوں میں ایک دیوانہ اپنی جان ہتھیلی پر لیے سانسوں کو روک لینے والا رقص پیش کر رہا تھا۔

اب وہ بازو پھیلائے ایک ٹانگ پر تیزی سے گھوم رہا تھا۔ وہ جیسے گرد و پیش سے مکمل بے خبر تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور کھلی ہوئی شرٹ اور بال ہوا میں تیزی سے لہرا رہے تھے۔ یہ فن کی معراج تھی۔ اچانک گھومتے ہوئے وہ رکا۔ آنکھیں بھر کے کیمرے کی طرف دیکھ کے ہلکا سا مسکرایا، دونوں بازو ہوا میں بلند کیے اور اچانک کندھوں کو پیچھے جھکا دیا۔

زرتاج کیمرا بلند کیے اس کا یہ خطرناک ترین پوز عکس بند کر رہی تھی۔ پچاس سیکنڈ کا کلپ ہو چکا تھا۔ اب بس عالیان کو ایک جھٹکے سے سیدھا ہونا تھا اور دیوار سے نیچے چھلانگ لگانا تھی۔ زرتاج کا پورا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ اس کا رُواں رُواں کانپ رہا تھا۔ اب بس چند لمحے باقی تھے۔ وہ ویڈیو اسٹاپ کرنے کے لیے تیار تھی۔

☆☆☆

تین دن بعد......

مشعل اپنے کمرے میں بیٹھی لیپ ٹاپ پر ایک انگلش سیزن دیکھ رہی تھی کہ اس کا سیل فون بجا۔ اس نے بُرا

سامنہ بنا کے فون اٹھایا۔ یہ اس کی دوست ماریہ کی کال تھی۔ اس نے ویڈیو اسٹاپ کر کے کال ریسیو کی۔

''مشعل، تم نے عالیان کی نئی ٹک ٹاک دیکھی۔'' ماریہ کی آواز ہیجان سے لرز رہی تھی۔ مشعل کی آنکھوں میں اچنبھے کے تاثرات نمودار ہوئے۔ پہلے تو اسے سمجھ ہی نہیں آئی کہ وہ کون سے عالیان کی بات کر رہی ہے۔ وہ ''کون عالیان'' پوچھنے ہی والی تھی کہ یکدم اس کے دماغ میں جھماکا ہوا۔

''ہمارا کلاس فیلو عالیان؟'' اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''ہاں...... ہاں...... اُسی کی...... تم جلدی سے ویڈیو دیکھو۔ پاگل ہو جاؤ گی۔''

''اچھا......'' اس نے حیرانی سے استفسار کیا۔ ''چلو، مجھے لنک بھیج دو۔ دیکھ لیتی ہوں۔''

''میں نے شیئر کی ہے۔ تم وہیں سے دیکھ لو۔''

''او ہو بھئی، تم جانتی ہو۔ میں کسی کو فالو نہیں کرتی۔ تمہیں بھی نہیں کرتی۔ تم لنک بھیج دو۔ میں دیکھ لوں گی۔'' اس نے نخوت سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ میں لنک بھیج دیتی ہوں۔ پر پلیز ابھی دیکھنا۔ ایسی ویڈیو تم نے زندگی میں بھی نہیں دیکھی ہوگی۔''

''او کے یار۔ اب بور تو مت کرو۔'' اس نے منہ بنا کے کہا اور کال کاٹ دی۔ وہ موبائل رکھ کے سیزن اسٹارٹ کرنے ہی لگی تھی کہ یکدم اسے ماریہ کا ہیجانی لہجہ یاد آیا۔

آخر ایسا کیا ہوگا اس ویڈیو میں۔ وہ سوچنے لگی۔ اسی لمحے اس کے سیل کی بیپ بجی۔ ماریہ نے اسے لنک بھیجا تھا۔ اس نے لنک کھولا۔ پہلا ہی سین اسے ششدر کر دینے کے لیے کافی تھا۔

عالیان ایک پتلی سی دیوار پر کھڑا تھا۔ اس نے شرٹ کے بٹن کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ شرٹ تیز ہوا سے پھڑپھڑا رہی تھی۔ اس کا عریاں بدن کندن کی طرح طرح دمکتا نظر آرہا تھا۔ اس کے بال تیز ہوا سے لہرا رہے تھے۔ ہوا کی گونج کے ساتھ پس منظر میں ایک طربیہ نغمہ گونج رہا تھا۔

''میں اس وقت بیس منزلہ عمارت کی چھت کی باؤنڈری وال پر کھڑا ہوں۔ میرا جسم ہوا کے زور سے خشک ٹہنی کی طرح لچک رہا ہے۔ لچک رہا ہے...... لچک رہا ہے......''

میوزک میں اس کی آواز مکس ہو کے عجیب سا تاثر دینے لگی تھی۔ اس کی بھرائی ہوائی آواز سن کے مشعل کو اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ اچانک وہ اپنے بدن کو دھیرے دھیرے ہلانے لگا۔ میوزک تیز ہونے لگا۔ اس کا رقص بھی تیز سے تیز تر ہوتا گیا۔ جوں جوں رقص میں تیزی آتی جا رہی تھی، مشعل کو اپنی دھڑکن بھی اپنی کنپٹیوں میں بجتی محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ ایک پاؤں پر دو سو فٹ کی بلندی پر جھوم رہا تھا۔ اچانک وہ رکا اور کیمرے کی آنکھ میں دیکھ کے ہلکا سا مسکرایا۔ مشعل کو اس کی نظریں خود میں اترتی محسوس ہوئیں۔ وہ جیسے اسے چیلنج کر رہا تھا۔ مشعل کا چہرہ پسینے سے تر ہو گیا۔

عالیان نے ہاتھ ہوا میں بلند کیے اور اچانک کندھوں پر پیچھے جھک گیا۔ وہ اس حالت میں بھی پورے اعتماد سے مسکرا رہا تھا۔ اس کے عقب میں بہت دور نیچے ٹمٹماتی ہوئی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ وہ سیدھا ہونے لگا۔ اچانک جانے کیا ہوا کہ سیدھا ہوتے ہوئے اس کے قدموں نے دیوار کو چھوڑ دیا۔ ایک دل کو ہلا دینے والی تیز چیخ گونجی۔ بجتا نغمہ خاموش ہو گیا۔ اب موبائل کے اسپیکر میں محض تیز ہوا کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ کیمرا اب اتھاہ گہرائی دکھا رہا تھا۔ اس گہرائی میں دور کہیں ٹک ٹاکر کا وجود اپنے خوابوں سمیت مردہ پڑا تھا۔ وہ ٹک ٹاک کا ستارہ بننا چاہتا تھا اور اب اس کی روح دور کہیں ستاروں میں تحلیل ہو چکی تھی۔ مشعل کے گرد جیسے کسی نے فسوں طاری کر دیا تھا۔ اس کے اردگرد کی تمام آوازیں خاموش ہو چکی تھیں۔ اگر کوئی آواز تھی تو بس تیز ہوا کی گونج......

مشعل نے لرزتے ہاتھوں سے ''فالو'' پر کلک کیا۔ یہ اس کا جاننے والا پہلا شخص تھا جسے وہ فالو کر رہی تھی۔ وہ بھی اُس کے مرنے کے بعد......

☆☆☆

زرتاج اس رات وہاں سے اتنی تیزی سے بھاگی تھی کہ اسے کسی چیز کا ہوش نہیں رہا تھا۔ وہ گھر پہنچی تو اسے احساس ہوا کہ عالیان کا موبائل بھی وہ ہاتھ میں پکڑے ساتھ لے آئی تھی۔ وہ پوری رات اس نے لرزتے کانپتے گزار دی تھی۔ صبح بمشکل اس نے خود کو سنبھالا اور عالیان کے گھر پہنچ گئی۔ وہاں ماتم کا سماں تھا۔ عالیان کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے گئی ہوئی تھی۔ رات کو تو اسے کسی چیز کا ہوش نہیں تھا مگر اب وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں رات کو اسے کسی نے بلڈنگ سے نکلتے دیکھا تو نہیں؟ کہیں کوئی جان تو نہیں گیا کہ وہ اس وقت اس دیوانے کے ساتھ تھی جب وہ اپنی زندگی کا آخری رقص پیش کر رہا تھا۔

بلڈنگ کے گیٹ پر گارڈ موجود ہوتا تھا، لیکن اسے یاد پڑ رہا تھا کہ جب وہ گیٹ سے باہر نکلی تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ گارڈ شاید عالیان کی لاش دیکھ کے ادھر بھاگ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی عالیان کی لاش آ گئی۔ دن بھر کمرے میں محصور رہنے والے عالیان کے جنازے پر سیکڑوں لوگ آ گئے تھے۔ آج اس کے والدین کو بھی اپنی مصروفیات ترک کرنا پڑ گئی تھیں اور اس کے رشتے داروں کو بھی۔ اس کے کچھ کلاس فیلوز بھی اس کے جنازے میں شریک تھے۔ کسی کو علم نہیں تھا کہ عالیان کیسے چھت سے گرا۔ یہ راز صرف وہی جانتی تھی اور اس نے اسے دل میں ہی دفن کر لیا تھا۔

وہ اسے دل میں ہی دفن کر لیتی اگر وہ عالیان کی آخری ویڈیو ایک بار پھر نہ دیکھ لیتی۔ وہ عالیان کا موبائل تلف کرنے سے قبل ایک آخری بار اس کی ویڈیو دیکھنا چاہ رہی تھی۔

ویڈیو بناتے ہوئے تو اسے کسی چیز کا ہوش نہیں تھا مگر اب وہ ویڈیو کو بغور دیکھ رہی تھی۔ نئے نئے زاویوں کے ساتھ۔ اچانک وہ چونکی۔ عالیان نے بلندی سے کندھے جھکائے مسکرا کے ہلکا سا ہاتھ ہلایا تھا۔ ایسے جیسے وہ خدا حافظ کر رہا ہو۔ وہ جتنے اعتماد سے یہ کرتب پیش کر رہا تھا، بہ آسانی خود کو سیدھا کر سکتا تھا مگر اسے ایسا لگ رہا تھا کہ عالیان نے جان بوجھ کے خود کو نیچے گرایا ہے۔ اس نے ویڈیو ریوائنڈ کر کے بار بار دیکھی۔ ہر بار اس کے ذہن نے اس کے خیال کی توثیق کی۔

’اس نے ایسا کیوں کیا؟‘ اس نے سوچا۔

’ٹک ٹاک کی دنیا میں ہمیشہ امر ہونے کے لیے۔‘ اس کے ذہن نے فوراً جواب دیا۔

’اگر واقعی اس نے خود کو جان بوجھ کے نیچے گرایا ہے تو اس کی یہ ویڈیو مجھ پر قرض ہے۔‘ وہ ٹک ٹاک کی دنیا میں تہلکہ مچانا چاہتا تھا اور اب اس کے ہاتھ میں ایک ایسی ویڈیو موجود تھی جو اسے ٹک ٹاکرز کی دنیا میں ہمیشہ کے لیے امر کر دیتی۔ اگر وہ اس ویڈیو کو ضائع کر دیتی تو...... نہیں نہیں...... اس ویڈیو کی قیمت اس نے اپنی زندگی دے کے چکائی ہے۔ میں اسے ضائع نہیں کروں گی۔ میں اسے دنیا کو دکھاؤں گی۔

اس نے کچھ سوچ کے ویڈیو کی ایڈیٹنگ کی۔ اس میں کچھ ساؤنڈ ایفیکٹس ڈالے۔ ویڈیو کو فلٹرز سے مزید سحر انگیز کیا اور The last tik tok کے ہیش ٹیگ کے ساتھ عالیان کے اکاؤنٹ سے ہی پوسٹ کر دی۔ ویڈیو پوسٹ کرنے کے بعد اسے ایسا لگا جیسے اس کے کندھوں سے منوں بوجھ اتر گیا ہو۔ عالیان کی آخری خواہش بن کہے اس نے پوری کر دی تھی۔ وہ اسے جان گیا تھا۔ اسے یقین تھا وہ ایسا ہی کرے گی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اسے تلقین تک نہ کی تھی۔ ورنہ شاید وہ ویڈیو بنانے کے لیے ہرگز تیار نہ ہوتی۔

ویڈیو پوسٹ ہونے کے بعد فوراً ہر طرف چھا گئی۔ چند گھنٹوں میں ہی اس نے ملین کا فگر کراس کر لیا۔ زرتاج جوں جوں اس کی ویڈیو پر ریسپانس دیکھتی جا رہی تھی، اس کی آنکھوں میں نمی بڑھتی جا رہی تھی۔

’اگر آج وہ زندہ ہوتا تو کتنا خوش ہوتا۔‘ اس نے سوچا۔

لیکن اگر وہ زندہ ہوتا تو شاید اس ویڈیو پر اتنا رسپانس آتا ہی نہ۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس نے سیدھا ہونے کے بجائے قدموں کو چھوڑ دینا پسند کیا تھا۔ دیوانے نے عجیب طرح سے اپنا خود سے کیا گیا وعدہ پورا کیا تھا۔

چوبیس گھنٹے میں عالیان کی ویڈیو دس ملین سے زائد لوگ دیکھ چکے تھے۔ The last Tik Tok اس دن تمام سوشل میڈیا پلیٹ فارمز کا ٹاپ ٹرینڈ تھا۔

رات کے خبرنامے میں بھی تقریباً تمام چینلز پر عالیان کی آخری ٹک ٹاک پیش کی گئی تھی۔

’’ایک اور ستارہ ڈوب گیا۔‘‘ کے عنوان سے ایک چینل نے باقاعدہ پروگرام پیش کیا تھا۔ جس میں تجزیہ نگاروں نے اپنے اپنے خیالات پیش کیے تھے۔ کوئی اسے نوجوان نسل کی گمراہی سے تعبیر کر رہا تھا تو کوئی ایک بار پھر ٹک ٹاک کو ہمیشہ کے لیے بین کرنے کی باتیں کر رہا تھا۔ کوئی عالیان کو نفسیاتی مریض قرار دے رہا تھا تو کوئی اس کی وجوہات کے متعلق اندازے لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس چینل نے عالیان کے والدین سے بھی رابطہ کیا تھا۔ عالیان کی ماما روتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

’’ہم نے اپنے بیٹے کو ہر وہ چیز دی جس کی اس نے خواہش کی۔ پھر جانے اس نے ایسا خطرناک کام کیوں کیا؟‘‘

وہ کیا چاہتا تھا، اس کے ذہن میں آخری وقت کیا تھا، یہ اس کی ماں بھی شاید نہیں جان سکی تھی۔ یہ بس زرتاج جانتی تھی کہ اسے توجہ چاہیے تھی۔ توجہ کی بھوک نے ہی اسے اتنا خطرناک قدم اٹھانے پر مجبور کیا تھا۔ زندگی میں نہ سہی مرنے کے بعد اسے بھرپور توجہ مل گئی تھی۔

زرتاج نے آخری بار عالیان کا اکاؤنٹ دیکھا اور اسے لاگ آؤٹ کر دیا۔ ہمیشہ کے لیے......



فتنہ پرداز

غلام قادر

کہتے ہیں کہ وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ... یہی وجودِ زن کبھی کبھی کسی کی زندگی میں وبال کی صورت اختیار کر لیتا ہے... ایک دلنشیں حسینۂ جمال کا ماجرا... جس کے گرد پروانوں کا ہجوم رہتا تھا... خواہشات کی تکمیل اس کی زندگی کی اولین ترجیح تھی... محبت کے لبادے میں ایک شکاری تھا جو شکار کی تلاش میں سرگرداں تھا...

بے وفائی اور دغابازی کے ہتھیاروں سے لیس ایک شکاری کی مہمات...

میں لاہور سے کراچی کی فلائٹ میں تھا کہ میرے برابر والی سیٹ پر ایک ادھیڑ عمر کا شخص آ کر بیٹھ گیا۔ ''آپ تیمور ہی نا؟'' اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''آپ مجھے جانتے ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''تصویریں دیکھی تھیں آپ کی۔'' اس نے جواب دیا۔

''آپ کون صاحب؟'' میں نے اس کا تعارف چاہا۔



''مجھے انصر کہتے ہیں لیکن یہ تعارف آپ کے لیے ناکافی ہوگا۔''

''تو آپ مکمل تعارف کروادیں۔'' میں نے کہا۔

''میں آپ کی بیوی کا پہلا شوہر ہوں۔'' اس نے کہا اور میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

''شاداں کا؟'' میں نے کنفرم کرنے والے انداز میں کہا۔

''یہی نام ہے نا آپ کی بیوی کا؟'' اس شخص نے جواب میں کہا جس نے اپنا نام انصر بتایا تھا۔

''تو آپ کی اس سے علیحدگی کیوں اور کس طرح ہوئی؟'' میں نے سوال کیا اور وہ ہنسنے لگا۔

''ایک بڑے آدمی نے کہا، یہ طوائفیں دل بہلانے کے لیے ہوسکتی ہیں گھر بسانے کے لیے نہیں۔'' اس نے کہا۔

''میں سمجھا نہیں کیا آپ شاداں کو طوائف کہہ رہے ہیں؟'' میں نے غصے بھری آواز میں کہا۔

''میں نے اسے کچھ نہیں کہا لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ طوائف زادی تو ہے۔'' انصر نے کہا۔

''شاید آپ مجھے طیش دلانے کی کوشش کررہے ہیں؟'' میں نے پوری کوشش کی کہ مجھے غصہ نہ آئے۔

''دیکھیں ہم اس وقت جہاز میں ہیں۔ اس جہاز میں میرا کوئی جاننے والا نہیں ہے لیکن ایسے بہت سے لوگ ہوں گے جنہوں نے میری طرح آپ کی اور شاداں کی شادی کی تصویریں دیکھی ہوں گی۔'' انصر نے مجھے تنبیہ کی۔

''ابھی تک تو میں نے کسی نہ کسی طرح برداشت کیا ہے لیکن مزید اس طرح کی کوئی بات کی تو میں آپ کو بتادوں کہ میں کرانے جانتا ہوں۔''

''میں تو آپ کے بھلے کے لیے کہہ رہا تھا۔'' انصر کا لہجہ نرم تھا۔

''مجھے آپ زخمی کردیں گے یا میرا ہاتھ توڑ دیں گے لیکن کل کے اخبارات کی سرخیوں کے بارے میں بھی سوچا ہے کہ کیا ہوں گی؟''

''مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔'' میں نے کہا اور اس نے پھر سے ہنسنا شروع کردیا۔

''یقینی طور پر اپنے ساتھ ہونے والی حرکت کی پروا نہیں ہوگی۔ شاید جیل جانے سے بھی آپ نہیں گھبراتے ہیں لیکن اس کا نتیجہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جب آپ جیل سے واپس آئیں تو آپ کی نوکری نہ رہے۔'' انصر کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

''میں نے جب کہا کہ مجھے اس کی پروا نہیں تو یہ تمام باتیں بے معنی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''بات آپ کی ذات تک محدود نہیں رہے گی بلکہ اخبارات میں موضوع شاداں بنے گی۔'' انصر نے کہا۔

''وہ کس طرح؟'' میں سوال کیے بنا نہیں رہ سکا۔

''اخبار کی خبر ہوگی کہ شاداں کے نئے شوہر نے پرانے شوہر کو زدوکوب کیا۔'' انصر نے مسکراتے ہوئے تصویر کا دوسرا رخ دکھایا اور میں ایک گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

''ویسے تم شکل سے اتنے احمق نظر نہیں آتے۔'' ایک مختصر سے وقفے کے بعد انصر نے کہا اور میں اسے گھور کر رہ گیا۔

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' میں نے سوال کیا۔

''تم نے ابھی سوال کیا تھا کہ میں نے شاداں سے کیوں اور کس لیے علیحدگی اختیار کی۔'' انصر نے کہا۔

''ہاں تو جواب دو۔''

''علیحدگی میں نے نہیں، اس نے لی تھی۔'' انصر اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا۔

''وجہ کیا تھی؟'' میں نے کہا اور انصر مسکرانے لگا۔

''شاداں جب میرے نکاح میں آگئی تو میں کروڑ پتی تھا یوں سمجھو کر میرے اکاؤنٹ میں اس وقت بائیس کروڑ تھے جس میں سے ایک کروڑ شاداں کی ماں کو... شادی سے پہلے ادا کیے تھے۔'' انصر نے کہا۔

''ہم نے تو کورٹ میرج کی ہے۔'' میں نے کہا۔

''یہ اخبار میں پڑھ چکا ہوں۔ تصویریں دعوتِ ولیمہ کی تھیں جس کے اخراجات یقینی طور پر تم نے ادا کیے ہوں گے۔'' انصر نے کہا۔

''ولیمہ تو دولھا کے ذمے ہی ہوتا ہے۔'' میں نے اپنے طور پر دلیل دی۔

''اس شادی میں بھی اس کا کوئی نقصان نہیں ہوا۔'' انصر نے ایک اور پہلو سے وار کیا۔

''اس نے ڈیفنس والی کوٹھی جو اس کے نام پر تھی، میرے نام کردی۔'' میں نے اس کے جواب میں کہا اور اس کے چہرے کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

''تم ڈیفنس فیز ٹو والی کوٹھی کی بات تو نہیں کررہے؟'' انصر نے عجیب سے لہجے میں سوال کیا۔ ''وہ کوٹھی میں نے ہی خرید کر اس کے نام پر کی تھی۔'' انصر نے کہا۔

''کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟'' میں نے تیز لہجے

میں سوال کیا۔

''ثبوت تو ہیں لیکن لاہور میں ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''صرف کوٹھی کے نہیں بلکہ اور بھی بہت سے ثبوت ہیں۔'' انصر نے کہا۔

''اور وہ سب لاہور میں ہوں گے؟'' میں نے کہا۔

''میری رہائش لاہور میں ہے تو ثبوت بھی لاہور میں ہی ہوں گے۔'' انصر نے میرے طنز کو محسوس کرتے ہوئے جواب دیا تھا۔

''تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ مجھے دوبارہ سے لاہور آنا پڑے گا۔''

''میں بالکل یہ نہیں کہہ رہا ہوں نہ میرے ذہن میں یہ ہے کہ تمہاری نئی شادی کو ختم کروادوں۔'' انصر نے کہا۔

''تو پھر اس گفتگو کا مقصد کیا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''جو عمارت جھوٹ پر کھڑی ہوتی ہے، وہ دیر پا نہیں ہوتی۔'' انصر نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''میں سمجھا نہیں؟'' میں نے کہا۔

''اس نے اپنی پرانی شادیوں کو تم سے چھپایا، اس طرح اس نے تم سے جھوٹ بولا۔'' انصر نے اپنے فقرے کی تائید چاہی۔

''شاداں کو پرپوز میں نے کیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''اس کی خوب صورتی سے متاثر ہو کر؟'' انصر نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

''اس وقت وہ تمہارے ذہن پر قابض ہے اس لیے وہ تمہیں خوب صورت ہی نظر آئے گی۔'' انصر نے کہا۔

''تو کیا وہ خوب صورت نہیں ہے؟'' میں نے سوال کیا۔ ''اگر وہ خوب صورت نہیں ہے تو تم نے اس سے شادی کیوں کی تھی؟'' میں نے سوال کیا۔

''میں ایک پرانا تماش بین ہوں۔'' انصر نے کہنا شروع کیا۔ ''شاداں جب پہلی بار اپنی بڑی بہن کے مجرے میں آکر بیٹھی تو میں نے اسے اپنا بنانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔'' انصر نے کہا۔

''تو کیا وہ اس وقت خوب صورت نہیں تھی؟'' میں نے پھر پوچھا۔

''جسے تم خوب صورتی کہہ رہے ہو، یہ سب میری دولت کا کمال ہے۔'' انصر نے کہا۔

''میں اسے لے کر کینیڈا گیا جہاں پلاسٹک سرجری کرنے والوں کے ایڈریس پہلے سے اس کے پاس تھے۔ میری غیر موجودگی میں یہ ان پلاسٹک سرجری والوں سے رابطہ کرتی تھی اور جس روز کا ٹائم فکس ہوتا تھا، اس روز بتاتی تھی۔''

''کیا کیا کروایا اس نے کینیڈا میں۔'' میں نے سوال کیا۔

''اپنی چوڑی اور بھدی ناک کو اس نے کہہ کر ستواں کروایا بلکہ فرمائش کی کہ سری دیوی جیسی ناک بنادیں ساتھ ہی اس نے بڑے ہونٹوں کو پنکھڑی گلاب کی جوائی اور آنکھوں کو بھی بڑا کروانے کے ساتھ پرمننٹ میک اپ بھی کروالیا۔'' انصر نے تفصیل بتائی۔

''کینیڈا سے واپسی پر ہی اسے ٹی وی ڈرامے ملے اور اتنے ملے کہ وہ ٹی وی کی سپر اسٹار بن گئی۔''

''اس کا مطلب ہے کہ شاداں نے مجھ سے جھوٹ بولے تھے۔'' میرے ذہن میں خیال آیا اور ایک ایک کر کے مجھے شاداں کے جھوٹ یاد آنے لگے۔

''میرے والد آرمی میں اعلیٰ افسر تھے۔ نصرت ٹھاکر سمیت بہت سے ٹی وی پروڈیوسرز سے ان کی دوستی تھی۔ ایک روز پاپا نے ان کو ڈنر پر مدعو کیا ہوا تھا۔ وہیں ٹھاکر صاحب نے مجھے ایک سیریل میں کام کرنے کی آفر کی۔ والد صاحب نے اجازت نہیں دی لیکن بعد میں میری ضد کے آگے انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ ایک بار ٹی وی پر آگئی تو آہستہ آہستہ سارے راستے کھلتے چلے گئے اور میں فلموں میں بھی آگئی۔ ایک فلم ہٹ ہوئی تو دوسری فلم مل گئی اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔'' میں شاداں کے جھوٹ کو یاد کرتے ہوئے کچھ دیر کے لیے ماضی میں کھو گیا تھا۔

''تم کسٹم میں ہو... نا؟'' انصر کی آواز میرے کانوں میں آئی تو میں نے چونک کر اسے دیکھا لیکن جواب دینے سے گریز کیا۔

''جب تم شاداں کے ماضی کو جانتے ہو تو یہ بھی جانتے ہو گے کہ اس کے والد کون ہیں؟'' میں نے انصر کو جواب دینے کے بجائے سوال کردیا۔

''اس حد تک صحیح ہے کہ یہ بریگیڈیئر احتشام کی بیٹی ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ انہوں نے اس کی ماں سے کبھی نکاح نہیں کیا بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اس کی ماں ان کی رکھیل تھی۔'' انصر اتنا کہہ کر رک گیا۔

''مگر شاداں کا کہنا تو کچھ اور ہے۔'' میں نے کہا اور انصر کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

''احتشام صاحب نے گزشتہ انتخابات میں خاموشی

ختم کی تھی۔

''ویسے تمہاری اور شاداں کی شادی میری سمجھ سے بالاتر ہے۔'' انصر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا سمجھ نہیں آتی؟'' میں نے سوال کیا۔

''وہ لاہور میں ہے اور تم کراچی میں۔'' انصر نے کہا۔

''شاداں نے دو سیریل ٹی وی کے اور ایک فلم کراچی میں سائن کی ہے۔'' میں نے کہا اور انصر ہنسنے لگا۔

''اس نے سائن ضرور کیے ہیں لیکن شوٹنگ کراچی میں نہیں ہوگی۔ یہ میری پیش گوئی ہے۔'' انصر نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''تمہارا علم نجوم میں بھی عمل دخل ہے۔'' میں نے سوال کیا اور انصر کی ہنسی تیز ہوگئی۔

''میں علم نجوم سے واقف ہوتا تو ایک بے وفا پر کروڑوں روپے کیوں ضائع کرتا؟'' انصر نے کہا۔

''بقول تمہارے کروڑوں روپے ضائع کر کے تمہیں عقل آگئی، ویسے اب کیا کر رہے ہو؟'' میں نے سوال کیا۔

''میری ساری توجہ کاروبار کی طرف ہے۔'' انصر نے جواب میں کہا۔ ''اور اللہ کا شکر ہے کہ میں اپنی ساکھ بحال کرنے میں کامیاب ہوگیا ہوں۔'' انصر کا جواب تھا۔

میں یہ سوال کیے بنا نہیں رہ سکا کہ ''کیا کاروبار ہے؟''

''گجرات میں میرا پنکھوں کا کارخانہ ہے اور شیخوپورہ میں ہماری خاندانی زمینیں ہیں۔'' انصر کا جواب تھا۔

''تو اب تمہاری توجہ کاروبار پر ہے؟''

''کافی عرصے بعد ہمیں ایکسپورٹ کا آرڈر ملا ہے اور ہم اسے پورا کرنے میں مصروف ہیں۔'' انصر کا جواب تھا۔

''یہ ہم سے کیا مراد ہے؟'' میں نے پوچھ ہی لیا۔ انصر کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ آگئی۔

''ہم سے مراد میں اور میرے دو چھوٹے بھائی۔'' انصر نے جواب دیا۔

''تو یہ کاروبار تمہارا خاندانی کاروبار ہوا۔'' میں نے کہا اور انصر کی گردن اثبات میں ہل گئی۔

''میرے دادا نے اس کی بنیاد رکھی اور والد صاحب نے اسے ترقی دی۔''

''اور تم نے اسے تباہ کرنے کی پوری کوشش کی۔'' میں نے کہا اور انصر بہت آہستہ سے ہنس دیا۔

''حال ہی میں اپنے بیٹے کو بھی اس کاروبار میں شریک کرلیا ہے۔ ابھی اس نے میٹرک کیا ہے لیکن میں نے اس لیے اسے شریک کرلیا کہ پڑھائی کے ساتھ وہ کاروبار بھی سمجھ لے۔''

''تمہارا بیٹا......!'' میں نے فقرہ ادھورا چھوڑا تھا لیکن وہ سمجھ گیا کہ میں کیا پوچھنا چاہ رہا ہوں۔

''آپ صحیح سمجھے وہ شاداں کا ہی بیٹا ہے۔'' انصر نے کہا۔

''جب تمہاری علیحدگی ہوئی، وہ کتنا بڑا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''جس روز شاداں نے خلع لی تھی اس سے اگلے روز اکبر کی تیسری سالگرہ تھی۔'' انصر کا جواب تھا۔

''تو بیٹے کی پرورش تم نے ہی کی ہے؟'' میں نے سوال کیا اور اس کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

''اکبر کی پرورش میں میری بہن کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اس کی شادی کے بعد میرے چھوٹے بھائی کی بیوی نے یہ ذمے داری سنبھال لی۔''

''تم یہ کہہ رہے ہو کہ علیحدگی کے بعد شاداں نے کوئی رابطہ نہیں رکھا؟''

''اسے ضرورت نہیں رہی تھی۔'' انصر کا جواب تھا۔ ''ٹی وی اور فلم سے اسے اتنی آمدنی ہوجاتی تھی کہ اس کا اور اس کے گھر والوں کا خرچ آرام سے چل جاتا تھا اور اب تمہاری شکل میں اسے ایک اچھا بکرا مل گیا ہے۔''

''مجھ سے اس نے آج تک کوئی رقم نہیں مانگی۔'' میں نے کہا۔ ''البتہ میں اپنی مرضی سے تحفے دیا کرتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''وہ خود سے فرمائش نہیں کرتی؟'' انصر نے سوال کیا۔

''نہیں کبھی نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''جب وہ میری بیوی تھی تو فرمائشوں کے ڈھیر لگا دیتی تھی۔ خیر اس کے کمانے کے اور بھی ذریعے ہیں۔'' انصر نے کہا اور میں پھر سمجھا کہ وہ مجھے طیش دلانے کی کوشش کر رہا ہے لیکن میں نے پوری کوشش سے اپنے غصے پر قابو رکھا اور صرف اسے گھور کر رہ گیا۔

''شاداں اب تمہاری بیوی ہے تو تم رضوان سے تو ضرور واقف ہوگے؟'' انصر نے سوال کیا۔

''رضوان جو اس کا کزن ہونے کے ساتھ اس کا بزنس منیجر بھی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''یہ دونوں بتائے تھے شاداں نے کوئی غلط بات نہیں کی۔'' انصر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔ دراصل رضوان ہی وہ ذریعہ تھا جس کے توسط سے میرا شاداں سے تعارف ہوا تھا۔

مجھے شاداں سے شادی پر رضوان نے ہی اکسایا تھا بلکہ ہمارے نکاح کے انتظام بھی اسی نے کیے تھے بلکہ نکاح کا ایک گواہ بھی وہی تھا۔ شاداں نے اس کا تعارف اپنے کزن کے طور پر کروایا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ وہ اس کا پی اے کم بزنس منیجر ہے۔

''رضوان اس کی خالہ کا بیٹا ضرور ہے مگر اس کی خالہ کا تعلق بھی اسی علاقے سے ہے جس سے شاداں کی والدہ کا تھا۔''

''اب تو وہ ماڈل ٹاؤن میں ہیں۔'' میں نے کہا اور انصر ہنسنے لگا۔

''کوٹھے سے بہت سے لوگ کوٹھیوں میں منتقل ہو گئے ہیں لیکن ذریعۂ آمدنی وہی ہے۔ وہ تبدیل نہیں ہوا۔'' انصر نے کہا۔

''ایک بار پھر تم مجھے طیش دلا رہے ہو۔'' میں نے کہا اور انصر ہنسنے لگا۔

''میں نے ایسی کیا غلط بات کر دی ہے۔'' اس نے کہا اور میں صرف اسے گھور کر رہ گیا۔

''رضوان وہ شخص ہے جو دس برس پہلے ہوتا تو اس کے کندھے پر رومال ہوتا۔'' انصر نے کہا۔

''مجھے مجبور نہ کرو کہ میں اپنے حواس کھو بیٹھوں۔'' میں نے کہا۔ ''جب وہ لاکھوں اپنی ایکٹنگ سے بنا لیتی ہے تو اسے یہ گھٹیا کام کرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' میرے لہجے سے غصہ صاف ظاہر تھا۔

''یہ وہ خواتین ہوتی ہیں جن کی پیسے کی ہوس ختم نہیں ہوتی۔'' انصر نے کہا اور میں نے ائرہوسٹس کو بلانے کے لیے بیل بجا دی۔ وہ آئی تو میں نے کہا۔

''میری سیٹ چینج کر دو۔''

ائرہوسٹس نے مجھے دیکھا اور کہا۔ ''سر فلائٹ پیک ہے آپ نظر ڈال لیں اگر کوئی سیٹ خالی نظر آئے تو مجھے بتا دیں میں اس پر آپ کو بٹھا دوں گی۔''

میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر نظر دوڑائی۔ سب سے پہلی نشست میں مجھے ایک سیٹ خالی نظر آئی تھی۔ میں نے اس کی جانب اشارہ کیا تو ائرہوسٹس نے کہا۔ ''سر وہ سیٹ خالی نہیں ہے اس پر جو شخص تھا وہ شاید واش روم گیا ہوگا۔'' ائرہوسٹس کی بات سن کر میں دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

''تم سیٹ کیوں بدلنا چاہتے ہو؟'' انصر نے میرے بیٹھنے کے بعد کہا۔ ''میں تو صرف تمہیں خبردار کر رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''جو کام میں نے اب کیا ہے وہ برسوں پہلے تم بھی کر چکے ہو۔'' میں نے کہا اور انصر کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

''جس طرح آج تم بھڑک رہے ہو اس طرح میں بھی بھڑک اٹھا تھا جب مجھے سمجھایا جا رہا تھا۔'' انصر نے کہا اب میرے مسکرانے کی باری تھی۔

''تو تم اعتراف کر رہے ہو کہ تم بھی شاداں کے زلف کے اسیر رہے ہو؟'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں نے اس سے کب انکار کیا ہے؟'' انصر نے جواب دیا۔

''جب اپنے وقت میں تم نے کسی کی بات نہ مانی نہ سمجھی تو اب تم یہ کیوں چاہ رہے ہو کہ میں تمہاری بات مانوں گا اور تمہارے کہنے پر عمل بھی کروں گا۔''

''شاید تم صحیح کہہ رہے ہو اس معاملے میں جب تک ٹھوکر نہ لگے بندہ نہ کچھ سمجھتا ہے نہ مانتا ہے۔'' انصر نے کہا۔

''تو پھر انتظار کریں کہ مجھے کب ٹھوکر لگتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''عورت کی بے وفائی کا زخم بہت دیر میں بھرتا ہے۔ خاص طور پر جب وہ اولاد کو آپ کے پاس چھوڑ کر چلتی بنے۔'' انصر نے کہا۔

''کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ماں کو اولاد سے بچھڑنے کا کوئی غم نہیں ہوتا؟'' میں نے سوال کیا۔

''عام عورتوں کو شاید ہوتا ہو لیکن وہ خواتین جن کی تربیت ایسے ماحول میں ہو جہاں لڑکوں کی کوئی اہمیت نہ ہو انہیں بیٹے سے جدائی کا کوئی غم نہیں ہوتا۔'' انصر نے کہا۔

''میں نے شاداں میں ایسی کوئی بات نہیں دیکھی۔'' میں نے کہا اور انصر مسکرانے لگا۔

''اس غم سے بچنا چاہتے ہو تو شاداں سے اولاد نہ ہونے دینا بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ وہ خود تم سے اولاد پیدا نہیں ہونے دے گی۔'' انصر نے کہا اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ عجیب شکی مزاج شخص ہے۔

''تمہارے اس فقرے سے تمہاری اور شاداں کی علیحدگی کی وجہ سمجھ میں آ گئی ہے۔'' میں نے کہا اور انصر نے مجھے حیرت سے دیکھا جیسے معلوم کرنا چاہتا ہو کہ کون سی وجہ

ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں ابھرتا سوال سمجھ لیا اور وہی کہا جو میرے ذہن میں آیا تھا۔ ”تم بنیادی طور پر ایک شکی آدمی ہو اور شاداں ایک آزاد پنچھی کی طرح ہے وہ پابندیاں برداشت کرنے کی عادی نہیں ہے۔“ میں نے کہہ دیا اور انصر کی آنکھوں میں غصے کی لہر ابھری تھی۔

”میری اور تمہاری لغت میں فرق ہے۔“ اس نے کسی قدر غصے بھری آواز میں کہا۔

”تمہاری لغت میں ہر وہ عورت جو گھر سے نکل کر کام کرتی ہے، وہ کرپٹ ہوتی ہے شاید یہ تمہارے گھٹے ہوئے ماحول میں ہونے والی تربیت کا نتیجہ ہے۔“ میں نے کہا اور انصر کی آنکھوں میں ابھرنے والا غصہ بڑھتا چلا گیا۔

”اور تم ایسا نہیں سمجھتے کیونکہ تم شہر کے آزاد ماحول میں پلے بڑھے ہو۔“ اس کے لہجے میں غصے کے سوا کچھ نہیں تھا۔

”میں ایسے اسکولوں میں پڑھا ہوں جہاں لڑکے اور لڑکیاں ایک ہی کلاس میں ہوتے تھے اور ایسے ہی کالجوں میں پڑھا ہوں، یونیورسٹی میں بھی یہی ماحول تھا بلکہ تمہیں یہ اطلاع بھی دیتا چلوں کہ اسکول سے لے کر یونیورسٹی تک میری دوستی لڑکیوں سے زیادہ رہی ہے بلکہ ان میں سے چند ایک سے اب بھی رابطے میں ہوں۔“

”اور تم انہیں اپنا دوست بھی کہتے ہو؟“ انصر نے کہا اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

”ان میں دو ایسی ہیں جو اس استقبالیہ میں بھی موجود تھیں جو میں نے شاداں سے شادی کے سلسلے میں دیا تھا۔“

”تم یہ بات فخریہ کہہ رہے ہو؟“ انصر نے سوال کیا اور میں ہنسنے لگا۔

”مجھے ایک بات کی وضاحت کریں۔“ میں نے کہنا شروع کیا۔ ”آپ نے ہی مجھے بتایا کہ آپ شاداں کی ماں کے کوٹھے پر جاتے رہے ہیں اور وہیں آپ نے پہلی بار شاداں کو دیکھا اور اس کی زلف کے اسیر ہو گئے جبکہ بقول آپ کے شاداں کی خوب صورتی یعنی آج کی خوب صورتی میں آپ کی دولت کا پورا دخل ہے۔ شاداں نے ناک کی، ہونٹوں کی اور آنکھوں کی پلاسٹک سرجری کروائی تو رقم آپ نے ادا کی پھر یہ بھی بتایا کہ شاداں کی ماں کو شاداں سے شادی کے لیے آپ نے کروڑ روپے دیے۔“ میں نے کہا اور انصر کی آنکھوں میں موجود غصہ بڑھتا چلا گیا۔

”کہنا کیا چاہ رہے ہو؟“ انصر نے سوال کیا۔

”آپ نے اپنی گفتگو کے آغاز میں مجھے بے وقوف ہونے کی سند تھما دی تھی۔ میں اس کا جواب دے رہا تھا۔“ میں نے کہا اور انصر کا منہ بن گیا۔

”بڑے اچھے لفظوں میں آپ نے مجھے بے وقوف کہہ دیا۔“ انصر نے کہا۔

”میں نے کوئی بات اپنی طرف سے نہیں کی صرف وہ باتیں دہرائی ہیں جو آپ نے ابھی چند منٹ پہلے کہی تھیں۔“ میں نے کہا اور انصر سوچ میں ڈوب گیا۔

”اگر تم یہ ثابت کرنا چاہتے ہو کہ میں نے حماقت کی شاداں سے شادی کر کے یا اس پر کروڑوں خرچ کر کے تو میں اعتراف کرتا ہوں کہ ہاں میں احمق تھا۔ میں نے حماقت کی کہ شاداں سے شادی کی لیکن اب میں چاہتا ہوں کہ کوئی دوسرا شخص اس حماقت کا شکار نہ ہو۔“ انصر نے وضاحت کی۔

”آپ نے خود تسلیم کر لیا کہ آپ احمق تھے اس لیے آپ سے یہ حماقتیں ہوئیں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن میں یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ ماضی کی بات نہیں ہے آج آپ یہ حماقت کر رہے ہیں کہ ایک شخص جس کی شادی کو ابھی چند ہفتے ہوئے ہیں، کوشش کر رہے ہیں کہ وہ اپنی بیوی سے متنفر ہو جائے اور اس کے لیے آپ ہر حد پار کر رہے ہیں۔“ میں نے کہا اور انصر نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں نے کوئی غلط بات کر دی ہو۔ ”اور اس میں آپ نے اس بے چارے رضوان کو بھی گھسیٹ لیا کہ دس برس پہلے وہ کندھے پر رومال رکھے گھومتا تھا۔“

”تم مجھے جو چاہو کہو لیکن وقت ثابت کرے گا کہ میری کہی ہوئی ایک ایک بات صحیح ہے۔“ انصر نے کہا۔

”تو پھر اس وقت کا انتظار کریں جب مجھ پر بقول آپ کے حقیقت آشکار ہوگی۔“

”میں تو انتظار کر لوں گا لیکن آپ بتائیں کہ جب حقیقت آشکار ہوگی تو آپ کیا کریں گے؟“ انصر نے خبردار کرنے والے انداز میں کہا۔

”میں یقینی طور پر وہ نہیں کروں گا جو آپ نے کیا یعنی جب آپ نے اسے طلاق دینے سے انکار کیا تب ہی تو وہ عدالت گئی اور اس نے آپ سے خلع لی۔“ میں نے کہا اور انصر پوری طرح غصے میں آ گیا۔

”کچھ دیر پہلے تم نے سیٹ بدلنے کی بات کی تھی۔ اب میں ائرہوسٹس کو بُلا کر اپنی نشست تبدیل کرنے کی بات کر رہا ہوں۔“ انصر نے کہا اور ساتھ ہی ائرہوسٹس کو بلانے کے لیے بٹن دبا دیا۔

ائرہوسٹس آئی اور اس کا جواب وہی تھا جو اس نے مجھ سے کی تھی۔ ”پوری فلائٹ فل ہے اس لیے وہ سیٹ تبدیل نہیں کر سکتی۔“ انصر سر ہلانے کے سوا کچھ نہیں کر سکا۔

انصر نے ائرہوسٹس کا انکار سنا اور اس کے ساتھ... وہ واپس سیٹ پر بیٹھا نہیں بلکہ واش روم کی طرف بڑھ گیا اور اس وقت تک واپس نہیں آیا جب تک جہاز نے لینڈ نہیں کرلیا۔

اس وقت جب انصر برابر کی سیٹ پر موجود نہیں تھا، میں نے شاداں کے فون پر ڈائل کیا لیکن جواب نہیں ملا۔ جب جہاز میں اعلان ہوا کہ ہم کچھ دیر بعد کراچی ائرپورٹ پر لینڈ کریں گے تو میں نے دوبارہ رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ اس بار رابطہ ہوگیا۔ ''کہاں ہو؟'' میں نے سوال کیا۔

''ائرپورٹ پر تمہاری آمد کی منتظر ہوں۔'' شاداں کا جواب تھا۔

''چند منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''یہاں بورڈ پر طیارے کی آمد کا اعلان ہو چکا ہے۔'' شاداں نے کہا۔

''اسی لیے کہہ رہا ہوں بس چند منٹ اور...... تمہارے ساتھ کون ہے؟'' میں نے ایک اور سوال کیا۔

''میں نے کہا تھا کہ آج کی تاریخ سے میری شوٹنگ کا آغاز ہوگا تو رضوان اس لیے ساتھ ہے کہ یہ معاملات طے کر سکے۔''

''کیسے معاملات؟'' میں سوال کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

''وہ ایک نئی فلم کی آفر تھی جس کی شوٹنگ بیرونِ ملک ہونی تھی۔'' شاداں نے جواب میں کہا۔

''رضوان تو اس فلم میں نہیں ہوگا تو وہ کیوں آیا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''کیا ہوگیا ہے جان آپ کو۔'' شاداں کا جواب تھا۔ ''آپ اچھی جانتے ہیں کہ میرے تمام معاملات رضوان ہی ڈیل کرتے ہیں اور چونکہ پروڈیوسرز کا تعلق کراچی سے ہے اس لیے میں اسے ساتھ لے آئی تھی۔'' شاداں نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ رضوان ہمارے ہی مکان میں مقیم ہوگا؟'' میں نے سوال کیا۔

''یہ تم کس قسم کے سوالات کر رہے ہو ظاہر ہے میرے ساتھ آیا ہے تو وہیں رہے گا جہاں میرا قیام ہوگا۔'' شاداں کا جواب تھا اور ایک ٹھنڈی آہ بھرنے کے سوا میرے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔

''شوٹنگ رات میں ہوتی ہے تو رضوان ہی مجھے چھوڑنے جاتا ہے اور وہاں سے واپسی پر یعنی مجھے لوکیشن پر چھوڑ کر واپس آجاتا ہے۔'' شاداں نے کہا تھا اور پہلی بار مجھے انصر کی باتوں میں حقیقت محسوس ہونے لگی۔ شاداں اپنی بات کہہ چکی تھی تبھی انصر واپس آکر برابر کی سیٹ پر بیٹھ گیا لیکن بیٹھنے سے پہلے اس نے مجھ پر ایک بھرپور نظر ڈالی تھی۔

''شاداں ائرپورٹ پہنچ چکی ہے۔'' میں نے اس سے کہا۔

''یہ تو بہت اچھی خبر سنائی۔'' انصر نے کہا۔ ''اب ائرپورٹ پر بھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوجائے گا۔'' انصر نے کہا۔

''مجھے آپ سے یہی توقع تھی کہ ائرپورٹ پر بھی کوئی ہنگامہ کریں گے لیکن میں ایسا کچھ نہیں چاہتا۔'' میں نے کہا اور انصر مجھے حیرت سے دیکھنے لگا۔

''کیا چاہتے ہو؟'' انصر کا سوال تھا۔ اس کا لہجہ عجیب سا تھا۔ ''میں اس سے صرف یہ معلوم کروں گا کہ وہ مجھے پہچانتی ہے یا نہیں۔'' انصر نے کہا۔

''یہ بات آپ کسی جگہ بھی معلوم کر سکتے ہیں جہاں میڈیا موجود نہ ہو۔'' میں نے کہا اور انصر کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھرے جیسے اسے میری بات پسند نہ آئی ہو۔

''ائرپورٹ پر کیوں نہیں؟'' اس نے سوال کیا۔

''اس لیے نہیں کہ ائرپورٹ پر میڈیا اور اس کے کیمرے موجود ہوں گے اور میں نہیں چاہتا کہ تماشا بنے اور ہیڈلائن میں نشر ہو۔'' میں نے کہا۔

جب وہ یہ بات کہہ رہا تھا تو طیارے کے پہیوں نے گراؤنڈ چھولیا تھا۔ ایک ہلکا سا جھٹکا لگا اور انصر کی بات ادھوری رہ گئی۔

''میں وعدہ کرتا ہوں کہ مختصر کروں گا۔''

''مجھے خطرہ آپ سے نہیں، شاداں اور رضوان سے ہے۔'' میں نے کہا اور انصر کچھ مطمئن سا ہوگیا۔

''ویسے مجھے آپ کے وعدے پر بھی اعتبار نہیں ہے۔'' میں نے کہا اور وہ مجھے گھور کر رہ گیا اور اس کی آنکھوں میں سوال ابھرے۔

اس سے پہلے کہ انصر اپنی آنکھوں میں ابھرنے والے سوالات کا زبان سے اظہار کرتا، میں نے کہنا شروع کردیا۔

''آپ یقینی طور پر ان باتوں کو دہرائیں گے جو مجھ سے کرتے رہے ہیں اور شاداں ان باتوں کو سختی سے دہرائے گی کیونکہ وہ ایسی خاتون نہیں ہے کہ آسانی سے ان الزامات کو قبول کرے گی اور نتیجے میں ائرپورٹ پر ایک تماشا ہوگا جو میں کبھی بھی نہیں چاہوں گا۔''

''اگر میں تمہاری بات مان لوں تو وہ کون سی جگہ تجویز کرو گے جہاں میرا اور شاداں کا سامنا ہو۔'' انصر نے کہا اور میں کچھ دیر خاموش رہا۔

"آپ کو وہ مکان تو یاد ہی ہوگا جو بقول آپ کے شاداں کو خرید کر دیا تھا۔" میں نے کہا۔

"اور شاداں نے تمہارے نام پر کر دیا ہے۔" انصر نے وضاحت چاہی۔

"بالکل وہی۔" میں نے کہا اور انصر صرف گردن ہلا کر رہ گیا۔

"ایک بات اور۔" میں نے کہنا شروع کیا۔

"اب کیا بات ہے؟" انصر نے کہا۔

"میں تم سے پہلے اتروں گا کیونکہ میرا ٹوٹل سامان اس چھوٹے بیگ میں ہے جو میں نے ہینڈ کیری کیا ہے۔" میں نے کہا۔

"اس سے کیا فرق پڑے گا؟" انصر نے کہا۔

"شاداں کے ساتھ رضوان بھی ائرپورٹ آیا ہے اور وہ بہت تیز آدمی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی طور شاداں کے علم میں یہ بات آئے کہ میں اور تم ایک ہی فلائٹ سے آئے ہیں۔" میں نے کہا اور انصر کے چہرے کی مسکراہٹ تیز ہو گئی۔

"بہت ڈرتے ہو شاداں سے۔" انصر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔

"بس یہ نہیں چاہتا کہ ہمارے درمیان یعنی میرے اور شاداں کے درمیان جو اختلافات ہوں، وہ منظر عام پر آئیں۔" میں نے کہا اسی دوران اناؤنس ہوا کہ مسافر ایک ایک کر کے جہاز سے اتریں۔ اس اعلان کے ساتھ جہاز میں ہڑبونگ سی مچ گئی۔ لوگ اپنے اپنے ہینڈ کیری نکالنے لگے۔ میں بھی اپنی جگہ سے اٹھا اور ہینڈ کیری نکال کر جہاز کے داخلی دروازے کی جانب بڑھا۔ کچھ دور آنے کے بعد مڑ کر دیکھا تو انصر اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا تھا اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے مطمئن کیا اور میں آگے بڑھ گیا اور جہاز سے نیچے اُتر آیا۔ میں لاؤنج میں پہنچا تو شاداں نظر آئی۔ وہ ٹی وی کیمروں میں گھری ہوئی تھی۔ رپورٹر سوال کر رہے تھے اور وہ جواب دے رہی تھی۔ شاداں سے پہلے رضوان نے مجھے دیکھا اور آگے بڑھ کر میرا بیگ لے لیا۔ اس کے بعد شاداں آگے بڑھی۔ "سفر خیریت سے گزرا؟" اس نے سوال کیا۔

اور بہت سے لوگ جن میں چند لڑکیاں بھی تھیں آگے آئیں "میڈم سیلفی۔" ایک آواز آئی اور شاداں ان کی خواہش کے احترام میں سیلفیاں کھنچوانے لگی۔ ایک بار اس نے مجھے بھی دعوت دی کہ میں سیلفیوں میں شریک ہو جاؤں لیکن میں نہیں گیا۔ "میں یہاں ٹھیک ہوں۔" میں نے کہا۔ میں نے شاداں کو انکار کیا ہی تھا کہ رضوان نے سرگوشی کی۔ "سر یہ میڈم کے فین ہیں۔" اس نے اپنے ساتھ کھڑی دو لڑکیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ آپ کے ساتھ سیلفی لینا چاہتی ہیں۔"

"فین یہ شاداں کی ہیں اور سیلفی میرے ساتھ لینا چاہتی ہیں؟ میں کچھ سمجھا نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"سر آپ ان کے شوہر ہیں اس لیے ان کا حق بنتا ہے کہ یہ اپنی پسند پر ہیروئن کے شوہر کے ساتھ سیلفی بنوائیں۔" رضوان نے ان لڑکیوں کی ترجمانی کی۔ مگر میں مسکراتا رہا۔

"تم جانتے ہو کہ میں اس کی فلمیں اور ڈرامے تک نہیں دیکھتا۔" میں نے رضوان کو جواب دیا جو ان دونوں لڑکیوں تک بھی پہنچ گیا۔

"جب آپ نے شاداں میڈم کی فلم نہیں دیکھی اور نہ ہی ڈرامے دیکھے تو ان سے شادی کیوں کر لی؟" ان میں سے ایک لڑکی نے جو زیادہ ماڈرن ڈریس میں تھی اور زیادہ ہی بولڈ تھی، سوال کر دیا۔

"یہ ایک لمبی کہانی ہے۔" میں نے کہا آئندہ کسی ملاقات میں سنا دوں گا۔"

"مگر ملاقات ہوگی کیسے نہ میرا نمبر آپ کے پاس ہے نہ آپ کا نمبر میرے پاس تو پھر ملاقات ہوگی کیسے؟" اس لڑکی نے سوال کیا۔

"میں آپ کو ان کا نمبر دے دوں گا۔" رضوان نے کہا۔

"بغیر میری اجازت کے؟" میں نے رضوان سے سوال کیا۔

ہمارے گفتگو جاری تھی کہ شاداں سیلفیوں سے فارغ ہو کر آ گئی۔ "چلیں۔" اس نے آتے ہی کہا اور ساتھ ہی گاڑی کی چابی میری جانب بڑھائی۔ میں نے چابی تو لے لی لیکن ساتھ ہی سوال کیا۔ "رضوان نہیں چلے گا؟" اور شاداں نے نفی میں گردن ہلا دی۔ "وہ میرے پروڈیوسر کے لیے جا رہا ہے۔ نئی فلم کا شیڈول طے کرنے۔" اور ہم دونوں لاؤنج سے باہر کی جانب چل دیے۔

ہم گاڑی میں بیٹھے ہی تھے کہ ایک کیمرا مین دوڑتا ہوا ہماری طرف آیا۔ وہ شاداں کی طرف جانے کے بجائے میری طرف یعنی ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آیا۔ "سر! میڈم کا انٹرویو تو ہم نے کر لیا، ایک دو سوال آپ سے کرنے ہیں۔" اس نے مائیک میری جانب بڑھایا۔

''پوچھیں۔'' میں نے کہا۔

''ہمارے یہاں اکثر ہیروئنز شادی کے بعد شوبز چھوڑ دیتی ہیں۔ شوہر یا سسرال کی پابندیوں کے سبب، کیا آپ کا ایسی کوئی پابندی لگانے کا کوئی پروگرام ہے؟'' اس نے سوال کیا اور میں ذہنی طور پر اس سوال کے لیے تیار تھا۔

''آپ کا یہ سوال بنتا ہی نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''شاداں کی کس بات سے ظاہر ہوا کہ وہ شوبز سے اپنا تعلق توڑ رہی ہے؟'' میں نے جواب میں کہا۔

''آپ سے میں کہہ چکی ہوں کہ میں کراچی اس لیے آئی ہوں کہ میرے نئے ڈرامے کی شوٹنگ شروع ہو چکی ہے اور ساتھ ہی میں ایک نئی فلم بھی سائن کر رہی ہوں جس کی ابتدائی شوٹنگ کراچی میں ہوگی اور زیادہ شوٹنگ لندن اور نیویارک میں ہوگی۔'' شاداں نے بات اچک لی تھی۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کے شوہر اور سسرال کی طرف سے کوئی پابندی نہیں۔'' رپورٹر کا رخ اب کی بار شاداں کی طرف تھا۔

''سسرال میری کوئی ہے نہیں، تیمور کی ایک بہن ہے جو کینیڈا میں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزار رہی ہے۔'' شاداں نے کہا اور اس طرح یہ مختصر انٹرویو ختم ہو گیا۔ میں نے ابھی کار اسٹارٹ ہی کی تھی کہ وہ دونوں لڑکیاں کار تک آگئیں۔

''میڈم! ایک سیلفی آپ اور آپ کے شوہر کے ساتھ۔'' ان میں سے وہ لڑکی بولی جو زیادہ بولڈ تھی۔

''میں نے دیکھا تھا کہ جب یہ باہر آئے تو آپ رضوان اور ان کے ساتھ کھڑی تھیں پھر شاید انہوں نے سیلفی کے لیے انکار کر دیا تو اب آپ دونوں پھر آگئیں۔''

''آپ کہیں گی تو یہ مان جائیں گے۔'' اسی لڑکی نے اصرار کیا۔

''ابھی تمہاری شادی نہیں ہوئی ہے۔'' شاداں نے کہنا شروع کیا۔

''جی نہیں۔'' لڑکی نے جواب دیا۔

''تم جوان ہو، خوب صورت ہو، تمہاری شادی ہونے میں زیادہ وقت نہیں ہوگا لیکن ایک بات میری یاد رکھنا۔ شوہر اور بیوی کا رشتہ احترام کا رشتہ ہوتا ہے، کبھی اپنے شوہر کو اس بات پر مجبور نہ کرنا جسے وہ پسند نہ کرتا ہو۔'' شاداں نے نصیحت کرنے والے انداز میں کہا۔

''میڈم! میں چاہتی ہوں کہ شادی سے پہلے میں آپ کی طرح نام کماؤں اور ملک کی سیلیبرٹی بن جاؤں۔'' اسی لڑکی نے کہا۔

اور شاداں نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ''یہ خواہش تو ہزاروں کیا لاکھوں لڑکیوں کی ہے لیکن اب دیکھیں کہ ان میں سے کتنوں کی یہ خواہش پوری ہوتی ہے۔''

''آپ سفارش کریں گی تو یہ خواہش ضرور پوری ہو جائے گی۔'' اسی لڑکی نے کہا۔

''شوبز کوئی آسان فیلڈ نہیں ہے۔'' شاداں نے کہا۔ ''وہ مصرع تو تم نے ضرور سنا ہوگا کہ ایک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کر جانا ہے۔'' شاداں نے کہا۔

''رضوان صاحب نے تو وعدہ کیا ہے کہ وہ ضرور سفارش کریں گے۔'' اسی لڑکی نے کہا۔

''شاداں، دیر ہو رہی ہے۔'' میں نے طویل ہوتے مذاکرات میں دخل دیا۔

''ٹھیک ہے میڈم ہم ان سے ہی رابطہ کریں گے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ انہوں نے ہی آپ کو چانس دلوایا تھا۔''

''یہ کہا اس نے؟'' شاداں کی آواز میں مجھے غصے کی ایک لہر محسوس ہوئی تھی۔ وہ اپنی طرف کا دروازہ بند کر چکی تھی لیکن دونوں لڑکیاں اب بھی اپنی جگہ پر موجود تھیں۔ دروازہ بند کر دیا تھا لیکن شیشہ اب بھی کھلا ہوا تھا۔

''چلو۔'' شاداں نے مجھ سے کہا۔ میں کار اسٹارٹ کرنے ہی والا تھا کہ شاداں نے کھلے ہوئے شیشے سے سر نکالا۔ ''رضوان میرا ملازم ہے۔ چالیس ہزار ماہانہ دیتی ہوں اسے۔'' شاداں نے تقریباً چیختے ہوئے کہا تھا۔

''کہاں چلنا ہے؟'' میں نے سوال کیا اور کار میں نے آگے بڑھا دی۔

''یہ کیا سوال ہے، گھر جائیں گے۔'' شاداں کا جواب تھا اور میں نے اسپیڈ بڑھا دی۔

''رضوان کتنی دیر میں آئے گا؟'' میں نے سوال کیا۔

''زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں آجائے گا۔'' شاداں کا جواب تھا۔

''آجائے تو بہتر ہوگا۔'' میں نے کہا اور شاداں نے مجھے یوں دیکھا جیسے وہ مجھ سے یہ توقع نہ کر رہی ہو۔ لیکن اس نے اس پر کچھ کہنے سے گریز کیا۔

''اللہ خیر کرے تمہیں آج رضوان کی اتنی فکر کیوں ہو رہی ہے؟'' شاداں نے تیکھے لہجے میں سوال کیا۔

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''بس ایک مہمان آ رہا ہے اس سے پہلے آجائے تو بہتر ہوگا۔'' میں نے کہا۔

"کون ہے مہمان؟" شاداں کا سوال تھا۔

"جب آئے گا تو خود دیکھ لینا شاید تمہارے لیے اجنبی نہ ہو۔" میں نے کہا۔

"کیوں خواہ مخواہ میں سسپنس پھیلا رہے ہو؟" شاداں نے کہا۔

"سسپنس تو تم نے پھیلایا ہوا ہے۔" میں نے فوری طور پر جواب دیا اور شاداں کی آنکھوں میں تجسس دوگنا ہو گیا۔

"میں سمجھ نہیں پا رہی ہوں کہ تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟" شاداں نے کہا اور میں ہنس دیا۔

"میں نے ایسی کیا بات کہی کہ تمہیں ہنسی آ رہی ہے؟" شاداں نے سوال کیا۔

"ہنسی تو مجھے اس وقت آ رہی تھی جب تم ان لڑکیوں کو بتا رہی تھیں کہ شادی کے بعد شوہر کے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہیے۔" میں نے کہا اور شاداں مجھے گھورنے لگی۔

"میں نے کوئی غلط بات کہی جس پر تمہیں ہنسی آ رہی تھی؟" شاداں کا سوال تھا۔

"ہنسی مجھے تمہاری کسی بات پر نہیں بلکہ اس پر آئی تھی جو تم نے کہا نہیں۔" میں نے کہا۔

ابھی بات یہیں تک پہنچی تھی کہ میری کار گھر پہنچ گئی۔

میں پہلے گھر میں داخل ہوا اور شاداں میرے پیچھے تھی۔ میں گیٹ پر رک گیا اور چوکیدار سے بات کرنے لگا کہ "ابھی ایک صاحب آئیں گے انصر نام ہو گا ان کا تو انہیں لے کر ڈرائنگ روم میں آنا۔" اور چوکیدار نے یوں گردن ہلائی جیسے وہ میری بات سمجھ گیا ہو۔

میں گھر میں داخل ہوا تو شاداں نظر نہیں آئی۔ البتہ ڈرائنگ روم میں پرانی ملازمہ صفائی میں مصروف نظر آئی۔

اماں نسیم میری پرانی ملازمہ تھی بلکہ یوں کہنا چاہیے وہ اماں کے ساتھ جہیز میں آئی تھی۔ جوانی میں ہی بیوہ ہو گئی تھی ایک بیٹی تھی جس کی شادی کر دی تھی لیکن داماد ناکارہ نکلا اب اماں نسیم اپنی تنخواہ بیٹی اور نواسے پر خرچ کرتی تھی۔

"یہ شاداں کہاں رہ گئی؟" میں نے اماں نسیم سے سوال کیا۔

"پتا نہیں چھوٹے صاحب، وہ آئیں اور مجھ سے کہا اچھی سی چائے بنا دو کچھ مہمان آ رہے ہیں اور یہ بھی کہا کہ ڈرائیور سے کچھ کھانے کے لیے بھی منگوا لینا۔" اماں نسیم نے جواب دیا۔

"میں نے پوچھا تھا کہ کہاں گئیں اور آپ مجھے کچھ اور بتا رہی ہیں۔" میں نے کہا۔

"بتانے کو تو میرے پاس بہت کچھ ہے۔" اماں نسیم نے بہت ہلکی آواز میں کہا۔

"کمرے میں ہو گی۔" میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"آپ کا کمرا اب آپ کا کمرا نہیں وہ رضوان صاحب کا کمرا ہو گیا ہے۔" اماں نسیم کی آواز اب بھی ہلکی تھی جیسے وہ میرے سوا کسی اور تک نہ پہنچ جائے۔ اماں نسیم کی یہ احتیاط میری سمجھ سے بالاتر تھی۔

"میں اس کمرے میں آیا جہاں میرے خیال سے شاداں کو ہونا چاہیے تھا لیکن شاداں وہاں نہیں تھی۔

میں اس کمرے سے نکل ہی رہا تھا کہ شاداں دوسرے بیڈ روم سے نکلتی ہوئی نظر آئی تھی۔

"مہمان نہیں آئے آپ کے؟" مجھ پر نظر پڑتے ہی شاداں نے کہا۔

"رضوان بھی تو نہیں آیا اب تک۔" میں نے کہا۔

"آ جائے گا وہ بھی۔" شاداں نے تیز لہجے میں کہا۔ اور میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا اس لمحے سے پہلے شاداں نے کبھی اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔

"میری وہ کون سی بات تھی جس پر تمہیں ہنسی آئی تھی لیکن اس وقت ہنسنے کے بجائے کافی دیر بعد ہنسے تھے؟" شاداں نے سوال کیا۔

"میں نے کہا کہ مجھے کسی بات پر ہنسی نہیں آئی تھی ہنسا تو میں اس پر تھا جو تم نے کہی ہی نہیں۔"

"جب میں نے جو بات کہی ہی نہیں تو تمہاری ہنسی کا کیا جواز ہے؟" شاداں نے کہا۔

"تم نے بہت سی باتیں کہیں لیکن یہ نہیں بتایا کہ جس سے شادی کرو اس سے اپنا ماضی نہ چھپانا اور نہ ہی ماضی کے بارے میں کوئی غلط بات کہنا۔" میں نے کہا اور شاداں نے مجھے یوں گھورا جیسے میں نے کوئی انہونی بات کر دی ہو۔

"میں نے ماضی کی کوئی بات نہیں چھپائی۔" شاداں نے پورے تیقن کے ساتھ کہا۔

"یہ تو تمہارا پرانا بیان ہے۔" میں نے کہا تو شاداں کہنے لگی۔ "یہ بیان پرانا ہے تو نیا بیان کیا ہونا چاہیے؟ وہ بھی بتا دیں۔"

میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ چوکیدار ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے انصر بھی آیا تھا۔

"انصر چیمہ تم؟" شاداں نے اس پر نظر پڑتے ہی کہا۔

"شکر ہے تم نے پہچان لیا ورنہ میں تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ ...... مجھے خود اپنی پہچان کروانے کے لیے معلوم نہیں

کیا جتن کرنے ہوں گے۔'' انصر کا لہجہ طنز میں ڈوبا ہوا تھا۔

''جب میں نے تم سے نجات حاصل کرلی تو اب دوبارہ سے چور دروازے سے میری زندگی میں آنے کی کوشش کیوں کررہے ہو؟'' شاداں کی آواز غصے سے بھری ہوئی تھی۔

''تم نے مجھ سے تو خلع لے لی لیکن ایک کڑی اب بھی ہمارے درمیان ہے جس سے تم چاہو تب بھی منہ نہیں پھیر سکتیں۔'' انصر نے کہا اور شاداں طیش میں آگئی۔

''کس کڑی کی بات کررہے ہو؟'' شاداں نے غصے بھری آواز میں کہا۔

''اس کڑی کی بات کررہا ہوں جس سے دنیا میں تم منہ موڑ لو لیکن قیامت کے دن اسے تمہارے نام سے ہی پکارا جائے گا۔''

''کس کی بات کررہے ہو؟'' شاداں نے کہا۔

''میں، ہمارے بیٹے کی بات کررہا ہوں جس کا نام تم نے اکبر رکھا تھا۔ وہ جب تین برس کا تھا تو تم اسے چھوڑ آئی تھیں۔'' انصر وہی کچھ دہرا رہا تھا جو مجھ سے طیارے میں کہتا رہا تھا۔

''کیا چاہتے ہو؟'' شاداں نے کہا اور انصر نے قہقہہ لگایا۔

''میں بے وقوف ضرور ہوں لیکن پاگل نہیں۔'' انصر نے ہنسنے کے دوران کہا تھا۔ ''تم مجھے جتنا برباد کرسکتی تھیں کر دیا۔ اب یہ اللہ کا شکر ہے کہ میں مکمل برباد ہونے سے بچ گیا۔''

''اس کا مطلب کیا میں یہ لے سکتی ہوں کہ تم نے تیسری شادی کرلی ہے؟'' شاداں نے کہا۔

''تمہارے جانے کے بعد میری زندگی میں کوئی خلا نہیں آیا، خلا آیا تو اکبر کی زندگی میں آیا لیکن میری بہن نے اس خلا کو کسی حد تک پورا کیا۔ اس کی شادی کے بعد میرے چھوٹے بھائی کی بیوی نے اس خلا کو پورا کیا اس لیے مجھے نئی شادی کی ضرورت نہیں ہوئی۔ شادی میں کرتا تو اکبر کی ماں کے لیے کرتا لیکن اس کی مجھے کوئی ضرورت نہیں پیش آئی۔ لیکن تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ جب تم میرے ساتھ تھیں تو تمہیں شکایت تھی کہ میں تم سے عمر میں زیادہ ہوں اور اسے تم نے اس طرح پورا کیا کہ اپنے سے کم عمر لڑکے سے شادی کرلی۔'' انصر چیمہ نے کہا اور شاداں طیش میں آکر کھڑی ہوگئی۔

''شاداں بیٹھ جاؤ۔'' میں نے کہا لیکن وہ بیٹھی نہیں۔

''آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ شخص مجھ پر کیسے الزامات لگا رہا ہے۔'' شاداں نے احتجاج کیا۔

''یہ جو بھی بات کررہا ہے، اس کے ثبوت اسے دینے ہوں گے۔'' میں نے کہا۔

''ابھی میں نے ایسی بات کہی ہی نہیں جس پر تم طیش میں آجاؤ۔''

''یہ بات جو تم نے میری عمر کے بارے میں کہی ہے، کیا اس کے ثبوت ہیں تمہارے پاس؟'' شاداں نے کہا۔

''میرے پاس میرا شناختی کارڈ ہے جس میں میری عمر درج ہے اس لیے اپنا یہ جھوٹا الزام تمہیں واپس لینا ہوگا۔'' شاداں نے کہا۔

''شاداں جو بھی بات کرنی ہے وہ بیٹھ کر بغیر غصے میں آئے کرسکتی ہو۔'' میں نے کہا لیکن شاداں کسی طرح کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھی۔

اس نے اپنا پرس اٹھایا اور اس میں سے شناختی کارڈ نکالا اور مجھے دیا۔ ''دکھاؤ اسے کہ ہماری عمروں میں کتنا فرق ہے۔ تم مجھ سے دو سال بڑے ہو یا میں بڑی ہوں۔''

یہ وہی شناختی کارڈ تھا جو شاداں نے نکاح کے وقت کورٹ میں دکھایا تھا۔ میں نے شاداں کا دیا ہوا شناختی کارڈ لیا اور اسے آہستگی سے انصر کی جانب بڑھا دیا۔

انصر نے کارڈ دیکھا اور ہنسنے لگا۔ ''تم میں بہت سی برائیاں تھیں اور شاید اب بھی ہوں لیکن یہ برائی نئی ہے کہ تم کاغذات بھی جعلی تیار کرلیتی ہو بلکہ میرا خیال ہے یہ جعلی کارڈ تمہارے بظاہر بزنس منیجر نے تیار کروایا ہوگا ایسے کاموں میں وہ کتنا ماہر ہے یہ تمہارے ساتھ میں بھی جانتا ہوں۔''

''تم اسے جعلی کس طرح کہہ سکتے ہو؟'' شاداں کا غصہ کم نہیں ہوا تھا۔

''میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میرے پاس تمہارے وہ شناختی کارڈ کی کاپی ہے جو اصلی ہے اور اس کا اندراج اس نکاح نامے میں بھی ہے جو ابھی میں آپ کی خدمت میں پیش کرنے والا ہوں۔'' انصر چیمہ نے کہا اور وہ ایک بار پھر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''مجھ پر جعلی شناختی کارڈ کا الزام لگانے والا اب اپنے پٹارے سے جعلی نکاح نامہ نکالنے والا ہے۔'' شاداں نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔

''شاداں آخری بار کہہ رہا ہوں کہ بیٹھ جاؤ اور اطمینان اور سکون سے بات کرو ورنہ نقصان میں رہو گی۔'' میں نے کہا مگر شاداں نہیں بیٹھی بلکہ اس کی توپوں کا رخ میری جانب ہوگیا تھا۔ ''کیا تم مجھے طلاق دینے کی دھمکی

دے رہے ہو؟'' شاداں نے مجھ سے سوال کیا۔
''یہ بھی ایک آپشن ہو سکتا ہے۔'' میں نے کہا اور ساتھ ہی اماں نسیم کو آواز دی۔ وہ آئیں تو میں نے کہا۔
''چائے تیار ہے؟''
اور اماں نے کہا۔ ''تیار ہے صاحب۔ میں نے آپ کے کمرے میں لگادی ہے۔''
''آیئے خواتین اور حضرات چائے پی لی جائے تا کہ ماحول کی گرمی میں کچھ کمی آئے۔'' ہم اسی کمرے میں آئے جہاں اماں نسیم نے چائے اور لوازمات سجائے تھے۔
''جان مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔'' شاداں ٹوسیٹر پر میرے ساتھ بیٹھی تھی اور اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا تھا۔
''اب باقی کیا رہ گیا ہے، کچھ کہنے سننے کے لیے؟'' میں نے بھی سرگوشی کے انداز میں کہا۔
''مجھے چند منٹ دے دو جان۔'' شاداں نے کہا۔ میں چاہتا تو نہیں تھا لیکن شاداں کی رونی صورت دیکھ کر مجھے ترس آہی گیا اور میں تیار ہو گیا۔ شاداں نے میرا ہاتھ پکڑا اور ہم ایک بار پھر ڈرائنگ روم میں آگئے۔
''کیا تم نے یہ نہیں مان لیا کہ تم انصر چیمہ کی بیوی رہی ہو اور اس سے تمہارا ایک بیٹا بھی ہے؟'' میں نے کہا۔
میں نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ شاداں میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔
''میں تم سے معافی مانگتی ہوں کہ میں نے تم سے یہ چھپایا لیکن یقین جانیں کہ اس میں میرا قصور نہیں۔'' اس کے ہاتھ جڑے ہوئے تھے اور آواز بھرّا چکی تھی۔
''تمہارا قصور نہیں تو پھر قصوروار کون ہے؟'' میں نے سوال کیا۔ مجھے غصہ تو بہت آرہا تھا لیکن میں کسی نہ کسی طرح اسے برداشت کر رہا تھا۔
''سارا قصور رضوان کا ہے۔'' شاداں نے کہا اور مجھے اس غصے میں بھی ہنسی آگئی۔
''تم اتنی معصوم تھیں کہ اس نے جو کہا تم نے اس پر عمل کیا بلکہ کچھ دیر پہلے تک کرتی رہی تھیں۔''
''میں تمہیں یقین دلاؤں کہ میرا قصور صرف اتنا ہے کہ جو کچھ وہ کہتا رہا میں اس پر عمل کرتی رہی۔''
''وہ کہاں گیا؟'' میں نے کہا۔ ''تم نے تو کہا تھا کہ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں آجائے گا لیکن اب تو ایک گھنٹے سے زیادہ وقت ہو گیا ہے۔'' میں نے کہا۔ میرا فقرہ غصے میں ڈوبا ہوا تھا۔

''وہ آجاتا لیکن میں نے اسے روکا تھا۔ میرے تصور میں بھی یہ نہیں تھا کہ حالات یہ رخ اختیار کریں گے۔'' شاداں نے کہا۔
''اب اسے فون کرو کہ جلد سے جلد واپس آجائے مگر یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ انصر چیمہ بھی یہاں موجود ہے۔''
شاداں نے بغیر کوئی بحث کیے رضوان کو فون کر دیا اور وہی کہا جو میں چاہتا تھا۔
''اب ایک بات سچ سچ یہ بھی بتادو کہ رضوان سے تمہارا رشتہ کیا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔
''آپ کو بتایا ہوا تو ہے۔''
''میں تمہارے اور اس کے درمیان خفیہ رشتے کی بات کر رہا ہوں۔'' میں نے لفظ خفیہ پر خاص زور دیا تھا۔ ''میں سمجھی نہیں۔'' شاداں نے کہا۔
''ایک سوال میرا بھی ہے۔'' شاداں نے کہا۔
''یہ انصر چیمہ آپ سے کہاں ملا تھا؟'' اس نے سوال کیا اور میں نے محسوس کیا کہ اب چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں۔
''ہم دونوں ایک ہی فلائٹ میں آئے ہیں۔'' میں نے حقیقت بتادی اور شاداں نے ایک گہری سانس لی۔
''اور ڈیڑھ گھنٹے میں وہ میرے خلاف آپ کے کان بھرتا رہا، مجھ سے متنفر کرتا رہا۔'' شاداں نے کہا۔
سچ تو یہی تھا لیکن اگر میں اعتراض کر لیتا تو بات کسی اور جانب مڑ جاتی۔
''ہم ایک فلائٹ میں ضرور آئے ہیں اور ہماری فلائٹ میں ملاقات بھی ہوئی لیکن زیادہ وقت وہ اپنا رونا روتا رہا کہ کس طرح تم نے اسے لوٹا، اپنی پلاسٹک سرجری اس کے پیسوں سے کرواتی رہیں۔'' میں نے وہ باتیں جو انصر نے بتائی تھیں، اس کا اثر زائل کرنے کی پوری کوشش کی اور شاداں کے چہرے پر کسی قدر اطمینان آگیا۔
''اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ مجھ پر کس طرح کے شک کرتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ میں نے اس سے خلع لے کر جان چھڑوائی۔'' شاداں نے کہا۔
''اس کا کہنا یہ بھی تھا کہ یہ گھر جو تم نے میرے نام پر کیا ہے یہ اس نے خریدا تھا اور تمہارے نام کر دیا تھا۔''
''مکان اس نے خریدا تھا لیکن تب یہ تقریباً کھنڈر تھا اس کا مکان میں نے اپنے پیسوں سے بنایا ہے۔'' شاداں نے وضاحت کی۔ اس وضاحت کو میرے ذہن نے قبول نہیں کیا لیکن میں نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔

ابھی میں اور شاداں ڈرائنگ روم میں ہی تھے کہ ہمیں رضوان ڈرائنگ روم میں آتا ہوا نظر آیا۔

''خیریت آپ دونوں یہاں اس طرح؟'' اس نے داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ہمیں ڈرائنگ روم میں ایک دوسرے کے ساتھ کھڑا دیکھ کر اسے حیرت ہوئی تھی اور اس کا اس نے اظہار کیا تھا۔

''دوسرے کمرے میں انصر چیمہ تمہارا منتظر ہے۔'' شاداں نے کہا۔

''یہ کہاں سے آ گیا؟'' رضوان کا لہجہ مذاق اڑانے والا تھا۔

''یہ اس کا دوسرا جنم ہے۔'' شاداں نے اس کے جواب میں کہا۔

''لاہور ائرپورٹ پر اسے دیکھ کر مجھے خطرہ تو محسوس ہوا تھا لیکن میں نے تم سے ذکر نہیں کیا۔'' رضوان نے کہا اور شاداں حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

''لاہور سے کراچی تک وہ نہ جانے کیا کیا زہر اگلتا رہا ہے کہ انہوں نے اسے گھر بھی بلا لیا۔'' شاداں نے میری جانب اشارہ کیا۔

جو گفتگو ہمارے درمیان ہوئی تھی، میں وہ بتا چکا ہوں۔'' میں نے کہا اور شاداں کندھے اچکا کر رہ گئی۔

''تم اس کی گفتگو سے متاثر تو ہوئے نا ورنہ اسے یوں گھر پر مدعو نہ کرتے۔'' شاداں نے کہا۔

''جو کچھ اس نے کہا، اس میں سے کچھ باتیں تو سچ ثابت ہو چکی ہیں۔'' میرے لہجے میں طنز اتر آیا۔

''کون سی بات سچ ثابت ہوئی ہے؟'' اس بار رضوان مجھ سے مخاطب ہوا اور اس کے ساتھ ہی طنزیہ انداز میں ہنسا تھا۔

''یاد ہے تمہیں، تم نے ائرپورٹ پر پہلی ملاقات میں کیا کہا تھا۔'' میں نے رضوان کو یاد کروانے کی کوشش کی مگر وہ ایک ڈھیٹ تھا۔

''کیا غلط کہا تھا؟'' رضوان نے انتہائی ڈھٹائی کے ساتھ پوچھا۔

''تم نے شاداں کے بارے میں جو کچھ کہا تھا، اس میں کچھ بھی سچ نہیں تھا۔'' میں نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی لیکن وہ بدستور ڈھٹائی کے ساتھ مسکراتا رہا تھا۔

''وہ حالات ہی ایسے تھے کہ میں نے سچ سے گریز کیا۔'' رضوان نے اپنی صفائی دی۔

''کیا تھے حالات؟'' میں نے سوال کیا۔ ''یہی نا کہ تم دونوں غیر ملکی کرنسی کے ساتھ دبئی کی فلائٹ میں پکڑے گئے تھے اور تم میرے پاس آئے تھے مدد کے لیے۔'' میں نے کہا اور رضوان سے پہلے شاداں کی گردن ہل گئی۔ یہ اظہار تھا کہ وہ میری بات مان رہی تھی۔

''اس وقت اگر میں انصر چیمہ کا ذکر بھی کرتا تو آج تم میاں بیوی نہ ہوتے۔'' رضوان اپنی بات پر ڈٹا رہا۔

''تم نے کہا تھا کہ میڈم کے پاس شہرت ہے، دولت ہے لیکن بدقسمتی کہ تنہا ہیں اور تنہائی انہیں ناگ کی طرح ڈستی ہے۔'' میں نے کہا لیکن رضوان مسکراتا رہا۔

''کیا مجھے یہ کہنا چاہیے تھا کہ میڈم نے حال ہی میں خلع لی ہے اور اپنے بیٹے کو اس کے باپ کے پاس چھوڑ دیا ہے؟'' رضوان کی ڈھٹائی برقرار تھی۔

''تم نے وہ کچھ کیوں نہیں کہا جو حقیقت تھی؟'' اس بار شاداں بولی۔

''کیا تم سمجھتی ہو کہ حقیقت جاننے کے بعد تم ان کی بیوی بن جاتیں؟'' رضوان نے شاداں سے سوال کیا۔

''میں نے ان کی آنکھوں میں یہ بات اس وقت محسوس کر لی تھی جب ہم اسکائی روم میں کافی لے رہے تھے۔'' شاداں نے کہا۔

''اور اسی لیے تم نے مجھے لاہور آنے کی دعوت دی تھی؟'' میں نے کہا۔

''میں بھی تم سے متاثر ہوئی تھی۔'' شاداں نے اعتراف کیا اور مجھے اپنے اندر ایک خوشی کا احساس ہوا۔

''مجھ سے متاثر ہوئی تھیں یا میری کسٹم کی نوکری نے تمہیں متاثر کیا تھا؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہر لڑکی کا حق ہے کہ وہ اپنے بہتر مستقبل کی تلاش کرے۔'' شاداں کا جواب تھا۔

''کراچی ائرپورٹ پر مجھے اپنی جانب متوجہ کرنے کے بعد لاہور میں تم دونوں نے مجھے پوری طرح جال میں جکڑا۔'' میں نے ان دونوں کو مخاطب کیا اور دونوں بغلیں جھانکنے لگے۔

''تم تو وہاں جاؤ جہاں وہ انصر چیمہ تمہارا انتظار کر رہا ہے۔'' شاداں نے رضوان کو مخاطب کیا۔

''یہ اکیلا وہاں جائے گا تو معاملہ مختلف رنگ اختیار کرے گا اور میں اپنے گھر میں ہنگامہ نہیں چاہتا۔'' میں نے کہا لیکن رضوان نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔

''میں دیکھ لیتا ہوں اسے۔'' رضوان نے کہا اور باہر نکل گیا۔

''یہ اتنا اکڑ کیوں رہا ہے؟'' میں نے شاداں سے سوال کیا۔

''یہ ایسا ہی ہے۔'' شاداں نے کہا لیکن میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا کیونکہ اچانک سے اس کمرے میں جہاں رضوان گیا تھا، تیز آوازیں آنی شروع ہوگئیں۔ میں آوازیں سُن کر اس کمرے میں گیا تو رضوان اور انصر ایک دوسرے سے اُلجھے ہوئے تھے۔ یہ بھی شکر ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے دور تھے۔ ورنہ ہاتھاپائی شروع ہونے میں کوئی کسر نہیں بچی تھی۔ شروع کے چند منٹ تو میں سمجھا ہی نہیں کہ بنیادی مسئلہ کیا ہے پھر چند منٹ بعد میں معاملہ سمجھا تو مجھے بھی دخل دینا پڑا۔

''کوئی مجھے بتائے گا کہ معاملہ کیا ہے؟'' میں نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

''میں ان سے یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ شاداں کو استعمال کررہے ہیں۔'' انصر نے کہا۔

''ان کا الزام ہے کہ میں میڈم کے لیے گاہک تلاش کرتا ہوں اور اسے بدکاری پر آمادہ بھی میں نے ہی کیا ہے۔'' رضوان نے کہا۔

''یہ تو بہت بڑا الزام ہے۔'' میں نے کہا اور رضوان کے چہرے پر کچھ اطمینان آیا تھا۔

''اس سے پوچھیں کہ کیا یہ شاداں کو تین، تین دن کے لیے دبئی نہیں لے جاتا رہا جب وہ میری بیوی تھی؟'' انصر نے کہا۔

''دبئی وہ کسی بھی کام سے جاسکتی تھی لیکن اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ وہ بدکاری کے لیے ہی جاتی تھی۔'' میں نے کہا ابھی میرا فقرہ مکمل ہی ہوا تھا کہ شاداں بھی کمرے میں آگئی اور انصر کی توجہ شاداں کی طرف ہوگئی۔

''کیا یہ غلط ہے کہ تم اور دبئی کا ایک شیخ ہوٹل کے ایک کمرے سے پکڑے گئے تھے؟'' انصر نے شاداں کی طرف رخ کیا۔

''میں آپ کو سنجیدگی سے جواب دیتی ہوں حالانکہ اس سے پہلے بھی کئی بار اس کا جواب دے چکی ہوں۔'' شاداں کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

''جس شیخ کی آپ بات کررہے ہیں، وہ اس پروگرام کا آرگنائزر تھا اور اسی کے بُلانے پر میں دبئی گئی تھی۔ اگلے روز پروگرام تھا اور وہ شیخ اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ پروگرام ڈسکس کرنے آیا تھا۔'' شاداں نے کہا۔

''کمرے سے ایک لاکھ درہم بھی برآمد ہوئے تھے؟'' انصر نے کہا۔

''تم یہ تو نہیں کہہ رہے کہ ان تین افراد کو مطمئن کرنے کے لیے میں نے لاکھ درہم لیے تھے۔''

''تم صحیح سمجھیں۔'' انصر نے کہا اور شاداں ہنسنے لگی۔

''تمہاری انہی باتوں سے تنگ آکر میں نے تم سے خلع لی تھی۔'' شاداں نے کہا اور انصر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

''تو تمہارا کیا خیال تھا کہ میں بھی رضوان کی طرح وہ کروں جو رضوان کرتا ہے؟'' انصر نے کہا۔

''یہ باتیں ہوتی رہیں گی تم بتاؤ تم جو اتنی دیر غائب رہے تھے تو تم نے کیا کارنامہ انجام دیا؟'' میں نے رضوان سے استفسار کیا۔

''میں نے وہ کام کیا ہے جسے سُن کر آپ خوش ہو جائیں گے۔'' رضوان نے کہا۔

''تمہید باندھنے سے بہتر ہے کہ اپنا کارنامہ بتادو۔'' میں نے کہا لیکن میرا لہجہ تلخ ہوچکا تھا جو میں نہیں چاہتا تھا۔

''لندن اور نیویارک میں شوٹنگ ہے مگر بڑی بات یہ ہے کہ آپ بھی اس ٹور پر ساتھ ہوں گے۔''

''میں جاؤں گا لیکن کس حیثیت میں؟'' میں نے سوال کیا۔

''اس بار میں نہیں جارہا اور میری جگہ آپ جارہے ہیں۔'' رضوان نے فخریہ انداز میں کہا۔

''اگر تم جاتے تو کیا کرتے جو اب تمہارے نہ جانے کی صورت میں مجھے کرنا ہوگا؟'' سوال میں نے رضوان سے کیا تھا لیکن جواب انصر نے دیا۔

''ابھی بتایا تو ہے کہ اس کا کام کیا ہے۔'' انصر نے کہا اور میں کچھ نہ سمجھا۔

''میں سمجھا نہیں کہ آپ کیا بتارہے ہیں؟'' میں نے کہا۔

''یہ سودے کرتا ہے اور شاداں ان سودوں کو پورا کرتی ہے۔'' انصر نے کہا اور شاداں یہ سنتے ہی جھٹکے سے اکھڑ گئی۔

''میں اب تمہاری منکوحہ نہیں ہوں کہ جو دل چاہے الزام لگادو۔'' شاداں نے تیز لہجے میں کہا۔

''ایک لاکھ درہم بقول تمہارے تمہیں پروگرام میں شرکت کے ملے تھے؟'' انصر نے سوال کیا تھا۔

''تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ تم جو کہہ رہے ہو وہی بات صحیح ہے؟'' رضوان کا لہجہ بھی تیز ہوگیا۔

''اب میں ایک اور بات کہہ رہا ہوں اور اُمید کرتا

ہوں کہ اس بار تم طیش میں آئے بغیر اقرار کرلو گے۔"

"یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ میں تمہاری بات مان لوں گا؟" رضوان نے کہا۔

"میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ اس کام کی ٹریننگ تم نے اپنے والد سے لی ہے۔ وہ تمہاری ماں کے لیے گاہک تلاش کرتا تھا اور پھر تمہاری والدہ کو اس کے گاہک تک پہنچانے کی ذمّے داری بھی پوری کرتا تھا۔" انصر نے کہا اور رضوان اسے مارنے کے لیے آگے بڑھا لیکن میں درمیان میں آگیا اور انصر سے کہا اس طرح کی باتوں سے احتراز کرو۔

"میں نے ایسا کیا کہہ دیا جو انہیں اتنا بُرا لگا؟"

"کیا یہ دونوں اس بات سے انکاری ہیں کہ انہوں نے اس محلے میں جنم لیا تھا جہاں دن کے اجالے میں شرماتے ہیں۔" انصر نے ایک دوسرے زاویے سے حملہ کیا۔

"یہ بات تم اپنے بارے میں کہہ رہے ہو؟" شاداں نے جواب دیا۔

"میں اعتراف کر چکا ہوں کہ میں نے تمہیں پہلی بار وہیں دیکھا تھا۔" انصر نے کہا۔

"تم نے مجھے مجرا کرتے دیکھا تھا، تم یہ کہہ رہے ہو؟" شاداں نے تیز لہجے میں سوال کیا۔

"تم نہیں بلکہ تمہاری بہن مجرا کر رہی تھی اور تم اس محفل میں شریک نہیں تھیں۔"

"تم جو کچھ کہہ رہے ہو؟ وہ میری سمجھ میں تو بالکل نہیں آرہا۔" میں نے کہا۔

"آپ کی سمجھ میں اس لیے نہیں آرہا کہ آپ کا گزر کبھی ان بازاروں سے نہیں ہوا لیکن یہ دونوں اچھی طرح سمجھ رہے ہیں کیونکہ یہ پیدا وہیں ہوئے ہیں۔" انصر نے کہا اور رضوان کے ساتھ شاداں بھی چیخ پڑی تھی۔

"تم اپنے بارے میں جو کچھ کہہ رہے ہو، وہ ہم مان لیتے ہیں لیکن ہمارے بارے میں تبصرہ کرنا اور وہ بھی جھوٹ پر مبنی تبصرے کی اجازت نہیں دے سکتے۔" شاداں نے کہا۔

"اس سے بھی انکار کرو گی کہ تمہاری ماں نے تمہیں شادی کی اجازت دینے کے لیے کروڑ روپے لیے تھے۔"

"یہ ایک سودا تھا جو تم دونوں کے درمیان ہوا تھا۔ مجھے اس میں کیوں گھسیٹ رہے ہو۔" شاداں نے کہا اور میں نے سوچا کہ ہر وار سے بچنے کے لیے شاداں پہلے سے تیار ہوتی ہے۔

"صاحب جی کچھ باتیں مجھے بھی آپ سے کرنی ہیں۔" میری ملازمہ نے کہا۔

"ابھی آتا ہوں پھر کر لینا جتنی باتیں کرنی ہیں۔"

"صاحب جی مجھے صرف ایک بات کرنی ہے۔" اس نے زور دے کر کہا۔

"اماں میں نے کہا نا کہ چند منٹ انتظار کرلو میں حاضر ہوتا ہوں پھر ایک نہیں ہزار باتیں کر لینا۔" میں نے بھی زور دے کر اپنی بات کی تھی اور وہ کمرے سے نکل گئی۔

"آپ ملازمہ کو اماں کیوں کہتے ہیں؟" شاداں نے سوال کیا۔

"شرفا میں یہی رواج ہے۔ تمہارے محلے کی طرح نہیں کہ ملازم کو گالی دے کر بلایا جائے۔" انصر نے لقمہ دیا۔

"صرف یہی بات نہیں ہے انصر صاحب۔" میں نے انصر کی تصحیح کرنے والے انداز میں کہنا شروع کیا۔ "یہ خاتون میری والدہ کے جہیز کے ساتھ آئی تھیں۔ والدہ نے ہی ان کی شادی کروائی تھی لیکن دو سال کے اندر یہ بیوہ ہوگئیں۔" میں نے کہا۔

انصر نظریں گھما گھما کے گھر کو دیکھ رہا تھا۔ "تمہیں اپنے شوہر سے بڑی محبت ہے جو تم نے اسے یہ گھر تحفے میں دے دیا۔"

"جو مکان تم نے میرے نام پر لیا تھا، وہ اپنا ٹیکس بچانے کے لیے لیا تھا بلکہ میں اگر یہ کہوں کہ وہ نیم کھنڈر تھا اس پر کروڑوں خرچ کر کے میں نے اسے رہنے کے قابل بنایا ہے۔ اس کا بیسمنٹ بلکہ اوپر کی منزل میں نے تعمیر کروائی ہے۔ اگر میں نے اسے کسی عزیز کے نام کر دیا ہے تو تمہیں اس سے کیا غرض تم تو عدالت میں اسے میرے نام تحفے کی دستاویز پر دستخط کر چکے ہو۔" شاداں نے کہا لیکن انصر نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔

"تم کہتی ہو کہ میں نے ٹیکس بچانے کے لیے مکان تمہارے نام کیا، تم یہ بتا سکتی ہو کہ تم نے کن ذرائع سے پیسے کما کر کروڑوں روپے اس کھنڈر بقول تمہارے یہ کھنڈر پر لگائے؟" انصر نے کچھ دیر بعد کہا۔

"میڈم نے کھنڈر نما کہا تھا۔" رضوان نے بہت دیر بعد زبان کھولی۔

"اب تم نے زبان کھول ہی دی تو گواہی دو کہ یہ کھنڈر تھا یا کھنڈر نما تھا جب میں نے اس ناشکری عورت کے حوالے یہ مکان کیا تھا؟" انصر کا رخ اب رضوان کی طرف ہوگیا۔

"کھنڈر نما تو نہیں تھا لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ میڈم نے اسے یہ شکل دینے میں بہت رقم خرچ کی تھی۔" رضوان نے کہا۔

’’مجھے تو اوپر کے چند کمروں کے سوا اور کوئی اضافہ نظر نہیں آیا۔‘‘ افسر نے کہا۔

’’اور بیسمنٹ نظر نہیں آیا؟‘‘ شاداں نے جواب دینے میں دیر نہیں کی۔

’’بیسمنٹ تو تب بھی تھا شاید اتنی اچھی کنڈیشن میں نہیں تھا لیکن بیسمنٹ تھا ضرور۔‘‘ افسر نے کہا۔

’’آپ لوگ کس بات پر جھگڑ رہے ہیں کیونکہ اس مکان کے مالک نہ آپ ہیں نہ آپ۔‘‘ میں نے باری باری ان دونوں کی جانب اشارہ کیا۔ ’’افسر آپ نے مکان اس کے نام کر دیا تھا۔ اب یہ کس کے نام مکان کریں، تحفہ میں دیں یا قیمت میں اس سے آپ کا تعلق نہیں ہے۔‘‘ میں نے کہا اور شاداں کی گردن ہلنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں ہوئی۔ ’’یہی بات میں تم سے بھی کہہ رہا ہوں تم نے اس مکان پر کتنا خرچ کیا، اس کے ذرائع کیا تھے مگر اب صورتِ حال یہ ہے کہ مکان آپ کا بھی نہیں ہے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’مجھے آپ سے توقع نہیں تھی کہ آپ اس طرح کی بات کریں گے۔‘‘ شاداں نے شکایت کی۔

’’میڈم آپ کو بُری لگے تو پیشگی معذرت لیکن صاحب کی بات غلط نہیں ہے۔‘‘ رضوان نے پہلی بار شاداں کے خلاف زبان کھولی تھی۔

’’بروٹس یو ٹو۔‘‘ شاداں نے شکایت کی۔ میں اور رضوان دونوں ہنسنے لگے۔

’’صاحب آپ کے معاملات تو الجھتے جا رہے ہیں اور میں دیر تک جاگنے کی عادی نہیں ہوں۔‘‘ میری ملازمہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

’’بس اماں پانچ منٹ اور انتظار کریں۔‘‘ میں نے اس سے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا اور وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ وہ اتنی آہستہ آواز میں بڑبڑا رہی تھی کہ میں کچھ سمجھ نہیں پایا سرف ایک لفظ سمجھ میں آیا ’’فائدہ‘‘ اور میں نے فیصلہ کیا کہ اسی نکتے کے سہارے آگے بڑھوں گا۔ میں نے اسے آواز دی اور اگلے ہی لمحے وہ حاضر تھی۔

’’ہاں بتاؤ، کیا بات تھی جو آپ مجھ سے کرنے کے لیے بے تاب تھیں۔‘‘ میں نے اور اس نے باقی لوگوں پر نظر ڈالی۔

’’چھوٹے صاحب یہاں نہیں، بات اکیلے میں کرنے والی ہے۔‘‘ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

’’دوسرے کمرے میں جا کر بات کرتے ہیں۔‘‘ میں نے کہا اور وہ تیار ہوگئی۔ میں نے دیکھا کہ جب وہ وہاں موجود لوگوں پر نظر ڈال رہی تھی تو اس کی نظریں لمحہ بھر کے لیے ہی شاداں اور رضوان پر رکی تھیں اور میں سمجھ گیا کہ وہ ان دونوں کی موجودگی میں بات کرنے سے گریز کر رہی ہے۔

’’صاحب جی میں یہ نوکری چھوڑنا چاہتی ہوں۔‘‘ ہم دوسرے کمرے میں آئے تو اس نے ابتدا کی۔

’’خیریت، ایسی کیا وجہ ہوئی کہ آپ اتنا پرانا تعلق ختم کرنے کے بارے میں سوچ رہی ہیں؟‘‘ میں نے یہ کہا اور اپنی کرسی اس کے قریب کھینچ لی۔ وہ بیڈ پر بیٹھی تھی اور میں کرسی کھینچ کر اس کے قریب لایا۔

’’چھوٹے صاحب اچھا ہوا کہ آپ نے پرانے تعلق کا حوالہ دے دیا۔‘‘ اس نے کہا۔

’’مجھ سے کوئی شکایت؟‘‘ میں نے ایک اور سوال کر دیا۔

’’بالکل بھی نہیں چھوٹے صاحب۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’آپ تو میرے یا ہمارے لیے اپنی والدہ سے بھی بہتر ہیں۔‘‘ اس نے کہا۔

’’تو پھر ایسی کیا وجہ ہے کہ آپ اس گھر سے اپنا تعلق ختم کر رہی ہیں جہاں آپ نے اپنی عمر گزار دی۔‘‘ میں نے کہا اور اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

’’صاحب جی آپ کے احسانات اتنے ہیں کہ میں ان کے بدلے میں سے ایک کا بھی بدلہ نہیں اتار سکتی۔‘‘ اس نے بھیگی آنکھوں کے ساتھ کہا۔ ’’آپ نے میرے نواسے کا داخلہ اچھے اسکول میں کروایا اور اب وہ سیکنڈری میں آ گیا ہے۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’چند سال میں وہ میٹرک بھی کرلے گا اور مجھے شاید کام کرنے کی ضرورت ہی نہ رہے۔‘‘ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

’’پھر کیا بات ہے؟‘‘ میں اصل مدعے پر واپس آ گیا۔

’’شکایت مجھے اور میری بیٹی کو شاداں اور رضوان سے ہے۔‘‘ اس نے اب اصل بات شروع کی تھی۔

’’اور وہ شکایت کیا ہے؟‘‘ میں نے سوال کیا۔

’’جب آپ ڈرائنگ روم میں ان سے سوال کر رہے تھے کہ تمہارا اور رضوان کا کیا تعلق ہے تو میں وہیں پردے کے پیچھے کھڑی تھی۔‘‘ اس نے کہا اور میں چونک گیا۔

’’مگر میں نے تو آپ کو وہاں نہیں دیکھا۔‘‘ میں نے کہا۔

’’آپ نے کیا مجھے تو شاداں نے بھی نہیں دیکھا۔‘‘ اس نے کہا۔

''دراصل جب آپ لوگوں نے ڈرائنگ روم چھوڑا تو میں نے سوچا کہ میں نے کھڑکیوں کی صفائی تو آج کی ہی نہیں اور میں ڈرائنگ روم میں آگئی اور اپنا ادھورا کام پورا کرنے لگی۔ تب ہی آپ اپنی بیوی کے ساتھ وہاں آئے اور آپ کے درمیان جو گفتگو ہوئی، اس کا ایک ایک لفظ میں نے سن لیا تھا اور تب ہی میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ یہی وقت ہے آپ کو حقیقت بتانے کا۔'' وہ خاموش ہوگئی۔ میں نے سوچا کہ اب ان سے پوچھ ہی لیا جائے کہ حقیقت کیا ہے اور میں نے وہ سوال کر ہی دیا جس کے جواب میں وہ کچھ دیر خاموش رہی۔

''حقیقت یہ ہے کہ شاداں آپ کی وفادار نہیں ہے۔'' اس نے کہا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے سر پر کسی نے بم کا دھماکا کر دیا ہو۔ میں نے فوری طور پر کوئی ردِعمل نہیں دیا بلکہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

''اتنی بڑی بات آپ بغیر ثبوت کے تو نہیں کرسکتیں؟'' میں نے کہا۔

''ثبوت بھی ہیں میرے پاس اور ایسا ثبوت ہے کہ وہ دونوں بھی اس کی تردید نہیں کرسکتے۔'' اس نے اتنا کہا اور خاموش ہوگئی۔

''پہلے میں آپ کو یہ بتادوں کہ آپ کی غیر موجودگی میں یہاں کیا کھیل ہوتا رہا ہے۔'' اس نے کہا اور چپ ہوگئی۔

''کیا کھیل ہوتا رہا ہے؟'' اس کی خاموشی طویل ہونے لگی تو میں نے سوال کیا لیکن فوری طور پر جواب نہیں ملا۔

''آپ کی غیر موجودگی میں جب وہ آئیں تو میں نے ان کا بڑی خوش دلی سے استقبال کیا۔ انہوں نے آتے ہی بتایا کہ ان کے ایک ڈرامے کی شوٹنگ ہے اور وہ سات دن قیام کریں گی۔ ساتھ ہی انہوں نے رضوان کا تعارف کروایا کہ وہ ان کا کزن اور بزنس منیجر ہے اور وہ بھی یہیں قیام کرے گا۔ مجھے اس پر کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ اپنے لیے انہوں نے وہ کمرا منتخب کیا جہاں وہ پہلے بھی ٹھہر چکی تھیں لیکن ساتھ کا کمرا انہوں نے رضوان کے لیے ٹھیک کرنے کا حکم دیا۔ اس پر میں نے اعتراض کیا کہ یہ تو چھوٹے صاحب کا کمرا ہے لیکن شاداں نے میرے اعتراض کو رد کرنے میں ایک منٹ بھی نہیں لگایا۔ ''تم سے جو کہا ہے وہ کرو'' انہوں نے حکم دیا۔ میں نے کہا کہ اس لہجے میں بھی چھوٹے صاحب نے بھی مجھے مخاطب نہیں کیا تو انہوں نے کہا۔ ''میں اس گھر کی مالکن ہوں اور تم صرف ملازمہ ہو اس لیے وہی کرو جو میں کہہ رہی ہوں۔'' اور میں خاموش ہوگئی اور وہی کیا جو وہ چاہتی تھیں۔''

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے سوال کیا۔

''چار دن اسی طرح گزر گئے۔'' اس نے دوبارہ سے اپنی بات شروع کی۔ ''میں وہی کرتی رہی جو وہ حکم دیتی رہی تھیں۔ پانچویں روز انہوں نے کہا یہ تمہارا نواسہ روز صبح ہماری گاڑی میں کہاں جاتا ہے تو میں نے کہا مالکن اسکول جاتا ہے۔ اس پر انہوں نے کہا کون سے اسکول میں۔ میں نے اسکول کا نام بتایا تو وہ بولیں۔ اللہ کی شان ہے کہ ایک ماسی کا بیٹا اتنے مہنگے اسکول میں پڑھ رہا ہے۔ یہ بات مجھے بُری لگی تھی اور میں نے کہا کہ اسکول میں داخلہ چھوٹے صاحب نے کروایا تھا اور وہی فیس بھی دے رہے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ وہ جھٹکے سے اکھڑ گئیں۔ میرے شوہر کی نرمی کا فائدہ اٹھا کر تم ماں بیٹی اسے لوٹ رہے ہو۔ یہ ایسی بات تھی جو میں برداشت نہ کرسکی۔''

''کیا لوٹ رہے ہیں؟'' میں نے پہلی بار اپنی زبان کھولی تھی جس کا انہوں نے بہت بُرا منایا۔ ''تمہارا نواسا اتنے مہنگے اسکول میں پڑھ رہا ہے، ہماری گاڑی استعمال کررہا ہے۔ گھر میں جو پکتا ہے اس میں تم اور تمہاری بیٹی اور نواسہ کھا رہے ہیں، کیا تنخواہ ہے تمہاری؟'' انہوں نے سوال کیا۔ جس کا جواب میں نے دیا۔ ''کوئی تنخواہ مقرر نہیں ہے۔ صاحب کا جب جی چاہتا ہے وہ مجھے گھر کے خرچ کے لیے رقم دے دیتے ہیں۔'' میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ انہوں نے کہا۔ ''اور لوٹنا کسے کہتے ہیں مجھے یقین ہے کہ نہ انہوں نے کبھی حساب مانگا ہوگا نہ تم نے حساب دیا ہوگا۔'' یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلی گئیں پھر پلٹیں اور کہا ''یہ تمہاری بیٹی صرف روٹیاں توڑنے کے لیے ہے وہ کام کیوں نہیں کرتی؟'' ان کا سوال ایسا تھا کہ مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔

''جب بیگم صاحبہ حیات تھیں تب سے ایسے ہی چل رہا ہے۔'' میں نے کہا اور انہوں نے کہا۔ ''انہیں گئے ہوئے عرصہ بیت گیا ہے اپنی بیٹی سے کہو کہ روز میرے پیر دبایا کرے۔''

''مگر رات میں تو آپ ہوتی ہی نہیں ہیں۔'' میں نے کہا تو انہوں نے فرمایا۔ ''میں نے یہ کب کہا کہ رات میں دبایا کرے جب شوٹنگ سے تھک کر آتی ہوں تب دبایا کرے۔'' اس دوران انہوں نے بتایا کہ میں نے اپنا قیام بڑھا دیا ہے کیونکہ ایک تو مجھے نئی فلم مل رہی ہے جس کی ابتدائی شوٹنگ کراچی میں ہونی ہے دوسرے تمہارے چھوٹے صاحب ایک دو دن میں آنے والے ہیں۔ اس روز شام میں جاتے ہوئے وہ اپنا موبائل گھر بھول گئی تھیں۔ شام میں اس کی بیل بجنی شروع ہوئی اور بجتی چلی گئی تو میں نے فون اٹھالیا۔ ''کہاں رہ

گئیں؟'' دوسری طرف کوئی مرد تھا اور کسی قدر غصے میں تھا۔ ''رضوان نے کہا تھا کہ تم چھ بجے تک آجاؤ گی لیکن سات بج گئے ہیں اور تمہارا کوئی پتا نہیں۔'' اس نے کہا۔

''یہ نمبر شاداں کا ہے لیکن میں شاداں نہیں ہوں۔'' میں نے انتہائی نرمی سے جواب دیا۔

''کہاں گئی ہے؟'' اس نے میرے شاداں نہ ہونے کا سُن کر سوال کیا۔

''میں نہیں جانتی۔'' میں نے کہا۔ ''شاید شوٹنگ پر گئی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''شوٹنگ تو اس نے میرے ساتھ کرنی تھی۔'' اس نے کہا۔

''آپ کون صاحب؟'' میں سوال کیے بغیر نہ رہ سکی تھی۔

''اس سے کہنا شیخ مختار کا فون تھا جس نے آج رات کے لیے ڈیڑھ لاکھ دیے تھے رضوان کو۔'' یہ کہہ کر اس نے فون کاٹ دیا اور اس آخری فقرے سے بہت کچھ میری سمجھ میں آگیا اگرچہ پہلے دن سے مجھے شک تو تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے لیکن یہ علم نہیں تھا کہ پوری دال ہی کالی ہے۔'' اس نے اپنی بات مکمل کر کے کچھ وقفہ لیا۔

''تو آپ نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا؟'' میں نے سوال کیا۔

''میں نے اپنی بیٹی سے بات کی اور اس نے مشورہ دیا کہ چھوٹے صاحب اگر ایک دو دن میں آرہے ہیں تو ان سے بات کرنے کے بعد کوئی فیصلہ کرنا۔'' اس نے کہا اور میں ہنس دیا۔

''آپ سے زیادہ عقلمند تو آپ کی بیٹی ہے۔'' میں نے کہا۔

''اس شام رضوان واپس آیا تھا اور آتے ہی اس نے فون اٹھا لیا تھا۔ ''کوئی کال تو نہیں آئی تھی؟'' اس نے سوال کیا اور مجھے بتانا پڑا کسی شیخ مختار کی کال تھی اور وہ ناراض ہو رہا تھا۔''

''یہ لوگ بھی عجیب ہیں۔ سمجھتے ہیں لاکھ روپوں میں انہوں نے خرید لیا ہے۔'' رضوان نے اتنا کہا اور موبائل لے کر چلا گیا۔

''صبح میں شاداں جلدی آگئی عام طور پر وہ دس بجے سے پہلے نہیں آتی تھیں مگر اس روز آٹھ بجے ہی آگئی تھیں۔ ''اپنی بیٹی کو میرے کمرے میں بھیجو۔'' اس نے آتے ہی کہا اور میں نے حکم کی بجا آوری کی۔

''شاداں کا حکم تھا کہ ہمارے آنے کے آدھے گھنٹے میں ناشتا کھانا چاہیے لیکن ابھی میں ناشتا تیار کر رہی تھی کہ مجھے اپنی بیٹی کی آوازیں سنائی دیں، میں اس طرف دوڑی تو وہ نیم برہنہ حالت میں تھی اور شاداں کی بھی وہی پوزیشن تھی جبکہ کمرے میں رضوان بھی تھا اور اس کے جسم پر برائے نام لباس تھا۔''

''تمہاری بیٹی کے ہاتھوں میں تو جان ہی نہیں ہے۔'' میری دستک پر شاداں نے ہی دروازہ کھولا تھا اور مجھے دیکھتے ہی اس نے کہا تھا۔

''جھوٹ بول رہی ہیں یہ۔'' میری بیٹی نے اس کی تردید کی۔

''اصل بات کیا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''میں نے ان کی ٹانگیں دبانی شروع کیں تو انہوں نے کہا تمہارے ہاتھوں میں تو جان ہی نہیں، میں دکھاتی ہوں کہ کیسے دبایا جاتا ہے یہ کہہ کر انہوں نے درمیانی دروازے پر دستک دی اور یہ صاحب کمرے میں آئے اور انہوں نے پہلے ہاتھ دبائے اور پھر میرے ساتھ بدتمیزی شروع کر دی۔ میں اٹھی تو ان دونوں نے مجھے روک لیا۔ میں نے کہا مجھے چھوڑ دیں ورنہ میں شور مچا دوں گی لیکن اس شخص نے مجھے بستر پر دھکا دیا میں بستر پر گری تو میری چیخ نکل گئی اور شاید اسی آواز پر آپ یہاں آگئی ہیں۔'' میری بیٹی نے کہا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہے؟'' میں نے شاداں سے سوال کیا۔

''یہ جھوٹ بول رہی ہے۔'' شاداں کا جواب تھا۔

''اگر یہ جھوٹ بول رہی ہے تو یہ کیا ہے؟'' میں نے رضوان کی جانب اشارہ کیا جو اس وقت تک انڈرویئر میں تھا۔ وہ یہ کہہ کر چپ ہو رہی۔

''ان تمام باتوں سے تو وہ انکار کر دے گی بلکہ دونوں انکار کر دیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ ثبوت کہاں ہے جس کے بارے میں آپ نے فرمایا تھا کہ وہ دونوں اس سے انکار نہیں کر سکتے۔'' میں نے سوال کیا۔ ''اور یہ شیخ مختار وہی ہے نا جو ہوٹل مہران کا مالک ہے؟'' میں نے کہا۔

''شیخ مختار کے بارے میں تو نہیں جانتی لیکن وہ ثبوت اس موبائل میں ہے۔'' اس نے اپنا موبائل میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے موبائل ہاتھ میں لیا تو اس نے دوبارہ موبائل لیا۔

''میں وہ ویڈیو نکال دیتی ہوں جو میں نے اپنے

نواسے سے بنوائی ہے۔'' اس نے موبائل میں ویڈیو نکالی اور میری جانب موبائل بڑھا دیا۔ میں نے وہ ویڈیو دیکھنی شروع کی۔ ویڈیو کیا تھی۔ ٹرپل ایکس فلم تھی جس میں ہیرو رضوان اور شاداں ہیروئن تھی۔ میں نے ویڈیو دیکھی اور موبائل واپس کر دیا۔

''یہ بنائی کس طرح؟'' میں نے سوال کیا۔

''جس صبح آپ کو آنا تھا، اس رات شاداں نے شوٹنگ سے چھٹی کر لی تھی۔ مجھے شبہ تھا کہ شاداں آج کی رات ضائع نہیں کرے گی اس لیے میں نے پہلے سے اس کھڑکی کو اندر سے کھلا رکھا تھا اور پردے کو ذرا سا کھسکا دیا۔ جب میں نے دیکھا کہ کمرے کی لائٹ بند ہو گئی تو میں نے نواسے کو بلا لیا اور یہ ویڈیو بنوائی کمرے میں زیرو واٹ کا بلب جلا ہوا تھا اس لیے ویڈیو بہت واضح نہیں لیکن ان دونوں کے چہرے اور حرکات واضح ہیں۔''

''اب آپ ایسا کریں کہ اس کمرے سے ان دونوں کو بُلوا لیں۔'' اور خود میں نے شیخ مختار کو ڈائل کر دیا۔ ''رابطہ ہوا تو میں نے کہا۔ ''تم تو مجھے اپنا دوست کہتے تھے، تمہیں شرم نہیں آئی میری بیوی کے ساتھ رات گزارتے ہوئے؟'' میں نے کہا۔

شیخ مختار کچھ دیر تو خاموش رہا لیکن پھر کہنے لگا۔

''سامنے بریانی موجود ہو تو کس کا ہاتھ رکتا ہے؟''

''کچھ رشتوں کا بھرم بھی ہوتا ہے۔'' میں نے کہا اور شیخ مختار نے قہقہہ لگایا۔ ''کن وقتوں کی بات کر رہے ہو یار ویسے میں نے مفت میں یہ دعوت نہیں اڑائی، ڈیڑھ لاکھ دیے ہیں ہر رات کے۔'' اس نے کہا۔

''جو ہونا تھا، وہ ہو چکا اب تم ایک کام کرو جلد سے جلد میرے گھر آ جاؤ۔'' میں نے کہا اور تب ہی شاداں اور رضوان دروازے پر نظر آئے۔

''اب کسے بُلا رہے ہیں؟'' رضوان نے سوال کیا۔

''زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں پہنچ جائے گا اس لیے دس منٹ انتظار کر لو۔'' میں نے کہا اور وہ دونوں ایک ایک کرسی سنبھال کر بیٹھ گئے اور میں اٹھ کر باہر آ گیا تاکہ چوکیدار کو بتا سکوں کہ وہ شیخ مختار کو نہ روکے مگر اس سے پہلے میں نے انصر سے کہا۔ ''تم بھی اس کمرے میں جاؤ تاکہ ایک گواہ کا اضافہ ہو جائے۔''

''مسئلہ کیا ہے؟'' انصر نے اٹھنے سے پہلے سوال کیا۔

''مسئلہ نہیں ہے بلکہ مسئلے کا اختتام ہے۔'' میں نے اس کے جواب میں کہا اور باہر کی جانب چل دیا۔

''اس کمرے میں آنے سے پہلے جہاں وہ تینوں موجود تھے میں نے ایک بار پھر شیخ مختار کو فون کیا۔ ''کہاں پہنچے؟'' پوچھا۔ ''تمہارے گھر کے آگے جو پیٹرول پمپ ہے اس سے پیٹرول ڈلوا رہا ہوں۔'' اس اطمینان کے بعد شیخ مختار اگلے ایک دو منٹ میں پہنچ جائے گا۔ میں اس کمرے کی جانب بڑھا جہاں وہ تینوں موجود تھے۔

''کہاں ہے تمہارا مہمان؟'' شاداں نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

''بہت جلدی ہو رہی ہے، واقعی انتظار بہت کٹھن ہوتا ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''دس منٹ کا کہا تھا اور دس منٹ تو گزر گئے۔'' رضوان نے کہا۔

''دس منٹ کا کہہ کر ہمیں بے وقوف بنایا اور ہم اتنے سادہ لوح کہ نہ صرف بے وقوف بن گئے بلکہ اب تک بن رہے ہیں جبکہ تیرہ منٹ گزر گئے۔''

''مجھ پر الزام لگا رہے ہو کہ دس منٹ کا کہہ کر بے وقوف بنایا اور تم دونوں جو ایک عرصے سے مجھے بے وقوف بنا رہے ہو۔'' میں نے کہا۔

''ہم نے کیا بے وقوف بنایا ہے؟'' شاداں نے کہا۔

''یہ تم دونوں زیادہ بہتر جانتے ہو۔'' میں نے کہا۔

''اور مجھ سے پہلے تم دونوں نہ جانے کس کس کو بے وقوف بناتے رہے ہو۔'' میں نے کہا اور شاداں اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

''بس بہت ہو گیا۔'' اس نے طیش بھری آواز میں کہا۔

''یہ فقرہ تو میرا ہونا چاہیے تھا۔'' میں نے شاداں کے مزید کچھ کہنے سے قبل کہا۔

عین اس وقت شیخ مختار کمرے کے دروازے پر پہنچا تھا۔ چوکیدار اسے کمرے تک پہنچا کر واپس ہو رہا تھا۔ شیخ مختار کو دیکھ کر ان دونوں کے چہروں کا رنگ زرد ہو گیا۔

''کیوں خاموش کیوں ہو گئے؟'' میں نے سوال کیا۔

''شیخ صاحب تُسی؟'' رضوان نے کہا۔

''ہاں جی میں۔'' شیخ مختار کا جواب تھا۔

''اور تم مجھ سے ایسے سوال کر رہے ہو کہ آج پہلی ملاقات ہوئی ہے؟'' شیخ مختار نے رضوان کو مخاطب کیا تھا۔

''ہمارے درمیان تو اس وقت سے تعلق ہے جب تم پروین کے پی آر او تھے۔'' شیخ مختار نے کہا اور رضوان کا

چہرہ مزید زرد ہوگیا۔
''یہ کیا ہے؟'' شاداں نے مجھ سے کہا۔
''اس کا جواب تو تم دو گی یا تمہارا یہ کزن۔ جو مجھے امریکا اور لندن کا لالچ دے رہا تھا کہ آپ کو وہی کرنا ہوگا جو میں کرتا ہوں اس نے اب سے کچھ دیر پہلے کہا تھا اور شاداں تمہیں بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا کیا تم نے مجھے بھی وہی سمجھا تھا جو یہ کرتا رہا ہے؟''
''میں مانتی ہوں کہ ہمارا جرم ناقابلِ معافی ہے لیکن اگر تم نے معاف نہیں کیا تو تمہارا نقصان ہے۔'' شاداں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔
''میں نقصان برداشت کرلوں گا شاید تم حق مہر کے ان دس لاکھ روپوں کا کہہ رہی ہو جو مجھے تمہیں طلاق دینے کے عوض دینے ہوں گے۔'' میں نے کہا اور شاداں کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔
''تمہیں یہ مکان بھی خالی کرنا ہوگا جس کی مالیت اس وقت تیس کروڑ سے زیادہ ہے۔'' شاداں نے ایک اور دھمکی دی۔
''مکان کے لیے تمہیں عدالت سے رجوع کرنا ہو گا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن اس سے پہلے وہ ویڈیو وائرل کر دوں گا جو میرے پاس ہے۔'' میں نے کہا۔
''کیسی ویڈیو؟'' شاداں کا سوال تھا اور میں نے ''اماں'' کہہ کر آواز دی اور اگلے ہی لمحے وہ دروازے پر تھی۔
''اماں یہ وہ ویڈیو دیکھنا چاہتی ہیں۔'' میں نے کہا اور اس نے ویڈیو لگا کر شاداں کو دی جسے شاداں نے دیکھنے کے بعد رضوان کو تھما دی جسے رضوان نے غور سے دیکھا۔
''اس میں تو واضح نہیں ہے کہ یہ ہم ہی ہیں۔'' رضوان نے کہا۔
''زیرو واٹ کی روشنی میں ایسی ہی ویڈیو بن سکتی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن پہلے تم دونوں اس پر غور کرو کہ کیا تم یہ سب افورڈ کرسکتی ہو۔'' میں نے سوال کیا۔ ''یہ بھی سوچو کہ ویڈیو دیکھنے کے بعد میڈیا میں کیا سوال نہیں اٹھیں گے اور تمہاری شہرت کیا ہوگی میڈیا کے سوالات کے بعد؟'' میں نے کہا اور وہ دونوں خاموش رہ گئے۔
''نمک حرام۔'' شاداں یہ کہتے ہوئے مارنے والے انداز میں آگے بڑھی لیکن افسر درمیان میں آگیا۔
''یہ ٹائٹل تو تم پر سجتا ہے۔'' اس نے شاداں کا ہاتھ پکڑلیا۔
''اور شیخ مختار تم اس کے عدالت میں جانے کی صورت میں گواہی دو گے کہ تم ایک رات کا ڈیڑھ لاکھ دیتے رہے ہو۔''
''تو بہن...... تو مجھے لاکھ روپے دیتا رہا ہے۔'' شاداں نے رضوان کو گالی دیتے ہوئے کہا۔
''مختار آج کی رات انہیں اپنے ہوٹل میں جگہ دے دو کیونکہ دس منٹ کے اندر یہ میرا گھر خالی کرنے والے ہیں۔'' میں نے شیخ مختار سے کہا۔
''میں ان کے لیے وی آئی پی کمرا بک کروا دیتا ہوں بلکہ انہیں ساتھ ہی لے جاؤں گا تاکہ ان کی ٹیکسی کا کرایہ بھی بچ جائے۔'' شیخ مختار نے کہا۔
''اماں ان کی پیکنگ میں مدد کردو۔'' میں نے انہیں مخاطب کیا جنہیں میں بچپن سے اماں کہتا آیا تھا۔
''اپنی بیٹی کو بھی بلوا لو تاکہ کام جلد نمٹ جائے۔'' شاداں نے کہا اس طرح اس نے گھر سے جانے پر رضامندی ظاہر کردی تھی۔
''ایک کام اور......'' میں نے شیخ مختار سے کہا۔ ''اپنے وکیل سے کہہ کر کل کے دن میں طلاق کے کاغذات تیار کروا دینا۔''
''اس کے لیے نکاح نامہ چاہیے ہوگا۔'' شیخ مختار نے کہا۔
''صبح دس بجے کے بعد کسی وقت میں وہ تمہارے ہوٹل پہنچا دوں گا۔'' میں نے کہا۔
''دس بجے میں اپنے وکیل کو دفتر بلا لوں گا۔'' شیخ مختار کا جواب تھا۔
''خدا کے لیے یہ نہ کرو۔'' شاداں نے میرے قدموں میں گرتے ہوئے کہا۔ ''اخبار میں جب یہ خبر آئے گی کہ شادی کے تین ماہ کے اندر مجھے طلاق ہوگئی تو میں کہیں کی نہیں رہوں گی۔'' شاداں نے کہا اور اس کے ساتھ ہی رضوان نے بھی میرے پیر پکڑ لیے۔
''میری بھی درخواست ہے کہ یہ نہ کریں۔'' رضوان نے کہا۔
''تجھے کیا فرق پڑے گا پہلے پروین تھی اب شاداں ہے۔ اگلے ہفتے کوئی اور ہوگی۔ تیری سپلائی ایجنسی پر تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' میں نے رضوان کو اپنے پیروں سے دور کرتے ہوئے کہا۔ ''اس پر شکر کر کہ میں تجھے اس گھر سے صرف نکال رہا ہوں ورنہ میری بہن جیسی لڑکی پر زیادتی کے جرم میں تیرا وہ حشر کرتا کہ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔'' میں نے کہا۔
وعدے کے مطابق شیخ مختار ان دونوں کو اپنے ساتھ

لے گیا لیکن اگلے روز میں شیخ مختار کے پاس نہیں گیا بلکہ فون کر کے شیخ مختار اور اس کے وکیل کو اپنے گھر بلوا لیا اور شام تک وکیل نے طلاق کے کاغذات تیار کر دیے اور میں نے دستخط کر کے نکاح نامہ پر درج شاداں کے پتے پر ٹی سی ایس کر دیے۔ انصر ان تینوں کے بعد میرے گھر سے رخصت ہوا تھا۔

"میں تو تمہیں اس گھر میں داخل ہونے تک بے وقوف مرد سمجھتا رہا لیکن تم نے نہ صرف مجھے غلط ثابت کیا بلکہ کروڑوں کا گھر بھی ہتھیا لیا۔ شاید یہ اس محلے کا پہلا واقعہ ہو کہ آخر میں اس محلے کی لڑکی کے ہاتھ کچھ نہ آیا ہو بلکہ کروڑوں کا نقصان کر کے لڑکی واپس آئی تھی۔"

☆☆☆

میں اب تک اسی گھر میں مقیم ہوں لیکن ایک فرق آیا ہے میری زندگی میں۔ اب میں شاداں کے ڈرامے بھی دیکھتا ہوں اور اس کی نئی آنے والی کوئی فلم میں نے نہیں چھوڑی۔

ایک بار ان دونوں بہنوں سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ اس ملاقات میں بھی ان دونوں نے سیلفی بنانے کی خواہش ظاہر کی اور میں نے انہیں ائرپورٹ کی طرح سے مایوس نہیں کیا۔ "ایک بات پوچھوں؟" اس بولڈ لڑکی نے سوال کیا۔

"سنا ہے آپ نے میڈم شاداں سے علیحدگی اختیار کر لی ہے؟" اس نے کہا اور میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

"علیحدگی نہیں بلکہ طلاق دے دی ہے اسے۔" میں نے کہا۔

"مگر وہ تو اتنی خوب صورت تھیں؟" اس لڑکی نے کہا اور میں ہنس دیا۔

"اگر تم بھی لاکھوں روپے کی پلاسٹک سرجری کروالو تو تم بھی خوب صورت دکھائی دے سکتی ہو۔" میں نے کہا اور وہ دونوں حیرت سے مجھے دیکھنے لگیں۔

"رضوان سے ملاقات ہوتی ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"آپ نہیں جانتے؟" انہوں نے میرے سوال کے جواب میں سوال کیا۔

"کیا نہیں جانتا؟" میں نے کہا۔

"رضوان کا تو مرڈر ہو گیا۔" بولڈ لڑکی نے کہا۔

"کب؟" میں نے ایک اور سوال کیا۔

"رضوان ہمیں چکمے دیتا رہا تھا کہ آج پروڈیوسر سے ملوا رہا ہوں، کل ڈائریکٹر کا فون آجائے گا لیکن نہ اس نے کسی سے ملوایا نہ کوئی فون آیا۔ اس چکر میں ہم ایک بار اسلام آباد اور دو بار لاہور کے چکر لگا چکے تھے۔ آخری چکر لاہور کا لگا کر واپس آئے تو اخبارات میں اس کے قتل ہونے کی خبر آگئی۔"

"یہ معلوم ہوا کہ اس کا قتل کس نے کیا؟"

"فرزانہ نامی ایک لڑکی کو بھی اس نے چکر دیے ہوئے تھے۔ اس نے پولیس کو بیان دیا کہ رضوان اسے تین پروڈیوسر سے ملوا چکا تھا لیکن عزت گنوانے کے سوا اسے کچھ حاصل نہیں ہوا اور اس نے بدلہ لینے کے لیے رضوان کو اس وقت قتل کیا جب وہ اسے چوتھے پروڈیوسر کے بہانے لے جا رہا تھا کہ راستے میں کچھ تلخ کلامی ہوگی اور اس نے رضوان کو شوٹ کر دیا۔" بولڈ لڑکی نے تفصیل بتائی۔

"اب وہ لڑکی کہاں ہے؟" میں نے ایک اور سوال کیا۔

"ہماری معلومات کا ذریعہ اخبار تھے اخبار کے لیے کہانی پرانی ہوگئی تو ہم نے بھی کھوج نہیں کی۔ ہوگی پولیس حراست میں یا جیل میں۔" انہوں نے کہا اور میں خاموش ہو گیا۔

یوں یہ کہانی اختتام کو پہنچی جو انصر سے شروع ہو کر مجھ سے ہوتے ہوئے رضوان کے قتل پر ختم ہوگئی۔

ایک بار میں نے سوچا کہ شاداں کو فون کر کے اس کے کزن کا پرسہ دے دوں لیکن پھر میں نے خود کو روکا۔ بلاوجہ ہی وہ سلسلہ جس سے میں نے مشکل سے جان چھڑائی تھی۔ اماں ضعیف ہو چکی ہیں۔ ان کی ذمے داریاں ان کی بیٹی نے سنبھال لی ہیں نواسہ انٹر کر چکا ہے۔ اور میں نے اپنے تعلقات استعمال کر کے اسے اینٹی نارکوٹکس میں ملازم کروا دیا ہے۔ اپیا ہفتے میں ایک بار ضرور فون کرتی ہیں اور ان کا پورا اصرار ہوتا ہے کہ میں کب تک اکیلا رہوں گا۔ انہوں نے تو میرے لیے ایک رشتہ بھی تلاش کر لیا ہے جو کینیڈا میں ہی پیدا ہوئی ہے اور میڈیکل ڈاکٹر ہے۔ لڑکی والوں سے انہوں نے کچھ نہیں چھپایا۔ لیکن وہ پھر بھی رشتے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ اپیا کے مطابق میں جب تک یہاں رہوں گا، شاداں کی یاد سے پیچھا نہیں چھڑوا سکوں گا حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ شاداں ایک تلخ ماضی تھا اور ماضی کی تلخیوں کو کون یاد کرتا ہے۔

اگلے ماہ شاید میں کینیڈا روانہ ہو جاؤں اور ایک نئی زندگی کا آغاز کر دوں۔ آپ بھی میرے اچھے مستقبل کی دعا کرتے رہنا جب تک میرے مرنے کی اطلاع نہ آجائے......





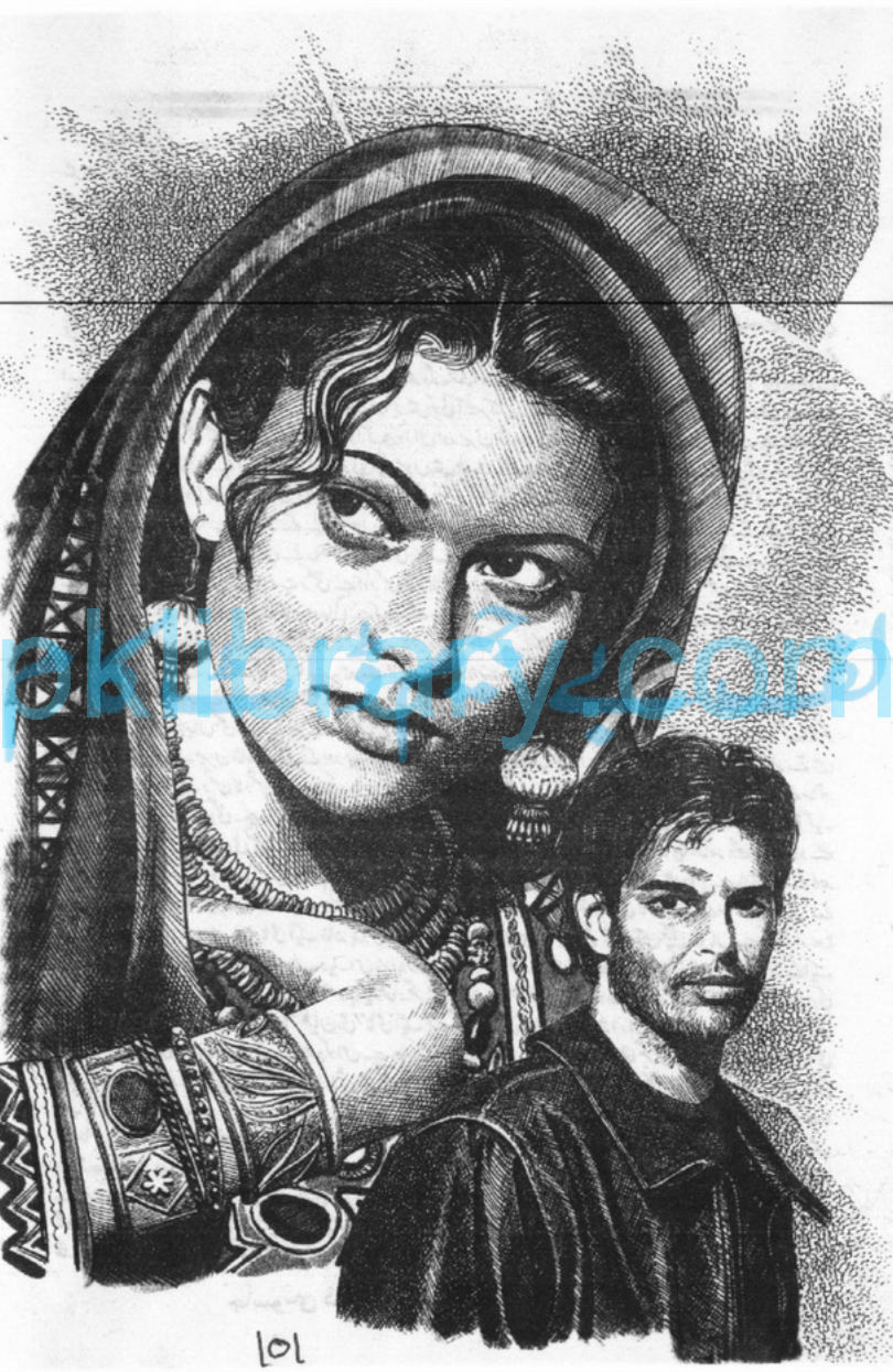
قسط: 12

پیکرِ انا گیر

امجد جاوید

زندگی کی کشمکش میں فنا و بقا ایک حقیقت ہے۔ قدرت کا دستور ہے کہ کوئی غیر معمولی طاقت اسی کو ملتی ہے جو اس کا موزوں استعمال جانتا ہے۔ فنا و بقا سے نبرد آزما ہونے والے خود شناس ہوتے ہیں۔ یہ وصف انہی کو حاصل ہوتا ہے جو انا گیر ہوں اور اپنا ادراک رکھتے ہوں... جو ظلم و جبر کے بگولوں کو مات دینا جانتے ہوں... سنہری ریت کے باطن سے اُبھرنے والے ایک نوجوان کی پرت در پرت کھلتی داستانِ دل نواز۔ وہ ریت کی طرح بکھر سکتا تھا مگر ذروں میں بٹ نہیں سکتا تھا۔ دھرتی کی مٹی میں نکھرنے اور سنورنے کا فن بخوبی جانتا تھا... اپنی ذات کو انا کے بھنور سے بچانا جانتا تھا... حالات کی آندھیوں کے سامنے سینہ سپر ہونے کے گر سے آگاہ تھا۔ جانتا تھا کہ بگولے ریت کو اِدھر اُدھر لے جاسکتے ہیں، فنا نہیں کرسکتے۔ ریشمی سراب تھے جو اس کی راہ میں حائل ہورہے تھے۔

صحرا کے سرابوں سے ایک دیدہ ور دل فگار نوجوان کی ہنگامہ خیزیاں



گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میرا نام علی زین ہے۔ صحرائے چولستان میں وارد ہوتے ہی میں مقامی غنڈوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ وہ مجھے زخمی کر کے بستی چراغ شاہ میں میرن شاہ کے ڈیرے پر لے آئے۔ وہاں پہنچ کر پتا چلا وہ غلط فہمی اور جلد بازی میں کسی دوسرے بندے کو اغوا کر کے لے آئے ہیں جبکہ مجھے اسی بستی اور ڈیرے پر جانا تھا۔ میں نے اپنا تعارف سروے آفیسر کی حیثیت سے کرایا تھا۔ میرن شاہ چونکہ اس علاقے کا حاکم تھا۔ میرے رہنے کا بندوبست اسی کے ڈیرے پر ہوا تھا۔ اس بستی میں میرے بچپن کی یادیں بکھری تھیں۔ مجھے اپنے بچپن کے دوست سانول اور ساوری کے علاوہ کئی دوسرے بھی یاد تھے۔ اگلے ہی دن معلوم ہوا کہ جس کے دھوکے میں مجھے اغوا کر کے لائے ہیں وہ نزدیکی بستی کا ایک فرد بختاور تھا، جن کے ساتھ ان کی خاندانی دشمنی چل رہی تھی۔ میرن شاہ بجائے وہاں کا سروے کروانے کے، مجھے خرگوش کے شکار پر لے گیا۔ اسی رات بارڈر پار سے کچھ لوگ میرن شاہ سے ملنے آئے..... جو سخت غصے میں تھے اور میرن شاہ پر قتل کا الزام لگایا جس سے وہ لاعلمی کا اظہار کرتا رہا۔ اسی رات ڈیرے پر میری ملاقات میرن شاہ کی خودسر بہن پیروزاں سے ہوگئی جو اپنے بھائی سے بھی زیادہ ظالم تھی۔ اگلی رات ڈیرے پر کچھ لوگ حملہ آور ہوئے جن میں ایک اس کے ہاتھوں جہنم واصل ہوا اور دو شدید زخمی ہو گئے یہیں سے میرے بارے میں شک ہوا کہ میں کوئی آفیسر نہیں۔ مجھے جلد ہی ایک مقامی نوجوان زمان موہل سے بہت ساری معلومات ملنے لگی تھیں۔ جس سے اندازہ ہوا کہ پیروزاں اور میرن شاہ روہی کے علاقے میں کیسے اپنی حاکمیت بنائے ہوئے تھے۔ دونوں بہن بھائی اپنے اپنے طور پر غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث تھے، دونوں ایک دوسرے کے راستے میں نہیں آتے لیکن اپنی اپنی حاکمیت مضبوط بنا رکھی تھی۔ میری ساوری سے ملاقاتیں بڑھ گئی تھیں۔ اس کا کہنا تھا کہ پیروزاں ایک ”ڈائن“ اور مردمار قسم کی عورت ہے۔ وہ مجھے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ روہی میں بارڈر پار سے کئی لوگ آتے تھے جو مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث تھے۔ پیروزاں نے راجھستان کے کئی بندے مروا دیے تھے۔ رتو بھوہڑ سے بھی مڈھ بھیڑ ہوئی ہے۔ مجھے پتا چلتا ہے کہ وہ اپنے تعلقات میں کتنی وسعت رکھتی ہے اور کس قدر طاقتور ہے۔ مجھ پر راجھستانی حملہ کرتے ہیں، جس میں، میں بچ جاتا ہوں۔ اس حملے میں پیروزاں کی نیت ظاہر ہو جاتی ہے کہ وہ مجھے چارے کے طور پر استعمال کرنا چاہتی ہے۔ میں نے بھی اس کے ساتھ کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔ حالات اس نہج پر آ پہنچتے ہیں کہ میں نے پیروزاں کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ ساوری اس رات پیروزاں کو بچا لیتی ہے اور مجھے اس کے ڈیرے سے جانا پڑتا ہے۔ میرے لاہور والے دوست روہی آ کر میری مدد کرتے ہیں اور میرن شاہ کے کئی لوگ ہمارے ہاتھوں قتل ہو جاتے ہیں۔ میرن شاہ سے میری جنگ لگی تھی۔ میں پوری پلاننگ کے ساتھ میرن شاہ کو اس کے گھر سے نکال کر بستی میں اس جگہ لایا جہاں کبھی اس نے میرے ماں، باپ اور بہن کو قتل کیا تھا۔ میں نے میرن شاہ کو اس کی ماں کے سامنے آگ لگا کر بےرحمی سے قتل کر دیا۔ میرن شاہ کے قتل کے بعد میرا وہاں رہنا مشکل تھا۔ پیروزاں اور اس کے طاقتور ساتھی پوری کوشش کرتے ہیں کہ مجھے گھیر کر مار دیں۔ دشمن کا دشمن، دوست کی بنا پر رتو بھوہڑ اور چاچا سائیں نے میری مدد کی۔ یہاں تک کہ پیروزاں کے ساتھ جنگ جیسی صورت حال بن گئی۔ پیروزاں نے فورسز کا سہارا لیا تو چاچا سائیں اور رتو بھوہڑ کی مدد سے میں سرحد پار راجھستان پہنچ گیا۔ مجھے ایک سرحدی بستی میں پناہ ملی تھی۔ مجھے وہاں کا مکھیا قتل کرنے کے درپے تھا۔ وہاں سے چاچا سائیں کا بیٹا بختاور مجھے بچا کر اودھے رام کے پاس لے گیا۔ اودھے رام ایک مجرم تھا جو اپنے ہاں پناہ لینے والوں سے جرم کرواتا تھا۔ اودھے رام سے ملاقات کے بعد مجھے ٹاسک دیا گیا کہ جیسلمیر میں موجود ایک بزنس مین کو قتل کرنا ہے۔ میں جیسلمیر پہنچ چکا تھا۔ مانسی نامی لڑکی کے ساتھ مل کر میں نے بزنس مین کا کام تمام کر دیا۔ مادھو نامی ایک خانہ بدوش کے ہاں پناہ لینا پڑی جہاں بھارتی آرمی آن پہنچی۔ وہاں سے بھی فرار ہونا پڑا۔ اسی جرم کی دنیا میں مجھے نیا ٹاسک سونپ دیا۔ اس بار دو لڑکیوں کو اغوا کرنا تھا۔ رتنا اور ششما نامی لڑکیوں کو میں نے اغوا کر کے ایک ویرانے میں پہنچا دیا تھا، جہاں میرے قتل کا منصوبہ تیار تھا۔ مگر میں رتنا اور ششما کو بچا کے جودھ پور لے گیا۔ رتنا اور ششما خود جرم کی دنیا کی بڑی کھلاڑی تھیں۔ وہیں پر مجھے ”کلیان جی“ نامی ایک مجرم تنظیم کا پتا مل گیا۔ مجھے اپنے ذرائع سے معلوم ہوا کہ پوجا نامی لڑکی دراصل کلیان جی کی ایجنٹ ہے۔ میں نے خود کو اس سے بچایا میں اسے اغوا کر کے قتل کرنا چاہتا تھا مگر قتل نہیں کر پاتا۔ پوجا کا ساتھی پرتاب راؤ، ان دونوں لڑکیوں کو غداری کی پاداش میں قتل کروانا چاہتا تھا۔ اسی دوران میں پتا چلا کہ کلیان جی کے ڈانڈے تو ریاستی خفیہ تنظیم سے ملتے ہیں، اس تنظیم کو چلانے والوں میں راکیش ورما بھی شامل تھا۔ جودھ پور میں خود کو بچاتے ہوئے مجھے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہیں سے مجھے ایک مددگار..... مشرا جی نامی آدمی سے پرتاب راؤ کے بارے میں خبر ملی۔ میں اس کے تعاقب میں دیوگڑھ جا پہنچا۔ دراصل وہاں پر رانی بھاگ وتی اور پرتاب راؤ کے درمیان دشمنی چل رہی تھی۔ اس نے رانی بھاگ وتی کی طرف سے پرتاب راؤ پر حملہ کیا۔ ریتو نامی ایک بازی گر لڑکی نے میرا ابھرپور ساتھ دیا۔ اپنی کارروائیوں سے میں نے پرتاب راؤ کو جھکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پرتاب راؤ خود ریاستی ایجنٹ تھا اور کلیان جی نامی خفیہ تنظیم کا رکن جس نے ڈاکٹر کامران ملک اور اس کی بیوی فائزہ ملک کو اپنی نجی جیل میں رکھا ہوا تھا۔ میں نے اپنی پوری قوت استعمال کرتے ہوئے ان دونوں کو بازیاب کروایا۔ یہاں سے مجھے پتا

چلا کہ کلیان جی نامی تنظیم کا وجود کتنی دور تک پھیلا ہوا ہے۔ پرتاب راؤ کے قتل کی پاداش میں مجھے وہاں سے فرار ہونا پڑا، آرمی فورس تعاقب میں تھی۔ ایک سادھو مائی نامی عورت کی مدد سے میں جے پور جا پہنچا۔ آسمان سے گرا اور کھجور میں اٹکا کے مصداق میں جے پور میں پھنس گیا۔ ایک مقامی تنظیم نے اس شرط پر مجھے بھارت سے نکالنے کی حامی بھری کہ میں ستیہ رام نامی شخص کو قتل کر دوں۔ بملا نامی آئی ٹی ایکسپرٹ کی مدد سے میں نے ان لوگوں کو قتل کر دیا۔ وہی بملا مجھے دوبارہ جیسلمیر تک لے گئی جہاں بھارتی فورسز انتظار میں تھیں۔ وہاں بھی حالات خراب تھے۔ میں بری طرح پھنس چکا تھا مگر بختاور کی مدد سے میں واپس روہی آن پہنچا۔ روہی میرا ٹارگٹ پیروزاں بھی جو میرے لیے پہلے ہی جال بچھائے بیٹھی تھی۔ پیروزاں اپنی پوری قوت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اس کی مدد کو راجستانی دشمن اور بھارتی ایجنٹ آ گئے۔ یہاں ایک نئی کشمکش کا آغاز تھا۔ یہاں تک کہ بختاور کی مدد سے ہم نے پیروزاں کو اغوا کر لیا۔ ساوری اپنے انتقام کے باعث پیروزاں کو قتل کرنا چاہتی تھی۔ ساوری کو اپنی محبت کے اظہار کے طور پر میں نے اپنا ماضی بتایا کہ کس طرح بستی چراغ شاہ سے بھاگا اور کہاں کہاں سے ہوتا ہوا لاہور پہنچ گیا۔ اب تک کی زندگی کیسے گزری۔ چاچا عبدالمجید جس نے ہر پل میری راہنمائی اور مدد کی، وہ روہی میں آ گیا تھا۔ ہم نے سانول اور رحماں کی شادی کر دی تھی۔ اسی شادی پر ناچنے والی لڑکی ردمی سے چھوٹو رام جیسا بدمعاش سامنے آ گیا تھا، جس کے ڈانڈے جرم کی دنیا میں بہت دور تک جاتے تھے۔ چھوٹو رام شخص ایک پرزہ تھا۔ اصل بیوپار کرنے والے پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھے۔ ان کے ساتھ زبردست ٹاکرا ہوا۔ ہم شہر آ گئے۔ اب کلیان جی نامی تنظیم کا کھوج لگانا تھا۔ اس سلسلے میں پوجا راہنمائی کر سکتی تھی مگر وہ کیا کھیل، کھیل رہی تھی۔ ابھی ہماری سمجھ سے دور تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

پوجا کے نرم چہرے سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ میری دشمن نہیں بہت پرانی دوست ہو۔ اس نے مجھے ایک مشکل فیصلے میں ڈال دیا تھا۔ میرا سب سے بڑا امتحان تو یہی تھا کہ میں اسے قتل کرنے کے بجائے چھوڑ دوں اور وہ چلی جائے۔ مگر میری سوچ اس سے آگے بڑھ ہی نہیں پا رہی تھی کہ وہ اتنی آسانی سے میرے پاس آ کر مجھے جو بھی آفر کر رہی ہے تو کیوں......؟

جہاں یہ بات میرے لیے معما تھی وہاں ایک رسک بھی تھا۔ وہ اگر مر جاتی تو اس کے ساتھ ہی دشمن کا نیٹ ورک بھی میری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا۔ حتمی طور پر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا کہ نیٹ ورک کے بارے میں پوجا جانتی بھی ہے یا نہیں، وہ اس نیٹ ورک کا حصہ ہے بھی یا نہیں، نیٹ ورک وہی چلا رہی ہے یا پھر محض اس کی آڑ لی ہے؟

''زیادہ سوچو گے تو کچھ بھی تمہارے پلے نہیں پڑے گا راج ویر سنگھ جی، ترنت فیصلہ کرو۔'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''تم کیا سمجھتی ہو، میں کیسا فیصلہ کرنا چاہتا ہوں؟'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا دی اور بولی۔

''مجھ پر اعتبار کرنا چاہیے یا پھر نہیں؟''

''نہیں پوجا، میں تمہیں مار دینے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔'' میں نے دھیمی سی مسکان کے ساتھ کہا۔ میرے یوں کہنے پر اس کا چہرہ کسی بھی تاثر سے خالی رہا، وہ خاموش رہی تو میں بولا۔ ''وہ طریقہ سوچ رہا ہوں جس سے راکیش ورما سے لے کر ان سب تک بھی تمہاری موت کی اطلاع پہنچ جائے، جنہوں نے تمہیں یہاں بھیجا ہے۔''

میرے یوں کہنے پر وہ بے بسی سے مسکرا دی، پھر اچانک تنک کر بولی۔ ''انہوں نے مجھے بھیجا ہی مرنے کے لیے ہے، مر گئی تو کوئی بات نہیں انہیں ذرا فرق نہیں پڑے گا لیکن اگر...... کچھ بھی نہیں ہو گا راج ویر۔''

''مجھے تیرے زندہ رہنے اور مرنے سے کوئی مطلب نہیں، نہ جانے کتنے دشمن ہیں میرے۔ مجھے صرف یہ دیکھنا ہے، مجھے فائدہ...... تیرے مرنے میں ہے یا زندہ رکھنے میں۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''تم بے وقوف ہو، میرے جیسا دشمن تمہیں کبھی نہیں ملے گا، سوچ لو، محض چند منٹ ہیں تمہارے پاس، پھر مجھے جانا ہے۔'' اس نے سخت لہجے میں کہا تو میں اطمینان سے بولا۔

''میں جانے دوں گا تو جاؤ گی نا۔''

''مجھے تو جانا ہے باقی تمہاری مرضی......'' اس نے کاندھے اچکاتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔

''پوجا تم پہلی عورت ہو جو میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہو۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی پھر بولی۔

''اگر میں سمجھ میں آ جاؤں تو پھر زندہ نہ رہوں۔''

''اگر میں تمہیں زندہ چھوڑ دوں تو......؟'' میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

”میں تمہیں بہت فائدہ دوں گی لیکن اس کے عوض فائدہ بھی لوں گی۔ سچ بول رہی ہوں، مجھے اپنے دشمن تمہارے ہاتھوں مروانے ہیں، جتنے مارو گے، اتنا فائدہ دوں گی، اگر تمہارے بھیجے میں بات آجاتی ہے تو کرو پھر ڈن۔“ اس نے بھی حتمی لہجے میں کہتے ہوئے اپنی ہتھیلی آگے کر دی۔ اس کی سفید ہتھیلی میرے سامنے پھیلی ہوئی تھی، صرف ایک لمحہ تھا۔ میں نے اسی لمحے فیصلہ کیا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر سرد لہجے میں بولا۔

”ڈن ہو گیا پوجا، جاؤ...... کچھ نہیں پوچھوں گا تم سے۔“

”مطلب؟“ اس نے میری طرف غور سے دیکھا۔

”مطلب یہ کہ ابھی تم جاؤ، پھر ملیں گے تو فائدے نقصان کی بات کریں گے۔ اب اگر میں نے کوئی بات کہی، تم یہی سمجھو گی کہ میں احسان کر رہا ہوں تم پر......“ میں نے کہنا چاہا تو وہ مجھے ٹوکتے ہوئے تیزی سے بولی۔

”راج ویر...... تم نے پوجا سے ہاتھ ملایا ہے، یہ یاد رکھنا۔“

میں نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ایک لمحہ اس کی آنکھوں میں دیکھا اور باہر جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”جاؤ۔“

اس نے میری طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی، جسے میں بالکل بھی سمجھ نہیں پایا تھا۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی، پھر اپنے سامنے پڑے پسٹل کو اٹھا کر اپنے نیفے میں رکھا اور تیزی سے برقع پہننے لگی۔ اس نے برقع پہننے میں دو تین منٹ لگائے اور دروازے سے نکلتی چلی گئی۔ میں جانتا تھا کہ میرے بغیر وہ وہاں سے نہیں نکل سکتی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے جانے لگا۔ سیڑھیاں اتر کر ہم لاؤنج میں آگئے۔ نیچے شہباز کھڑا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا تو میں نے اسے اشارہ کر دیا کہ پوجا کو جانے دو۔ وہ اسے لے کر باہر کی جانب چلا گیا۔ کچھ دیر بعد پوجا گیٹ سے باہر تھی۔

”کیوں جانے دیا اُسے؟“ شہباز نے واپس لاؤنج میں آکر میرے ساتھ والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”یار اگر میں توجیہات بیان کروں تو بہت ساری کہہ دوں لیکن میں ایک بھی نہیں کہنا چاہتا، بس یار اسے جانے دیا میں نے۔“ میں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

”کوئی وجہ تو ہو گی جو یوں اُسے جانے دیا؟“ اس نے پوچھا تو میں نے ساری بات اسے بتا دی۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔ ”کوئی بات نہیں، اچھا کیا جانے دیا۔“

”شہباز، مجھے راکیش ورما کو ختم کرنے کے بجائے، یہاں کے نیٹ ورک کو تباہ کرنے میں زیادہ دلچسپی ہے۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

”فکر نہیں کر سو جا، ابھی تو آؤ نا، میں تمہیں گھر چھوڑ دوں، صبح تمہیں کچھ باتیں بتاؤں گا۔ یہ بھی ہو جائے گا۔“ اس نے کہا اور گاڑی کی طرف چل دیا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم وہاں سے نکل گئے۔

میں ساری رات جاگتا رہا تھا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ پوجا میرے ساتھ کھیل گئی ہے یا مجھے اپنے ساتھ کھیل میں شامل کر گئی ہے۔ زندگی میں پہلی بار میں ایسی کسی صورتِ حال سے دوچار ہوا تھا۔ میری تربیت ہی اس طرح ہوئی تھی کہ میں فوری فیصلہ کر کے اس پر عمل کر دیتا تھا۔ بہت زیادہ سوچنے اور پلاننگ میں بہت ساری مجبوریاں بھی در آیا کرتی تھیں۔ یہی مجبوریاں بندے کو کمزور کر دیتی ہیں۔ میں نے کوشش کی تھی کہ میرے رت جگے کا ساوری کو ذرا سا بھی احساس نہ ہو۔

جس وقت اذانیں ہونے لگیں تو میں بیڈ سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔ لاؤنج سے ہوتا ہوا کاریڈور کی سیڑھیوں پر جا بیٹھا۔ وہاں تازہ ہوا سے مجھے سکون محسوس ہوا۔ کچھ دیر تک کے لیے پوجا کی باتیں، رویہ اور اس کا کھیل میرے دماغ سے نکل گیا۔ مجھے وہاں بیٹھے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ میں نے اپنے عقب میں قدموں کی چاپ سنی۔ میں نے مڑ کر دیکھا، ساوری چلی آرہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں چائے کے کپ تھے۔ وہ میرے قریب آگئی۔ اس نے کوئی لفظ کہے بنا ایک کپ میری طرف بڑھایا۔ وہ بالکل میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ ہم دونوں خاموشی سے چائے پینے لگے۔ تھوڑی دیر بعد وہ دھیمے سے بولی۔

”علی...... دیکھ رہے ہو اس وقت اندھیرا ہے؟“

”ہاں۔“ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے ہنکارا بھرنے کے سے انداز میں کہا۔

”ذرا تصور کرو، یہاں تو بجلی سے چلنے والی روشنیاں ہیں لیکن اگر ہم روہی میں ہوں جہاں بجلی نہیں ہے، وہاں اس وقت کیسا محسوس ہوتا ہو گا؟“ اس نے دھیمی آواز میں پوچھا تو میں دھیمے سے بولا۔

”بالکل گھپ اندھیرا، جس میں کچھ بھی سجھائی نہیں دے۔“

”اس اندھیرے میں بھی ہم سانس لے رہے ہوتے ہیں۔“ اس نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا تو میں نے

پوچھا۔

''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟''

''ابھی اندھیرا ہے، لیکن تھوڑی دیر بعد روشنی ہو جائے گی۔ ہمارے پاس سوائے انتظار کے اور کچھ نہیں ہے۔ وقت ہونے پر ہی اُجالا ہوگا، اس میں سب دکھائی دے جائے گا، تم سورج کو پکڑ کر آگے پیچھے نہیں لے جا سکتے...... بلکہ سورج ہی اندھیرے اور اُجالے کا فیصلہ کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے تخلیق کار نے اسے ایسا کرنے کی طاقت دی ہوئی ہے۔'' اس نے دھیمے سے کہا اور چائے کا ایک لمبا گھونٹ بھر لیا۔

''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟'' میں نے کافی حد تک سمجھتے ہوئے کہا۔

''میں یہ کہنا چاہتی ہوں میرے سوہنے، اس وقت تم اندھیرے میں ہو، اگر تم اس لیے گھبراؤ گے تاکہ تمہیں کچھ پتا نہیں چل رہا تو نہیں پتا چلے گا، کیونکہ اندھیرا ہے۔ مگر یہ اندھیرا رہے گا نہیں۔ کچھ دیر بعد اُجالا ہو جائے گا۔ سارے منظر واضح ہو جائیں گے۔ مصنوعی روشنی میں تم اصل منظر پھر بھی نہیں دیکھ سکتے ہو، تھوڑا انتظار کرو بس۔''

''تم کیا جانتی ہو، میں کیوں پریشان ہوں؟'' میں نے تشویش سے پوچھا۔

''میں جانتی ہوں، اس پوجا نے تمہیں چکرا کر رکھ دیا ہے۔ دراصل وہ اندھیرے کا فائدہ اٹھا رہی ہے۔ کیونکہ اندھیرے میں سایہ نہیں ہوتا۔ جب سایہ ساتھ ہو... ہو تو خوف نہیں رہتا۔'' اس نے سمجھاتے ہوئے کہا تو میں اس کی بہت ساری باتیں سمجھ گیا۔ میرے سامنے جو اُلجھن کا پردہ تھا، وہ ہٹ گیا لیکن اس کے ساتھ ہی ایک خوشگوار حیرت ہوئی۔ تبھی میں نے اسی حیران کن لہجے میں پوچھا۔

''یہ اتنی موٹی موٹی باتیں تم نے کہاں سے سیکھ لی ہیں؟''

''روہی سے، یہ مجھے روہی نے سکھائی ہیں، جب انسان مشکل میں جیتا ہے نا تو زندگی سکھا دیتی ہے۔ میرے بابا نے مجھے روہی میں رہنا سکھایا ہے۔ میں تو اس دنیا کو بھی روہی ہی سمجھتی ہوں، یہاں پیاس ہے، ہر طرح کی پیاس ہے، دیکھتے نہیں ہو، یہاں بگولے بھی ہیں، زیرِ زمین سانپ بچھو اور نجانے کیا کیا ہیں۔ اس لیے اس دنیا کی بڑی جلدی سمجھ آ گئی ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا تم جو کہنا چاہ رہی ہو، چلو اٹھو۔'' میں نے کہا اور اٹھ کر واپس بیڈروم میں چلا گیا۔ وہ

میرے پیچھے پیچھے آ گئی۔

☆☆☆

میرے آفس پہنچتے ہی شہباز آ گیا۔ اس نے آتے ہی کافی منگوائی اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا سوچا تم نے پوجا کے بارے میں؟''

''کچھ نہیں، سامنے آئے گی تو دیکھ لیں گے۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔

''دیکھ علی، ہمارے سامنے مختلف رپورٹس آتی رہتی ہیں۔ فوری طور پر تو یہ پتا نہیں ہوتا کہ کون سا واقعہ، کس سے جڑا ہوا ہے۔ لیکن جب کوئی مچھلی ہاتھ لگ جاتی ہے تو پھر اس سے جڑے بہت سارے واقعات بہت کچھ سمجھا دیتے ہیں۔ پوجا ہمارے لیے ایک بڑی مچھلی ہے۔ وہ خود کو بہت سیانی سمجھ رہی ہوگی، اگر سیانی ہے بھی تو کوئی بات نہیں۔ وہ اگر......''

''او یار، بکواس بند کر، کوئی نئی بات کر۔'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا تو اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا پھر ایک دم سے قہقہہ لگا کر ہنس دیا، وہ کتنی ہی دیر تک ہنستا رہا پھر بولا۔

''اس کا مطلب ہے کہانی سمجھ گئے ہو......''

''ہاں، وہ آئی اور چلی گئی، اب وہ جو داؤ کھیلے گی، اس سے اندازہ لگا لوں گا، تم ایسے کرو، دو بندے پکڑے تھے رو ہی سے، بکا راجھستانی اور ایک دوسرا آدمی۔ کیا تمہیں معلوم ہے اس وقت وہ کہاں ہیں؟''

''جیل کے خصوصی سیل میں ہیں، کیوں کیا ہوا؟'' اس نے سوچتے ہوئے پوچھا تو میں نے عام سے لہجے میں کہا۔

''ان سے تھوڑی بات کرنی ہے، ایویں گپ شپ، تھوڑی دل جوئی ہو جائے گی۔ کچھ پرانے واقف کاروں کی بات ہو جائے گی۔''

اتنے میں ایک لڑکا کافی کے دو مگ لے کر آ گیا۔ جیسے ہی وہ واپس پلٹا، شہباز نے اپنا سیل فون نکال لیا اور باتیں کرتا ہوا باہر چلا گیا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔ فون پر وہ بات اب بھی کر رہا تھا۔ اس نے فائل میرے سامنے رکھی اور مجھے پڑھنے کا اشارہ کیا۔ وہ کسی کے ذمے لگا رہا تھا کہ ہماری ملاقات بکا راجھستانی سے کروائیں۔ جب تک اس نے بات کی تب تک میں نے فائل کھول لی۔ اس نے بات ختم کر لی اور بولا۔

''اس فائل میں ان دونوں کے بارے میں معلومات ہیں۔ یہ لوگ کہاں سے ہیں، مطلب جو معلومات انہوں نے پولیس کو دی ہیں، وہ ہیں۔''

''چلو کافی پی لو، پھر نکلتے ہیں۔'' میں نے کہا اور فائل پڑھنے لگا۔ ان کے بارے میں زیادہ تفصیلات نہیں تھیں۔ ظاہر ہے ان میں زیادہ تر غلط معلومات ہوتی ہیں، بکا راجھستانی کے بارے میں مجھے اتنا جاننے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے وہ فائل ایک طرف رکھ دی۔ کافی پیتے ہوئے ہم یونہی باتیں کرتے رہے۔ وہ مجھے ان واقعات کا بتانے لگا جو چند دنوں سے اردگرد کے علاقے میں رونما ہو رہے تھے۔ بظاہر وہ عام سے تھے لیکن اگر ان پر غور کیا جاتا تو ان میں بہت کچھ پوشیدہ تھا۔ بہت کچھ سمجھ میں آ رہا تھا۔

دوپہر تک ہم یونہی آوارہ گردی کرتے رہے۔ ایک پارکنگ میں گاڑی کھڑی کر کے ہم اندرونِ لاہور کی گلیوں میں گھس گئے۔ میں نے شہباز سے نہیں پوچھا، وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ ہم نے چونکہ وقت گزارنا تھا اس لیے آوارہ گردی میں وہ چاہے جدھر بھی جاتا، میرا سوال کرنا بنتا ہی نہیں تھا۔ ہم کافی دیر اِدھر اُدھر بھٹکتے ہوئے ایک تنگ سی گلی میں آ گئے۔ تقریباً گلی کے درمیان ایک تین چار منزلہ گھر کے سامنے وہ رک گیا۔ اس کے آگے چھوٹا سا تھڑا تھا جس کے آگے سیمنٹ کی جالی لگی ہوئی تھی۔ اپنے دور میں وہ بڑا جدید مکان رہا ہوگا لیکن اس وقت باہر سے خستہ ہی دکھائی دے رہا تھا۔ دروازے پر دستک کے جواب میں ایک لڑکا نمودار ہوا۔ اس نے شہباز کو دیکھا تو مسکراتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ ظاہر ہے وہاں اس کی اچھی خاصی جان پہچان ہوگی۔ اس نے دروازے میں داخل ہوتے ہی پوچھا۔

''او سنا بھئی شیرا، سب ٹھیک چل رہا ہے نا۔''

''بالکل ودھیا پائین۔'' اس لڑکے نے خالص لاہوری لہجے میں کہا تو شہباز نے ڈیوڑھی میں آ کر پوچھا۔

''سنا فیر، کتھے ہیں دادا جی؟''

''بیٹھے ہیں، میچ دیکھ رہے ہیں۔'' اس نے خوشگوار لہجے میں کہا تو ہم تینوں نے چلتے ہوئے ڈیوڑھی پار کی۔ سامنے ایک کھلا سا صحن تھا جو کافی اوپر تک جاتا تھا۔ برآمدے کے ساتھ تین اطراف میں کمرے تھے۔ وہ ہمیں بالکل ساتھ والے کمرے میں لے گیا، جس کی ایک کھڑکی باہر گلی میں کھلتی تھی۔ وہاں ایک بوڑھا شخص چھوٹے سے بیڈ پر تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ سفید رنگ، سفید بال، کلین شو، دھوتی کرتہ پہنے ہوئے تھا۔ شہباز کو دیکھتے ہی مسکراتے ہوئے بڑے جاندار انداز میں بولا۔

''اُوئے کدھراوئے، بڑے دنوں بعد آئے ہو؟''
''بس تایا جی، جب کوئی مشکل آتی ہے نا تو پھر آپ ہی کو یاد کرتے ہیں۔'' اس نے پہلے گھٹنے کو ہاتھ لگایا، پھر مصافحہ کیا، میں نے بھی ویسے ہی کیا۔ بوڑھے نے ایک بار مجھے غور سے دیکھا، پھر قریب پڑی کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے ٹی وی کی آواز ہلکی کر دی۔
''کیا حال چال ہیں تیرے؟'' انہوں نے پُرشوق لہجے میں پوچھا۔
''میں تو بالکل ٹھیک ہوں بس گمسن گھیریاں ہیں جو دن رات چلتی رہتی ہیں ہمارے ساتھ، پتا ہے آپ کو۔'' شہباز نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''ہاں یہ تو ہے، خیر کیا کھاؤ پیو گے؟'' بوڑھے نے پُرتجسس نگاہوں سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تو شہباز نے کہا۔
''تایا جی کوئی کھابہ تو چلے گا نا، دوپہر ہونے والی ہے۔''
''جا بھئی، لے آ اس کی پسند کی چیزیں، کہنا مہمان آئے ہیں۔'' تایا نے اسی لڑکے کو کہا تو وہ انہی قدموں واپس پلٹ گیا۔ تبھی شہباز نے پوچھا۔
''ہور سنائیں تایا جی کیسی طبیعت چل رہی ہے۔''
''مجھے چھوڑ میں تو اب بوڑھا ہوں، بُڑھاپا خود بیماری ہے، تم سناؤ تمہاری مشکل کیا ہے۔'' انہوں نے خوشگوار لہجے میں کہا تو شہباز بولا۔
''مشکل یہ ہے تایا جی، کچھ دنوں سے ایک بھارتی لڑکی ایک گیانی عورت کا روپ دھار کر ننکانہ صاحب کے علاقے میں پھر رہی ہے۔''
''ہاں تم لوگ اس کے پیچھے بھی گئے تھے۔'' تایا نے پُراسرار لہجے میں کہا میں تھوڑا حیران ہو گیا، تایا خاصی بڑی شے تھا جسے ہمارے بارے میں اطلاع تھی۔ شہباز چونکے بنا روانی میں یوں کہتا چلا گیا جیسے یہ معمول ہو۔
''ہاں نا تایا، اسی کو تلاش کر رہے ہیں۔'' اس نے تیزی سے کہا۔
''کچھ پتا چلا؟'' تایا نے پوچھا۔
''نہیں نا، میاں عالم نے تھوڑا بہت بتایا ہے اُس کے بارے میں۔ وہاں ان کے پیر کی کوئی گدی ہے اور......'' اس نے کہنا چاہا تو تایا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔
''اوئے یار میاں عالم تو بے چارہ بھولا بندہ ہے۔ وہ تو پیری مریدی میں مست ہے۔ اسے پتا ہی نہیں اس کی ناک کے نیچے کیا کچھ ہو جاتا ہے۔ وہ مست ملنگ بندہ ہے۔ ویسے جو اس نے کہا ہے وہ سچ ہی ہے۔'' تایا نے تصدیق کر دی تو شہباز نے پوچھا۔
''تایا جی اس کا کوئی اتا پتا، کیا کر رہی ہے وہ یہاں پر۔ اگر تو وہ......''
''لگتا ہے وہ بہت پہنچی ہوئی شے ہے، کیونکہ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے پیچھے بڑے ڈاہڈے بندے ہیں۔ سمجھ لو یہاں لاہور کا انڈرورلڈ اس کے پیچھے ہے۔'' تایا نے بتایا تو شہباز نے تڑپ کر پوچھا۔
''تایا جی، اب لاہور کا انڈرورلڈ کون سا ہم سے چھپا ہوا ہے۔ چند لوگ ہیں، ان کی ہی بدمعاشی چلتی ہے۔ یہ پار والا کام کون کر رہا ہے؟''
''یار یوں سمجھ لو کہ انہی لوگوں کی نئی شاخیں کھل گئی ہیں، وہ کیا کہتے ہیں فرنچائز۔ وہ فرنچائز کھول کر بیٹھ گئے ہیں۔ نئی پود آ گئی ہے نا تو اب جرم کے طریقے بھی بدل گئے ہیں۔ پہلے جو بدمعاش ہوتا تھا، اس کے بھی کچھ اصول تھے۔ وہ عورت کا کام نہیں کرتا تھا، اب جو بدمعاش ہیں ان کے کام کی شروعات ہی غلط طریقے سے ہوتی ہے۔ اب مسئلہ صرف پیسے کا ہے، کوئی اصول، کوئی اخلاق نہیں رہا۔'' تایا نے دلبرداشتہ ہوتے ہوئے بتایا۔
''تو پھر اب......'' اس نے کہا۔
''وہ لڑکی آئی فرید کوٹ ہی سے ہے۔ اسی گدی نشین کے ریفرنس سے آئی ہے۔ اب یہ نہیں پتا وہ بھارت کے کسی دوسرے علاقے سے ہے یا وہیں اسی علاقے سے ہے۔ اس کا پاسپورٹ وغیرہ سب وہیں کا ہے۔'' تایا نے بتایا۔
''وہ یہاں کر کیا رہی ہے؟'' اس نے پوچھا۔
''اس کا تو ابھی مجھے بھی پتا نہیں چلا، اور نہ ہی مجھے اس کی ضرورت پڑی اس کا پتا رکھنے کی کہ وہ یہاں کیا کر رہی ہے۔'' تایا نے اکتاہٹ سے کہا۔
''پھر تایا جی آپ کو کیسے پتا اُس کا؟''
''اس لڑکی کا ذکر کسی دوسرے معاملے میں ہوا تھا۔ یہاں لاہور کی ایک پارٹی کو کروڑوں روپے ملے ہیں اُس کی حفاظت کے لیے۔ وہی پارٹی اب اس کی حفاظت کی ذمے دار ہے۔ پیسہ کس نے دیا؟ یہ نہیں پتا...... کیونکہ مجھے کوئی مطلب نہیں تھا۔''
''کون سی پارٹی؟'' اس نے پوچھا تو تایا نے بے پروائی سے کہا۔

''دیکھو اگر تم نے اس پارٹی پر ہاتھ ڈالنا ہے تو پوچھو ورنہ جانے دو۔''

''تایا جی، سیدھی اور سچی بات یہ ہے، مجھے اس لڑکی سے نہیں اس کے یہاں پر ہونے سے مطلب ہے۔ وہ کیوں ہے یہاں پر؟'' اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

تایا کے چہرے پر ایک دم سے پریشانی چھا گئی۔ اس نے سوچنے والے انداز میں سر جھکا لیا، پھر سر اٹھا کر بولا۔ ''سرفراز ملک ہے نا، اس کے بیٹوں کو شاید جانتے ہو تم۔ ان کا باپ اس کام میں ملوث نہیں ہے۔ وہ لڑکے یہاں بہت کچھ کر رہے ہیں۔ وہ لڑکی ان کے پاس انہی کے فارم ہاؤس پر رہتی ہے۔''

''ان کے فارم ہاؤس پر...... وہ تو بڑا بدنام فارم ہاؤس ہے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''اسی لیے وہاں چھپی ہوئی ہے، وہاں کئی لڑکیاں ادھر اُدھر سے آئی رہتی ہیں۔ کاروبار ہے ان کا۔'' تایا نے نفرت سے کہا۔

''تو پھر سرفراز ملک کے لڑکوں سے پوچھا جائے۔''

''سنبھال کے ہاتھ ڈالنا۔'' تایا نے سرزنش کی۔

''فکر نہ کرو تایا جی، دھیان سے ہوگا، آپ ہی نے بتایا ہے کہ ایسی جگہوں پر ہاتھ کیسے ڈالتے ہیں۔'' شہباز نے ہنستے ہوئے کہا تو تایا نے میری طرف دیکھ کر خوشگوار انداز میں پوچھا۔

''اس جوان کا تعارف نہیں کرایا تم نے ابھی تک۔''

''یہ وہی علی زین ہے جو بھی گورنمنٹ کالج میں......'' شہباز نے کہا تو تایا نے حیرت سے دیکھا پھر خوشگوار انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''سچ پوچھو نا علی زین، تو نے مجھے ہرایا ہے۔ میں نے بڑی گیم کی لیکن تیرے سامنے ہارتا گیا ہوں۔ پتا نہیں تیرے پاس ایسا کیا تھا۔''

اب میں تایا کو کیا بتاتا کہ میرے ساتھ کیا تھا۔ کیونکہ مجھے خود پتا نہیں تھا، بس جو سمجھ میں آتا تھا، کرتا چلا جاتا تھا۔ ایک طرف جہاں چاچا عبدالمجید کی راہنمائی تھی تو دوسری طرف کالج کے دنوں میں صائمہ مجھے معلومات دیا کرتی تھی۔ انہی دنوں مجھے یقین ہوا تھا کہ انفارمیشن کتنی بڑی قوت ہوتی ہے۔ میں خاموش رہا تو شہباز چہکتے ہوئے بولا۔

''وہ وقت بیت گیا تایا جی۔''

''ہاں دیکھ رہا ہوں وہ وقت پیچھے چلا گیا اور یہ جوان بہت آگے نکل گیا۔ اب مجھے امید ہے کہ تم سرفراز ملک کے بیٹوں پر ہاتھ ڈال سکو گے۔'' تایا نے پرامید انداز میں کہا تو شہباز نے پوچھا۔

''تو بتائیں نا کیسے؟''

اتنے میں باہر سے یوں آواز آئی جیسے کوئی آ گیا ہو۔ تایا نے باہر کی جانب سے آنے والی آواز پر کان دھرتے ہوئے کہا۔

''اوئے سانس تو لو، کچھ کھا پی لو، بتاتا ہوں۔''

وہ لڑکا خالص لاہوری روایتی کھانے لے کر آ گیا تھا۔ جن میں ہریسہ اور روغنی چرغہ زیادہ تھا۔ کافی سے زیادہ روغنی نان تھے۔ اس نے وہ کھانے میز پر سجا دیے۔ کھانے کے دوران تایا ہمیں لاہور انڈر ورلڈ کے بارے میں بتاتا بھی رہا اور سمجھاتا بھی رہا۔ میں نے جو سمجھا وہ یہی تھا کہ یہ سارا انڈر ورلڈ بھتا خوری، قبضہ مافیا، اور جوئے کے اڈے چلانے کی بنیاد پر ہے۔ اس میں کئی قتل ہوئے اور خوف کی فضا بنی ہوئی ہے۔ بات وہی تھی کہ فائدہ اور طاقت کس کی ہے؟ کھانا ختم ہوتے ہی جب قہوے کی پیالیاں ہمارے سامنے آئیں تو تایا نے پھر سے تکیے کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

''دیکھو یارو، بات یہ ہے کہ تم لوگ جرم کی دنیا سے نہیں ہو، تم لوگوں کا مقصد کچھ اور ہے۔ سرفراز ملک کے پیچھے سیاسی لوگوں کا ہاتھ ہے۔ یہ لوگ سیاسی لوگوں کو فائدہ دیتے ہیں اور وہ سیاسی لوگ اِن کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ وہ تم لوگوں کے لیے مسئلہ نہیں ہوگا۔ میں تمھیں ایک بندہ بتاتا ہوں۔ اس کے پاس چلے جاؤ، وہ سارے راستے بتا دے گا۔''

''تایا پھر کوئی بندہ؟'' شہباز نے اکتاہٹ سے کہا۔

''سوہنے مجھے اس لڑکی پوجا کا نہیں پتا لیکن وہ سب بتا دے گا، سرفراز ملک کے بیٹوں کو کیسے گھیرنا ہے وہ بھی بتا دے گا۔ خیر تم اس کے پاس نہیں جانا چاہتے تو وہ آ جائے گا تم لوگوں کے پاس۔'' تایا نے سکون سے کہا۔

''ٹھیک ہے تایا، اس کا کوئی نمبر ہے تو دے دو، میں......'' شہباز نے کہا تو تایا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''وہ فون وغیرہ نہیں رکھتا۔ وہ تم سے کر لے گا رابطہ۔''

''او کے۔ میں اُس سے مل لوں گا......'' لفظ ابھی اُس کے منہ ہی میں تھے کہ شہباز کا سیل فون بج اٹھا، اس

نے اسکرین پر دیکھا اور ہیلو کہہ دیا۔ دوسری جانب سے کچھ کہا گیا تو اس نے سن کر کال بند کر دی۔

''اچھا تایا، ہم چلتے ہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو تایا نے مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اس وقت تک شہباز اپنی جیب سے بڑے نوٹوں کی ایک گڈی نکال چکا تھا۔ وہ اس نے تایا کے سرہانے کے نیچے رکھی اور ہم وہاں سے نکلتے چلے گئے۔

گاڑی میں بیٹھنے تک شہباز نے کوئی بات نہیں کی۔ جیسے ہی گاڑی روڈ پر ڈالی تو اُس نے طویل سانس لے کر کہا۔

''پتا ہے، تایا کون تھا؟''

''مجھے الہام نہیں ہوتے سوہنے۔'' میں نے تایا کے انداز میں کہا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے بولا۔

''پہلے تو میں تمہیں یہ بتا دوں ہم بکا راجستھانی سے ملنے جیل جا رہے ہیں۔ اس سے ملاقات کا بندوبست ہو گیا ہے، اسی بارے میں فون تھا۔''

''چل اچھا ہوا آج ہی مل لیں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''ہاں تو تایا کا اصل نام فاروق ہے لیکن فاروق شاہ کے نام سے مشہور ہے، اپنے زمانے کا دبنگ پولیس آفیسر رہا ہے۔ ساری زندگی لاہور ہی کے مختلف تھانوں میں گزاری۔ اس کے سامنے ہی لاہور انڈر ورلڈ سے ابھرا ہے۔''

''پھر تو یہ بڑے کام کا بندہ ہے۔'' میں نے کہا۔

''صرف چند لوگوں کے لیے اور وہ بھی جو لمبے نوٹ لگائیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ زور سے ہنس دیا۔ مجھے شہباز کا جاندار قہقہہ بہت پسند تھا۔ وہ فاروق شاہ کے بارے میں باتیں سناتا رہا اور میں توجہ سے سنتا رہا، تقریباً پونے گھنٹے بعد ہم جیل تک جا پہنچے۔

مختلف مراحل میں ہمیں ایک گھنٹا لگ گیا۔ یہاں تک کہ ہمیں جیل کے اندر ایک کمرے میں لے جایا گیا جو انتہائی بوسیدہ تھا۔ تنگ و تاریک سیلن زدہ کمرا جس میں سانس لینا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ ایک پیلا بلب روشن تھا، جس کی روشنی بھی لرز رہی تھی۔ ایک اُڑے رنگ والی بڑی سی میز کے اردگرد چار کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں دو پر ہمیں بٹھا دیا گیا۔ ہمارے ساتھ آئے ہوئے اہلکار واپس چلے گئے تو پانچ سات منٹ بعد اندر کی طرف والا ایک دروازہ کھلا اور ایک اہلکار کمرے میں آیا، اس کے پیچھے بکا راجستھانی اور اُس کے پیچھے وہی بھارتی ایجنٹ تھا، جو بکا راجستھانی کے ساتھ تھا، وہ اہلکار ان دونوں کو چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ وہ دونوں ہی حیرت بھری نگاہوں سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ چند لمحے یونہی ایک دوسرے کو دیکھتے رہنے کے بعد میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرد سے لہجے میں کہا۔

''کیسی گزر رہی ہے بکا؟''

''ویسی ہی جیسے جیل میں ہوتی ہے۔'' اس نے دھیمے سے لہجے میں کہا پھر شکوہ بھرے لہجے میں بولا۔ ''تم اگر مجھے وہیں مار دیتے تو اچھا تھا، یہاں تو نہ مرنے دیتے ہیں اور نہ جینے دیتے ہیں، کوئی مقدمہ بھی نہیں جس سے کوئی امید ہو کہ ہم باہر آ جائیں۔''

''رہتے تو ٹھیک ہو نا یہاں پر؟'' میں نے پوچھا تو وہ بولا۔

''سچی بتاؤں، نہ تو ہمیں کسی نے مشقت پر لگایا ہے، نہ کوئی ذلیل کرتا ہے، روٹی بھی ٹھیک ملتی ہے اور کپڑا بھی، بس تنہائی کی زندگی ہے۔''

''اور تم جیون رام کیسے ہو؟'' میں نے دوسرے سے پوچھا، جس کا نام میں فائل میں پڑھ چکا تھا۔ اپنا نام سنتے ہی وہ ایک دم سے چونکا اور پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

''اس کا مطلب ہے تم کوئی عام مجرم نہیں ہو، کسی فورس کے آدمی ہو۔''

''یہ اندازہ تم نے کیسے لگایا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے اپنا نام یہاں کی سرکار کو یہی بتایا ہے، تم نے یہ نام لیا تو سمجھ گیا ہوں، کون ہو سکتے ہو تم؟'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''چلو تم یہی سمجھ لو، بہرحال کیسے رہ رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ویسے ہی جیسے ابھی بکا نے بتایا۔'' اس نے اعتماد سے کہا۔

''کیا خیال ہے جانا ہے واپس یا یہیں رہنا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ کام بتاؤ، جس کے لیے تم یہاں آئے ہو، ایسی دَیا والی بات تم یونہی نہیں کرو گے، کچھ تو ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''سمجھ دار بندے لگتے ہو۔ تم جانتے ہو، میں نے تمہارے فون سے تمہاری اس پوجا سے بات کی تھی، یاد ہے تمہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، بات تو کی تھی۔'' اس نے یاد کرتے ہوئے

کہا۔

''کاش اس وقت میں تمہارے فون کی اسکرین پر نمبر دیکھ لیتا۔ وہ نمبر یہیں کا تھا، پار کا نہیں تھا۔ اگر مجھے پتا چل جاتا کہ پوجا یہیں ہے تو پھر تم یہاں نہ ہوتے بلکہ پوجا کے ساتھ ہوتے۔''

''وہ وقت گزر گیا، اب کی بات کرو راج ویر۔'' اس نے اکتاہٹ سے کہا۔

''پوجا کہاں ہے؟'' میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

''نہیں جانتا، میں تو یہاں جیل میں ہوں۔'' اس نے حیرت سے یوں کہا جیسے میں نے بے وقوفی کی بات کر دی ہو۔ تبھی میں نے پوچھا۔

''جانتا ہوں کہ تم نہیں جانتے ہو، کرنے کیا آئے تھے یہاں پر؟''

''وہی جو تمہارا اور میرا کام ہے۔ سب سے پہلے تمہیں ٹھکانے لگانا تھا، پھر یہاں پر موجود نیٹ ورک کو مضبوط کرنا تھا، اس کے لیے بھلے جتنے بندے مارنا پڑتے۔'' اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''تم اتنے دلیر ہو نہیں، جتنا میرے سامنے بن رہے ہو۔ سیدھی طرح بتاؤ کیا پلان لے کر آئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''بتایا نا ابھی تیرا پلان ختم نہیں ہوا تھا۔ وہ ختم کر کے ہم نے یہیں لاہور شہر میں آنا تھا۔ پھر کوئی کارروائی کرنا تھی۔'' اس نے بتایا۔

''کیا کرتے؟'' میں نے پوچھا تو اس نے سکون سے بتایا۔

''کچھ بھی، قتل کرتے، بم دھماکے، بس افراتفری پھیلانا تھی۔''

''کتنے لوگ آئے تھے یہاں پر؟'' میں نے پوچھا۔

''کئی سارے ہیں، کون کہاں پر کن رستوں سے آیا، میں .... نہیں جانتا، روہی میں ہم دو ہی آئے تھے، ایک تم نے مار دیا اور میں جیل میں ہوں۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں نفرت عود کر آئی تھی۔ وہ بتانا نہیں چاہتا تھا لیکن بتا رہا تھا۔ میں چند لمحے خاموش رہا، پھر بولا۔

''دیکھ جیون رام، ایک آفر ہے، غور سے سننا، میں تمہیں یہاں سے نکال دوں گا۔ بھلے واپس اپنے وطن چلے جانا لیکن پوجا کے بارے میں بتا دو۔''

''پتا نہیں تم مجھے بے وقوف کیوں سمجھ رہے ہو؟ یہاں بیٹھا میں اس کے بارے میں کیسے جان سکتا ہوں؟'' اس نے اکتاہٹ سے کہا تو میں اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

''باہر نکل کر بتا دو، صرف پوجا کے بارے، پھر واپس چلے جانا۔''

''باہر نکلتے ہی سو طرح کے سوال ہوں گے، میرا پکڑا جانا......'' اس نے پوچھنا چاہا تو میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''باہر نکلو گے تو معلوم ہوگا تمہیں۔ تمہارے بارے میں کسی کو کچھ نہیں پتا ہے کہ تم کہاں ہو؟ یا کہاں تھے۔ پکڑے جانے کا تو بالکل بھی نہیں پتا۔ تم کہاں تھے، اس بارے میں آگے کی کہانی تم خود بنا سکتے ہو۔''

''یعنی کہ......'' اس نے اُلجھتے ہوئے پوچھا۔

''یہی کہ روہی سے فرار ہو گیا تھا، زیرِ زمین چلا گیا تھا۔ کہیں چھپ گیا تھا۔ اگر کسی گواہی کی ضرورت ہو تو بکا کی گواہی لے لینا، یہ بھی تیرے ساتھ بھاگا تھا اور اب تک تیرے ساتھ ہے۔''

''کیا مجھے بھی باہر نکال دو گے؟'' بکا نے خوشگوار حیرت سے پوچھا تو میں نے دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''ہاں، نکال دوں گا۔ شرط وہی ہے اپنے دیس لوٹ جانا۔ یہاں نہیں رہنا، بس پوجا کو دے دو اور یہاں سے چلے جاؤ۔''

''ڈن ہو گیا۔'' جیون رام نے حتمی لہجے میں کہا۔

''میری طرف سے بھی......'' بکا راجستھانی نے کہا تو شہباز نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے انتہائی دھیمی آواز میں سمجھاتے ہوئے کہا۔

''تو سنو پھر...... آج رات یا کل دن میں، کسی کے ساتھ بھی لڑنا ہے اور خود تھوڑا بہت زخمی ہو جانا ہے، میں یہاں پر رابطہ رکھوں گا، جیسے ہی تم اسپتال گئے، آگے میں خود سنبھال لوں گا، کل دوپہر تک رابطہ رکھوں گا۔''

''ٹھیک ہو گیا، مطلب اسپتال جانا ضروری ہے؟'' جیون رام نے پوچھا۔

''یار یہی آسان ترین حل ہے، یہاں سے باہر نکلنے کا۔''

''ڈن ہے جی۔''

ہمارے پاس مزید کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ یونہی دو چار منٹ باتیں کر کے ہم دونوں وہاں سے اٹھ گئے۔

جیل سے جب باہر آئے تو دن ڈھلنے والا تھا۔ شہباز کو جہاں رابطہ کرنا تھا، کر لیا اور انہیں بتا دیا کہ یہ لوگ اگر زخمی ہو جائیں تو بتا دیں۔

''شہباز، میں تمہارا پلان ابھی تک نہیں سمجھ پایا ہوں، آخر تم کرنا کیا چاہتے ہو؟'' میں نے پسنجر سیٹ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا تو وہ بولا۔

''آدھی ادھوری بات کیا کرنی، کل بتاؤں گا۔ ابھی تم گھر فون لگاؤ، بھابی سے کہو، کوئی اچھی سی ڈش بنا دے ایک بھوکے بندے نے بھی لنگر کرنا ہے۔''

''ویسے پوجا نے بھی ابھی تک خود رابطہ نہیں کیا۔'' میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''کرے گی...... وہ رابطہ کرے گی۔ اس کا باپ بھی رابطہ کرے گا، تم بالکل ٹینشن مت لو، بس لنگر کے بارے میں کہو۔''

اُس کے یوں کہنے پر میں سوائے مسکرانے کے اور کیا کر سکتا تھا۔

☆☆☆

دن خاصا چڑھ آیا تھا مگر میں بستر پر کسلمندی سے پڑا تھا۔ میں شہباز ہی کے پلان کو سوچ رہا تھا جو کسی حد تک مجھے سمجھ بھی آ رہا تھا۔ اس کا فائدہ مجھے یہ ہوا کہ جب میں نے کئی آپشن سوچے تو منظر واضح ہونے لگا۔ میں شاید مزید یونہی پڑا رہتا، شہباز کی کال آ گئی۔ اس نے ہیلو کہتے ہی کہا۔

''میں آ رہا ہوں ناشتا کرنے۔''

''او ماما، تجھے کھانے پینے کے علاوہ کچھ سوجھتا بھی ہے کہ نہیں۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

''میری کون سا گھر والی ہے، مجھے تو اب مانگ تانگ کر ہی کھانا پڑتا ہے۔''

''کہاں ہو؟'' میں نے اکتاہٹ سے پوچھا۔

''بس ایویں پانچ منٹ کی دوری پر۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میں بستر میں ہوں، چپ چاپ آ کر بیٹھ جانا، جو کھانا ہو کہہ دینا۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا اور کال آف کر دی۔

میں جب لاؤنج میں گیا تو وہ سامنے چائے کا مگ رکھے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی تیزی سے بولا۔ ''بہت زبردست ناشتا میری بہن نے مجھے بنا کر دیا، مزہ آ گیا۔''

میں خاموشی سے اس کے سامنے بیٹھا تو وہ چائے کا سپ لے کر بولا۔

''لو بھئی، کام ہو گیا، تیرے بندے باہر آ گئے ہیں۔''

''کہاں ہیں وہ؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''ابھی تک تو ہمارے اسپتال میں ہیں، کچھ دیر بعد انہیں چھٹی مل جائے گی، پوچھنا یہ ہے کہ انہیں جانے دوں یا تم ان سے ملنا چاہو گے؟''

''دیکھو تمہارے پلان میں اگر میرا ملنا ضروری ہے تو کہو۔''

''ملنے کی ضرورت تو نہیں ہے، وہ ہماری نگاہ میں رہیں گے۔''

''کیسے؟'' میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''یار نکالنے کو تو انہیں ویسے ہی نکال دیتے، اُن پر کون سا خصوصی مقدمہ کر کے اندر ڈالا گیا تھا، ایویں تھوڑا بہت تھا۔ ہاں مگر انہیں اس خصوصی سیل میں رکھا گیا تھا جہاں ایسے لوگوں کی صرف تفتیش ہوتی ہے۔'' اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''اور دوسری بات، پوجا اگر ہمارے سامنے آ جاتی ہے تو بھی ٹھیک، اس طرح اس کی سوچ کے بارے میں پتا چل جائے گا۔ اگر نہ آئی تو یہ دونوں اس کے رابطے میں تو آئیں گے ہی، ہم پھر......''

''او کے، تم دماغ لڑانا چاہتے ہو۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اب تم خود سمجھتے ہو، وہ یہاں سے نکلنے کے بعد اپنے لوگوں سے رابطہ کریں گے، ان سے ملیں گے، پتا چل جائے گا کہ کون کہاں پر ہے۔'' اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا تو میں نے پوچھا۔

''کیا یہ اتنا ہی آسان ہے؟''

''ہے نا، باقی ہماری کوشش اور صبر ہے۔ دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔'' اس نے پُراعتماد لہجے میں کہا تو میں نے مزید سوال کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

''اچھا یہ تو ہو گیا، اب وہ سرفراز ملک کے بیٹوں کے بارے میں سوچو، ان کا کیا کرنا ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ لوگ باتوں کے نہیں، لاتوں کے بھوت ہیں۔ ان کے ساتھ تو سیدھے سیدھے بدمعاشی کرنا پڑے گی۔'' اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

''تو پھر یہ کیس میرا بنتا ہے۔'' میں نے کہا تو اس

نے قہقہہ لگا دیا۔ پھر اسی طرح ہنستے ہوئے بولا۔
’’ہاں نا تیرا ہی بنتا ہے۔‘‘
’’اچھا تو کیا ہے پھر اُن کا جغرافیہ؟‘‘ میں نے پوچھا۔
’’لاہور کا سب سے جدید پوش علاقہ جہاں پر فارم ہاؤس ہیں، ان میں ایک فارم ہاؤس ان کا بھی ہے، یہاں یہ اپنی فیملی کے ساتھ نہیں رہتے، یہاں پر بڑے جدید انداز میں وہی پرانے دھندے ہو رہے ہیں۔‘‘
’’جدید انداز میں پرانے دھندے؟ تایا تو کچھ اور ہی کہہ رہا تھا۔‘‘ میں نے پوچھا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکتے ہوئے کہا۔
’’اس فارم ہاؤس میں کچھ لڑکیاں مستقل رہائش پذیر ہیں۔ کچھ باہر رہتی ہیں۔ شام ڈھلتے ہی پیسے والے لوگ وہاں جاتے ہیں، کچھ تو کن سسٹم یا کچھ اس طرح کے دوسرے طریقے، جن کا مقصد صرف اور صرف سکیورٹی ہوتی ہے۔ دیکھنے میں وہاں پارٹی ہو رہی ہوتی ہے لیکن ... لڑکیوں کے دھندے کے ساتھ، منشیات اور اسلحہ وغیرہ کا دھندا بھی ہوتا ہے۔ لیکن ......‘‘ یہ کہہ کر وہ رک گیا تو میں نے پوچھا۔
’’لیکن کیا؟‘‘
’’یہاں پر قانونی یا غیر قانونی بزنس ڈیل کے ساتھ ساتھ بہت سی خفیہ میٹنگ بھی ہوتی ہیں۔ اب تایا کے مطابق، اگر پوجا وہاں چھپی ہوئی ہے تو معاملہ خاصا آگے تک بڑھا ہوا ہے۔‘‘ اس نے پورا ’جغرافیہ‘ بتا دیا۔
’’چل کرا بکنگ، آج ہی چلتے ہیں وہاں پر۔‘‘ میں نے کہا۔
’’شام تو ہو لینے دو.... ابھی ناشتا تو کرلو میری جان پتا نہیں وہ بھی تجھے ملنا ہے کہ نہیں۔‘‘ اس نے کہا تو میں نے حیرت سے پوچھا۔
’’نہیں، کیوں نہیں ملنا، تم نے کوئی بے غیرتی تو نہیں کردی؟‘‘
’’نہیں ابھی تک تو نہیں کی، فارم ہاؤس والا بتا دوں تو......‘‘ یہ کہتے ہوئے باقی بات اس نے اشارے سے کر دی تو میں ہنس دیا۔
ناشتے کے بعد ہم آفس کے لیے نکل پڑے۔ ہم ابھی رستے میں تھے کہ میرا فون بج اٹھا۔ نمبر دیکھتے ہی میں چونک گیا۔ وہ پوجا کی کال تھی۔ میرے بدن میں ایک دم سے سنسنی ہونے لگی۔ میں نے کال ریسیو کر کے فون کان سے لگا کر ہیلو کہا تو وہ چہکتے ہوئے بولی۔
’’میری یاد نہیں آئی تمہیں؟‘‘
’’میں بھولا ہی کب تھا۔‘‘ میں نے سنجیدگی سے کہا۔
’’یہ تو مجھے یقین ہے، اب تم مجھے بھول سکتے بھی نہیں ہو۔ یہ میرا نمبر ہے، جب چاہے کال کر سکتے ہو۔‘‘
’’ٹھیک ہے۔‘‘ میں نے اختصار سے کہا، لیکن میں جاننا چاہتا تھا کہ اس نے فون کال کیوں کی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں سوال کرتا، وہ بولی۔
’’آج دو پارٹیوں کی بزنس ڈیل ہونے والی ہے، ایک پارٹی پار کی ہے اور ایک یہاں کی۔‘‘
’’کس طرح کی ڈیل ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔
’’بس اگر انہیں طریقے سے پکڑ لو تو سمجھو شہر میں امن رہے گا۔‘‘ اس نے بڑے ہی محتاط انداز میں بتایا۔
’’کہاں پر؟‘‘ میں نے پھر اختصار ہی سے پوچھا۔
’’ابھی مقام طے نہیں ہوا، کچھ دیر میں ہو جائے گا تو میسج کر دوں گی۔ تم ذہنی طور پر تیار رہو۔‘‘ اس نے تیزی سے کہا۔
’’میں تیار ہوں۔‘‘ میں نے خود پر قابو رکھتے ہوئے کہا تو اس نے کال بند کر دی۔ میں نے سیل فون کی طرف دیکھا اور شہباز سے پوچھا۔
’’تم نے مجھے یہ تو بتایا کہ وہ فارم ہاؤس میں ہو سکتی ہے، کیا اس کا نمبر ٹریس کر کے پتا نہیں لگا سکتے کہ وہ اس وقت کہاں ہے، جیسے اُس رات......‘‘
’’تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو؟‘‘ اس نے ایک دم سے کہا۔
’’تھوڑا بہت۔‘‘ میں نے سنجیدگی سے کہا۔
’’چل پھر ٹھیک ہے۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے چند لمحے نگاہیں سڑک پر رکھیں پھر مجھے خشمگیں نگاہوں سے دیکھ کر نگاہیں سامنے کرتے ہوئے بولا۔ ’’میں نے رات ہی پوری معلومات لے لی تھیں۔ وہ اسی فارم ہاؤس میں ہے۔ اسی لیے پورا پلان کر کے تمہیں بتایا۔‘‘
’’ابھی اسی کی کال تھی۔‘‘ میں نے کہا اور پوری بات بتا دی۔
’’یہ رسک تو لینا پڑے گا۔‘‘ اس نے سوچتے ہوئے کہا پھر ایک دم سے بولا۔ ’’ہاں ضرور، یہ رسک لینا ہوگا۔‘‘
’’چل بھگا گاڑی، آفس پہنچ کر بندوبست کرتے ہیں۔‘‘ میں نے کہا تو اس نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔ ہم آفس کے سامنے جا پہنچے۔

شہباز اپنی مختلف تیاریوں میں لگ گیا اور میں صوفے پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔ جب گاڑی میں بیٹھے ہوئے پوجا کا فون آیا تھا اور میں نے شہباز سے پوچھا تھا، اس وقت ایک دم سے مجھے بملا یاد آگئی۔ جے پور کی موڈی اور جنونی لڑکی بملا، جس نے چند دن مجھے باندھ کر رکھ لیا تھا۔ میں جلدی سے اٹھا اور لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ گیا۔ مجھے گوگل میں محفوظ اس کا نمبر ملنا چاہیے تھا۔ اس کے علاوہ کچھ معلومات بھی تھیں۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد محفوظ کیا ہوا نمبر مجھے مل گیا۔ میں اگر سیدھے سبھاؤ اسے کال ملاتا تو بہت گڑبڑ ہو جاتی، میری کال ٹریس ہو جاتی۔ میں نے پہلے کہیں اور فون ملایا اور بڑے محفوظ طریقے سے بملا کو کال کر دی۔ کچھ دیر تک میری کال جاتی رہی۔ اس نے کال ریسیو نہیں کی۔ دوسری کوشش پر اس کی اونگھتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''کون ہے؟''

''میں ہوں راج ویر۔'' میں نے عام سے لہجے میں کہا تو اس کی تڑپتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''ابے...... کہاں ہے تو...... یہ نمبر تو مجھے کچھ اور ہی بتا رہا ہے؟''

''میں ٹھیک ہوں، آج بیٹھے بیٹھے تیری یاد آگئی۔'' میں نے پیار بھرے لہجے میں کہا تو وہ ایک دم سے قہقہہ لگا کر ہنس دی پھر خمار آلود لہجے میں بولی۔

''کچھ دن مزید رہ جاتے نا تو بس ادھر ہی کے رہ جاتے۔''

''شاید ایسا ہی ہوتا۔'' میں نے اعتماد سے جھوٹ بول دیا پھر فوراً ہی بولا۔ ''چلو تم ہو جاؤ فریش پھر کرتا ہوں بات۔''

''کوئی کام ہے تو بتا۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''بتاتا ہوں، فریش ہو جاؤ، لیکن کال میں ہی کروں گا، سمجھی۔'' میں نے کہا اور کچھ دیر بعد کال کرنے کا کہا اور کال بند کر دی۔ میں بات ختم کر کے ابھی موڈی اور جنونی بملا کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ شہباز آگیا۔ اس نے دروازے پر آتے ہی تیزی سے کہا۔

''چل آ نکلتے ہیں۔''

میں نے یہ پوچھے بغیر کے کہاں جانا ہے، اٹھ گیا۔ وہ پورچ میں پہنچ چکا تھا۔ میں تیزی سے آگے بڑھا اور اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''اتنی تیزی، بات کیا ہے؟''

''وہ تایا نے جس بندے کا بتایا تھا نا، وہ رابطہ کرے گا، اس نے ابھی فون کیا ہے۔ وہ ملنا چاہ رہا ہے۔'' اس نے گیٹ سے گاڑی نکال کر سڑک پر لاتے ہوئے کہا۔ میں خاموش رہا، وہ گاڑی بھگاتا چلا گیا۔

شہباز نمبر کے ساتھ ساتھ چلتا چلا گیا، یہاں تک کہ وہ حضرت میاں میرؒ کے مزار کے پاس جارکا۔ ہم گاڑی سے اترے اور مزار کے اندر چلے گئے۔ فاتحہ خوانی کر کے صحن میں بیٹھ گئے۔ ہمیں وہاں بیٹھے ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ ایک ملنگ بالکل ہمارے پاس یوں آکر بیٹھا کہ اس کا رخ ایک طرف تھا لیکن اس کا چہرہ ایک رخ سے ہم دیکھ سکتے تھے۔ کوئی ہمیں دیکھتا بھی تو اسے یونہی لگتا کہ ہمارے قریب بیٹھا ملنگ اپنی موج میں ہے اور بڑبڑا رہا ہے۔ اچانک اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

''میری طرف مت دیکھو اور جو کام کی بات ہے، وہ سنو۔''

''بول کیا کہتا ہے۔'' شہباز نے دھیمے سے کہا۔

''ملک سرفراز کا اب اپنے بیٹوں کے کاموں میں ذرا سا بھی عمل دخل نہیں رہا، وہ اپنے بیٹوں کے کاموں سے متنفر ہے کیونکہ وہ اب ملک دشمنی والے کام کر رہے ہیں۔ ان کا جو بھی دو نمبر دھندا تھا وہ چل رہا تھا لیکن جب سے انہوں نے غیر ملکیوں کے ساتھ ڈیل کرنا شروع کر دی ہے، ملک سرفراز لندن چلا گیا ہے اور وہیں رہتا ہے۔''

''مجھے ملک سرفراز کی بائیوگرافی نہیں سننی۔'' شہباز نے تلخ ہوتے ہوئے کہا تو اس ملنگ نے ذرا بھی بُرا نہ مناتے ہوئے کہا۔

''اس لیے اس کے بیٹے یہاں پر کھل کر اپنی من مانی کر رہے ہیں۔ تقریباً تین چار ماہ سے وہ کوئی ایسا کھیل کھیل رہے ہیں جس کی ابھی پوری طرح سمجھ نہیں آئی لیکن یہ کنفرم ہے کہ وہ ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔ ان کی پشت پناہی یہاں کا مشہور غنڈا دودا پہلوان کر رہا ہے۔ ان کے اپنے کچھ سیاسی لوگوں سے مراسم ہیں۔ سب سے زیادہ حبیب کھوکھر ان کے سبھی کاموں کو اعلیٰ سطح پر تحفظ دے رہا ہے۔''

''یہ بتا اُن پر ہاتھ کیسے ڈالیں؟'' شہباز نے تحمل سے پوچھا۔

''دودا پہلوان، حبیب کھوکھر اور ملک سرفراز کے کسی بیٹے سے اگر پوچھ تاچھ کی گئی، بھلے ویسے ہی بات چیت ہوا یا اُن میں سے کسی کو بھی اٹھا کر کی گئی تو وہ الرٹ ہو جائیں گے

اور جتنے بھی پنچھی وہاں پر ہوں گے، سب اُڑ جائیں گے۔ میرے خیال میں پوری طاقت کے ساتھ ایک دم سے دھاوا بولا جائے اور جو بھی پنچھی ہاتھ لگے اٹھالیں۔'' اس ملنگ نے کہا۔

''اندر کی خبر کیسے ملے گی؟'' شہباز نے پوچھا۔

''جب سے ہمیں خبر ہوئی تھی، دو بندے وہاں ایڈجسٹ کر دیے تھے۔ ایک تو مستقل وہیں رہتا ہے، ایک آتا جاتا ہے۔ تقریباً دو گھنٹے بعد وہ آپ سے رابطہ کریں گے۔ پھر جیسی چاہئیں معلومات لیتے رہیں۔''

''ملک سرفراز کے بیٹوں کی تازہ تصویریں ابھی بھیج دیں، وہ دیکھیں تو سہی کیسے ہیں۔''

''کچھ دیر بعد مل جائیں گی۔'' اس نے دھیمے سے کہا۔

''ڈن ہو گیا۔'' شہباز نے بتایا تو وہ ملنگ ایک دم سے اٹھا اور چلتا چلا گیا۔ ہم چار پانچ منٹ وہیں بیٹھے رہے۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ نیٹ ورک کھلنے لگا ہے۔ دھیرے دھیرے سب سامنے آجائے گا۔ بس ذرا صبر چاہیے۔ ہم وہاں سے اٹھے اور نکلتے چلے گئے۔

☆☆☆

دوپہر سے ذرا پہلے پوجا نے میسج کے ساتھ دو تصویریں بھیج دی تھیں۔ ان دونوں کو شہر کے فائیو اسٹار ہوٹل میں ملنا تھا۔ وہاں سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اسلحہ لے کر نہیں جاسکتے تھے۔ اگر لازمی ہی لے جانا ہوتا تو پھر اس میں کئی دوسرے لوگوں کو بھی شامل کرنا پڑتا۔ ہمیں وہاں اسی وقت پہنچنا تھا جب وہ دونوں آپس میں مل بیٹھتے۔ لمحہ بہ لمحہ وقت قریب آتا جارہا تھا۔ میں اور شہباز فائیو اسٹار ہوٹل کے پاس پہنچ چکے تھے۔ شہباز بالکل آہستہ گاڑی چلا رہا تھا۔ بڑے اطمینان سے پارکنگ میں گاڑی لگانے کے بعد ہم ٹہلتے ہوئے داخلی دروازے کی جانب بڑھے۔ لاؤنج میں اتنا زیادہ رش نہیں تھا۔ ان میں چار پانچ ہمارے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم دونوں بھی ایک طرف خالی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ہمارا انداز ایسا ہی تھا جیسے ہم کسی گپ شپ کے لیے آئے ہوں۔

اس وقت ہم آرڈر دے چکے تھے جب مجھے پہلی اطلاع ملی کہ ان دو میں سے ایک آگیا ہے۔ میں نے غیر محسوس انداز میں نگاہ داخلی دروازے کی طرف رکھی۔ تقریباً ایک منٹ بعد ایک لمبا تڑنگا نوجوان بریف کیس تھامے، سیاہ سوٹ پہنے اندر داخل ہوا، اس نے گرے کلر کی ٹائی باندھی ہوئی تھی۔ وہ شکل ہی سے کوئی ایشیائی دکھائی دے رہا تھا، وہ تیز قدم چلتا ہوا سیدھا استقبالیہ تک گیا۔ اس نے وہاں کھڑی ایک لڑکی سے کوئی بات کی تو وہ لڑکی مسکراتے ہوئے ہاں میں ہاں ملانے لگی، پھر اس نے ریسیور اٹھالیا۔ چند لمحے بات کرنے کے بعد اس نے قریب کھڑی ایک لڑکی کو اشارہ کیا، پھر انہیں ایک میز کی جانب بھیج دیا۔ لڑکی اسے ایک میز تک لے گئی، شاید وہ ریزرو میز تھی۔ وہ وہیں بیٹھ گیا اور بیٹھتے ہی اپنے سیل فون کو ہاتھ میں لے لیا۔ اس کی ساری توجہ اپنے سیل فون پر تھی۔ وہ جیسے ساری دنیا سے بے خبر دکھائی دے رہا تھا۔ اگلے تین چار منٹ میں ایک نوجوان تیزی سے چلتا ہوا وہاں تک آگیا۔ اس کے آنے کا احساس کر کے بیٹھا ہوا نوجوان اٹھا، اس نے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ دونوں بیٹھ گئے اور ان کے درمیان گفتگو شروع ہوگئی۔

''دیکھا تم نے کچھ؟'' میں نے شہباز کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''ہاں، دونوں تصویروں والے وہی ہیں۔'' اس نے کہا تو میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''او ماما، کچھ اور بھی سمجھ آئی ہے کہ نہیں؟''

''مطلب کیا سمجھتا ہے؟'' اس نے ایک دم سے پوچھا، پھر جلدی سے اپنا سیل فون نکال کر دیکھا۔ اس میں ملنگ کی ملک سرفراز کے بیٹوں کی بھیجی ہوئی تصویریں تھیں۔ اس نے تصویر دیکھ کر سر اٹھاتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

''اوئے یہ جو بعد میں آیا ہے، یہ ملک کا بیٹا ملک حامد ہی ہے نا؟''

''یہی کہہ رہا ہوں، اب بتا کیا کرنا ہے؟''

''اگر تو فارم ہاؤس جانا ہے، پھر تو خاموش رہنا ہی بہتر ہے اور اگر نہیں جانا تو ان دونوں کو اٹھا لیتے ہیں، پھر دیکھی جائے گی۔'' اس نے مشورہ دیا۔

''میرا خیال ہے پوجا کو آزما لیتے ہیں، وہ کیا کرتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''تو پھر فارم ہاؤس؟'' اس نے پوچھا۔

''اگر وہاں تھوڑی بہت بھی ہلچل ہوئی تو وہاں موجود دونوں لڑکے بتا دیں گے، انہیں الرٹ کر دو۔ پھر فارم ہاؤس بھی دیکھ لیں گے۔'' میں نے کہا۔

''دیکھو یہاں چاروں طرف سی سی ٹی وی کیمرے لگے ہوئے ہیں، انہیں اگر اٹھایا تو کام خراب بھی ہوسکتا ہے۔'' اس نے مجھے احساس دلایا۔

''او کے، ان میں سے ایک کو سہی، اٹھانا تو ہے نا، اندر نہ سہی باہر سہی۔'' میں نے حتمی انداز میں کہا اور انہیں چور نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

ہمارے سامنے کافی رکھ دی گئی تھی۔ ہم کافی پینے لگے۔ اسی دوران پوجا کا فون آگیا۔ میں نے کال ریسیو کر کے کہا۔

''ہاں بولو۔''

''کیا وہ بندے تم نے دیکھ لیے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، دیکھ لیے ہیں۔'' میں نے کہہ دیا۔

''انہیں دیکھ لو، ان سے آگے بہت کچھ مل جائے گا۔'' اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا اور کال بند کر دی۔

ان دونوں کی میز پر کھانا آگیا تھا۔ اب میرے پاس تھوڑا وقت تھا۔ میں نے شہباز کی طرف دیکھا، وہ سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں۔ جبکہ میں اپنے طور پر فیصلہ کر چکا تھا۔ یہ احمقانہ فیصلہ ہوگا اگر میں ان دونوں کو چھوڑ دیتا۔ یہ بہت بڑا رسک تھا۔ میرے سامنے یہ جو دو بندے بیٹھے ہوئے تھے، یہ پوجا کا مجھ پر وار بھی ہو سکتا تھا یا پھر یہیں سے مقامی نیٹ ورک کا پتا بھی مل سکتا تھا۔ میں یہ رسک لینے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ میں نے اپنا فیصلہ شہباز کو بتا دیا۔

وہ لوگ کھانا کھا چکے تھے۔ ہمارے بندے باہر بھی تھے۔ ملک حامد نے بل دیا تو میں نے شہباز سے کہا۔

''بولو، تم کسے دیکھو گے؟''

''میں باہر والے کو دیکھ لیتا ہوں، تم ملک حامد کو دیکھو۔'' اس نے کہا تو میں نے تیزی سے کہا۔

''اپنے بندوں کو الرٹ کر دو، صورتِ حال کچھ بھی ہو سکتی ہے۔''

''او کے۔'' اس نے کہا اور سیل فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ دونوں اٹھ چکے تھے اور داخلی دروازے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ہم دونوں بھی اٹھ گئے۔ مجھے یقین تھا کہ ہمارے ساتھ آئے لوگ بھی اٹھ چکے تھے۔

وہ دونوں پورچ میں جا کر یوں اجنبی بن گئے جیسے کبھی ملے بھی نہ ہوں۔ میری نگاہ ملک حامد پر تھی۔ وہ یوں کھڑا تھا جیسے کسی کا منتظر ہو۔ میں نے اپنے ایک ساتھی کو بلایا اور تیزی سے پارکنگ کی طرف بڑھتے ہوئے اپنی گاڑی تک جا پہنچا۔ ملک حامد کی گاڑی پورچ میں ڈرائیور لے آیا تھا۔ جس وقت وہ کار میں بیٹھا، اس وقت تک میرا ساتھی پارکنگ سے گاڑی نکال چکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ شہباز اپنی گاڑی کا بندوبست کر لے گا۔ میں گاڑی میں بیٹھا تو میرا ساتھی گاڑی نکال کر گیٹ تک لے آیا۔ اس دوران میں نے اپنے ساتھی کو سمجھا دیا تھا کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔ ہم نے ابھی تھوڑا سا فاصلہ طے کیا تھا کہ ملک حامد کی کار ہمارے قریب سے گزری۔ میرے ساتھی نے گاڑی اس کے پیچھے لگا دی۔ میں نے ڈیش بورڈ میں پڑا ہوا پسٹل نکالا، فالتو میگزین بھی جیب میں ڈال لیے اور پوری طرح تیار ہو گیا۔

تھوڑے سے فاصلے پر یوٹرن تھا۔ ملک حامد والی کار سائڈ پر ہوتے ہوئے آہستہ ہوئی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اسے یوٹرن لینا ہے۔ یہی وقت تھا جب میرے ساتھی نے گاڑی ایک دم سے تیز کی اور اس کے ساتھ لگا کر سائڈ مار دی۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے فطری ہو۔ بس گاڑی آگے نکالنے کی کوشش میں سائڈ لگ گئی تھی جس میں سراسر قصور ہمارا تھا۔ یہی ایک لمحہ ملک حامد کی سمجھ داری اور بے وقوفی کا تھا۔ اگر وہ سمجھ دار ہوتا تو یہ دیکھے بغیر کہ کیا ہوا اسے نکل جانا چاہیے تھا۔ کون سا رکنے سے گاڑی ٹھیک ہو جاتی۔ مگر اس نے بے وقوفی کی، وہیں کار کو بریک لگا دیے۔

اس کا ڈرائیور تیزی سے نکلا۔ یہی وہ لمحہ تھا جس کا مجھے فائدہ اٹھانا تھا، میں انتہائی تیزی کے ساتھ گاڑی سے نکلا اور سیدھا کار تک جا پہنچا۔ ملک حامد باہر دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کا دروازہ کھولا اور باہر آنے کا اشارہ کیا۔ اس وقت تک ڈرائیور پلٹ کر میرے پاس آرہا تھا، جسے میرے ساتھی نے روک لیا۔ ملک حامد بھڑک چکا تھا۔ وہ جیسے ہی باہر آیا، میں نے اس کی گردن پر ایک گھونسا جڑ دیا، اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں ایسا کروں گا، وہ لڑکھڑایا تو میں نے اسے اٹھایا اور اپنی گاڑی کی جانب بڑھا، وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے، اس لیے وہ مچلتا رہا لیکن میں نے اسے گاڑی میں پچھلی نشست پر ڈالا اور اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ میرا ساتھی اس وقت تک ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ میں نے ڈرائیور کی طرف پسٹل سیدھا کیا تو وہ خوف زدہ ہو گیا۔ ڈرائیور کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا، وہ واپس کار کی طرف لپکا شاید ہتھیار لینے لیکن اس وقت تک میرا ساتھی گاڑی بھگا چکا تھا۔ میں نے ملک حامد کی گردن پر پسٹل رکھ کر اپنا سیل فون نکالا اور شہباز کو فون کر دیا۔ اس نے فوراً کال پک کر لی۔

''میں نے حامد کو اٹھا لیا ہے۔'' میں نے بتایا تو وہ تیزی سے بولا۔

''او کے، بس میں بھی آیا۔''

میں نے فون بند کیا ہی تھا کہ ملک حامد نے میری طرف دیکھتے ہوئے غرا کر پوچھا۔

''تم نے یہ سارا ڈراما مجھے اغوا کرنے کے لیے کیا ہے؟''

''میں تو سمجھتا تھا تم خاصے احمق ہو، لیکن تھوڑی بہت سمجھ ہے، نرے گدھے نہیں ہو۔'' میں نے انتہائی حقارت سے کہا۔

''کون ہو تم؟'' اس نے پوچھا۔

''تیرا باپ۔'' میں نے پھر حقارت سے کہا تو اس نے غصے میں پاگل ہوتے ہوئے کہا۔

''تم نہیں جانتے ہو، کون ہوں میں......'' اس نے کہنا چاہا تو میں نے زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیا۔

''خاموش۔''

میرے اس طرح سخت کے رویے سے وہ بالکل بھی نہیں گھبرایا۔ اس کی آنکھوں میں ذرا سا بھی خوف نہیں تھا بلکہ اس کی آنکھوں میں وحشت ٹپکنے لگی۔ بڑے سے بڑا جگادری بھی اپنے سامنے موت کو دیکھ کر ایک بار تو سہم جاتا تھا۔ کسی نہ کسی سمجھوتے پر اتر آتا ہے لیکن وہ کسی خوف کے بغیر اس تاک میں تھا کہ مجھ سے کوئی غلطی ہو۔ ایسے لوگ یا تو بے خوف اور دلیر ہوتے ہیں یا پھر نرے احمق۔ میرے خیال میں اسے گمان بھی نہیں تھا کہ لاہور کی سڑکوں پر کوئی اسے اٹھا بھی سکتا ہے، اس کا سامنا بھی کرنے کی جرأت رکھتا ہے۔ وہ اسی اعتماد میں مارا گیا تھا۔ میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے لیے سڑک پر کوئی مصیبت پیدا کرتا، میں نے اسے بے ہوش کرنا مناسب سمجھا۔ میں نے پسٹل اس کی گردن سے ہٹایا ہی تھا کہ اس نے اپنا ہاتھ میرے گریبان پر ڈالنے کی کوشش کی، میں نے بھنا کر پسٹل کا دستہ اس کے مارا جو سر کے بجائے ماتھے پر لگا۔ خون کی پھوار تو نہیں نکلی لیکن وہاں اچھا خاصا گومڑ بن گیا۔ وہ دونوں ہاتھ اپنے ماتھے پر رکھتا ہوا سیٹ پر لڑھک گیا۔

میرا ساتھی ممکن حد تک تیز رفتاری سے جا رہا تھا۔ تھوڑا سا فاصلہ طے کیا تھا کہ شہباز کا فون آ گیا۔

''میں نے دوسرے کو اٹھا لیا ہے، تمہیں پتا ہے نا کہاں جانا ہے؟''

''اوئے مجھے کیا پتا، تم نے کون سا بتایا تھا۔'' میں نے کہا۔

''اچھا فون دو اُسے۔'' اس نے کہا تو میں نے فون اپنے ساتھی کے کان سے لگا دیا۔ اس نے اپنی 'منزل' کو سمجھا اور فون ہٹانے کا اشارہ کیا۔ میں نے فون ہٹا لیا۔

مغل پورہ کے علاقے میں ایک حویلی نما گھر سیف ہاؤس کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ ہم گاڑی سمیت اندر جا چکے تھے۔ حامد کافی حد تک ہوش میں آ چکا تھا۔ وہاں موجود لوگ الرٹ تھے۔ وہ اسے گاڑی میں سے اٹھا کر اندر کمرے میں لے گئے۔ مجھے شہباز کا انتظار تھا۔ اسے فون کرنے پر پتا چلا کہ وہ کہیں قریب ہے۔ میرے دماغ میں نجانے کیوں یہ خیال آ رہا تھا کہ مجھے فارم ہاؤس جانا چاہیے تھا۔ ان سے تو بعد میں بھی پوچھا جا سکتا ہے۔ یہی سوچتے ہوئے میں کمرے میں گیا تو حامد کو ہوش میں لانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ پھر انہوں نے اس کے منہ پر پانی پھینکا تو وہ ہوش میں آ گیا۔ میں کچھ دیر اس کے چہرے کی جانب دیکھتا رہا، پھر اس کے قریب جا کر پوچھا۔

''وہ دوسرا شخص کون تھا؟''

اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے حیرت سے پوچھا۔

''تم نے اس لیے مجھے اغوا کیا؟''

''میں پوچھ رہا ہوں، وہ کون تھا اور کیا ڈیل ہوئی ہے؟'' میں نے پوچھا تو وہ نفرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''پہلے تم بتاؤ، تم کون ہو؟''

میں سمجھ گیا کہ وہ تھوڑا ٹیڑھا آدمی ہے۔ میں نے اس سے سوال کرنا ترک کر دیا، اس کے پاس کھڑے تین بندوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس کی ذرا ٹون ڈھیلی کرو، اس دوران اگر یہ مر جاتا ہے تو کوئی فکر مت کرنا، وہ دوسرا آنے والا زیادہ اہم ہے۔''

یہ کہہ کر میں جب تک دیوار کے ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھا، ان تینوں نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ وہ ایک دم سے گالیاں بکنے لگا۔ اس پر ان تینوں میں غصے کی... شدت بڑھنے لگی، وہ پاگلوں کی طرح اسے پیٹنے لگے۔ ڈیڑھ منٹ سے بھی کم وقت میں وہ فرش پر گرتے ہوئے چیخ کر بولا۔

''پوچھو کیا پوچھتے ہو؟''

''نہیں ابھی اس کی ٹون مزید کم کرو، یہاں تک کہ

خود بخود بولنے لگے۔‘‘
’’میں کہہ رہا ہوں پوچھو......‘‘ یہ کہتے ہوئے وہ گالیاں دینے لگا۔ میں خاموش تماشائی کے مانند وہاں بیٹھا دیکھتا رہا۔ اس کے کئی جگہوں سے خون نکل آیا تھا۔ وہ مار کھاتے ہوئے تڑپ رہا تھا، مچل رہا تھا لیکن میں خاموش بیٹھا تھا۔ وہ لحہ بہ لحہ ڈھیلا پڑتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔

اسی دوران شہباز آ گیا۔ اس کے ساتھیوں نے اس شخص کو پکڑا ہوا تھا۔ جیسے ہی وہ کمرے میں آئے، شہباز کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔
’’یہ مر گیا ہے؟‘‘

یہ لفظ ایسے تھے جن کا شدید ترین اثر اس شخص پر ہوا۔ وہ ایک دم سے ہی بوکھلا گیا۔ میں شاید اس کے چہرے کے مزید تاثرات دیکھتا، کسی نے اسے دھکا دیا تو سیدھا فرش پر جا پڑا۔ تبھی میں نے کرخت لہجے میں کہا۔
’’جو سیدھی بات نہیں کرے گا، اسے مرنا پڑے گا، تم تو جانتے ہو نا، میں فضول وقت ضائع نہیں کرتا۔‘‘
’’ہاں یہ تو ہے۔‘‘ شہباز نے سہم جانے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا تو فرش پر گرا ہوا شخص وہیں بیٹھ گیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ کافی حد تک حواس باختہ دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں پوچھا۔
’’کون ہو تم، اس سے کیوں ملے تھے؟‘‘
’’اگر نہیں بتاؤں گا، تو کیا کرو گے، مار دو گے نا، تو مار دو۔‘‘ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا تو میں نے بے پروائی سے کہا۔
’’ہاں ظاہر ہے، بتا دو گے تو وہ لوگ مار دیں گے، جنہوں نے تمہیں بھیجا ہے، نہیں بتاؤ گے تو ہم مار دیں گے۔‘‘
’’ہے تو ایسا ہی۔‘‘ اس نے اعتماد سے کہا۔
’’ہاں بس ٹھیک ہے۔‘‘ یہ کہہ کر میں نے وہاں موجود لوگوں سے کہا، ’’اسے بھی مرنے کا شوق ہے، اسے بھی لے جا کر مار دو۔‘‘

میرے کہنے کی دیر تھی، وہاں موجود لوگوں نے اسے اٹھایا اور بری طرح گھسیٹتے ہوئے باہر لے جانے لگے۔ وہ شور مچاتا رہا کہ میں خود چلا جاؤں گا لیکن کسی نے ایک نہ سنی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ حامد ہوش میں آ گیا۔ اس نے غور سے دیکھا تو سمجھ گیا کہ دوسرا بھی لے آئے ہیں۔ اسی لیے میری طرف دیکھ کر لرزتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
’’کیا چاہتے ہو؟‘‘
’’موت یا ڈیل...... دو حرفی بات ہے بس۔‘‘ میں نے کہا۔
’’کیا ضمانت ہے کہ تم مجھے جانے دو گے؟‘‘ اس نے پوچھا۔
’’ضمانت یہی ہے کہ میں کہہ رہا ہوں۔ جانے دوں گا، جو پوچھوں وہ بتا دو شرافت سے۔‘‘ میں نے سخت لہجے میں کہا تو وہ میری طرف دیکھنے لگا۔ پھر وحشت ناک انداز میں بولا۔
’’یہ کھیل نہ ہی کھیلو، مارے جاؤ گے۔‘‘
’’چپ کر کسی ایکٹر کی اولاد، بکو گے یا......‘‘ یہ کہتے ہوئے میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ تینوں اسے پھر سے مارنے لگے۔ اس کی چیخیں بلند ہونے لگیں تو ایک نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ اچانک وہ ہاتھ کے اشاروں سے سمجھانے لگا کہ وہ بتاتا ہے۔ اس نے منہ پر سے ہاتھ ہٹا دیا تو وہ سسکتے ہوئے بولا۔
’’یہ بھارت سے آیا ہے مجھ سے بات کرنے کے لیے۔‘‘
’’کیسی بات؟‘‘ میں نے پوچھا۔
’’کچھ لڑکیاں ہیں بھارت کی، وہ اس وقت دبئی میں ہیں۔ انہیں یہاں لا کر رکھنا ہے۔‘‘ اس نے بتایا تو میں نے پوچھا۔
’’قانونی طریقے سے آئیں گی؟‘‘
’’ہاں نا۔‘‘ اس نے کہا۔
’’کیا کام لینا ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔
’’میرے فارم ہاؤس پر رہیں گی۔ مختلف لوگوں سے دوستیاں ہوں گی، نوٹ بنائیں گی اور میرا فائدہ بھی ہوگا۔‘‘ اس نے کہا۔
’’بڑے عجیب قسم کے کمینے ذلیل ہو یار، تمہیں پتا ہے جو لڑکیاں یہاں آئیں گی، وہ ملک دشمنی بھی کریں گی۔ یہاں کے راز بھی باہر جا سکتے ہیں۔‘‘ میں نے پوچھا تو وہ شدید اکتاہٹ سے بولا۔
’’سب سے پہلے تو انہیں ملک کا وفادار ہونا چاہیے جن کے پاس راز ہیں، وہ کیوں دیں گے راز، اگر وہی راز نہیں رکھ سکتے تو کیا ہو سکتا ہے۔ ایسے عیاش لوگوں کی ماں کو بیچ دیا جائے تو بھی وہ خاموش رہتے ہیں۔‘‘
’’میری معلومات کے مطابق ڈیل یہ نہیں میرے

بچے، وہ بتا جو ڈیل ہوئی ہے، اصل بات بکو......" میں نے سخت انداز میں کہا۔

"یہی ہے۔" اس نے کہا تو میں اٹھتے ہوئے بولا۔

"یہ ایسے نہیں مانے گا، اسے دو چار دن رکھ کر خوب سیوا کرو۔" یہ کہتے ہوئے میں کمرے سے باہر آ گیا۔

دوسرا سامنے کمرے میں تھا اور وہاں سے اس کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو وہاں پر اسے فرش پر لٹایا ہوا تھا۔ اس کی حالت بری ہو رہی تھی۔ میرے اشارے پر انہوں نے چھوڑ دیا۔ میں اس کے پاس فرش پر ہی بیٹھ گیا۔ اس کی حالت بہت خستہ تھی۔ میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں پوچھا۔

"کہاں پر کارروائی کرنا تھی؟"

"کہیں بھی...... جہاں ہجوم ہوتا...... کوئی جلسہ...... یا جلوس۔" اس نے کراہتے ہوئے کہا تو میں نے پوچھا۔

"کسی پر بھی یا کوئی ٹارگٹ تھا؟"

"یہ اسی کو دیکھنا تھا...... ابھی تو...... صرف ڈیل ہوئی ہے...... آج اس نے...... ہامی بھری ہے...... کل اسے...... رقم پہنچ...... جانی تھی۔" اس نے بہت مشکل سے کہا تو میں نے تصدیق والے انداز میں پوچھا۔

"وقت اور مقام اسی نے طے کرنا تھا؟"

"بالکل......" اس نے کہا اور چکرا کر فرش پر گر گیا تو میں نے تیزی سے کہا۔

"اسے پانی پلاؤ، اچھی جگہ پر رکھو۔ اسے کچھ کھانے کو دو۔"

وہ لوگ اسے اٹھا کر سہارا دے کر باہر لے جانے لگے۔ مجھے ایک دم ہی حامد پر غصہ آنے لگا۔ اس نے جھوٹ بولا تھا۔ شہباز میرے نزدیک آ کر بولا۔

"اسے یہاں نہیں رکھنا، کہیں......"

"کہاں لے جانا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کسی بھی محفوظ مقام پر، یہاں پر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہاں اس کے پیچھے کوئی آ جائے۔" اس نے تشویش زدہ لہجے میں کہا۔

"اچھا جو کرنا ہے کر، مجھے اس حامد کو... تھوڑا ٹھیک کرنا ہے، ہمیں بے وقوف بنا رہا ہے۔" میں نے غصے میں کہا۔

"یہ طوطے کی طرح بولے گا تھوڑی ٹکنیک لگانی پڑے گی۔ یہ سنبھال لیں گے، آؤ ہم چلیں۔" اس نے کہا۔

"ایسے کیسے چلے جائیں، اگلی بات......" میں نے کہنا چاہا تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"شام تک ساری رپورٹ آ جائے گی، اب چلو جلدی۔"

"او یار اتنی جلدی، کیوں کر رہے ہو......" لفظ میرے منہ ہی میں تھے کہ چاچا عبدالمجید کی کال میرے فون پر آ گئی۔ میں نے کال ریسیو کی تو وہ بولے۔

"ملک سرفراز کے بیٹے حامد کو اٹھایا ہے؟"

"ہاں، اٹھایا ہے۔" میں نے کہا۔

"چل ٹھیک ہے۔ اچھا کیا، اب فوراً اس کے فارم ہاؤس پر پہنچو، وہاں پر بھی قبضہ کر لو...... باقی میں دیکھتا ہوں۔ وہاں بندے پہنچنے والے ہوں گے۔" چاچا عبدالمجید نے کہا اور کال بند کر دی۔

"چل نکل شہباز۔" میں تیزی سے بھاگتے ہوئے بولا۔

"اب بڑی تیزی آ گئی ہے۔" اس نے پوچھا تو میں نے کال کے بارے میں بتایا۔ وہ ایک دم سے سنجیدہ ہو گیا۔ وہ بھی تیز ہو گیا۔ اس نے تقریباً بھاگتے ہوئے وہاں پر موجود ایک بندے سے کہا۔

"ان دونوں کو حفاظت سے پہنچا دینا، میں آتا ہوں ابھی۔"

اگلے چند منٹ میں ہم گاڑی لے کر نکل رہے تھے۔

☆☆☆

فارم ہاؤس کے مین گیٹ پر پہنچے۔ یوں لگا جیسے کسی محل کا بیرونی دروازہ ہو۔ جیسے ہی میں نے گیٹ کے سامنے پڑے بیریئر کے قریب گاڑی روکی، سامنے کھڑے دو گارڈز حرکت میں آ گئے۔ وہ تن کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے ہاتھ اپنی گنز پر تھے۔ ہماری گاڑی کے پیچھے مزید گاڑیاں آتی چلی گئیں، وہ تین گاڑیاں تھیں جو ہماری گاڑی کے پیچھے رُک گئی تھیں۔ ان دونوں میں سے ایک گارڈ آگے بڑھا اور اس نے شہباز والی سائیڈ پر قریب آ کر کہا۔

"جی صاحب۔"

"گیٹ کھولو۔" شہباز نے اپنی طرف کا شیشہ نیچے کرتے ہوئے کہا تو... گارڈ نے کہا۔

"پہلے یہاں آ کر اپنی شناخت کروائیں۔" اس نے کہا تو شہباز گاڑی سے اتر گیا۔ میں بھی تیزی سے اس کے پیچھے لپکا۔ ہم دونوں اس جگہ پر گئے جہاں شناخت کروانی تھی۔ وہاں چند بدمعاش ٹائپ غنڈے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ گاڑیاں دیکھ کر پریشان ہو گئے تھے اس لیے انہوں نے

اپنا اپنا اسلحہ ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ تبھی شہباز نے انتہائی سنجیدگی سے رعب دار لہجے میں پوچھا۔

''ہاں بھئی کس نے کرنی ہے شناخت؟''

''جی بتائیں کون ہیں آپ؟'' ان میں سے ایک نے کہا جس نے سوٹ پہنا ہوا تھا اور ٹائی بھی لگائی ہوئی تھی۔

''مجھے یہاں کی تلاشی لینی ہے۔'' شہباز نے انتہائی اعتماد سے کہا۔

''جی میں اپنے......'' اس نے کہنا چاہا لیکن شہباز نے بولنے نہیں دیا، اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''میں نے یہ کہا ہے کہ مجھے تلاشی لینی ہے؟''

ایک غنڈے نے جلدی سے اپنا سیل فون نکالا تو شہباز نے اس کے سیل فون پر ہاتھ ڈالا اور فون چھینتے ہوئے کہا۔ ''کوئی کسی کو کال نہیں کرے گا، سب ایک طرف ہو جاؤ۔''

''اوئے کون ہے تو......'' ان میں سے ایک نے کہا اور شہباز کا گریبان پکڑنے کے لیے آگے بڑھا، تبھی میں آگے بڑھا اور ایک دم سے تھپڑ اس کے منہ پر مار دیا۔ ساتھ کھڑے غنڈے آگے بڑھنے لگے تو میں نے اپنا پسٹل نکالا اور ایک دم سے فائر کرنا شروع کر دیے۔ وہ ایک لمحے کے لیے بوکھلا گئے حالانکہ ان کے ہاتھوں میں گنز تھیں۔ فائر کرنے کے لیے اجازت اور حوصلہ چاہیے ہوتا ہے جو اُن کے پاس نہیں تھا۔ پیچھے سے کچھ لوگ بھاگتے ہوئے آگئے تھے۔ انہوں نے کوئی بات کیے بغیر فرش پر کئی فائر کر دیے۔ وہ سہم کر دیوار سے لگ گئے۔ تبھی میں نے کہا۔

''انہیں باندھ کر یہیں چھوڑ دو، کوئی بھی حرکت کرے تو گولی مار دو۔''

وہ وہاں پر مصروف ہو گئے، میں انتہائی تیزی سے واپس مڑا گاڑی تک پہنچا۔ وہ دو گارڈ کہیں بھی دکھائی نہیں دیے۔ مجھے ان کا ڈر تھا کہیں وہ چھپ کر کوئی فائر نہ کر دیں۔ جیسے ہی میں گاڑی میں بیٹھا، ایک گارڈ نے دائیں طرف سے سر نکالا اور فائر کر دیا لیکن اس وقت تک کئی فائر ہو گئے۔ پچھلی گاڑیوں میں بیٹھے لوگ چوکنا تھے۔ میں نے یہ نہیں دیکھا کہ اس گارڈ کا کیا بنا، میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ گیٹ پار کر کے شہباز کو بٹھایا اور آگے بڑھ گیا۔

جیسے ہی میں نے گاڑی پورچ میں کھڑی کی، باقی گاڑیاں بھی رک گئیں۔ انہیں ایک ادھیڑ عمر بلاور شاہ لیڈ کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ بندے تھے، کچھ پہلے ہی وہ دیواریں پھاند کر اندر داخل ہو چکے تھے۔ گاڑیوں سے نکلنے والے لوگ رہائشی عمارت کے اردگرد پھیلنے لگے۔ میں نے اس بلاور شاہ کی طرف دیکھا تو وہ تیزی سے میرے قریب آ کر بولا۔

''اندر سنبھالیں، باہر ہم ہیں۔''

''کوئی بندہ باہر نہ جانے پائے۔'' میں نے کہا تو شہباز اس وقت تک داخلی دروازے سے اندر لاؤنج میں جا چکا تھا۔ میں اس کے کور پر تھا، اچانک ایک طرف کے کمرے سے دو بندے گنز سیدھی کرتے ہوئے نکلے، ان کے فائر کرنے سے پہلے ہی میں نے فائر کر دیا۔ ایک پیچھے ہٹ گیا، دوسرا وہیں چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ میں نے ایک جست بھری اور وہاں تک جا پہنچا۔ میں دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ وہ باہر دیکھنے کے لیے ذرا سا آگے بڑھا۔ جیسے ہی اور جتنا بھی مجھے دکھائی دیا، میں نے وہیں فائر کر دیا۔ گولی اس کی ران پر لگی تھی۔ وہ پیچھے تو ہٹا لیکن دوسرے قدم پر ڈھیر ہو گیا۔

ہم سب فائر کرتے ہوئے اندر کی جانب بڑھنے لگے۔ کچھ ہی دیر بعد باہر سے بھی فائر ہونے لگے۔ تبھی ہمارے ایک ساتھی نے راہداری میں کھڑے ہو کر اونچی آواز کہا۔

''جو بھی اندر ہے، اپنے ہاتھ سر پر رکھ کر باہر آجائے، کچھ نہیں کہا جائے گا، لیکن جو اندر رہا، یا کسی نے مزاحمت کی، اسے فوراً گولی ماردی جائے گی۔''

اس کی آواز کی بازگشت لمحہ بھر رہی اور پھر کچھ دیر تک سناٹا رہا۔ اچانک ایک دروازہ کھلا اور ایک لڑکی اپنے ہاتھ سر پر رکھے باہر نکلی۔ وہ خوف زدہ سی آگے بڑھتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ وہ قریب آئی تو اسے دو افراد باہر چھوڑ آئے پھر دھیرے دھیرے کئی لوگ باہر نکلتے چلے آئے۔ ان سب کو باہر لان میں بٹھایا جاتا رہا۔ وہاں چند لوگ ان کی نگرانی پر اسلحہ لیے کھڑے تھے۔ وہاں کوئی پچیس کے قریب لوگ تھے جن میں بارہ تیرہ لڑکیاں تھیں۔ تقریباً ایک گھنٹے میں اس فارم ہاؤس کو خالی کرا لیا گیا۔ ایک ایک کمرا دیکھ لیا گیا۔ یہاں تک کہ چھت پر بھی لوگ دیکھ لیے گئے۔ مجھے یہ حیرت ہو رہی تھی کہ ان میں پوجا نہیں تھی۔ میں باہر لان تک گیا، ایک ایک لڑکی کو غور سے دیکھا۔ ان میں کوئی بھی پوجا جیسی نہیں تھی جس پر شک کیا جا سکتا ہو۔ جب پوری طرح اس فارم کو چھان پھٹک کر دیکھ لیا گیا تو میں نے ان سب سے کہا۔

''دیکھو، اگر تمہارے ساتھ کا کوئی بندہ پیچھے چھپا ہوا

ہے تو بتادو، ورنہ وہ زندہ نہیں رہے گا۔''

میری بات کے جواب میں کوئی نہیں بولا۔ سبھی خوف زدہ سے میری طرف دیکھے چلے جا رہے تھے۔ میں انہی کی طرف دیکھ رہا تھا کہ میرا سیل فون بج اٹھا، میں نے اسکرین پر نگاہ ڈالی تو وہ پوجا کا فون تھا۔ میرے ہیلو کہتے ہی وہ قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے بولی۔

''بڑی جلدی پہنچ گئے فارم ہاؤس۔''

''تم کہاں ہو؟'' میں نے تیزی سے پوچھا تو وہ سنجیدہ لہجے میں بولی۔

''یار جب تمہیں ایک رستہ دے دیا ہے تو پھر میں تمہارے راستے میں کھڑی ہو کر انتظار تو نہیں کر سکتی، آم کھاؤ، پیڑ مت گنو۔''

''یہاں پر کوئی کام کا بندہ ہے؟'' میں نے تیزی سے پوچھا۔

''بندہ نہیں ایک بندی ہے۔ اس سے بہت کچھ ملے گا۔'' اس نے کہا تو میں ہنس دیا، پوجا بہت ہی خطرناک اور چالاک تھی۔ آگے جو کچھ بھی ہونا تھا، اس کا سارا الزام اسی لڑکی پر جاتا، تبھی میں نے پوچھا۔

''واہ پوجا واہ، اس لڑکی کو قربانی کا بکرا بنا کر خود غائب؟''

''بکرا نہیں بکری، سالی راکیش ورما کی طرف سے مجھ پر نگران تھی۔ اب یہ تم پر ہے، تم کتنی تیزی سے اس نیٹ ورک کو پکڑتے ہو۔''

''چل دیکھتا ہوں۔'' میں نے کہا تو وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''بڑی معصوم لگتی ہے، مجھ سے بھی زیادہ معصوم، کہیں جھانسے میں مت آجانا۔ اس کے اوپری ہونٹ پر دائیں جانب چھوٹا سا سیاہ تل ہے۔ گوری ہے گول چہرے والی۔ جو بتائے مجھ سے تصدیق بھی کر لینا، جے رام جی کی۔'' یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔

میں چند لمحے گم صم کھڑا رہا۔ پوجا کے اس فون نے مجھے بہت کچھ سمجھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کی رسائی نچلی سطح پر نہیں تھی بلکہ وہ کوئی اونچا گیم کھیل رہی تھی۔ یہاں کا نیٹ ورک وہ خود تباہ کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اس کے لیے اس نے اپنے لوگوں کو بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ اسے پتا تھا کہ یہاں فارم ہاؤس پر کچھ ہونے والا ہے، میں اگر نہ بھی آتا تو کوئی دوسرا ضرور آتا۔ چاچا عبدالمجید نے مجھے یہاں فارم ہاؤس پر آنے کا کہا تھا۔ اس کا مطلب بالکل یہی تھا کہ جہاں پر یہ فیصلہ ہوا تھا، اس بارے میں پوجا جانتی تھی۔

میرے لیے یہ بڑا لمحۂ فکریہ تھا کہ وہ بڑی دور تک رسائی رکھتی ہے۔ میں جو یہ سمجھتا تھا کہ وہ صرف میرے لیے یہاں آئی ہے اور اس نے مجھے ہی قتل کرنا تھا، یہ بہت معمولی بات رہ گئی تھی۔ اس نے جو کہا تھا کہ میں تین بار اس کے نشانے پر آیا تھا لیکن اس نے مجھے قتل نہیں کیا تو وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ سوچوں کا ایک سلسلہ دراز ہو گیا تھا۔ میں نے یہ سوچنا کسی اور وقت کے لیے رکھا اور سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں لاشعوری طور پر اس لڑکی کو دیکھنے لگا۔ لیکن میری سوچ پر پوجا حاوی تھی۔ اسی لمحے میرے دماغ میں خیال آگیا، میں بھی اب پوجا کے ساتھ کھیل ہی کھیلوں گا۔ میں سرسری انداز میں سب کو دیکھنے لگا۔ مجھے وہ لڑکی دکھائی دے گئی۔ میں نے جان بوجھ کر صرف نظر کیا۔ ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور نظر انداز کر دیا۔

''سب کلیئر ہو گیا۔'' بلاور شاہ نے قریب آ کر بتایا تو میں نے شہباز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''چاچا کو بتادو۔''

شہباز نے سر ہلایا اور اپنا فون نکال کر تھوڑا دور چلا گیا۔ اس نے ایک دو منٹ بات کی اور واپس آ کر بولا۔

''او کے ہو گیا، کہہ رہے ہیں آفس آجائیں۔''

''اور یہ لوگ......؟'' میں نے پوچھا تو وہ حیرت سے بولا۔

''یہ ہیں نا، یہ سب یہیں رہیں گے۔''

''نہیں مجھے تھوڑی پوچھ تاچھ کرنی ہے۔'' میں نے کہا اور اندر کی طرف جانے لگا۔ شہباز چند منٹ وہیں کھڑا رہا پھر میرے پیچھے آ کر پوچھا۔

''خیر ہے، بات کیا ہے؟''

''باہر بیٹھی لڑکیوں میں سے مجھے ایک لڑکی چاہیے لیکن سب کے سامنے نہیں، سب سے چھپا کر نکالنا ہے اُسے۔'' میں نے کہا تو وہ بے ساختہ بولا۔

''او ماما خیر ہے۔ تجھے ساوری بھابی کا پتا......''

''اوئے بکواس نہ کر، ساوری کا کچھ لگتا۔'' میں نے تلخی سے کہا تو اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

''کون ہے ان میں؟''

''اس نے میرون رنگ کا اسکرٹ اور سیاہ شرٹ پہنے ہوئے ہیں، گول چہرہ، گوری اور ہونٹ پر دائیں طرف تل ہے۔''

''کیا کرنا ہے اس کا؟'' اس نے پوچھا۔
''اچار ڈالنا ہے۔'' میں نے انتہائی سنجیدگی سے کہا تو وہ ایک دم سے ہنس دیا پھر بڑے سکون سے بولا۔
''ابھی پولیس آنے والی ہے، ان سب کو پکڑ کرلے جائے گی۔ اگر اس لڑکی کو خفیہ رکھنا ہے تو پولیس کے آنے سے پہلے کچھ کرنا ہوگا۔''
''تو کرو نا جا کر۔'' میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ وہ میری طرف دیکھتا رہا، پھر باہر نکل گیا۔ میں شیشے میں سے باہر دیکھ رہا تھا۔ وہ لان میں چلا گیا۔ اسے وقت ہی نہیں مل سکا۔ انہی لمحات میں پولیس کی گاڑیاں آگئیں۔ ان میں سے کئی پولیس والے اترے، ان میں لیڈی پولیس بھی تھی۔ وہ سب کو ہانک کر گاڑیوں میں بٹھانے کے لیے کھڑے ہونے کا اشارہ کرنے لگے۔ وہاں ایک رش سا لگ گیا۔ شہباز اس رش میں گیا اور اسی لڑکی کو کھینچ کر پیچھے لے آیا۔ اس لڑکی نے حیرت سے شہباز کو دیکھا، پھر مطمئن سی ہوگئی۔ شہباز نے اس کے کان میں کچھ کہا اور پھر اسے اندر کی جانب دھکیل دیا۔ وہ تیز قدم اٹھاتی ہوئی اندر لاؤنج کی طرف آگئی تو میں نے اس سے کہا۔
''ادھر کمرے میں جا کر بیٹھ جاؤ، دروازہ کھلا رکھنا، کوئی آئے تو دروازے کے پیچھے چھپ جانا۔''
اس نے غور سے میری بات سنی اور پھر مجھے حیرت سے دیکھتی ہوئی سامنے والے کمرے میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد سناٹا چھا گیا۔ بلاور شاہ اور اس کے لوگ لان میں کھڑے تھے۔ وہیں ان کے پاس شہباز کھڑا تھا۔ وہ سب گئے تو شہباز آگیا۔ اس نے آتے ہی کہا۔
''کہاں ہے وہ؟''
میں نے اندر کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہ اندر گیا اور اسے باہر لے آیا۔ گاڑی باہر پورچ میں کھڑی تھی۔ اس نے مجھے چلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے جاتے ہی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے سے پہلے پیچھے کا دروازہ کھول دیا۔ شہباز اور وہ تیزی سے آئے اور پیچھے بیٹھ گئے۔ میں نے گاڑی بڑھا دی۔

☆☆☆

شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں اور شہباز اس لڑکی کے ساتھ اس جگہ پہنچ چکے تھے جہاں حامد اور اس کے ملاقاتی کو رکھا ہوا تھا۔ وہ پوش علاقہ تھا اور سرِ شام ہی سناٹا چھا گیا تھا۔ وہ بنگلا ابھی نیا تعمیر ہوا تھا۔ اس میں ابھی زیادہ سامان نہیں تھا۔ میں اوپری منزل کے ایک کمرے میں جا کر خوب نہایا، اچھی طرح فریش ہو کر جب میں کمرے میں آیا تو شہباز اس لڑکی کے ساتھ صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر اٹھتے ہوئے بولا۔
''تم لوگ بیٹھو، میں ابھی آیا۔''
میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ لڑکی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ میں نے بیڈ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔
''کیا نام ہے تمہارا؟''
''پروین۔'' اس نے ہنکارا بھرنے والے انداز میں کہا تو میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں اسے سمجھاتے ہوئے پوچھا۔
''کیا تم اس بات کو سمجھ رہی ہو کہ میں اُن سب میں سے فقط تمہیں ہی وہاں سے نکال کر کیوں لایا ہوں؟''
''پتا نہیں کیوں آپ بتا دو۔'' اس نے بھاری پلکیں اٹھاتے ہوئے کہا۔
''پھر بھی کیا سمجھتی ہو، کچھ تو ہوگا ذہن میں؟'' میں نے اصرار کرتے ہوئے کہا تو وہ ہلکا سا مسکراتے ہوئے نخرے سے بولی۔
''وہی جس کے لیے سبھی فارم ہاؤس پر جاتے ہیں۔''
''بالکل بھی نہیں اور یہ سب ذہن سے نکال دو۔ میں جاننا ہوں تم کون ہو اور یہاں فارم ہاؤس پر کس لیے ہو۔ تمہیں واپس بھیجنا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تو وہ چونک گئی۔ اس نے غیر یقینی انداز میں میری طرف دیکھا اور حیرت بھرے لہجے میں بولی۔
''کیا جانتے ہیں آپ میرے بارے میں؟''
''دیکھو اگر تم ایسے ہی کرتی رہیں تو سمجھو یہیں کہیں قتل ہو کر دفن ہو جاؤ گی، کسی نے انتم سنسکار نہیں کرنا تمہارا؟ میں بارہ برس سے یہاں پر ہوں اور واپس جانے کو ترس رہا ہوں۔''
''کہاں جانا ہے واپس؟'' اس نے پوچھا۔
''مجھے چھوڑو، اپنے بارے میں سوچو۔'' میں نے کہا تو اس نے چونک کر دیکھا۔ ''اب تم میری حفاظت میں ہو لیکن زیادہ دیر نہیں رکھ سکوں گا۔ آج رات یا کل دوپہر تک......''
''میں سمجھی نہیں آپ کیا کہہ رہے ہو؟'' اس نے اُلجھے ہوئے انداز میں کہا۔
''میں نے کہا نا، میں تمہیں واپس پہنچا سکتا ہوں، اگر تم جانا چاہو تو۔'' میں نے کہا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اس کے ساتھ ہی دروازہ کھلا، ایک لڑکا ٹرے لے آیا۔

اس میں شراب کی چھوٹی بوتل اور پینے پلانے کے..... لوازمات رکھے ہوئے تھے۔ لڑکا وہ ٹرے رکھ کر واپس چلا گیا۔ وہ حیرت سے سب دیکھ رہی تھی۔ میں نے یوں اس کی طرف دیکھا کہ جیسے یہ سب معمول ہو۔

”پیو، مجھے احساس ہے اس وقت تمہیں طلب ہو گی۔“

”مجھے سگریٹ بھی منگوا دیں۔“ اس نے دھیمے سے فرمائش کی تو میں بولا۔

”منگوا دیتا ہوں۔ ابھی پیو۔ کھانا آتا ہے وہ کھاؤ سکون سے۔“ یہ کہہ کر میں اٹھا اور اپنا فون اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ فون ہے، اگر تمہارا کوئی ہے تو اُسے کال کرلو۔“

وہ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی، پھر فون پکڑ لیا۔ میں کمرے سے باہر چلا گیا۔ وہ میرا فون نہیں تھا، وہ یہیں سے لیا گیا خاص فون تھا۔ اس کی کال ہی سے سب پتا چل جانا تھا کہ وہ کیا کرتی ہے۔ دوسرے کمرے میں شہباز بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور آنکھ کے اشارے سے پوچھا، میں نے بھی اشارے سے اسے بتا دیا۔ ہم باہر آ گئے۔ اسی لڑکے سے سگریٹ کا پوچھا تو وہ اس کے پاس تھے۔ وہ اس نے لڑکی کو بھجوا دیے۔ واپسی پر اس نے بتایا کہ وہ پینے لگ گئی ہے۔ لڑکا کچن میں چلا گیا تو میں نے شہباز سے پوچھا۔

”حامد یا اُس کے ملاقاتی نے کچھ بتایا؟“

”نہیں، ابھی تک میں نے پوچھا نہیں، اس لڑکی کے چکر میں رہا۔ کرتے ہیں پتا۔“ اس نے اکتاہٹ سے کہا۔

”پتا تو کر یار۔“ میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے پوچھا۔

”وہ فون دے آیا لڑکی کو۔“

”ہاں دے آیا ہوں، ویسے یہ بتا اُس فون میں کوئی خاص بات ہے؟“

”ہاں ہے نا، اس میں......“ لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ میرا فون بج اٹھا۔ چاچا عبدالمجید کی کال تھی۔ میں نے شہباز کی بات پر توجہ نہیں دی اور کال ریسیو کرلی۔ میرے ہیلو کے جواب میں انہوں نے پوچھا۔

”ہاں بھئی کیا اَپ ڈیٹ ہیں؟“

میں نے انہیں اب تک کی ساری صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ فارم ہاؤس اور جو پوجا کے بارے میں سوچا...... وہ سب بتا کر پوچھا۔

”آپ کو کیسے پتا تھا کہ ہمیں فارم ہاؤس جانا چاہیے؟“

میرا سوال سن کر وہ لمحہ بھر رُکے پھر بڑے تحمل سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ابھی اسے چھوڑ دو، بیٹھ کر بات کریں گے۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا تو وہ بولے۔

”اس وقت حامد کا بھائی زاہد ملک پوری طرح اس کوشش میں ہے کہ یہ معاملہ میڈیا پر نہ آئے اور خاموشی سے حامد کو بازیاب کرالے۔ وہ اپنے سارے ذرائع استعمال کر رہا ہے۔“

”کہاں پر کوشش کر رہا ہے، کون سے ذرائع ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”دو دا پہلوان کے ذریعے پورے شہر میں تلاش کر رہا ہے، جہاں بھی شک پڑتا ہے، وہاں جا رہے ہیں، حبیب کھوکھر کے ذریعے سیاسی دباؤ بڑھا رہا ہے، تاکہ فورسز متحرک ہو جائیں۔ دھیان رکھنا زیرِ زمین بہت ہلچل ہے۔“

”میں خیال رکھوں گا۔“ میں نے فوراً کہا تو انہوں نے بتایا۔

”اس پر یہ دباؤ بھی ہے کہ دیرات کہاں گیا، کیا اُسے بھی اغوا کر لیا گیا ہے یا وہ کہیں چھپ گیا ہے؟“

”دیرات وہی ہے نا جو حامد سے ملنے آیا تھا؟“ میں نے تصدیق کے لیے پوچھا تو وہ گمبھیر لہجے میں بولے۔

”ہاں وہی ہے، پتا چل گیا ہے وہ کس کی طرف سے آیا تھا۔ میں تھوڑی دیر میں اس کی تفصیل دیتا ہوں، دونوں سے اچھی طرح پوچھ تاچھ کرنی ہے۔ اور ہاں وہ لڑکی...... اچھا کیا تم اس کے ساتھ پیار والا سلوک کر رہے ہو، صبح تک جو صورتِ حال ہوئی، اس کے بارے میں دیکھیں گے۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا تو انہوں نے کال ختم کر دی۔ میں نے فون جیب میں رکھتے ہوئے شہباز سے پوچھا۔

”یار وہ بکارا جھستانی اور جیون رام کہاں ہیں، اُن کا کوئی پتا ہی نہیں؟“

”او ہاں یار...... کرتا ہوں پتا، تم جاؤ اس لڑکی کو دیکھو، میں باقی سب دیکھتا ہوں۔“ اس نے کہا اور اپنے فون میں مصروف ہو گیا۔ وہ لڑکا کچن سے کھانا لے کر اوپر چلا گیا تھا۔ میں بھی واپس کمرے میں آ گیا۔

وہ لڑکی آدھی سے بھی زیادہ وہ بوتل خالی کر چکی تھی۔ شاید وہ اعصابی طور پر انتشار کا شکار تھی۔ سگریٹ کے

دھوئیں سے کمرا بھرا ہوا تھا۔ وہ موج میں آچکی تھی۔ اس نے فون ایک طرف رکھا ہوا تھا۔
''کرلی بات؟'' میں نے پوچھا۔
''ہاں جی کرلی۔'' اس نے اطمینان سے کہا اور فون میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا تو میں نے فون لے کر اپنے سرہانے کے نیچے رکھتے ہوئے پوچھا۔
''مجھے بتاؤ کہیں جانا ہے یا......''
''نہیں کہیں نہیں جانا، کھانا کھا کر مجھے سونا ہے، اگر آپ......'' اس نے مخمور نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔
''کیا آپ؟'' میں نے پوچھا تو وہ اسی خمار آلود لہجے میں بولی۔
''اگر آپ کو میرے ساتھ وقت گزارنا ہے تو میں حاضر ہوں، آپ نے میرے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا ہے۔ کم ازکم مارا تو نہیں مجھے۔''
''تم نہیں سمجھوگی، مجھے تم سے یا تمہارے جسم سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ بس تم بہت بڑے خطرے سے بچ گئی ہو۔ میں چاہتا ہوں اب تم کسی محفوظ مقام تک پہنچ جاؤ۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔'' میں نے کہا تو وہ گھورتے ہوئے چہرے سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
''میں نہیں جانتی، تم کون ہو۔ کیوں ایسا چاہتے ہو۔ بس...... جو کرنا ہے کردو۔ میں اپنی زندگی سے بہت تنگ ہوں، بہت تنگ......'' وہ خمار آلود لہجے میں بولی اور ایک دم سے رونے لگی۔ میں نے اسے رونے دیا، وہ کچھ دیر یونہی روتی رہی، پھر اپنی کلائی سے آنکھیں پونچھ کر ایک تگڑا سا پیگ بنایا اور پی گئی۔ میں خاموش رہا۔ کتنا ہی وقت بیت گیا۔ میں چپ چاپ لیٹا رہا، وہ پیتی رہی، یہاں تک کہ وہ کھانا کھا کر وہیں کرسی پر لیٹ کر سیدھی ہوگئی۔ وہ نشے میں تھی۔ میں نے اٹھ کر اس کا کندھا ہلاتے ہوئے کہا۔
''جاؤ بیڈ پر جا کر سوجاؤ۔''
اس نے بہ مشکل آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا، وہ اٹھنے لگی پھر بیٹھ گئی، میں نے اسے اٹھایا اور لے جا کر بیڈ پر لٹا دیا۔ وہ کروٹ لے کر لیٹی اور سوگئی۔ اس کے ہلکے ہلکے خراٹے آنے لگے تھے۔ میں نے چند لمحے اسے دیکھا اور باہر نکل گیا۔ میں نے سرہانے کے نیچے رکھا فون اٹھالیا تھا۔
فون سے کی گئی آخری کال اس نے ڈلیٹ کردی تھی۔ اس کا سیدھا مطلب تھا کہ وہ مجھ پر اعتبار نہیں کر رہی تھی۔ میں نیچے پہنچا تو شہباز کمرے میں نہیں تھا۔ ایک طرف کونے میں لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی سیدھا ہو کر کھڑا ہوگیا۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے شہباز کے بارے میں پوچھتا، اس نے خود ہی بتادیا۔
''وہ صاحب کہہ گئے ہیں کہ جب آپ آئیں تو انہیں فون کرلیں۔''
''ٹھیک ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے فون نکال کر اس کے نمبر پش کیے۔ چند بیل جانے کے بعد اس نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔
''میں باہر لان میں ہوں، یہیں آجاؤ۔''
میں باہر نکل گیا، وہ لان میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے کچھ کرسیاں پڑی ہوئی تھیں، میں نے ان میں سے ایک پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
''یہاں کیوں بیٹھے ہو؟''
''سوچ رہا ہوں۔'' اس نے سوچتے ہوئے کہا۔
''اوماما یہ بتا کیا سوچ رہا ہے؟'' میں نے اکتاہٹ سے کہا تو وہ ایک دم سے قہقہہ لگا کر شرارت سے بولا۔
''یہ جو اوپر لڑکی ہے نا، اس کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔''
''یار بتا کیا سوچ رہا ہے؟'' میں نے ہنستے کہا۔
''اس لڑکی نے فون کیا ہے نا لیکن وہ نمبر اس نے ڈلیٹ بھی کردیا ہوگا، اب میں تجھے بتاؤں، اس فون سے کوئی بات کر کے فون سے نمبر ڈلیٹ کردے، اسے توڑ دے ضائع کردے لیکن اس سے کی ہوئی بات کسی خاص جگہ پر ریکارڈ ہو جاتی ہے نمبرز سمیت۔ لو سنو اس نے کیا بات کی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے فون سے کال چلادی۔
''ہیلو، بادیہی شرما بات کر رہی ہوں۔'' لڑکی کی دھیمی سی آواز ابھری۔
''او ہاں، یہ نمبر؟'' ایک ٹھٹھری ہوئی مردانہ آواز میں پوچھا گیا۔
''کسی کے فون سے کر رہی ہوں۔ تمہیں شاید پتا نہیں ہمارے ساتھ کیا کچھ ہوگیا ہے۔'' لڑکی نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔
''کیا ہوا؟'' اسی ٹھٹھری ہوئی آواز میں پوچھا گیا۔
''ہم پر چھاپا پڑ گیا ہے، ایک بندہ مجھے وہاں سے نکال کر لایا ہے، وہ کہہ تو یہ رہا ہے کہ ہمارا آدمی ہے لیکن......'' لڑکی نے کہنا چاہا تو اس نے اس کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے کہا۔
''ذرا بھی یقین نہیں کرنا۔''
''ہاں ہاں، اس نے مجھے آفر کی ہے جہاں چاہو،

تمہیں وہاں چھوڑ دوں، کہو تو پار بھیج دیتا ہوں۔ اب بولو کیا کروں؟'' لڑکی نے پوچھا۔

''اسے کہو، مجھے لاہور میں کسی بھی جگہ چھوڑ دو، میں تمہیں لے لوں گا۔ میرا نمبر تو یاد ہے نا تمہیں۔'' مرد نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں وہ تو یاد ہے۔'' اس نے اعتماد سے کہا تو وہ بولا۔

''بس کہیں سے فون کر لینا۔ میں آج ہی پہنچ رہا ہوں لاہور۔''

''ٹھیک ہے۔ میں کل دن میں کرتی ہوں فون اگر اس نے اپنی کہی ہوئی بات پر مجھے چھوڑ دیا۔'' لڑکی نے کہا۔

''کوشش کرو کہ نکل آؤ۔'' مرد نے کہا۔

گڈ بائے۔'' لڑکی نے کہا۔

''گڈ بائے۔'' مرد بولا۔

کال ختم ہونے پر شہباز نے فون واپس جیب میں رکھا اور بولا۔

''یہ نمبر یہیں پاکستان سے قصور سے آگے کسی علاقے میں ہے۔''

''مطلب اس نے اپنے دیس فون نہیں کیا؟'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

''ظاہر ہے۔ یہیں اپنے نیٹ ورک میں فون کیا۔'' اس نے کہا۔

''چلو یہ اچھا ہے۔ اب کیا کرنا ہے اس کا؟'' میں نے پوچھا۔

''صبح جہاں کہے گی چھوڑ دیں گے۔ جس طرح بکا راجھستانی اور جیون رام کو چھوڑا ہے۔'' اس نے کہا تو میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''اوہ...... اسی لیے اسے شراب پلائی تھی؟''

''ہاں نا، وہ میرے مامے کی شادی پر نہیں آئی جو اس کی دعوت کروں، ابھی کچھ دیر میں ڈاکٹر آجاتا ہے۔'' شہباز نے کہا اور اپنے فون پر کسی کے نمبر پش کرتے ہوئے کان سے لگالیا۔ پھر کسی سے ڈاکٹر کے بارے میں پوچھا۔ وہ کال ختم کر کے اس نے بکا راجھستانی اور جیون رام کے بارے میں پوچھا۔ وہ کچھ دیر تک سنتا رہا۔ اس کے چہرے پر حیرت پھیل گئی۔ پھر کال بند کرتے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولا۔

''جس لوکیشن پر اس لڑکی نے فون کیا ہے نا۔ اسی لوکیشن پر یہ دونوں بھی موجود ہیں۔''

''او خیر......'' بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

''یہ پوجا کا بھی پتا کرتا ہوں، یہ کہاں ہے۔'' اس نے کہا اور پھر کال ملا کر باتیں کرنے لگا۔ چند منٹ بعد کال بند کی اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نہیں وہ وہاں نہیں ہے۔ اس کی لوکیشن لاہور ہی کی آرہی ہے۔''

''اچھا تم ڈاکٹر کا انتظار کرو، میں ذرا حامد کی طرف......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ تیزی سے بولا۔

''چھوڑو، اب ان سے پوچھ تاچھ کی ضرورت نہیں رہی۔ اب بات اوپر کے لوگوں میں ہو رہی ہے۔ یہی چاہیے تھا۔''

''اوکے، میں ذرا کمر سیدھی کرلوں۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا اور اپنے لیے مخصوص کمرے میں جا پہنچا۔ اگر شہباز کو ضرورت ہوتی تو وہ مجھے بلا لیتا۔

☆☆☆

میری جب آنکھ کھلی تو کھڑکی پر نگاہ پڑی۔ باہر روشن دن چمک رہا تھا۔ مجھے شہباز پر بہت پیار آیا۔ اس نے مجھے آرام کرنے دیا تھا۔ کچھ دیر بعد میں فریش ہو کر باہر نکلا تو بنگلا دن کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ مجھے لگا میں کہیں اجنبی بنگلے میں آگیا ہوں۔ میں نے اوپر سے دیکھا تو مجھے وہی لان دکھائی دیا جہاں پر ہم رات بیٹھے ہوئے تھے، کرسیاں وہیں پڑی ہوئی تھیں۔ میں چلتا ہوا اس پروین یا بادیہی کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی اس نے کروٹ بدل کر مجھے دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

''کیسی گزری رات؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت اچھی، میری توقع سے بالکل ہٹ کر۔'' اس نے دھیمے سے کہا۔

''توقع کیا تھی۔'' میں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''وہی جو ایک لڑکی کسی اجنبی ماحول میں کر سکتی ہے جبکہ اسے پکڑ کر بھی لایا گیا ہو۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اچھا اب کیا سوچا تم نے؟ یہیں لاہور میں جانا ہے یا پار بھجوانے کا بندوبست کروں؟'' میں نے جان بوجھ کر ہولے سے پوچھا۔

''آپ یہ مجھے کیوں کہہ رہے ہیں کہ مجھے پار جانا ہے؟'' اس نے ایک دم سے پوچھا تو میں نے کافی حد تک سختی سے کہا۔

''کیونکہ فارم ہاؤس پر حملے سے پہلے مجھے بتایا گیا تھا کہ تم وہاں ہو۔ اسی لیے کہہ دیا، اب اپنا فیصلہ سناؤ مجھے، یہاں سے جانا بھی ہے؟''

میرے یوں کہنے پر اس نے ایک دم سے چونک کر میری طرف دیکھا اور لمحہ بھر خاموش رہنے کے بعد بولی۔

''مجھے یہیں لاہور ہی میں چھوڑ دیا جائے۔''

''او کے، تیار ہو جاؤ، پانچ منٹ بعد یہاں سے نکلنا ہوگا۔'' میں نے ایک دم سے کہا تو وہ بیڈ سے اٹھ گئی۔ میں نے کمرے سے باہر آکر شہباز کو فون کیا۔ وہ اسی بنگلے کے ایک کمرے میں تھا۔ میں جب نیچے پہنچا تو وہ راہداری میں کھڑا میرا منتظر تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

''شہر میں تو بہت ہلچل مچی ہوئی ہے۔''

''کس نے مچائی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''دودا پہلوان نے رات کئی جگہوں پر جا کر لوگوں کی ٹھکائی کی، دو ناکوں پر پولیس سے جھڑپ ہوئی ہے، تین چار بیوروکریٹس کو دھمکیاں دے دی گئی ہیں، حبیب کھوکھر سیاسی لوگوں کے ساتھ اعلیٰ افسران کے ہاں بیٹھا ہوا ہے۔ ملک زاہد پاگلوں کی طرح اپنے بھائی کو تلاش کر رہا ہے، کئی جگہ فائرنگ کر چکا ہے۔''

''تم پوجا کا سناؤ، کہاں ہے وہ؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ کل سے ایک ہی جگہ پر ہے، یہیں گلبرگ میں۔ اب پتا نہیں وہ وہیں ہے یا فون رکھ کر ادھر اُدھر ہے۔'' اس نے بتایا۔

''اچھا چل، اس لڑکی کو یہاں سے بھیج پھر ہم بھی نکلیں۔''

''او ماما تو نے کہاں نکلنا ہے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''یار ہم بھی اپنا حصہ ڈالیں، دودا پہلوان کو دیکھیں، یا حبیب کھوکھر کو۔'' میں نے کہا تو وہ ایک دم سے بولا۔

''ابھی تھوڑا صبر کر، چاچا کو آنا ہے، پھر جو مرضی کرنا۔''

''او کے، چل اس لڑکی کو بھیج۔'' میں نے کہا تو وہ فون پر کسی سے کہنے لگا۔

ہم وہیں کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ وہ لڑکی ایک نوجوان کے ساتھ وہیں آگئی۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور اس نوجوان کے ساتھ نکلتی چلی گئی۔ ہمیں چاچا کا انتظار تھا، اس کے آنے تک میں نے چاہا کہ ایک بار ملک حامد کو دیکھ لوں میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کی اکڑ ختم ہوئی ہے یا نہیں۔ میں اس بارے میں شہباز سے کہنا ہی چاہتا تھا کہ میرا سیل فون بج اٹھا۔ وہ چاچا کی کال تھی، میں نے کال ریسیو کر کے ہیلو کہا تو وہ بولے۔

''او یار مجھے آنا تھا لیکن اب وہاں نہیں آسکوں گا، تم شہباز کو لے کر آفس آجاؤ۔''

''جی ٹھیک ہے میں ابھی نکلتا ہوں۔''

''ہاں آرام سے آجاؤ۔'' انہوں نے کہا تو میں نے شہباز کو بتایا، وہ میرے ساتھ ہی چل دیا۔ جیسے ہی اس نے گاڑی مین روڈ پر ڈالی تو میں نے کہا۔

''یار شہباز، یہ جو چوہے بلی کا کھیل ہوتا ہے نا، مجھے یہ اچھا نہیں لگتا، سیدھے سیدھے بندہ آر یا پار کرے۔''

''میں کہتا ہوں اسی میں مزہ ہے، سیانے اسی کو حکمت عملی کہتے ہیں، چاچا اگر آج تک موجود ہے اور شہر پر حکمرانی کر رہا ہے تو یہی وجہ ہے۔ سیاست داں ہو یا کوئی لیڈر وہی کامیاب ہوتا ہے جو لوگوں کی خوبیوں اور خامیوں کو استعمال کرنا جانتا ہو۔ اب یہ خوبیاں اور خامیاں استعمال کیسے کرنی ہیں، ظاہر ہے اس کے لیے ایک ماحول چاہیے ہوتا ہے۔'' اس نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''بات پھر گھوم کر وہیں آجاتی ہے، فائدہ اور طاقت۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ بولا۔

''ہے تو یہی بات...... خیر چھوڑ، بھابی سے کہو اچھا سا ناشتا تو بنا دے۔''

''اچھا۔'' میں نے کہا اور اپنا سیل فون اٹھا لیا۔

گھر سے ناشتا کر کے، کپڑے بدل کر جب ہم آفس پہنچے تو دوپہر ہو چکی تھی۔ چاچا نہیں آئے تھے۔ میں اپنے کمرے میں آبیٹھا۔ اپنی کرسی پر بیٹھ کر یونہی سوچنے لگا۔ شہباز سے جو اب تک معلومات ملی تھیں، اس کے مطابق پروین یا بادیہی اس وقت قصور کے پاس پہنچ چکی تھی۔ لڑکوں نے اس گاؤں کی نشاندہی کر لی تھی جہاں پر اس نے رات بات کی تھی۔ اس وقت بکا اور جیون رام وہیں پر موجود تھے۔ پوجا کی لوکیشن اب بھی وہی گلبرگ والی تھی۔ اب یہ اتفاق تھا، کوئی سوچا سمجھا پلان یا کسی نئی کہانی کی شروعات تھی، میں اس وقت کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ مجھے یہ سب ہضم نہیں ہو رہا تھا اور میں سوچ سوچ کر خود کو پاگل بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے ان لوگوں نے ڈی ٹریک کر دیا تھا۔ جس سے کچھ بھی ہاتھ نہیں آرہا تھا۔ میں انہی خیالوں میں اُلجھا ہوا تھا کہ چاچا عبدالمجید آگئے۔ وہ آکر صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

''ہاں بھئی جوان، کس خیال میں گم ہے؟''

ان کے یوں کہنے پر میں نے پوری سچائی سے ہر بات بتا دی۔ انہوں نے کمالِ تحمل سے میری ایک ایک بات سنی اور پھر اسی تحمل سے بولے۔

''دیکھو علی، میدانِ جنگ میں لڑنے والا اور میدانِ جنگ میں لڑوانے والا دونوں ہی اہم ہیں۔ میں مانتا ہوں تم میں بہت حوصلہ ہے، لڑنے کی قوت ہے، لیکن ہمارا دشمن بڑا چال باز ہے۔''

''میں مانتا ہوں چاچا لیکن......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ بولے۔

''ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہمیں دشمن بہت کمینہ اور گھٹیا ملا ہے۔ جس کی دشمنی کا کوئی اصول نہیں ہے۔ اس کی چال میں وہی کمینگی، گھٹیا پن اور سازش ہے۔ وہ سامنے آکر وار کرنے کی ہمت نہیں رکھتا اور سب سے اہم بات، وہ ٹریپ میں لا کر چال چلتا ہے۔''

''میں سمجھ گیا، سانپ تو ہوتا ہی ڈسنے کے لیے ہے، اس کی آنکھیں نیلی ہوں یا کالی، رنگین سانپ ہو یا جیسا بھی۔ لیکن اس کا پھن طاقت ہی سے کچلا جاتا ہے۔'' میں نے شدتِ جذبات سے کہا تو چاچا مسکرا دیے پھر چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد بولے۔

''اب دیکھو تمہاری پوجا نے کس قدر کھیل کھیلا ہے۔''

''کیسا کھیل؟'' میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''اب میں سمجھاتا ہوں تمہیں۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکے اور پھر کہتے چلے گئے۔ ''وہ روہی میں تمہارا کچھ نہ بگاڑ پائی تو یہاں آگئی۔ یہ سچ ہے کہ وہ اس وقت اپنے کسی گیم میں ہے۔ وہ یہاں کے نیٹ ورک میں اپنا ایک الگ گروپ بنا رہی ہے اور جو پسند نہیں ہیں، انہیں ختم کروا رہی ہے۔ یہ اتفاق ہے یا قدرت کی مدد کہ تم نے بکا کو، جیون رام کو قتل نہیں کیا، وہ آج ہمارے کام آرہے ہیں۔ بھلے اس بات کا انہیں بھی نہیں پتا، وہ قصور کے علاقے میں جمع ہو رہے ہیں، وہاں اب تک پانچ سے چھ افراد موجود ہیں، جس کا پوجا کو نہیں پتا۔''

''کیا راکیش ورما کو اس کا علم نہیں ہے کہ پوجا......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ بولے۔

''یہی تو بات ہے۔ اسے دو ہفتے پہلے راکیش ورما ہی سے ٹاسک ملا ہے کہ وہ یہاں کے لوگوں کو اُلجھا کر ایک نئی ہلچل پیدا کرے، جس کی آڑ میں وہ یہاں پر کچھ قتل کرنا چاہتے ہیں اور ممکن ہے بم دھماکے بھی ہوں۔ پوجا اس آڑ میں اپنا گیم کھیل رہی ہے۔ بہ ظاہر وہ راکیش ورما کا ہی کام کر رہی ہے۔''

''آپ اتنے وثوق سے یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ پوجا اپنا گیم کر رہی ہے؟'' میں نے پوچھا تو وہ تحمل سے سمجھاتے ہوئے بولے۔

''وہ اسی شہر میں ایک ایسا گروپ بنانے میں کامیاب ہوگئی ہے جو صرف اسی کے لیے کام کرنے پر بالکل تیار ہے۔ اب اس میں تیرے جیسا ایک بیٹا بھی موجود ہے۔ جو سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ اسے پوجا کے بارے میں بالکل علم نہیں تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے ہے۔ جب اس نے مجھ سے ڈسکس کیا تو بات سامنے آگئی۔ اب پوجا یہ چاہتی ہے کہ ملک حامد وغیرہ منظر سے غائب ہو جائیں اور ان کی جگہ اس کا گروپ سب کچھ کرے۔ اب تک ملنے والی معلومات پر یہ سارا منظر واضح ہو گیا ہے۔''

''اب ہمیں کرنا کیا ہے، وہ بتائیں۔'' میں نے دبے دبے غصے میں کہا۔

''ہاں یہ بات......'' انہوں نے کہا اور پھر غور سے دیکھنے کے بعد بولے۔ ''یہاں پر نیٹ ورک بنتے رہیں گے، ختم ہوتے رہیں گے، کوئی فیصلہ ہو جانے تک یہ سلسلہ رکنے والا نہیں۔ ابھی پوجا جن لوگوں کو ختم کر رہی ہے، کرنے دو بلکہ تم اس کا ساتھ دے کر وہ نیٹ ورک جلدی ختم کر دو۔ یہ ایک دو دن بہت اہم ہیں۔''

''ڈن ہو گیا۔'' میں نے ایک دم سے کہا تو چاچا کی آنکھیں چمک گئیں۔ کیونکہ میں سمجھ گیا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ اس کا یقین چاچا عبدالمجید کو بھی تھا۔ انہوں نے مزید کوئی بات نہیں کی اور اٹھ کر چل دیے۔

اصل میں ہوتا کچھ یوں ہے کہ ہمارے ہاں ہی کے لالچی، بدطینت اور خبیث لوگ، جنہیں اپنے فائدے اور طاقت کے سوا کچھ نہیں چاہیے ہوتا۔ وہ سوچے سمجھے بنا، صرف اپنے فائدے کے لیے دشمن کے آلۂ کار بن جاتے ہیں۔ انہیں یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ ٹشو پیپر کے مانند استعمال کیے جا رہے ہیں۔ اب جیسے ملک زاہد اور ملک حامد کو تو پتا تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں، انہیں فقط فائدے اور طاقت سے غرض تھی۔ اسی زور پر وہ اپنا کالا دھندا چلائے جا رہے تھے۔ دودا پہلوان اور حبیب کھوکھر جیسے لوگ انہیں بچانا چاہ رہے تھے، اصل میں ایسے لوگ ہی وطن دشمن ہیں۔

''کون سا مسئلہ حل نہیں ہو رہا تمہارا جو ٹیوٹن بنے ہوئے ہو؟'' شہباز نے کمرے میں آکر صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا تو میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"مجھے یہ بتا، پہلے دودے پہلوان کا کچھ کریں یا حبیب کھوکھر کا؟"

"جو بھی ہتھے چڑھ جائے۔" اس نے بے ساختہ کہا تو میں نے اٹھتے ہوئے حتمی لہجے میں کہا۔

"چل پھر، نکلتے ہیں۔"

ہم دونوں آفس سے نکل پڑے۔ شہباز نے اپنے نیٹ ورک میں کسی سے بات کرتے ہوئے کہا۔

"اس وقت دیکھو، یہ دودا پہلوان کہاں پر ہے یا پھر حبیب کھوکھر کا پتا کرنا ہے لیکن فوراً کرو یہ۔"

ہم دونوں فوروہیل لے کر نکل آئے۔ ہماری کوئی منزل نہیں تھی۔ ضرورت کے مطابق اسلحہ گاڑی میں موجود تھا۔ گاڑی میں چلا رہا تھا لیکن اپنے طور پر خاموش تھا اور وہ اپنے سیل فون میں مگن تھا۔ شہباز نے کوئی بات نہیں کی حالانکہ وہ ایسے وقت میں خوب چہکا کرتا تھا۔ اس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ جس مشن پر ہم نکلے ہیں وہ کوئی معمولی نہیں ہے۔

میں نہر کے ساتھ روڈ پر آ گیا تھا اور میرا رخ پنجاب یونیورسٹی کی طرف تھا جو کم از کم دو کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ ابھی ہمارا مقصد صرف آوارہ گردی تھا، جب تک ان لوگوں کے بارے میں ہمیں معلوم نہ ہو جاتا۔ یونیورسٹی پل قریب آ گیا تھا۔ شیخ زید اسپتال روڈ سے پیٹرول لینے کے لیے گاڑی ادھر موڑ لی۔ اس وقت فلنگ اسٹیشن پر پیٹرول بھرا جا رہا تھا، جب اچانک شہباز کی آواز ابھری۔

"اوئے، دودا پہلوان اس وقت ملتان روڈ پر ہے، اپنے پورے پروٹوکول کے ساتھ، وہ سبزہ زار میں کہیں جا رہا ہے۔"

"چل پھر، وہیں فیلڈنگ لگا دیتے ہیں۔" میں نے ایک دم سے کہا اور پیٹرول بھرا کر گاڑی بھگا دی۔

جس وقت ہم مین سروس روڈ پر پہنچے اس وقت تک ہمارے کچھ لوگ وہاں پہنچ چکے تھے۔ دودا پہلوان اس وقت ایک گھر میں موجود تھا، جہاں کچھ لوگ جمع تھے۔ ہمیں لمحہ بہ لمحہ رپورٹ مل رہی تھی۔ جیسے ہی ہم انشورنس کمپنی کے آفس کے ساتھ ہی بائیں جانب مڑے، ہمیں پتا چلا کہ وہ باہر نکلنے کی تیاری کر رہے ہیں۔

ہمارا فاصلہ یہی کوئی ایک کلومیٹر کا تھا۔ وہاں صورت حال یہ تھی کہ گلی تنگ تھی، جس کی وجہ سے گاڑی گلی میں نہیں جا سکتی تھی۔ ان لوگوں کی گاڑیاں بھی باہر ہی گلی میں کھڑی تھیں۔ جیسے ہی ہم گلی کے نکڑ پر پہنچے تو گلی کے باہر ہی گاڑی روک دی۔ اس چھوٹی گلی میں ایک گھر کے سامنے پانچ سات لوگ کھڑے تھے۔ میں اور شہباز گلی میں ایک طرف سے آئے اور دوسری طرف سے ہمارے تین بندے آگے آ گئے۔ میں نے دودا پہلوان دیکھا ہوا نہیں تھا لیکن اس کی تصویر دیکھی ہوئی تھی۔ ہم ابھی اس گھر کے گیٹ تک نہیں پہنچے تھے کہ پہلے لمبے بالوں والا ایک نوجوان گن مین باہر آیا، اس کے پیچھے یم تحیم دودا پہلوان باہر آ گیا۔ اس کے پیچھے مزید گن مین نکلا۔ ہمارا اور ان کا فاصلہ یہی کوئی دس قدم کا رہا ہو گا۔ ان دونوں گن بردار نوجوانوں کے گن پکڑنے کے انداز پر مجھے دودا پہلوان پر ترس آنے لگا۔ انہوں نے صرف دکھاوے اور دہشت کے لیے کھلا اسٹائل میں پکڑی ہوئی تھیں۔ جب تک وہ گن سیدھی کرتے میں اپنا کام کر سکتا تھا۔ چونکہ دودا پہلوان ایک دہشت کا نام تھا اس لیے کوئی اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ یہی مان اسے بے پروا کر رہا تھا۔

دودا پہلوان آگے تھا اور دونوں گن بردار اس کے دائیں بائیں تھے۔ ان کے پیچھے یہی کوئی دس بندے تو ہوں گے۔ ہمارا اور ان کا فاصلہ یہی کوئی پانچ قدم کا رہ گیا ہو گا، اسی لمحے میں نے اپنے نیفے کے دونوں طرف ہاتھ ڈالا اور پسٹل نکال کر گن برداروں کا نشانہ لیا، بالکل میرے ساتھ شہباز نے بھی انہی کو نشانہ بنایا تھا۔ وہ دونوں سانس بھی نہ لے سکے اور گر کر تڑپنے لگے۔ ہماری فائرنگ کے ساتھ لوگ لاشعوری طور پر پیچھے کی جانب مڑے تو پیچھے سے ہوائی فائر ہو گیا، سبھی سہم کر کھڑے ہو گئے۔ دودا پہلوان ہونقوں کے مانند مجھے دیکھنے لگا۔ تبھی میں نے دہاڑتے ہوئے کہا۔

"کوئی نہ ہلے...... ہمیں صرف دودے سے مطلب ہے۔"

"او گگ...... کون...... ہو تم......؟" اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

"رات سے تم نے کتنے لوگوں کو تنگ کیا ہے، صرف ملک زاہد کے لیے، ملک کی اور تیری آج سے بدمعاشی بند، اب کوئی سامنے آیا تو اس کا بھی یہی حال ہو گا، لے فیر......" یہ کہتے ہوئے میں نے فائر کر دیا، وہ دودے پہلوان کے سینے میں لگا، شہباز نے بھی تین چار فائر کر دیے۔ وہ وہیں گلی میں گر کر تڑپنے لگا، میں شہباز کے کور پر ہو گیا، پیچھے کی طرف آئے لوگوں کو میں نے جانے کا اشارہ کیا اور واپس پلٹ گیا۔ میں کچھ کہے بنا بھی دودے کو مار سکتا تھا لیکن مجھے کہیں

نہ کہیں پیغام تو پہنچانا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگلے پانچ منٹ تک وہ پیغام پہنچ جانا تھا۔

میں گلی سے نکل کر گاڑی میں آبیٹھا۔ جب تک میں نے گاڑی اسٹارٹ کی، شہباز بھی میرے ساتھ آن بیٹھا۔ یہی میرے امتحان کا وقت تھا۔ مجھے ان گلیوں سے گاڑی کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر نکال کرلے جانا تھی۔ میں پوری توجہ سے گاڑی سروس روڈ پر لے آیا تھا۔ وہاں آکر میں کافی حد تک پُرسکون ہو گیا، پھر ملتان روڈ تک ہمارے درمیان خاموشی رہی۔

''مجھے یقین نہیں تھا کہ دودا پہلوان اتنا بے پروا ہوگا، میں تو بہت سوچ رہا تھا، پوری پلاننگ کر رہا تھا۔'' شہباز نے خاموشی توڑی تو میں نے کہا۔

''یہی پلاننگ اگلے بندے کو باخبر کر دیتی ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ ان آٹھ دس بندوں میں سے کسی کے پاس اسلحہ بھی ہوگا، لیکن عین موت کے منہ کے سامنے بڑے بڑے غنڈوں کا پتّا، پانی ہو جاتا ہے۔ یاد رکھو، دوسروں پر ظلم کرنے والا غنڈا اور بدمعاش ہمیشہ اندر سے بزدل ہوتا ہے۔'' میں نے اپنے اندر کے حبس کو نکال باہر کیا۔

''تم سچ کہتے ہو، پتا ہے وہ اس گلی میں کیا کرنے گیا تھا، ایک انتہائی شریف بیوروکریٹ کو دھمکانے گیا تھا، ایک پلاٹ کے سلسلے میں کل عدالت میں پیشی تھی۔'' اس نے افسوس سے کہا۔

''تیرا سورس کون تھا؟''

''دودے پہلوان کے پیچھے کھڑے لوگوں میں سے ایک تھا۔ تقریباً ایک برس سے وہ اس کے ساتھ ہے۔'' شہباز نے کہا تو میں سر ہلا کر رہ گیا۔ پھر چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد کہا۔

''اب حبیب کھوکھر کا سوچ، وہ کہاں ہے؟''

''ابھی نہیں، ابھی دودے کی ہوا پھیل جانے دے۔'' شہباز نے کہا تو میں نے پوری توجہ ڈرائیونگ پر لگا دی۔ مجھے یہ گاڑی ایک سیف ہاؤس میں چھوڑنا تھی۔ بلاشبہ اس گاڑی کی تصویریں کئی کیمروں میں آچکی تھیں۔

☆☆☆

شام ڈھل کر اندھیرا پھیل گیا تھا۔ میں شہباز کے گھر تھا جسے وہ اپنا 'ٹھکانا' کہا کرتا تھا۔ میرے ذہن میں تھا کہ وہاں سامان بکھرا پڑا ہوگا، اکیلا بندہ کہاں تک گھر سنبھال سکتا ہے۔ لیکن جیسے ہی میں نے لاؤنج میں قدم رکھا، مجھے صاف ستھرا اور سلیقے والا گھر دکھائی دیا۔ اسی ایک لمحے میں مجھے یہی خیال آیا کہ ہو نہ ہو، اس گھر میں عورت ضرور ہوگی۔ میں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''او ماما، یہ بتا، شادی کب کی تم نے؟''

''میں نے شادی نہیں کی۔'' اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بتایا۔

''یہ گھر میں صفائی ستھرائی اور یہ......'' لفظ میرے منہ ہی میں تھے کہ ایک درمیانے سے قد کی خوب صورت، بوائے کٹ بال، گلابی رنگت، تیکھے نین نقش اور پتلی سی، نازک سی لڑکی، جس نے گلابی اور سیاہ رنگ کے شارٹس پہنے ہوئے تھے، وہ ٹرے تھامے مسکراتی ہوئی آگئی۔ اس نے ٹرے میز پر رکھتے ہوئے سلام کیا اور شہباز کے ساتھ جا کر بیٹھ گئی۔ وہ چند لمحے بیٹھی مسکراتی رہی پھر میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

''آپ نے کیسے پہچانا کہ اس گھر میں کوئی عورت ہے؟''

''ظاہر ہے جہاں عورت ہوتی ہے، وہاں کچھ نہ کچھ سلیقہ تو دکھائی دے ہی جاتا ہے۔'' میں نے دھیمے سے لہجے میں کہا تو وہ شہباز کی طرف انگلی کر کے بولی۔

''اور اس نے کہا ہے کہ اس نے شادی نہیں کی؟''

''بالکل یہی کہا ہے۔'' میں نے ناراضگی سے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''اس نے بالکل درست کہا ہے، اس نے نہیں، میں نے اس سے شادی کی ہے، یہ تو مانتا ہی نہیں تھا۔ مجھے زبردستی کرنا پڑی تھی اس کے ساتھ۔''

''شہباز، یہ کیا ہے بھئی؟'' میں نے تلخی سے پوچھا۔

''او یار جس طرح کے ہمارے حالات ہیں، جو کچھ ہم کرتے ہیں وہاں یہ شادیاں کہاں افورڈ ہوتی ہیں، یہی شادیاں ہمیں کمزور کرتی ہیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو بھی پتا چلے۔'' اس نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

''پھر مجھے کیوں بتایا، یہ راز رہنے دینا تھا۔'' میں نے پوچھا۔

''او ماما، تم دل کے جانی ہو۔'' اس نے پیار سے کہا تو میرا دل بھر آیا، میں خاموش رہا پھر جیب میں ہاتھ ڈال کے جتنے بھی نوٹ تھے، اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ منہ دکھائی ہے تمہاری۔''

''نام پتا ہے اس کا، ایویں منہ دکھائی دے رہے ہو۔'' شہباز نے مذاق میں کہا تو وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

''شانزے شہباز۔''

وہ میرے قریب آئی، اس نے وہ نوٹ پکڑے اور واپس جا کر بیٹھ گئی تو شہباز ہنستا ہوا بولا۔

''اوئے شانزے، تم جانتی ہو اس بندے کے بارے میں، ایسے ہی منہ دکھائی لے رہی ہو۔''

''میں نے انہیں دیکھا نہیں لیکن جس طرح آپ سے سنا، جس طرح بھابی ساوری کے بارے میں سنا، یہ ہمیشہ مجھے اپنے بڑے بھائی لگے ہیں، میرا حق بنتا ہے، میں تو مانگ کر بھی لے سکتی ہوں۔'' اس نے کہا تو مجھے اس کا انداز اچھا لگا۔تبھی شہباز نے کہا۔

''میں نے آتے ہوئے تمہیں میسج کیا تھا، وہ......''

''آپ یہاں بیٹھ گئے تو میں پانی اِدھر لے آئی، اب بتائیں وہاں ٹیبل پر کھائیں گے یا پھر یہیں لے آؤں۔''

''وہیں کھاتے ہیں۔'' اس نے کہا تو میں اٹھ گیا۔ گھر میں ایک گرانڈیل سی خاتون بھی کچن میں مصروف تھی۔ وہ ابھی تک پوری طرح سامنے نہیں آئی تھی۔ بس ایک جھلک دیکھی تھی۔ میں آگے بڑھنے لگا تو شہباز نے کہا۔

''اچھا وہ کھانا لگاتی ہے، میں اتنی دیر میں تجھے ایک شے دکھاؤں۔''

''دکھاؤ۔'' میں نے کہا تو وہ مجھے لیتا ہوا اوپر ایک کمرے میں چلا گیا۔ ایک دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو وہاں مجھے یوں لگا جیسے کمپیوٹر کی کوئی لیب ہے۔ ہر طرح کے پانچ سات کمپیوٹر تھے۔ ایک لڑکی وہاں بیٹھی کام کر رہی تھی۔ اس نے ہمیں دیکھ کر سلام کیا اور پھر سے اپنے کام میں کھو گئی۔ شہباز سنجیدہ سے لہجے میں بولا۔

''یہ جو میں تمہیں ساری معلومات دیتا ہوں نا، وہ یہیں سے ہوتی ہیں۔''

''مطلب، یہاں سے......'' میں نے خوشگوار حیرت میں بے ساختہ کہا۔

''ہاں نا، شانزے نے امریکا سے آئی ٹی میں اعلیٰ ڈگری لی ہے، یہ مجھے وہیں ملی تھی اور بس پیار ہو گیا۔ میں یہاں آگیا اور مجھے یہاں آنا ہی تھا۔ یہ میرے پیچھے یہیں آگئی۔ اس کے والدین پاکستانی ہیں اور خوش ہیں کہ ان کی بیٹی نے وطن میں شادی کی ہے۔ بس یہ آگئی تو مجھے اس کے ساتھ شادی کرنا پڑی، اور اب بھگت رہا ہوں۔'' اس نے بتاتے ہوئے قہقہہ لگا دیا۔

''یار یہ شانزے وہاں رہ کر کسی بڑے ادارے میں کام کر سکتی تھی اور......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ...... لہک کر بولا۔

''یہ عشق ہے نا نکما کر دیتا ہے، غالب چا چا سچ کہتا ہے۔''

''اور اس نے یہاں پر سب بنا لیا۔'' میں نے پوچھا۔

''یہ یہاں بیٹھ کر بھی بہت پیسہ بنا لیتی ہے، لیکن سب کچھ پیسہ نہیں ہوتا نا میری جان، کیا تم پیسہ نہیں بنا سکتے ہو؟'' اس نے بتاتے ہوئے سوال کر دیا، جس کا جواب اسے پہلے ہی سے معلوم تھا۔

ہم کھانے کی میز تک پہنچے تو مجھے خوشگوار حیرت ہوئی کہ شانزے نے روایتی پنجابی لباس پہنا ہوا تھا۔ پتا نہیں کس کی کہی ہوئی بات مجھے یاد آگئی کہ عورت جو ہوتی ہے نا مرد کی آنکھ میں اس کی نیت بھانپ لیتی ہے۔ شانزے نے ایسا ہی محسوس کیا ہوگا۔ کھانا کھا کر ہم وہیں لاؤنج میں بیٹھے رہے، شانزے چائے لے آئی تو میں اس سے مختلف حوالوں سے بات کرتا رہا، تبھی اس نے ایک سیل فون میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''بھائی، یہ سیل فون اپنے پاس رکھیں، اپنی سم اس میں ڈال لیں۔ یہ آپ کے بہت کام آئے گا۔''

''مثلاً، کیسے کام......'' میں نے پوچھا تو وہ ایک دم سے اٹھتے ہوئے بولی۔

''یہ آپ شہباز سے پوچھتے رہیں۔ مجھے اجازت دیں، مجھے تھوڑا کام کرنا ہے، میری اسسٹنٹ مجھے بلا رہی ہے۔''

شہباز مجھے سمجھانے لگا کہ اس فون کا کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ میں دھیان سے سنتا رہا۔ اسی دوران پوجا کا فون آگیا۔ میری ہیلو سنتے ہی بولی۔

''میں نے تجھے بادیہی کے بارے میں بتایا تھا، کہاں ہے وہ، کچھ بتایا اس نے۔ مجھے......''

''کون بادیہی؟'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''وہ جسے کل فارم ہاؤس سے لائے تھے۔'' اس نے فوراً کہا۔

''تم سے یہ کس نے کہا کہ میں وہاں سے کوئی لڑکی لایا تھا۔'' میں نے کہا تو وہ یک دم گڑبڑاتے ہوئے بولی۔

''راج ویر، وہی لڑکی جس کا میں نے تمہیں بتایا تھا۔''

''وہ وہاں پر تھی ہی نہیں۔ کوئی لڑکی ایسی نہیں تھی جس کے ہونٹ پر دائیں جانب تل ہو۔'' میں نے قدرے

کرخت لہجے میں کہا تو وہ شدت حیرت سے بے ساختہ بولی۔

”تو پھر وہ کہاں گئی؟“

”یہ میں کیا کہہ سکتا ہوں، پوجا تم میرے ساتھ مذاق بھی کروگی، یہ مجھے بالکل بھی پتا نہیں تھا۔ تم نے ایسا بے تکا مذاق کیوں کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”یقین جانو راج ویر، وہ وہیں تھی، میں اُسے وہیں چھوڑ کر آئی تھی۔“

”تم نے مجھے بتایا ہی نہیں کہ تم بھی اسی فارم ہاؤس میں تھیں، تم کہاں تھیں؟ تم کیوں نہیں ملیں وہاں پر؟ کیا وہاں چھاپا پڑنے کا تمہیں پہلے ہی سے معلوم تھا؟“ میں نے ایک دم سے کئی سوال کرڈالے تو وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

”ہاں، میں وہیں تھی اور مجھے وہیں سے پتا چلا تھا کہ ملاقات ہونے جارہی ہے اسی لیے پورے یقین سے بتایا تھا۔“

”تم نے مجھے نہیں بتایا؟“ میں نے پوچھا۔

”تم نے پوچھا کب تھا۔ میرے وہاں ہونے یا نہ ہونے سے تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔“ اس نے شکوہ بھرے لہجے میں کہا، اس سے پہلے کہ میں کوئی بات کرتا، اس نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔ ”راج ویر اس بادیہی کا ملنا بہت ضروری ہے۔ اسے پتا ہے کہ میں نے تمہیں اس ملاقات کے بارے میں بتایا ہے۔ اسے تلاش کرنا ہوگا۔“

”دیکھو پوجا، وہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔ ہاں ملک حامد یا اس جیون رام نامی بندے کے بارے میں بات کرنا چاہو تو کرو، میں اس کی پوری ذمے داری لیتا ہوں۔ اب کہو جو کہنا ہے۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔

”راج ویر تم سمجھ کیوں نہیں رہے ہو، سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ ملک زاہد کسی وحشی کُتے کی طرح اپنے بھائی کو تلاش کررہا ہے اور......“

”تم مجھے دھمکی دے رہی ہو؟“ میں ایک دم ہتھے سے اُکھڑ گیا۔ اس لیے میرا لہجہ کرخت اور ہتک آمیز ہوگیا۔

”نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ اس بادیہی کا مرنا بہت ضروری ہے راج ویر، ورنہ میں نے جو تمہاری مدد کی اس کی اطلاع راکیش ورما تک پہنچ جائے گی اور وہ سب سمجھ جائے گا کہ میں کیا کررہی ہوں۔ معاملہ میرے ہاتھ میں بالکل بھی نہیں رہے گا۔“ اس نے مجھے سمجھاتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

”مجھ سے بحث مت کرو۔ اگر یہاں کے بارے میں کوئی انفارمیشن ہے تو بولو، تمہارا کوئی مخالف ہے تو اس کی بات کرو۔ میرا دماغ خراب نہیں کرو، سمجھیں تم۔“ میں نے غصے میں کہا تو وہ بولی۔

”اچھا میں پھر بات کرتی ہوں۔“

اس کے ساتھ ہی فون بند کردیا۔ میں نے فون جیب میں ڈالا تو شہباز صوفے پر نہیں تھا، وہ بات کے دوران اٹھ کر چلا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ مجھے سیڑھیاں اترتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بلٹ پروف جیکٹ تھی۔ وہ مجھے دیتے ہوئے بولا۔

”اِسے پہن لو۔“

”خیریت ہے، کہیں لام (جنگ) پر جانا ہے؟“

”یہی سمجھ لو۔“ اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

”خیریت ہے نا؟“ میں نے پوچھا۔

”اسے پہنو تو چلیں۔“ اس نے کہا تو میں نے جیکٹ پکڑی اور باہر کی جانب چل دیا۔ وہ بھی میرے پیچھے پورچ تک آگیا۔ میں نے گاڑی میں بیٹھ کر جیکٹ پہنی۔ اس دوران وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آن بیٹھا۔ وہ گاڑی روڈ پر لاکر بولا۔

”کہو تو آج ہی ملک زاہد کو پار کردیں؟“

”وہ کیسے؟“ میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”بتاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے سامنے دیکھ کر رفتار کم کی اور بولا۔ ”ابھی اس وقت وہ پولیس کے ایک اعلیٰ آفیسر کے پاس بیٹھا ہے۔ اس کے ساتھ دو تین ممبر اسمبلی بھی موجود ہیں۔ وہ یہی کہہ رہے ہیں کہ پرچہ ان کے مخالفین پر ڈالا جائے اور ملک حامد کا اغوا بھی۔“

”اچھا ویسے حامد کا پرچہ درج ہوگیا ہے؟“

”ابھی کچھ بھی نہیں ہوا نا، یہی تو بات ہے۔ وہ مخالفین پر پرچہ درج کروانا چاہتے ہیں، وہ بھی تگڑے بندے ہیں، پولیس درمیان میں یہی کہہ رہی ہے کہ جھوٹا پرچہ نہ کروائیں۔ ہمیں تفتیش کرنے دیں۔ یہاں پر آکر ان کا موقف ہے جن لوگوں نے فارم ہاؤس پر چھاپا مارا ہے یا جن کے کہنے پر مارا ہے، ان کی نشاندہی کردو۔ اب پولیس والے کیا بتائیں۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”اس میں زاہد کو پار کرنے والی کیا بات ہے؟“ میں نے اکتاہٹ سے پوچھا۔

”وہاں پولیس آفیسر کے پاس سوائے بحث ومباحثے کے کچھ بھی نہیں ہونا، وہ وہاں سے نکلے گا تو سہی، جب بھی نکلے۔“ اس نے سمجھایا۔

''ہاں نکلنا تو ہے، وہیں تو نہیں رہتا اس کو۔'' میں نے اس کی بات سمجھتے ہوئے کہا۔
''اب سنو...... اس کے گھر کے راستے میں ایک پولیس چوکی آتی ہے، یہی سڑک پر بیریئر لگائے ہوتے ہیں نا۔'' اس نے سمجھایا، میں اس کی بات تو سمجھ گیا لیکن ایک بات میرے دماغ میں اٹک گئی۔ میں نے کہا۔
''کیا وہاں پر پولیس کو شامل کیے بنا بات نہیں بنی؟ اس کے پاس گاڑی بھی یقیناً بلٹ پروف ہوگی۔''
''تم ٹھیک سوچ رہے ہو۔ ہاں ایسا ہی ہے، لیکن ہم پولیس کو شامل نہیں کر رہے ہیں۔''
''وہ کیسے؟'' میں نے پوچھا۔
''اس کے گھر کے راستے پر ایک ہی چوکی ہے لیکن آج اُسے دو چوکیاں ملیں گی۔ تھوڑے سے فاصلے پر دوسری چوکی اسی کے لیے بنائی گئی ہے۔''
''اس کا مطلب ہے بات ہوگئی ہے تمہاری؟'' میں نے پوچھا۔
''ہاں نا، بس ہمیں وہاں تک جانا ہے۔ دوسری چوکی پر پولیس والے نہیں ہیں بلکہ وہاں پر جو انچارج بنا ہوگا، اس لڑکے کا بھائی مارا ہوا ہے انہوں نے۔ وہ کئی ماہ سے بدلہ لینے کے لیے بے تاب ہے۔ انہوں نے روکنا ہے اور ہم نے مار دینا ہے۔''
''سب طے ہوگیا ہے نا؟'' میں نے تصدیق کرتے ہوئے پوچھا۔
''بالکل، انہی لڑکوں کا ایک بندہ اس وقت تھانے میں ہے۔ وہی اطلاع دے رہا ہے۔ اب بس ملک زاہد اسی رستے سے واپس اپنے گھر جائے تو سارا کام ہو جائے گا۔ کیونکہ......'' اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔
میں نے خاموش رہتے ہوئے اپنے پسٹل چیک کیے۔ میگزین میں بلٹ دیکھے، انہیں بالکل تیار کر لیا۔ کچھ دیر بعد ہم ایک پولیس ناکے پر پہنچ گئے۔ وہ ایک رواں دواں دو رویہ سڑک تھی۔ ون وے ٹریفک چل رہی تھی۔ انہوں نے ایک طرف ناکا لگایا ہوا تھا۔ جس کے ساتھ ہی آگے موڑ پڑتا تھا۔ اگر وہاں بے تحاشا ٹریفک نہیں تھی تو بہت کم بھی نہیں تھی۔ درمیانے درجے کا پوش علاقہ تھا۔ جیسے ہی شہباز نے بریک لگائے، ایک پولیس والے نے ہمیں روک لیا۔ ایک پولیس والے نے شہباز کی طرف آکر پوچھا۔
''ہاں جی کدھر جا رہے ہیں؟''
''آپ لوگوں کی طرف ہی آئے ہیں، کہاں ہے مانہا۔'' شہباز نے کہا تو اس پولیس والے نے چونک کر دیکھا، جس پر شہباز نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اوئے مامامنہ بند کر کبھی پڑ جائے گی، جا بھیج اُسے۔''
اس نے کوئی بات نہیں کی اور چپ چاپ واپس پلٹ گیا۔ چند لمحوں میں ایک نوجوان سا لڑکا آگیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ کہا۔
''آؤ بھاجی آگئے ہو۔''
''یار تم نے بلایا تو میں آگیا، بولو کیا کرنا ہے؟''
''آپ ہم سے بڑے ہیں جو کرنا ہے آپ ہی نے کرنا ہے۔ آپ بتا دیں۔'' اس نے نہایت عاجزی سے مسکراتے ہوئے کہا تو مجھے اس کی ہنسی انتہائی منافقانہ لگی جو یہی ظاہر کر رہی تھی کہ وہ کوئی اچھا آدمی نہیں ہے۔ میں نے کوئی ردِعمل نہیں دیا۔ تبھی شہباز نے کہا۔
''بس تم لوگوں نے کسی طرح ان کے ڈرائیور کو نیچے اتار لینا ہے، باقی سب ٹھیک ہو جائے گا، جیسے ہی ڈرائیور اُترے گا، ہم آجائیں گے۔''
''ٹھیک ہو گیا بھائی جان۔'' وہ کہتے ہوئے گاڑی سے پیچھے ہٹا تو شہباز نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ ہم اگلے کراس تک گئے اور گاڑی واپس موڑ لی۔ اس طرح پھر اگلے کراس تک جا کر ایک جوس والے کے پاس گاڑی روک کر جوس پینے لگے۔
ہمیں وقت گزارنا تھا۔ ہم بڑے سکون سے وہاں گپ شپ کرتے ہوئے جوس پیتے رہے، سڑک کا جائزہ لیتے رہے۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد شہباز کا فون بج اٹھا۔ اس نے دوسری طرف سے سنا اور فون بند کر کے جیب میں ڈال لیا۔ وہ اطمینان سے جوس پیتا رہا۔ کچھ دیر بعد اسی اطمینان سے گلاس واپس رکھتے ہوئے ادائیگی کرنے لگا۔ میں نے خالی گلاس واپس رکھا تو وہ گاڑی کی طرف چل پڑا۔ میں پسنجر سیٹ پر بیٹھا تو گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔
''ملک زاہد تھانے سے نکل چکا ہے۔ یہاں تک آتے ہوئے بیس سے پچیس منٹ لگ سکتے ہیں۔ وہ بندہ اُس کے پیچھے ہے اور مسلسل ہمارے رابطے میں ہے۔''
''اب کہاں پر ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''یہیں کہیں نزدیک ہوگا۔'' اس نے کہا اور گاڑی بڑھا دی۔
ناکے پر دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ انہوں نے اسے پار کیا اور ہماری گاڑی ناکے سے پار یوں لگوا دی کہ ہم فوراً

وہاں سے گاڑی نکال سکتے تھے۔ میں گاڑی سے نیچے اتر آیا۔ سڑک پر چاہے جتنی مرضی روشنی تھی، لیکن رات ہی کا وقت تھا۔ سامنے سڑک کے پار دکانوں کی روشنی بھی آرہی تھی۔ وہ سڑک ون وے تھی، دوسری جانب کی ٹریفک رواں تھی۔ میں نے چاروں طرف کا جائزہ لے لیا اور سڑک کنارے فٹ پاتھ پر کھڑا ہو گیا۔

اس وقت ماہنما کے چہرے پر رومال بندھا ہوا تھا جیسے عام پولیس والے آلودگی سے بچنے کے لیے لگا لیتے ہیں۔ وہ ہر آنے والی گاڑی کو جلدی جلدی نکال رہے تھے۔ پھر وہ لمحہ آگیا جس کا انتظار تھا۔ ایک گاڑی تیزی سے آکر رک گئی۔ اس کے پیچھے بھی ایک گاڑی آکر رک گئی۔ ماہنما بالکل الرٹ تھا۔ اسے بتا دیا گیا تھا۔ ایک لڑکا ڈرائیور سیٹ کی طرف گیا اور ان سے باتیں کرنے لگا۔ وہی ہوا، ماہنما کو وہاں تک جانا پڑا۔ اس نے جاتے ہی سخت لہجے میں بات کی تو ان کی منہ ماری ہونے لگی۔ ملک زاہد کا ڈرائیور اس بات پر ناراض ہونے لگا کہ ہمت کیسے ہوئی ہمیں روکنے کی۔ اس دوران ماہنما نے ہمیں مخصوص اشارہ کر دیا۔ جس کا مطلب یہی تھا کہ ملک زاہد پسنجر سیٹ پر بیٹھا ہوا ہے۔ میں پوری توجہ سے انہیں دیکھ رہا تھا اور اس لمحے کا انتظار کر رہا تھا جب مجھے آگے بڑھنا تھا۔

اچانک پچھلی سیٹ کے دونوں دروازے کھلے اور اس میں سے دو بندے باہر آگئے۔ وہ جنگ آمیز انداز میں ماہنما کو دھکے مارنے لگے۔ یہی وقت انتہائی مناسب تھا، میں نے چند تیز قدم اٹھائے، پسنجر سیٹ والا دروازہ بائیں ہاتھ سے کھولا، اس وقت ملک زاہد دوسری جانب باہر دیکھ رہا تھا۔ اچانک دروازہ کھلنے پر اس نے چونک کر میری طرف دیکھا، میں نے دائیں ہاتھ سے پسٹل سیدھا کر کے ملک زاہد کے سر پر رکھ کر فائر کر دیا۔ ایک دھماکا ہوا تو گاڑی سے نکلنے والے بندے حیرت سے پلٹے۔ ماہنما اور اس کے دونوں ساتھیوں نے اسی وقت دوڑ لگا دی۔ ڈرائیور اور وہ دو آدمی حیرت بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگے۔ ملک زاہد کو مار کر میں اپنی گاڑی کی طرف بھاگنے لگا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ان دونوں نے یا ڈرائیور نے اسلحہ نکالا تھا یا پچھلی گاڑی والوں میں سے کوئی بندے اترے تھے۔ شہباز جو میرے کور پر تھا، ایک دم سے اس نے فائرنگ کرنا شروع کر دی۔ ممکن ہے انہوں نے اسلحہ نکال لیا ہو کیونکہ طے یہ ہوا تھا کہ اگر وہ مزاحمت نہ کر سکے تو فائر نہیں کرے گا۔ وہ فائر کرتے ہوئے بھاگتا ہوا آیا، یہاں تک کہ گاڑی

کے نزدیک پہنچ گیا۔ میں گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر بیٹھا ہی تھا کہ میں نے گاڑی بھگا دی۔ میں ہر آنے والے لمحے کے ساتھ دور ہوتا چلا گیا۔

☆☆☆

صبح میری آنکھ کھلی تو ساوری مجھ پر جھکی ہوئی تھی۔ میں نے اسے یوں دیکھ کر ہولے سے پوچھا۔

''کیا بات ہے، یوں کیوں دیکھ رہی ہو؟''

''بس ویسے ہی، رات تم نیند میں کافی بے چین رہے ہو۔'' اس نے بھی ہولے سے کہا تو میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''تم مجھے نیند میں بھی دیکھتی رہتی ہو؟''

''ہاں نا، تمہاری ذرا سی بے چینی مجھے پریشان کر دیتی ہے۔'' اس نے اپنا ماتھا میرے ماتھے کے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''اتنا پریشان نہ ہوا کرو، میرے تو نصیب میں ایسی بے چینیاں ہیں۔''

''تھوڑی سی مجھے دے دے۔'' اس نے کہا۔

''اچھا زیادہ رومانوی مکالمے مت بولو، لگتا ہے یہاں آکر فلمیں کچھ زیادہ ہی دیکھنے لگی ہو۔'' میں نے موضوع بدلنے کی خاطر کہا تو وہ یک دم پیچھے ہٹتے ہوئے قہقہہ لگا کر ہنس دی پھر لاڈ سے پوچھا۔

''اچھا جو فلمیں دیکھتا ہے، وہی رومانوی ہوتا ہے؟''

''اصل بات کیا ہے، وہ بتاؤ؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ نہیں، تم چند دنوں سے مصروف ہونا، گھر میں کم نظر آتے ہو، اس لیے تم پر پیار آرہا ہے۔ اٹھو، وہ تمہاری پوجا کا بار بار فون آرہا ہے۔ سن لو، پھر تیار ہو کر ناشتا کرو، مجھے بھی تمہارے ساتھ ہی ناشتا کرنا ہے۔''

''اتنا پیار نہ دو، میں گھر ہی بیٹھ جاؤں۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا اور فون کی طرف ہاتھ بڑھایا، میں نے اس پر کالز دیکھیں تو شہباز کی کال کے ساتھ پوجا کی کال بھی تھی۔ میں نے پہلے شہباز کو کال کی۔ اس نے کال ریسیو کرتے ہی ایک دم سے کہا۔

''ابھی کسی نے خبر دی ہے کہ ملک سرفراز وطن واپس آگیا ہے۔ اس کے کافی ذرائع ہیں، ذرا محتاط ہو جانا۔''

''اوئے ماما، میں ٹی وی پر انٹرویو دینے جا رہا ہوں، پاگل ہو تم۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا تو وہ قہقہہ لگا کر بولا۔

''تمہارا کیا پتا تم چوک میں کھڑے ہو کر تقریر شروع کر دو۔''

''اُو چل بکواس نہ کر، مجھے پوجا کو بھی کال کرنی ہے۔'' میں نے کہا تو اس نے کال بند کر دی۔ میں پوجا سے رابطہ کرنے لگا۔ میری دوسری کال پر اس نے ریسیو کرتے ہوئے پوچھا۔

''راج ویر تم ناراض ہو مجھ سے؟''

''میں کیوں ناراض ہونے لگا تم سے۔ تمہیں شاید پتا نہیں، میں اگر کمٹمنٹ کر لیتا ہوں نا تو اس پر پورا اترتا ہوں، تمہاری طرح چال باز نہیں ہوں۔ تم مانو کہ تم نے مجھ سے غلط بیانی کی۔'' میں نے غصے والے لہجے میں کہا۔

''اچھا وہ چھوڑو...... اس وقت مجھے تمہاری سخت ضرورت ہے۔ ایک بندہ رستے سے ہٹانا ہے، ایک دو دن میں ہی۔'' اس نے کہا۔

''ایسی باتیں فون پر کرتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میں وہی کہنے والی تھی، کہیں بھی، جہاں تم چاہو، مجھ سے ملو، میں تمہیں پوری تفصیل بتاؤں گی۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''اچھا چل ٹھیک ہے، بتاتا ہوں۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں فریش ہو کر تیار ہوا اور ناشتے کی میز تک جا پہنچا۔ سامنے شہباز اور شانزے کو دیکھ کر مجھے ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی۔ مجھے پتا تھا کہ وہ ایسا ہی کوئی ڈراما کرے گا۔ میں سلام کر کے بیٹھا تو شہباز نے کہا۔

''طبیعت ٹھیک ہے تمہاری، کوئی بات نہیں کی؟''

''مجھے تیری سمجھ آرہی ہے۔'' مجھ سے مزید کچھ کہا نہیں گیا۔

''مجھے تو میرے ماں باپ نہیں سمجھ سکے تم کیا سمجھو گے۔ بہر حال، آپ نے حکم فرمایا تھا اور ہم حاضر ہو گئے ہیں۔''

میں نے ساوری کی طرف دیکھا تو اُس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''تمہیں پتا تھا ان کے آنے کا؟''

''ہاں، مجھے شانزے نے بتایا تھا۔'' اس نے ہونٹوں میں مسکراتے ہوئے کہا تو میں حیران رہ گیا۔

''بیگم یہ بات مجھے تمہیں خود بتانی تھی، مجھے کل شام ہی پتا چلا تھا کہ موصوف شادی شدہ ہے۔''

''مجھے شانزے نے رات ہی ساری تفصیل بتا دی تھی اور اسے صبح آنا تھا۔ بس ایسے ہی ہم دونوں نے تمہارے لیے سرپرائز رکھا تھا۔'' ساوری نے میری آنکھوں میں

دیکھتے ہوئے پیار سے کہا تو میں خفگی سے بولا۔

''مطلب تم اِن کے ساتھ مل گئی ہو؟''

''ہاں مل گئی ہوں، اب تمہیں ناشتا کرنا ہے تو چپ چاپ بیٹھو، ورنہ جاؤ۔'' ساوری نے ایک دم سے کہا تو میرا قہقہہ نکل گیا۔

''اب ماما آرام ہے۔'' شہباز نے کہا اور قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

ساوری نے ایک پل نہیں لگایا، نیفے میں اُڑسا ہوا پسٹل نکالا اور جس طرف میں نے اشارہ کیا تھا، وہاں فائر کر دیا۔ جس کی آواز سے پورا گھر گونج اٹھا۔ شانزے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ کر چیخ مارتے ہوئے صوفے پر لیٹ گئی۔ فرزانہ اور شبانہ فوراً ہی نمودار ہوگئیں، ان کے ہاتھ میں بھی پسٹل تھے۔ ایک لمحے میں ہلچل مچ گئی۔ ساوری ہاتھ میں پسٹل لیے اسی طرف دیکھ رہی تھی۔

''شانزے، ایک بات بتاؤ یہ اکثر اپنے کنوارے... ہونے کا بتا کر، ہمدردیاں سمیٹ کر کھانا کھاتا ہے، اس کی وجہ تم بتا سکتی ہو؟'' میں نے پوچھا تو شہباز جلدی سے بولا۔

''یہ مجھ سے پوچھ۔''

''چل بتا۔'' میں نے کہا۔

''جب یہ اپنے کام میں مصروف ہوتی ہے تو میں اسے تنگ نہیں کرتا، اگر سو رہی ہو، تب بھی۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا تو میں نے مزید سوال نہیں کیا۔ اتنے میں شبانہ اور فرزانہ باقی ماندہ ناشتے کا سامان لے کر وہیں آگئیں۔ خوشگوار ماحول میں ناشتا کر کے فرزانہ اور شبانہ سب سامان سمیٹنے لگیں۔ ساوری اور شانزے ایک طرف جا کر صوفے پر بیٹھ گئیں۔ میں شہباز کو پوجا کے فون کے بارے میں بتانے لگا۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی پھر سوچنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''یار اسے کس سے اس طرح کا خطرہ ہو سکتا ہے۔ چلو دیکھ لیتے ہیں، کیا بات کرتی ہے۔''

''ٹھیک ہے ڈن ہوگیا۔'' میں نے کہا تو وہ کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا پھر شرارت سے بولا۔

''وہ دیکھ سامنے میری بیگم، پڑھی لکھی، آئی ٹی ماہر اوپر سے رج کے خوبصورت، نازک سی۔''

''تو پھر میں کیا کروں؟'' میں نے اس کی بات نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

''اپنی دیکھ، وہی اَن پڑھ، صحرا کی رہنے والی، معاف کرنا اتنی سوہنی بھی نہیں ہے۔'' اس نے کافی حد تک نخوت سے کہا۔

''تو کہنا کیا چاہتا ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''یہی کہ تیری اور میری بیگم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔'' اس نے پھر اسی نخوت سے کہا تو مجھے اس کی شرارت کی سمجھ تو نہ آسکی لیکن میں نے فوراً بے ساختہ ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ساوری، وہ دیکھ، فائر......''

''کچھ نہیں ہوا، پُرسکون ہو جاؤ۔'' میں نے کہا تو سب میری طرف دیکھنے لگے۔ شانزے حیرت سے ساوری کو دیکھتے ہوئے صوفے سے اٹھنے لگی۔ تبھی میں نے شہباز کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ ہے زمین اور آسمان کا فرق۔''

پہلے تو وہ میری طرف دیکھ کر زیرِلب مسکراتا رہا پھر قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

''یہ کیا تھا؟'' شانزے نے کافی حد تک ناراضگی سے کہا تو وہ خود ہی بات بتانے لگا، ساری بات بتا کر کہا۔

''شانزے، یہ ہے وہ ٹائمنگ، جسے تم کو اچیو کرنا ہے۔''

''او خدایا......'' شانزے نے اپنا سر پکڑ لیا، پھر ناراض ہوتے ہوئے بولی۔ ''یہ بندہ مجھے شوٹنگ سکھا کر ہی رہے گا۔''

''آؤ اوپر میرے کمرے میں چلتے ہیں۔'' ساوری نے کہا اور وہ اوپر کی طرف جانے لگیں تو شہباز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اب میری طرف کیا دیکھ رہا ہے، چل نکلیں آفس کی طرف۔''

میں نے ایک دم سے قہقہہ لگا دیا پھر اس کے ساتھ نکل پڑا۔

آفس آنے تک شہباز نے مجھے تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ ایک ہی دن میں دو دو پہلوان اور ملک زاہد کا قتل پورے شہر میں ہلچل مچا دینے کے لیے کافی تھا۔ خاص طور انڈر ورلڈ میں سراسیمگی پھیل گئی تھی۔ اصل میں حیرت، خوف اور ڈر اسی وقت تک رہتا ہے جب تک ہونے والے واقعے کی سمجھ نہ آرہی ہو۔ جیسے ہی سمجھ آجاتی ہے، حیرت، ڈر اور خوف ختم ہو جاتا ہے اور پھر اس کی مزاحمت یا مقابلہ کرنے کی سمجھ آنے لگتی ہے۔ لاہور انڈر ورلڈ میں کسی کو یہ پتا نہیں تھا کہ یہ قتل کس نے کیے ہیں۔ میں نے دو دو پہلوان کو ختم کرتے وقت جو پیغام دیا تھا، وہ کسی کی سمجھ

میں نہیں آرہا تھا۔ دودے پہلوان نے ملک زاہد کے لیے جن لوگوں کو ایک ہی رات میں تنگ کیا تھا، ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ دودے کو یوں مار دیں۔ حالانکہ یہ غلط سوچ تھی، یہ غنڈے اور بدمعاش لوہے کے تو بنے ہوئے نہیں ہیں یا انہیں موت نہیں آتی۔ ایک چھوٹی سی بلٹ ان کا بھی ویسا ہی سینہ چیرتی ہے، جس طرح ایک کمزور آدمی کا۔ ان دونوں کے ختم ہونے سے جہاں بہت سارے لوگوں نے سکھ کا سانس لیا تھا، وہیں کئی سارے لوگوں پر خوف بھی طاری ہو گیا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے، یہ کون سی بلا شہر میں وارد ہو گئی ہے، جس نے ایک ہی ہلّے میں ملک سرفراز کے بیٹوں کو اور اس کے حاشیہ برداروں کو ختم کر کے رکھ دیا تھا۔

''حبیب کھوکھر کہاں ہے؟''

''اس کا پتا نہیں چل رہا۔ وہ رات ہی سے غائب ہے۔'' شہباز نے سوچتے ہوئے کہا۔

''کوئی معلومات، کوئی سراغ؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے بھی حیرت ہو رہی ہے، یہ فطری ردِعمل ہے۔ اس نے چھپنا ہی تھا۔ ملک زاہد کا سب سے بڑا سپورٹر وہی تھا۔ وہی اداروں پر دباؤ ڈالتا تھا۔ وہ بے وقوف نہیں ہے کہ ان حالات میں بھی اپنے لیے خطرہ محسوس نہ کرے۔'' اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا تو میں نے دبے دبے غصے میں کہا۔

''میرا خیال ہے، اس پر توجہ دی جائے، وہ جس بِل میں بھی جا گھسا ہے وہاں سے نکال کر اس کا معاملہ بھی صاف کر دیا جائے، تاکہ ان لوگوں کے ساتھ دوسروں کو بھی سمجھ آجائے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو، یہی وہ دائرہ ہے جس میں ہم ابھی تک پھنسے ہوئے ہیں، یہاں سے نکل جانا چاہیے، کرتے ہیں کچھ۔'' شہباز نے کہا اور گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔ ہم ابھی آفس سے تھوڑا دور تھے کہ پوجا کا فون آگیا۔ میری آواز سنتے ہی بولی۔

''مجھے بتایا نہیں پھر تم نے، کہاں ہو تم؟''

''اتنی جلدی کس بات کی ہے؟'' میں نے اجنبی سے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں ہے نا، جلدی ملو۔'' اس نے سختی سے کہا۔

''اوکے، بولو کہاں ہو تم؟'' میں نے پوچھا۔

''تم بولو، میں پہنچ جاؤں گی۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''ریس کورس پارک میں آجاؤ۔'' میں نے کہا تو وہ فوراً بولی۔

''ڈن ہو گیا۔ میں پندرہ منٹ میں آرہی ہوں۔''

میں نے فون بند کر کے شہباز کی طرف دیکھا تو اس نے رفتار آہستہ کرتے ہوئے گاڑی سائیڈ پر لگاتے ہوئے کہا۔

''تم آؤ گاڑی چلاؤ، میں وہاں نگرانی پر لگاتا ہوں۔''

کچھ دیر بعد میں گاڑی چلا رہا تھا اور وہ فون پر مصروف ہو گیا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد ہم پارک جا پہنچے۔ شہباز نے گاڑی پارکنگ میں لگائی اور مجھ سے تھوڑے فاصلے پر میرے پیچھے چلتا ہوا آیا۔ مین گیٹ پار کر کے تھوڑا آگے گیا تو پوجا کا فون آگیا۔

''کہاں ہو تم؟'' اس نے پوچھا۔

''میں یہیں پارک میں ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''میں بھی آگئی ہوں، یہ آبشار کے پاس کھڑی ہوں۔'' اس نے کہا تو میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، تھوڑی دور ایک مصنوعی آبشار تھی۔ میں وہاں تک چلا گیا، وہ لان میں ٹہل رہی تھی۔ وہ بالکل کسی لاہوری لڑکی کے مانند دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی، ایک چادر لی تھی اور اس پر حجاب تھا۔ کلائی میں ایک چھوٹا سا پرس اور ہاتھ میں سیل فون تھا۔ میں نے شہباز کی طرف دیکھا، وہ کسی اجنبی کے مانند مجھ پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ میں پوجا کے پاس جا پہنچا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی آگے بڑھی اور مجھے بغور دیکھتے ہوئے بولی۔

''تم مجھ پر اعتماد کیوں نہیں کرتے ہو؟''

''یہ فضول سوال ہے، آؤ اِدھر بینچ پر بیٹھیں۔'' میں نے کہا اور ایک سنگی بینچ پر جا بیٹھا۔ وہ میرے ساتھ آکر بیٹھ گئی تو میں نے پوچھا۔ ''بولو، کیا کہنا ہے؟''

''میں نے کہا تھا، ایک آدمی کو راستے سے ہٹانا ہے، وہ نہ صرف میرے لیے بلکہ تمہارے لیے بھی خطرناک ہے۔ اس کے عوض میں تمہیں جو بتانے جا رہی ہوں، وہ نجانے کتنی زندگیوں کا سوال ہے۔''

''کچھ بتاؤ گی بھی یا پہلیاں ڈالتی رہو گی۔'' میں نے چڑتے ہوئے کہا۔

''تو سنو پھر...... راکیش ورما کا جو یہاں پر نیٹ ورک کام کر رہا ہے، اس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آج کل میں ایک بم دھماکا کرنا ہے۔ اس کے لیے انہوں نے خودکش بمبار کا بندوبست کر لیا ہے۔ اس وقت وہ ان لوگوں کے

پاس موجود ہے۔ کسی بھی وقت، کسی بھی جگہ وہ خودکش کہیں نہ کہیں خود کو بلاسٹ کر دے گا۔'' اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''کہاں پر رکھا ہے اس خودکش بمبار کو؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ مجھے نہیں پتا، لیکن پورا پلان تیار ہے، صرف مناسب وقت اور جگہ کا فیصلہ کرنا ہے۔'' اس نے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔

''مناسب وقت اور مناسب جگہ......'' میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا تو وہ تیزی سے بولی۔

''یہ جو ملک زاہد اور اس کا ایک دوست پہلوان قتل ہوا ہے، ملک زاہد کا بھائی بھی اغوا ہے۔ ہوسکتا ہے اس کی کوئی احتجاجی ریلی نکالی جائے۔ اس میں کوئی ایسا کیا جائے......''

''کچھ بھی ممکن ہے۔'' میں نے انتہائی بے چینی سے کہا لیکن اپنی پوری کوشش کی کہ میری بے چینی کا احساس پوجا کو نہ ہو۔

''ہاں ہوسکتا ہے اس سے ہٹ کر ہو۔'' اس نے تشویش سے کہا۔

''تم بتاؤ، تم کو کسے صاف کرنا ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''وہ کوئی دوسرا نہیں، وہی ہے جس نے خودکش بمبار کو رکھا ہوا ہے۔ اس کے لوگ اسے چھپائے ہوئے ہیں۔'' پوجا نے قدرے محتاط انداز میں کہا۔

''کون ہے وہ؟'' میں نے اکتاہٹ سے پوچھا۔

''حبیب کھوکھر......'' اس نے سرسراتے ہوئے لہجے میں بتایا تو مجھے اتنی حیرت نہیں ہوئی، وہ کچھ بھی کرسکتا تھا۔ میں پہلے ہی سے جانتا تھا کہ اس وقت پوجا کی راہ میں وہی حائل ہے۔ لیکن وہ جرم کی دنیا میں اس قدر آگے بڑھ جائے گا کہ دہشت گردی پر اتر آئے گا، یہ میرے ذہن میں نہیں تھا۔

''اوکے ہوگیا۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

''میں تمہیں اس کی وہ ساری تفصیلات بھیجتی رہوں گی جو راکیش ورما کے نیٹ ورک کی طرف سے آتی رہیں گی۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''کوئی آئیڈیا ہے کہ وہ خودکش کہاں پر ہوسکتا ہے؟'' میں نے یونہی پوچھا۔

''حتمی لوکیشن کا مجھے نہیں پتا، بس اتنا معلوم ہے وہ کوئی ڈیرا ہے اور لاہور ہی کے مضافات میں ہے۔ میں کوشش کر کے تلاش کرتی ہوں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا تو میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اور کچھ......؟''

''کچھ نہیں، بس مجھے اس بادیہی کی فکر ہے، وہ کہاں گئی؟'' اس نے تشویش سے کہا تو میں نے پوچھا۔

''کیا وہ اتنی ہی خطرناک ہے؟''

''وہ صرف اس حوالے سے خطرناک ہے کہ وہ یہاں کی ساری خبریں دیتی ہے۔ پچھلے دو برس سے وہ دبئی میں تھی، کچھ عرصہ پہلے یہاں آئی ہے۔ بس سمجھ لو وہ ایک سورس ہے۔'' اس نے بتایا۔

''وہ جانے اور تم، اب یہ بتاؤ، پہلے تمہیں نکلنا ہے یا مجھے؟''

''کیا مطلب؟'' اس نے پوچھا تو میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''ظاہر ہے تم بھی اپنے لوگ لے کر آئی ہو اور میں بھی، ہم اکیلے تو یہاں نہیں بیٹھے۔''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر سر جھکاتے ہوئے بولی۔

''میں نکلتی ہوں۔''

''اوکے جاؤ پھر۔'' میں نے کہا اور بینچ کے ساتھ ٹیک لگالی۔ وہ ایک دم سے اٹھی اور لان سے نکلتی چلی گئی۔ کچھ دیر بعد میں بھی اٹھ گیا۔

پارکنگ سے نکلتے ہوئے جب میں ڈرائیونگ کرتے ہوئے مال روڈ پر آیا تو میں نے چاچا عبدالمجید کو اس صورتِ حال کے بارے میں بتانے کے لیے فون کر دیا۔ شہباز نے اسپیکر آن کر دیا۔ انہوں نے میری بات پورے تحمل سے سنی اور پھر تشویش زدہ لہجے میں بولے۔

''یہ خبر تو مجھے بھی ہے۔ کچھ لڑکے لگائے ہوئے ہیں اس کام پر مگر یہ پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔ اب اگر حبیب کھوکھر کے پاس ہے تو اگلے چند گھنٹوں میں اس کا پتا چل جائے گا۔''

''ٹھیک ہے، شاید پوجا مجھے بتا دے۔'' میں نے کہا۔

''کچھ بھی کریں گے لیکن اُسے تلاش تو کریں گے، تم تیار رہو، فوراً نکلنا ہوگا...... کیونکہ دو دوے پہلوان اور ملک زاہد کا آج ہی جنازہ ہے اور ایک ہی جگہ ہے، یہ کسی بھی ریلی سے کم نہیں ہوگا۔'' چاچا نے تشویش سے کہا۔

''تو اس کا مطلب ہے، ہمارے پاس وقت بہت ہی کم ہے؟'' میں نے ایک دم سے چونکتے ہوئے کہا۔

''ہاں نا، ہو سکتا ہے اس جنازے میں حبیب کھوکھر بھی ہو، تاکہ اس پر شک ہی نہ جا سکے۔ اگلے دو گھنٹے ہمارے لیے بہت اہم ہیں۔'' چاچا نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا تو مجھے بھی ان حالات کی گمبھیرتا کا احساس ہوا۔ پہلی بار چاچا کے لہجے میں اعتماد ڈانواں ڈول ہوا تھا۔

''آپ فکر نہ کریں، میں دیکھتا ہوں۔'' میں نے کہا اور فون بند کرنے کے لیے شہباز کو اشارہ کیا۔ فون اس سے پہلے ہی بند ہو گیا۔ اس نے اسپیکر پر ساری بات سن لی تھی، وہ بھی پریشان ہو گیا۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''صرف دو گھنٹے، اس دوران میں تو وہ وہاں سے تیار ہو کر نکلنے والا بھی ہو گا۔''

''ہاں یہ بھی ہے۔'' میں نے بے چین ہوتے ہوئے کہا تو اچانک وہ تیزی سے جوش کے ساتھ بولا۔

''ٹھہرو ذرا، میں پتا کرتا ہوں، اس کے ڈیرے کہاں کہاں پر ہیں۔''

اس نے تیزی سے سیل فون پر پیغام چھوڑ دیا۔

''شانزے تو اس وقت ساوری کے ساتھ ہو گی۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا تو وہ پریشانی سے بولا۔

''ہاں یہ تو ہے، لیکن خیر، کچھ نہ کچھ تو کرتے ہیں۔''

ہمارے درمیان ایک عجیب سی بے چینی بھری صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی۔ میرے دماغ میں صرف یہی تھا کہ اگر یہ حادثہ ان کے جنازے میں ہو گیا تو کتنے بے گناہ لوگ مارے جائیں گے۔ اس کا سارا فائدہ ہمارا دشمن اٹھائے گا۔ کتنے گھر اُجڑیں گے۔ میں جوں جوں سوچتا جا رہا تھا، میرے خون کی گردش بڑھتی جا رہی تھی۔ یہی اِک سوچ تھی جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

''علی......'' شہباز نے مجھے پکارا تو میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

''ہاں......''

''رفتار آہستہ کرو۔'' اس نے دھیمے سے کہا تو مجھے احساس ہوا میں گاڑی تیز بھگا رہا تھا۔ میں نے فوراً ہی رفتار آہستہ نہیں کی، دھیرے دھیرے رفتار کم کرتا چلا گیا۔ مجھے رفتار کے ساتھ اپنے اعصاب پر بھی قابو پانا تھا۔ میں خود پر قابو پاتا چلا گیا۔ اس وقت میں باغِ جناح کے پاس سے گزر رہا تھا جب پوجا کا فون آ گیا۔ شہباز نے کال ریسیو کرتے ہوئے اسپیکر آن کر دیا۔

''ہاں بولو۔'' میں نے کہا۔

''یہاں کوئی سکیاں پل ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں ہے؟'' میں نے جواب دیا۔

''اس کے پاس جو کھوکھر کا ڈیرا ہے۔ وہ خودکش وہیں پر ہے۔ اور راج ویر...... وقت بہت کم ہے۔'' اس نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''میرے سورس نے یہی بتایا ہے وہ وہاں سے نکلنے کی تیاری کر رہا ہے۔ اب یہ پتا نہیں اُسے کہاں جانا ہے۔'' اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''اب تم مجھے یہ بتاؤ، کھوکھر کو پہلے ختم کرنا ہے یا خودکش کو اٹھانا ہے؟'' میں نے جان بوجھ کر اس سے یہ سوال کیا تھا۔

''ظاہر ہے اب تو اس خودکش کا معاملہ ہی نمٹانا ہے۔'' وہ تیزی سے بولی۔

''چل پھر تیرا اور میرا وعدہ رہا، تیرا کام میں کروں گا، اپنے سورس سے رابطہ رکھ اور وہ جتنا ملتا ہے اُسے دے۔ سمجھو وہ میری طرف سے ہو گا۔'' میں نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا تو وہ بولی۔

''میں تمہارے جذبات سمجھ رہی ہوں۔''

''اور پوجا، اگر خدانخواستہ یہ حادثہ ہو گیا تو پھر تم جانتی ہو، میں کیا کروں گا، ایک بندے کے بدلے میں دس بندے ماروں گا۔'' میرا لہجہ ایک دم سے وحشت ناک ہو گیا تو وہ تیزی سے بولی۔

''نہیں، نہیں ایسا نہیں ہو گا، میں پوری کوشش کرتی ہوں۔''

یہ کہتے ہی اس نے کال بند کر دی۔ باتوں کے دوران میں انارکلی کے پاس آ گیا تھا۔ میں نے لاشعوری طور پر گاڑی کا رخ اسی طرف کر لیا تھا۔

''سکیاں پُل کے پاس......'' شہباز بڑبڑایا اور تیزی سے فون پر پیغام بھیج دیا۔ اس کا چہرہ قابلِ دید تھا۔ اچانک اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ میں نے شہباز کا ایسا چہرہ پہلی بار دیکھا تھا......

حالات کی تند و تیز آندھیوں کی زد میں آجانے والے نوجوان کی سنسنی خیز داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ پڑھیے



آتشِ انتقام

اے۔آر۔راجپوت

انتقام کی آگ کے شعلے اس قدر وحشت ناک اور شر انگیز ہوتے ہیں کہ کبھی کبھی اپنا وجود بھی اس کی لپیٹ میں آجاتا ہے... بدلے کی آگ میں سلگتی ایک عورت کا فسانہ جو شادی کی رات ہی بیوہ ہو گئی تھی...

قاتل و مقتول کے درمیان کھیلی جانے والی آنکھ مچولی......

''آج میں اُس سے سب کہہ ڈالوں گا، کچھ نہیں چھپاؤں گا، بہت ہو گیا، بہت بے قراری کا عذاب سہہ لیا میں نے...... بھلا میں نے کب کس سے محبت کی ہے؟ کب کسی کو چاہا ہے! پتا نہیں شیبنہ میں ایسا کیا جادو تھا کہ میں اُس کی محبت کا اسیر ہو کر رہ گیا تھا۔ نہ جانے ایسی کیا بات تھی اُس میں۔ ٹھیک ہے خوب صورت ہے...... حسین ہے لیکن ایسی تو کئی لڑکیاں میری زندگی میں آتی رہیں پہلے بھی...... اُن پر کیوں نہ دل آیا کبھی میرا...... آخر شیبنہ ہی کیوں......؟''

وہ عجیب انداز میں بڑبڑاتے ہوئے جھلّا سا گیا تو اس کے کان میں کسی نے کہا۔

''یہ دل کے معاملے ہیں بیٹا جی! کب کس کا ہو جائے، کب کس پر مر مٹے...... کیا پتا......؟''

یہ اس کے ''سنڈے نائٹ اسپیشل'' گروپ سے تعلق رکھنے والے تین دوستوں میں سے ایک شمشاد نے اس سے کہا تھا، جب وہ دونوں ہفتے کی رات ظہیر شاہ کے اپارٹمنٹ میں تاش کی بازی لگا رہے تھے۔ زیادہ تر تینوں ہفتے کی شب میں یہ رنگ جمایا کرتے تھے۔ ریحان اگرچہ کم آتا تھا اور ان سے بس، ایک واجبی سا تعلق رکھے ہوئے تھا، زیادہ تر مدثر مرزا، شمشاد اور ظہیر شاہ ہی ساتھ ہوتے تھے، تاہم اسے کھویا اور مسلسل ہارتا دیکھ کر شمشاد نے واپسی میں اسے فلیٹ پر ڈراپ کرتے ہوئے پوچھ ہی لیا تھا کہ وہ آج کل اس قدر کھویا کھویا کیوں رہنے لگا ہے، تو اس نے کہہ ڈالا تھا کہ ''معاملہ'' یہ ہے۔ میں کسی کی ''گرفت'' میں آچکا ہوں۔

یہ اسے شمشاد کا ہی مشورہ تھا کہ اس طرح پگھلنے سے بہتر ہے کہ شبینہ سے اظہارِ عشق کر دیا جائے۔ آخر پتا تو چلے آگ برابر کی ہے یا بس...... دوستی ہے؟

اپنے دوست کی یہ بات اس کے دل کو بھی لگی تھی، یہی وجہ تھی کہ آج اس نے شبینہ سے ملاقات میں سب کہہ دینے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

اس کی تیاری میں کوئی عجلت نہ تھی، وہ بڑے اطمینان سے تیار ہو رہی تھی اگرچہ اس ''تیاری'' کا اہتمام خاص تھا۔ وہ حسین تو تھی ہی، لیکن سیاہ رنگ کے قدرے چست سلکی اور چمکتے دمکتے لباس اور میک اَپ نے اس کے حسن کو دو آتشہ بنا دیا تھا۔

سب سے آخر میں اس نے اپنی سیاہ گہری آنکھوں میں ڈارک براؤن لینس بھی استعمال کیے تھے۔

''اس قدر اچھے میک اَپ کے بعد انسان کی صورت ہی بدل جاتی ہے۔'' وہ ہولے سے بڑبڑائی۔ اس وقت کوئی اور وہاں ہوتا تو اس کی بڑبڑاہٹ کی معنی خیزی کو سمجھے بنا نہ رہ سکتا۔

وہ اپنا پرس سنبھالے نکلنے لگی تو اس کا سیل گنگنایا۔ اسکرین پر ریحان کا نام تھا۔ اس کے گداز ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ اُبھری، اس کا کال اٹینڈ کرنے کو جی نہیں چاہا مگر پھر کچھ سوچ کر، اس نے 'ہیلو' کیا۔

''کیا......؟ صرف ہیلو......؟'' دوسری جانب سے ایک مردانہ آواز اُبھری۔

''اور کیا کہتی؟'' شبینہ نے کہا۔ اسے کوفت ہو رہی تھی۔

''کبھی کبھی تو تم اس قدر سرد مہر ہو جاتی ہو کہ بس......''

''یہ بات نہیں ریحان! تم جانتے ہو کہ...... میں کس قیامت سے گزری ہوں، ایک تمہاری ہی دوستی کا تو سہارا ہے کہ...... اب تک زندہ ہوں، ورنہ تو کب کی......''

''بس، پلیز! اس سے آگے کچھ مت کہنا۔'' ریحان نہایت رسان سے بولا۔ ''کاش! تم مجھے اپنے اس دکھ سے آگاہ کر دیتیں تو...... خیر، اچھا آج رات ڈنر کا پروگرام ڈن ہے نا؟''

''سو سوری، ریحان! آج مجھے اپنی ایک سہیلی کے ہاں عیادت کو جانا پڑ گیا ہے۔ کسی اور دن کے لیے رکھ لو پروگرام...... پلیز۔'' اس نے کہا۔

دوسری جانب چند ثانیوں کے لیے خاموشی چھا گئی پھر ایک گہری سانس لینے کی آواز ابھری اور ریحان بولا۔ ''اچھا! جیسے تمہاری مرضی، آج پتا نہیں کیوں میں کچھ زیادہ ہی بے چین ہو رہا تھا تم سے ملنے کو، کچھ ضروری بات بھی کہنا تھی مجھے تم سے...... کچھ اس لیے بھی بے قراری تھی۔''

اس کی بات کا مطلب وہ سمجھ گئی تھی، تب بھی اس کے گداز ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ ابھری اور بولی۔

''پھر کسی وقت سہی، ہم ملتے تو رہتے ہی ہیں نا......''

''ضرور کیوں نہیں۔''

اس کے بعد اس نے چند رسمی جملے ادا کر کے رابطہ منقطع کر دیا، جبکہ ریحان کا ابھی اس سے مزید باتیں کرنے کا موڈ تھا۔ حقیقت یہی تھی کہ آج اس کے ایک دوست مدثر مرزا کی منگنی کی تقریب تھی، جیسا کہ مذکور ہو چکا، ان سے اس کی دوستی بس ٹائم پاس اور واجبی سی تھی، یہی وجہ تھی کہ اگر ریحان کی آج شبینہ سے رات کی ملاقات ڈن ہو جاتی تو وہ اس تقریب پر بھی لعنت بھیجنے کو تیار تھا۔

شبینہ اسے اپنے دوستوں سے بھی زیادہ عزیز تھی، بالفاظ دیگر وہ شبینہ کی خاطر اپنے دوستوں سے بھی قطع تعلق کرنے پر تیار تھا۔ اب چونکہ پروگرام کینسل تھا اسی لیے اس نے بھی چاروناچار منگنی پر جانے کا پروگرام بنا ہی لیا۔

اسے اپنی اور شبینہ کی پہلی ملاقات اچھی طرح یاد تھی۔ لگ بھگ کوئی مہینہ بھر پہلے ہی کی تو بات تھی۔ وہ اپنی ہنڈا کار میں ایک ذیلی شاہراہ سے گزر رہا تھا اور کار میں اکیلا ہی تھا۔ رات کے گیارہ بجے تھے۔ وہ سڑک سنسان تھی۔

ایک جگہ اس نے ٹیکسی رکی دیکھی...... جس کا بونٹ کھلا ہوا تھا اور...... ڈرائیور اس پر جھکا شاید خرابی تلاش رہا تھا مگر ریحان کے چونکنے کی وجہ...... وہ خوب صورت اور دلکش خاتون تھی جو پریشان حال اس کے قریب ہی کھڑی تھی۔

ریحان نے کار قریب لے جا کر روک دی۔

''پلیز! آپ مجھے ذرا آگے تک لفٹ دے دیں گے۔ میری ٹیکسی خراب ہوگئی ہے اور اس کے جلدی ٹھیک ہونے کے امکانات نہیں نظر آرہے ہیں'' ؟ خاتون نے اس کی کھڑکی پر جھک کر درخواست کی۔

ریحان اسے دیکھتے ہی دنگ رہ گیا۔ پل کے پل اس نے بہت کچھ دیکھ اور بھانپ لیا۔ سب سے پہلے اس کے دلکش چہرے پر اداسی اور کشادہ سیاہ خوب صورت آنکھوں میں چمکتی ہوئی نمی...... تیسرا اس کے گورے نرم و گداز ہاتھوں میں حنا کا رنگ...... صاف لگا وہ پہلے ہی سے مضطرب الحالی کا شکار رہی ہے۔ کیوں؟ اس کا جواب۔ فی الحال ریحان کے پاس نہیں تھا۔ اسے کچھ اندازہ ہوا تھا جیسے خاتون اپنے شوہر سے جھگڑا کر کے میکے جارہی ہے۔

''شوہر'' کے خیال سے اس کی طبیعت خواہ مخواہ ہی مکدر سی ہونے لگی۔

''یقیناً...... بیٹھیے۔'' ریحان نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔ عورت نے اس کا شکریہ ادا کیا، پھر وہ پلٹی اور ٹیکسی ڈرائیور سے کچھ کہا، اس نے اس کا مختصر سا سامان ڈکی سے نکلوا کر ریحان کی کار میں منتقل کر دیا۔ اس کے بعد وہ ریحان کے برابر والی سیٹ کا دروازہ کھول کے بیٹھ گئی۔

ریحان نے کار آگے بڑھا دی۔ کار میں اس اپسرا کی موجودگی اس پر ایک سحر سا طاری کرنے لگی۔ وہ تھی ہی ایسی...... جسمانی اور جمالیاتی حسن و شباب سے بھرپور۔ ہلکے گلابی لباس میں وہ کافی شاندار شخصیت کی مالک نظر آرہی تھی۔ چہرہ اس کا دلنشین تھا کہ ریحان بار بار اس کی جانب دیکھ لینا چاہتا تھا مگر تہذیب آڑے آرہی تھی اور اسے اپنی خواہش دبانا پڑ جاتی۔ تاہم باتوں کے بہانے اس نے دیدارِ رخِ روشن کرنا ضروری سمجھا تھا کہ اچانک وہ عورت خود ہی اس سے مخاطب ہو کے بولی۔

''آپ مجھے کسی قریبی چوراہے پر اتار دیں، وہاں سے میں کوئی اور ٹیکسی......''

''جی نہیں......'' ریحان نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''میں آپ کو جہاں کہیں گی وہیں اتار دوں گا۔''

''شکریہ آپ کا......'' خاتون نے دھیرے سے کہا۔

کچھ دیر خاموش سفر جاری رہا۔ ریحان کی کوشش تھی کہ وہ کم سے کم مخاطب ہو، کہیں خاتون گھبرا نہ جائے، اسے جانے کیوں اس کا بڑا خیال آرہا تھا، سوچ رہا تھا کہ کیا ایسی بھی دلکش حسن کی مالک کوئی عورت ہوتی ہے کہ بس...... اسے دیکھے اور دیکھتا ہی رہ جائے۔

''آپ کہاں رہتی ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''یونیورسٹی روڈ، ایک سپر مارکیٹ کے قریب نعمان اپارٹمنٹس میں......'' خاتون نے بتایا۔

ریحان نے اندازہ لگالیا کہ وہ وہاں تک اسے نصف گھنٹے تک پہنچا دے گا۔

''بائی دا وے...... میرا نام...... ریحان خاں ہے۔''

جی میں تو آئی کہ اس کا نام پوچھ لے، لیکن پھر وہی تہذیب...... اُمید تو تھی کہ شاید وہ ...خود ہی بتادے۔ یوں اس کی اُمید بر آئی اور خاتون نے اپنا نام اسے شبینہ بتادیا۔

پھر ان کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی۔ ریحان کو یہ خاتون کچھ لیے دیے والی لگی تھی جو محض مجبوری کی خاطر اس کے ساتھ بیٹھ گئی تھی۔

لیکن جب ریحان نے اسے ''صحیح سلامت'' اس کی منزل تک پہنچا دیا تو شبینہ نے اس کا تہِ دل سے شکریہ ادا کیا۔

''اس کی ضرورت نہیں......'' ریحان بھی خوش اخلاقی سے بولا ''مجھے تو خوشی ہوئی ہے کہ میں آپ کے کام آیا۔

پھر وہ دونوں جدا ہو گئے، لیکن اس مختصر سی ملاقات کے بعد شبینہ، ریحان کے دل و دماغ پر بجلیاں گرا چکی تھی۔ اسے بے چین و بے قرار کر چکی تھی۔ اس میں گویا کوئی ایسی نامعلوم سی کشش ضرور تھی جس نے اسے پہلی ہی ملاقات میں فریفتہ کر دیا تھا۔

''دوبارہ کیسے ملا جائے؟'' وہ ہر وقت اسی خیال کے مدار میں گردش کرتا رہا اور تب ہی اسے ایک آئیڈیا سوجھ گیا۔

اُس کے گھر کے نیچے ایک سُپر مارکیٹ تھی، اگر وہ روزانہ وہاں کچھ نہ کچھ خریدنے یا یونہی چکر لگانے کے بہانے جائے تو اس دلنشیں خاتون سے دوبارہ ملاقات کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ پھر وہ یہی کرنے لگا، اس میں بھی اسے دس پندرہ دن لگ ہی گئے، وہیں شبینہ اس سے ٹکرائی اور پھر ایسی ٹکرائی کہ...... دونوں میں اچھی خاصی علیک سلیک کے بعد دوستی بھی ہوگئی۔

اسی دوران ریحان کو ایک اچنبھا بھی ہوتا رہا۔ شبینہ

دلکش تو تھی ہی لیکن جانے کیوں وہ اسے کچھ پُراسرار بھی لگتی تھی۔ اس کے حسین چہرے اور مدھ بھری کشادہ سیاہ آنکھوں میں ہر وقت بے نام سی اُداسی دکھائی دیتی تھی۔

دو چار ملاقاتوں کے بعد اب ان دونوں کے گہرے مراسم ہو گئے، اپنے بارے میں شبینہ نے ایک ملاقات میں اس سے صرف اسی قدر کہا کہ...... وہ دنیا میں اکیلی ہے...... اور بس...... ہاں! ایک شادی ہوئی تھی۔ وہ ماضی کا حصہ بن کر ختم ہو گئی۔ وہ اس کے فلیٹ میں بھی آجایا کرتی تھی مگر ریحان نے بھی خود کو تہذیب سے نیچے نہ آنے دیا تھا۔ شبینہ نے بھی ایک حد رکھی تھی۔

ریحان محسوس کر رہا تھا کہ شبینہ اپنے ماضی کے ذکر یا بیان پر متحمل سی ہو جاتی ہے، کبھی تو اس کا حسین چہرہ عجیب اندرونی جذبے تلے سرخ ہو جایا کرتا، اس نے کہا تھا کہ ابھی وہ اس سے اس کے ماضی کی تفصیل نہ پوچھے، جس کا کوئی فائدہ بھی نہ تھا۔

ریحان کو تو اس سے محبت ہو چکی تھی۔ وہ اسے دل و جان سے چاہنے لگا تھا، تب اس نے بھی عہد کر لیا کہ اس کے ماضی کے حوالے سے کوئی بات نہ کرے گا مبادا وہ ناراض ہی نہ ہو جائے۔

☆☆☆

رات کے دس بج چکے تھے۔ شبانہ ہائٹس کی گیارھویں منزل پر ایک تقریب تھی۔ مدثر مرزا کی منگنی ہو رہی تھی۔ یہاں بڑے لگژری اپارٹمنٹس تھے، یہاں سے ایک طرف ساحلِ سمندر کا دل فریب نظارہ کیا جا سکتا تھا اور دوسری جانب شہر کی روشنیوں کا...... ساتھ والا اپارٹمنٹس خالی تھا اسی لیے اسے بھی ساتھ ملا لیا گیا تھا۔

یہ مہربانی بلڈنگ یونین صدر توصیف نے کی تھی۔ خالی اپارٹمنٹ کی چابی اسی کے پاس تھی اور وہی اس کا مالک بھی تھا۔

شمشاد اور ظہیر شاہ بھی پہنچ چکے تھے۔ تقریب کا آغاز ہو چکا تھا اور ہلا گلا بھی جاری تھا۔ خواتین مرد اور بچے سب ہی مدغم ہو کے انجوائے کر رہے تھے اور کھا پی رہے تھے، چند ایک من چلے تقریب کی رونق دوبالا کرنے کے لیے ''سنو اسپرے'' بھی کر رہے تھے۔ قریبی دوستوں کے درمیان الگ کمرے میں ''پینے پلانے'' کا بھی دور چل رہا تھا۔ ان میں یہ چاروں بھی شامل تھے۔

وہ سب سے آخر میں آئی تھی اور بن بلائی تھی۔ اپارٹمنٹ کے گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ ٹیکسی والے کو اس نے باہر سے ہی کرایہ دے کر فارغ کر دیا تھا۔ وہ پارکنگ کے درمیان سے گزرنے لگی اور دانستہ اس ''رو'' سے...... جہاں وہ چھتیس، سینتیس اور اکتالیس نمبر والی ہلکے گرے رنگ کی کرولا کھڑی ہوتی۔

وہ پہلے بھی یہاں تین چار بار آچکی تھی۔ جب بھی اس کار اور اس کی نمبر پلیٹ کو دیکھتی تو اس کے اندر یہی الفاظ گویا از خود اُبھرتے۔

''کیا یہ اُس دن کے بعد استعمال میں بھی نہیں آئی؟ کس قدر گرد جمی ہوئی ہے اس پر اور ایک ہی جگہ پر کھڑی نظر آتی ہے ہمیشہ...... ہم......''

وہ ہمکاری بھرتے اور لفٹ کی جانب بڑھتے ہوئے سوچتی۔ ''یہی تو موقع ہے اور وہ بھی تو یہی موقع تھا......'' اس کا انداز جانے کیوں دل دہلا دینے والا تھا۔

گیارھویں منزل پر تقریب عروج پر تھی اور وہ اس میں شامل ہو چکی تھی۔ اس کی تیاری اور سج دھج ایسی تھی کہ خواتین اسے دیکھ کر ایک دوسرے کو کہنی مار کے سرگوشی میں پوچھتیں۔

''کون ہے یہ؟''

دل پھینک مرد ایک دوسرے کو آنکھ مار کے اور ایک بھوں اُچکا کر اشارے کی زبان میں مستفسر ہوتے۔

''کون ہے آخر یہ آفت......؟''

وہ آفت کسی کے ساتھ گھل مل نہیں رہی تھی۔ اسی سے...... مدثر مرزا کی اس پر نظر پڑ گئی اور وہ خود بھی یہی چاہتی تھی کہ اس کی ہی نظر اس پر پڑے۔ وہی ہوا۔

حالانکہ مدثر کی شمسہ جیسی خوب صورت لڑکی کے ساتھ منگنی تھی، مگر وہ اسے دیکھ کر دنگ ہی رہ گیا تھا۔ وہ بہت خوب صورت تھی، سیاہ لباس میں تو اس کا حُسن اور بھی نکھر گیا تھا۔ اس کے گورے گورے بازو اور ہاتھ مہین لباس اس کی ملائم جلد کی رنگت کو اور بھی نکھار بخش رہے تھے۔ اس کے بال اسٹائلش اور ڈائی کیے ہوئے تھے۔

مدثر کا بے اختیار جی مچلا کہ وہ اس حسین اور متناسب خدوخال کی اپسرا سے مخاطب ہو۔

اُدھر اس دلکش خاتون نے بھی اسے اپنا منتظر پا کے کچھ گھبراہٹ اور پریشان ہونے کی ایکٹنگ شروع کر دی اور مدثر کو گویا موقع مل گیا۔ وہ تیر کی طرح اس کی جانب لپکا۔

''کوئی پریشانی ہے محترمہ؟'' اس نے نہایت شستہ لہجے میں دریافت کیا۔

''جج...... جی ہاں! معاف کیجیے گا میں کسی غلط تقریب میں آگئی ہوں شاید، کیا یہ مسز دلشاد اکبر......''

''جی نہیں، یہ مدثر مرزا کی منگنی کی تقریب ہے۔'' اس نے خوش اخلاقی سے مسکرا کے کہا۔

''سوسوری...... امیں...... چلوں گی۔'' وہ بولی۔

''ہرگز نہیں، اب آپ آہی گئی ہیں تو...... کچھ نہ کچھ تو لینا ہی پڑے گا۔ آپ ہماری مہمان ہیں اب...... پلیز۔''

یہی وہ چاہتی تھی مگر مدثر کو زیادہ دیر اس کے ساتھ رہنا نامناسب لگ رہا تھا، ظاہر ہے اس کی منگنی تھی، لیکن کم بخت دل کو اس حسینہ قاتلہ نے بے قرار کر ڈالا تھا کہ اس سے رہا ہی نہیں جا رہا تھا۔ چند ایک شاطر قسم کی خواتین نے یہ بات محسوس کر کے ایک دوسرے کے کہنی کے ٹھوکے مار کے ہولے سے کہا۔ ''توبہ ہے یہ مرد ذات بھی......''

مدثر نے خاتون کی جھینپ مٹانے کی خاطر اپنی کسی ہوتی سوتی کو اسے ''کمپنی'' دینے کا کہہ دیا اور پھر ایک موقع نکال کر وہ اس سے دوبارہ ملا اور دلکش خاتون نے بھی یہ موقع غنیمت جانا، کیونکہ وہ اپنا ''کام'' جلد از جلد نمٹانا چاہتی تھی، جو اس کے لیے اتنا ہی اچھا تھا۔

اسی دوران میں اس دلکش خاتون کو ایک جھٹکا لگا، اسے وہاں ریحان بھی نظر آیا۔ وہ اس کی نظروں میں نہیں آنا چاہتی تھی، یوں بھی اسے تسلی تھی کہ ریحان کی اگر اس پر نظر پڑ بھی جاتی تو وہ بھلا اسے کب پہچان سکتا تھا۔ تاہم وہ اب عجلت میں نظر آنے لگی۔

''بڑی گھٹن سی ہو رہی ہے، اگر ذرا گیلری کی جانب چلا جائے۔ وہ...... دراصل آپ سے ایک ضروری بات بھی کہنا تھی۔'' اس نے ایک ذرا موقع نکال کر مدثر سے کہا، اندھا کیا چاہے دو آنکھیں...... مگر اب بھی وہ کشش و پنج میں ہی تھا کہ اس کے قدم خود ہی اس حسینہ کے ساتھ اُٹھتے چلے گئے، خود اس کا بھی تازہ ہوا میں سانس لینے کو جی چاہ رہا تھا۔ وہ دونوں وہیں آگئے۔

سامنے شہر کی رنگ برنگی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ وہ بہت خوش تھا کہ ایک دلکش حسینہ سے ہم کلام تھا۔

''میں نے شاید آپ کو کہیں دیکھا ہے، تین افراد کے ساتھ ایک کار میں......'' عورت نے کہا۔

''میں کئی بار دوستوں کے ساتھ کار میں رہا ہوں۔'' مدثر نے جواب میں کہا۔

''یقیناً'' خاتون بولی۔ ''اور اس کار کا نمبر چھتیس، سینتیس اور اکتالیس ہے۔''

''ہاں! لیکن......'' وہ اُلجھ گیا۔ نجانے کیوں اسے اس خاتون کا انداز دل دہلا دینے والا محسوس ہوا۔

''اور وہ کار تب سے استعمال میں ہی نہیں آئی۔ یوں جیسے ایک جگہ عرصے سے پڑے پڑے کھڑی گل سڑ گئی ہو۔''

''آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں۔'' اچانک مدثر نے کہا۔ ''آپ بہت پُراسرار خاتون محسوس ہو رہی ہیں۔

''ضرور، میرا نام......'' خاتون بتاتے ہوئے ہولے سے چیخی اور اس کا پرس چھوٹ کر ریلنگ (جنگلے) میں جا گرا اور وہیں اسٹریپ سے اٹک کر رہ گیا۔ وہ اسے اچکنے کے لیے جھکی، ہاتھ بڑھایا مگر چھو نہ سکی، مدثر نے ازراہ ہمدردی اس کی مدد کرنا چاہی اور اسے ایک طرف کر کے خود گگر پر نصف حد تک جھک گیا، کیونکہ پرس وہیں جا اٹکا تھا، پرس خالی تھا...... خاتون کے لیے اس میں کوئی کشش نہ تھی، اس نے اِدھر اُدھر دیکھا، وہاں تاریکی سی تھی اور پرے کہیں لوگوں کی آوازیں اور شور سنائی دیتا تھا، اس نے پھرتی سے جھک کر مدثر کی دونوں ٹانگوں کو پکڑ کر اوپر کر دیا، وہ پہلے ہی اپنے وزن پر نصف سے زیادہ نیچے جھکا ہوا تھا، اسی لیے خاتون کو کوئی دقت نہ ہوئی۔ مدثر...... چیختا ہوا گیارہویں منزل سے نیچے آ رہا۔ جب تک نیچے شور مچا...... خاتون پیچھے گھوم کر زینے کی طرف جا چکی تھی۔

اسے تسلی تھی کہ اس کا شکار اتنی بلندی سے گر کے بچ نہیں سکے گا۔

ریحان اس تقریب میں دیر سے پہنچا تھا اور اُسے بھی اس دل فگار واقعے پر افسوس ہوا تھا۔

☆☆☆

انسپکٹر شوکت حسین نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ رکھے تھے۔ اس کے قریب اس کا اسسٹنٹ باری شاہ موجود تھا۔

''نہیں سر! یہ دوسرا قتل نہیں ہو سکتا، نہ ہی یہ پہلے قتل کے سلسلے کی کڑی ہے۔'' باری شاہ بولا۔

''لیکن مجھے پتا نہیں کیوں ایسا لگتا ہے کہ یہ دوسرا واقعہ بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے مگر......'' انسپکٹر شوکت کہتے کہتے اُلجھ سا گیا۔

''یہ حادثہ ہے سر!'' باری اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولا۔

''کیا حادثہ ہے؟'' شوکت حسین گومگو سے لہجے میں بولا۔ یوں جیسے وہ کوئی گتھی سلجھانے کی سوچ میں محو ہو۔

''یہی سر! کہ...... جمال اختر قتل ہوا تھا، لیکن یہ مدثر مرزا...... حادثاتی موت سے ہمکنار ہوا۔'' باری نے بتایا۔

''ہو سکتا ہے، لیکن میں اس کی تحقیق کروں گا۔'' شوکت۔ قطعیت سے بولا۔ ''کیونکہ جس گیلری کی ریلنگ سے وہ نیچے گرا تھا، اس کی گگر پر ایک پرس پایا گیا ہے۔ چند ایک عینی شاہدین کے مطابق مدثر کو ایک حسین اور اجنبی خاتون کے ساتھ اس طرف جاتے دیکھا گیا تھا۔''

''بصد شوق سر! میں آپ کے ساتھ ہوں۔'' باری نے فدویانہ لہجے میں کہا۔

''کیونکہ میں جمال اختر مرڈر کیس کے حل کے قریب قریب پہنچ ہی چکا ہوں۔''

''لیکن آپ نے اس کی حسین بیوہ...... کیا نام تھا......؟'' باری یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

''شبینہ......''

''جی ہاں! اس سے آپ نے تفصیلاً بیان لے لیا تھا؟''

''لے تو لیا تھا، مگر اب نہ جانے وہ کہاں چلی گئی ہے، حالانکہ اس نے بعد میں بھی تعاون کرنے کا مجھ سے وعدہ کیا تھا۔''

''تلاش لیں گے اُسے بھی کہاں جائے گی سر!'' باری بولا اور شوکت حسین نے پھر پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

☆☆☆

مدثر مرزا کی ''حادثاتی موت'' کا دوسرا دن تھا۔ ریحان نے شبینہ سے آج ایک فیصلہ کن ملاقات طے کر ہی ڈالی تھی۔ اگرچہ شبینہ کبھی کبھار اس کے کہنے پر اس کے فلیٹ پر بھی آ جاتی تھی لیکن آج چونکہ اسے شبینہ سے خاص بات کہنا تھی اسی لیے اسے کچھ اچھا نہ لگا کہ وہ یہ خاص بات اس کے ساتھ اپنے ہی فلیٹ میں کرے، اسے یہ سب کہنا باہر ہی مناسب لگا تھا۔

وہ دونوں ڈنر پری ویو کے کنارے واقع ایک اچھے سے اوپن ائر ہوٹل میں یکجا ہوئے، کھانا کھانے کے بعد...... دونوں ساحل کنارے آ گئے۔

ان کے دائیں جانب کھلے تاروں بھرے آسمان تلے سمندر ہلکورے لے رہا تھا۔ مرطوب ہوا سبک خرام تھی اور وہ دونوں چہل قدمی کے انداز میں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے کہ ریحان نے پہلی بار فرط جذبات تلے شبینہ کا نرم و نازک ہاتھ تھام لیا، جس پر شبینہ قدرے چونک کر رک گئی۔ وہ بھی رک گیا۔

”اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا شبینہ! مجھے کہہ لینے دو...... پلیز کہہ لینے دو...... ورنہ میں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں گا۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“ شبینہ نے اس کی طرف دیکھ کر ہولے سے پوچھا۔ رات کی تاروں بھری مدھم ملگجی سی تاریکی ہر سُو طاری تھی۔ ایک طلسماتی سا سحر تھا ماحول میں بھی اور ریحان کے جذبات میں بھی......

”میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں، شبینہ! میں اب تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا، روز تہیہ کرتا تھا کہ تم سے.... یہ سب کہہ دوں گا مگر ہمت نہیں کر پاتا تھا کہ تم ناراض نہ ہو جاؤ اور میں تمہاری اس دوستی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھوں۔“

وہ خاموش رہی۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا، یوں لگا جیسے اسے ریحان کے جذبات اور اس کے اظہار دل سے چنداں دلچسپی نہ ہو۔

”تمہیں برا تو نہیں لگا، شبینہ؟“ اس کا چہرہ اتھاہ خاموشی میں پا کر ریحان نے پوچھا۔ وہ اندر سے اب بھی تھوڑا ڈرا ہوا تھا۔ اس کی بے چین نظریں شبینہ کے حسین اور مرطوب ساحلی ہواؤں سے ...... اُڑتے گھنے بالوں سے لہراتے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”نہیں۔“ شبینہ نے ہولے سے کہا اور آگے قدم بڑھائے۔ ہاتھ اس نے آہستگی سے ریحان کی گرفت سے چھڑا لیا تھا۔ وہ دونوں پھر قدم بہ قدم چلنے لگے۔

”شکر ہے خدا کا.....“ حوصلہ پا کر ریحان ترنگ میں آ گیا۔ مزید ہمت کر کے بولا۔ ”میں تو تمہاری اس..... چپ پر ڈر گیا تھا کہ بس اب دوستی بھی ختم.....“

شبینہ پھر بھی کچھ نہ بولی، یوں جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ہو۔

”میں واقعی تم سے محبت کرنے لگا ہوں شبینہ! یقین کرو میں خود حیران ہوں، اپنے آپ پر..... یہ مجھے کیا ہو گیا ہے آخر.....؟ آج سے پہلے کیوں نہیں مجھے کسی لڑکی نے متاثر.... کیا پھر تم ہی کیوں، تب میں سمجھا کہ محبت شاید اسی کو کہتے ہیں۔“

وہ چپ ہو گیا۔ شبینہ تو کچھ بولی نہیں۔ دونوں کچھ اور آگے آ گئے۔

”تم کچھ بول نہیں رہی ہو؟“ بالآخر ریحان نے اس سے کہا۔

”کیا کہوں.....؟ تم میرے بارے میں کیا جانتے ہو؟“ شبینہ بولی۔

”جاننے کی کوشش تو کی تھی مگر تم نے ہی دھمکی دے دی تھی کہ اگر مجھ سے دوستی قائم رکھنا چاہتے ہو تو میرے بارے میں کچھ بھی جاننے کی کوشش مت کرو کہ تم کون ہو، کیا ہو؟ وغیرہ.....؟“ ریحان مسکرا کر کہا۔

”ہاں! میں نے کہا تھا۔“ شبینہ نے اعتراف کیا۔

”میں اب بھی کچھ جاننے کی کوشش نہیں کروں گا، بس، تم میری زندگی میں آجاؤ یہی کافی ہے میرے لیے۔“ ریحان بُری طرح فریفتہ ہو رہا تھا۔

”سوچ لو، ایسا نہ ہو کہ بعد میں میری حقیقت پتا چلے تو تمہیں پچھتاوا ہو اور......“ شبینہ عجیب سے انداز میں یہ کہتے ہوئے رکی۔ وہ دونوں رک گئے۔

پھر ریحان نے وفورِ جذبات تلے اپنے دونوں ہاتھوں سے شبینہ کو تھام لیا۔ اس کی پیاسی اور پُرشوق نظریں شبینہ کے صبیح چہرے پر جم گئیں۔ وہ بھی کشادہ آنکھیں اور گھنیری پلکیں وا کیے اس کا چہرہ تکتی رہی، پھر وہ جیسے دل کی گہرائیوں سے بولا۔

”ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ بعد میں مجھے کسی قسم کا کوئی پچھتاوا ہو، تم مل گئیں اور بس میری تنہا اور اُدھوری زندگی مکمل ہو گئی۔“

”نہیں۔“ شبینہ نے دھیرے سے کہا۔ ریحان بے چین ہو گیا۔ وہ آگے بولی۔ ”میں تم سے شادی سے پہلے اپنے بارے میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی۔ اب واپس چلو۔“

ریحان خوش ہو گیا۔ اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ شبینہ نے اسے رد نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

آج وہ پھر بڑے اہتمام سے تیار ہو رہی تھی۔ یہ تیاری وہ اسی وقت کرتی تھی جب اُسے کوئی اگلا شکار، شکار کرنا ہوتا تھا۔ جس طرح اس نے مدثر مرزا کا کام تمام کیا تھا۔ اب یہی کچھ وہ اپنے دوسرے شکار شمشاد کے ساتھ کرنے جا رہی تھی۔ اس کے بعد اس کا آخری شکار...... ظہیر شاہ تھا۔

تیاری کے بعد اس نے ایک فائل اُٹھائی اور اپنے فلیٹ کو تالا لگایا اور نکل گئی۔

☆☆☆

مدثر مرزا کی موت کو اب تک حادثاتی ہی قرار دیا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے تینوں دوستوں، شمشاد، ظہیر شاہ اور ریحان کا بھی یہی خیال تھا۔ ریحان تو کم ہی ان

کے درمیان ہوتا تھا، البتہ یہ تینوں زیادہ وقت ساتھ گزارتے تھے۔ اب وہ دورہ گئے تھے۔

اُس روز شمشاد اپنے آفس میں دیر تک رکا رہا۔ اس کا اپنا ایک ذاتی پبلشنگ ادارہ تھا۔ وہ ناول کتابیں اور زیادہ تر معروف اور شوقیہ شاعروں کی کتابیں شائع کیا کرتا تھا، جو پیسے دے کر اس سے اپنی کتابیں چھپواتے تھے۔

اس وقت کمپوزیشن سیکشن کے چاروں افراد جا چکے تھے، چپراسی موجود تھا۔ ایک خاتون سیکریٹری تھی جمیلہ وہ بھی اجازت لے کر جا چکی تھی۔ چپراسی سجاد کو اس نے روکے رکھا تھا اور اسی نے اس کے آفس روم میں آکر اطلاع دی کہ کوئی خاتون آئی ہیں۔

کسی خاتون کا سن کر اس کا دل یکبارگی دھڑکا۔ اس کا کام ہی ایسا تھا کہ زیادہ تر وہ خواتین جوان لڑکیاں اس کے پاس اپنی کتابوں وغیرہ کی اشاعت کے لیے آیا کرتی تھیں جنہیں راتوں رات شاعرہ اور ادیبہ بننے کا جنون سر چڑھتا تھا۔ شمشاد بھی کوئی پارسا آدمی نہ تھا۔ وہ ایسی لڑکیوں اور خواتین سے مل کر خوش ہوتا تھا۔

اس نے سجاد کو فوراً اسے اندر بھیجنے کو کہا۔ ذرا دیر گزری تھی کہ ایک خاتون اس کے کمرے میں داخل ہوئی اور شمشاد اسے تکتا ہی رہ گیا۔ وہ واقعی دلکش خدوخال کی مالک تھی۔ بال گہرے ڈائی کیے ہوئے تھے اور لباس بھی سلیقے کا مگر قیامت کے رنگ بکھیرتا ہوا تھا۔ گداز اور بھرے بھرے سرخ ہونٹ نہایت کشش انگیز تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک فائل دبی ہوئی تھی۔

اس نے نہایت مترنم سی آواز میں شمشاد کو سلام کیا۔ وہ تو جیسے سلام کا جواب دینا ہی بھول گیا یکدم سنبھلتے ہی جواب دیا اور اسے بیٹھنے کا کہا۔ اسے یاد آچکا تھا کہ وہ ایک کامیاب پبلشنگ ادارے کا مالک ہے اور یہاں خواتین و حضرات آتے ہی رہتے ہیں۔

''جی فرمایئے......؟'' اس نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔

''جی، میرا نام...... آنسہ شائستہ ہے اور میں ساحل تخلص کرتی ہوں۔'' اس نے دلنشین مسکراہٹ شمشاد کی طرف پھینکتے ہوئے کہنا شروع کیا پھر فائل اس کی میز پر رکھتے ہوئے بولی۔

''میں شاعری کرتی ہوں۔ چند ایک رسائل میں وہ چھپ چکی ہیں، میرا خیال ہے مواد اتنا ہو چکا ہے کہ اب مجموعۂ کلام چھپ سکتا ہے۔ باقی آپ کی مدد اور رہنمائی درکار ہوگی۔''

''بہت خوب!'' شمشاد نے کہا۔ پھر اس کی فائل کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ شائستہ نے فوراً وہ اس کی جانب کھسکا دی۔ شمشاد نے رسماً ہی فائل کے اندر ٹائپ شدہ شاعری کو دیکھا، پھر فائل بند کر کے اپنی میز کی دراز میں رکھ دی اور اس سے مخاطب ہو کے بولا۔

''ٹھیک ہے مس شائستہ! میں یہ دیکھ لوں گا اور اپنے کسی شاعر سے اس کی تصحیح بھی کرانے کی کوشش کروں گا۔ تب ہی اس کی اشاعت یا ناقابلِ اشاعت کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔''

''شکریہ جناب! آپ نے میری حوصلہ افزائی فرمائی۔'' شائستہ ایک دم خوش ہو کے بولی۔ ''کیا مجھے اس مجموعے کو چھپوانے کے لیے پیسے دینا ہوں گے؟''

''ہرگز نہیں۔'' شمشاد نے فوراً اپنے سر کو دائیں بائیں جنبش دی۔ اگر اس حسین خاتون کی جگہ کوئی اور عام شکل وصورت کی عورت ہوتی یہی سر اس کا دائیں بائیں کے بجائے اُوپر اور نیچے حرکت کرتا۔

''اچھی کتاب تو ہاتھوں ہاتھ بک جاتی ہے۔ بلکہ ہم آپ کو رائلٹی کی صورت میں یہ مجموعہ چھپنے کے بعد معقول معاوضہ دیں گے۔''

''آپ کو کیسے پڑھے بغیر اندازہ ہو گیا کہ......؟'' شائستہ نے دانستہ آخر میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو شمشاد کو فوراً ہی اپنی بے جا گاوٹ کا احساس ہوا۔ جلدی سے بات بناتے ہوئے بولا۔

''آپ خود ہی تو کہہ رہی ہیں کہ آپ کی شاعری رسائل میں چھپ چکی ہے، ظاہر ہے اب وہ غیر معیاری شاعری تو چھاپنے سے رہے۔''

''شکریہ، مجھے اجازت ہے؟'' شائستہ نے ایک اور دل کش مسکراہٹ سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا اور شمشاد جو اَب تک اس کے حُسنِ صبیح... اور دل فریب مسکراہٹوں پر فریفتہ ہو چلا تھا، تقریباً اُچھل کر بولا۔

''ارے نہیں، آپ چائے پی کر ہی جایئے......''

شائستہ نے کچھ نہیں کہا۔ چاہتی وہ بھی یہی تھی۔ شمشاد نے بیل دے کر چپراسی سجاد کو اندر بلایا اور اسے چائے لانے کا کہا۔

تھوڑی دیر میں چائے آگئی۔ دونوں کپ سجاد نے میز پر رکھ دیے اور شمشاد سے بولا۔

''صاحب! میں چلوں، دیر ہو رہی ہے، مجھے اپنی

بیوی کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا تھا۔"

"ہاں...... ہاں...... جاؤ...... تم......" شمشاد نے فوراً اُسے اجازت دے دی۔

"اس طرف شیلف میں...... شاید کلاسک شاعری کے مجموعے رکھے ہوئے ہیں...... اگر میں ان میں سے خریدنا چاہوں تو......" کہتے ہوئے شائستہ نے جملہ ادھورا چھوڑا تو اس کی توقع کے عین مطابق شمشاد پھر اُچھلا۔

"نہیں...... نہیں، خریدیں کیوں؟" وہ یوں بولا، جیسے کہنا چاہ رہا ہو کہ خریدیں آپ کے دشمن، میں تو مفت دینا چاہتا ہوں۔

وہ اُٹھ کر فوراً دائیں جانب کے ایک شیلف کی جانب بڑھ گیا اور جب تک وہ اندر سے دو تین کتابیں چن کر دوبارہ اپنی چیئر تک پہنچا...... مس شائستہ اپنا "کام" کر چکی تھی۔ اسے چند سیکنڈ لگے تھے، اپنے گریبان سے پوٹاشیم زہر کی پُڑیا نکال کر شمشاد کی چائے کے کپ میں گھولنے میں۔

وہ چائے پینے لگے اور اس دوران باتیں بھی کرتے رہے۔ شمشاد نے چند گھونٹ ہی چائے کے بھرے تھے کہ اچانک اس کی طبیعت بگڑنے لگی اور اس نے اپنا سینہ تھام لیا، چائے کا کپ میز پر الٹ دیا اور سر میز کی سطح پر پٹخنے لگا۔

شائستہ کے چہرے پر نفرت و انتقام کے سائے پھیل گئے، جہاں ذرا دیر پہلے ہی دلربا مسکراہٹیں رقصاں تھیں۔

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور اسی لہجے میں بولی تو اس کی آواز اور لہجہ کسی زخمی ناگن جیسا تھا۔

"میں آنسہ شائستہ نہیں، مسز جمال اختر ہوں، مسٹر شمشاد......!"

شمشاد مر چکا تھا۔ وہ خاموشی سے لوٹ گئی۔

☆☆☆

"یہ بھی جمال اختر مرڈر کیس کی کڑی ہے۔" انسپکٹر شوکت حسین نے جھلا کر میز کی سطح پر ہاتھ مارا۔ اس کا اسسٹنٹ جو اس کے دائیں جانب والی کرسی پر بیٹھا، اپنی ناک کے گرد منڈلانے والی مکھی کو کافی دیر سے چھاپنے کی کوشش میں تھا کہ اُچھل پڑا۔

"کیا ہوا......؟" شوکت حسین نے چونک کر پوچھا۔

"پکڑی گئی سالی!" باری شاہ مٹھی بند کرتے ہوئے فاتحانہ لہجے میں بولا۔

"تمہارا خیال ہے کہ قتل کی اِن وارداتوں میں کسی عورت کا ہاتھ ہے؟" شوکت حسین نے بھویں اُچکائیں، ابھی باری شاہ اس مکھی کے بارے میں بتانا ہی چاہتا تھا۔۔

جو اس نے بڑی مشکلوں سے اپنی مٹھی میں بند کر ڈالی تھی کہ انسپکٹر یک دم چونک پڑا اور جوشیلے انداز میں کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنے نہایت "قابل" اسسٹنٹ باری شاہ کو گلے لگا لیا۔ باری شاہ حیران و پریشان رہ گیا۔

"یہ تم نے ٹھیک کلیو ڈھونڈا ہے باری شاہ......! اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں تھا کہ قتل کی اِن وارداتوں میں مرد کے بجائے کوئی عورت بھی ہوسکتی ہے، کیونکہ ہم اس پرس کو بھول رہے ہیں جو مدثر مرزا کی حادثاتی موت والی جگہ سے ملا تھا، اگرچہ وہ خالی تھا۔"

"جی...... جی، سر......! آپ نے ٹھیک کہا۔" باری شاہ شاید اب تک اپنی مفت کی تعریف کا مطلب سمجھ چکا تھا اور بالآخر اس نے مشکلوں سے پکڑی ہوئی مکھی مٹھی کھول کر چھوڑ دی۔ وہ اپنے "سر" کو اب اس مکھی کے بارے میں نہیں بتانا چاہتا تھا۔ کیونکہ اب وہ اس کی "ذہانت" کا قائل ہوگیا تھا۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارے کوڑھ مغز دماغ میں ایسا باریک اور گہرا کلیو آیا کس طرح......" انسپکٹر شوکت کی حیرت جاری تھی۔ باری شاہ کا منہ بن گیا۔

"سر جی! میرے ذہن میں تو ایسے کلیو اور نکتہ رس باتیں آتی ہی رہتی ہیں اور وہ میں آپ کے گوش گزار کرتا بھی رہتا ہوں، مگر آپ......"

"اچھا...... اچھا...... چھوڑو اب...... بیٹھو، اب یہ بتاؤ کہ اِن وارداتوں میں کسی عورت کا ہاتھ ہو تو ہمیں کس رخ اور کس سمت پر اپنی تفتیش کو آگے بڑھانا...... چاہیے؟" شوکت حسین بولا۔

"سر جی! اگر آپ اس بات پر مُصر ہیں کہ مدثر مرزا کا حادثہ بھی قتل تھا، نیز وہ اس سے پہلے قتل ہونے والے جمال اختر اور تیسرے نمبر پر قتل ہونے والے شمشاد کا تعلق بھی اسی کڑی سے ہے تو......" وہ سوچنے کے انداز میں ذرا رکا۔

"اسی ڈگر پر سوچو، باری شاہ! تم بھی اور میں بھی...... شروع سے آخر تک...... بلکہ اب تک...... پہلی واردات سے...... جمال اختر کے قتل سے...... تصور کرو، ضرور کوئی نہ کوئی بات آئے گی ذہن میں......"

انسپکٹر شوکت نے کہا اور باری شاہ سر دُھننے لگا۔ دونوں عقل اور سوچوں کے گھوڑے دوڑانے لگے لیکن افسوس وہ ابھی تک...... اصل قاتل سے کوسوں دور تھے۔

☆☆☆

ریحان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ بار بار اپنی اس

ہمت اور حوصلے کی خود کو داد دیے جا رہا تھا کہ بالآخر آج اس نے اپنے دل کی بات شبینہ سے کہہ ڈالی تھی اور نہ صرف یہ بلکہ کامیاب بھی رہا تھا، گویا اس نے شبینہ کا دل جیت لیا تھا مگر نہیں...... ابھی شاید دل نہیں...... شبینہ کے ہامی بھرتے ہی ریحان کے من میں یہ خواہش ابھری کہ شبینہ کا ماضی کیا ہے؟ اسے تسلی تھی کہ وہ اسے ضرور بتائے گی، جیسا کہ اس نے وعدہ کر رکھا تھا، وہ مطمئن تھا۔ یوں بھی اسے کوئی پروانہ تھی کہ وہ کون تھی، کیا تھی؟ اس کے لیے تو یہی بہت تھا کہ اس خوب صورت اور دلکش خاتون جس سے وہ بے انتہا محبت کرنے لگا تھا، وہ ایک دن اس کی بیوی بننے والی تھی۔

ان سب باتوں کے باوجود ریحان کے دل و دماغ کو ایک خیال ضرور بے چین کرتا تھا کہ شبینہ کی شخصیت اسرار میں قید ہے۔ وہ جب بھی شبینہ سے ملتا تو یوں لگتا جیسے وہ اس کے سامنے بھی چھپی ہوئی ہے، اس کی ذات ظاہر ہوتے ہوئے بھی مخفی ہے۔

اُس روز...... اسے ظہیر شاہ کا فون آ گیا۔

''ارے بھئی کہاں ہوتے ہو یار! کچھ دوستوں کی بھی خیر خیریت معلوم ہے کہ نہیں......؟''

ریحان تھوڑا شرمندہ ہوا، یہ حقیقت تھی کہ...... وہ آج کل دوستوں سے کم ہی ملنے لگا تھا۔ وجہ یہی تھی کہ اس کے دل و دماغ میں ہر وقت شبینہ ہی سوار رہتی تھی۔

''ارے نہیں یار ظہیر میاں! ایسی بات نہیں ہے، بس، آج کل مصروفیت زیادہ ہو گئی ہے۔ تم سناؤ کیسے ہو، شمشاد کیسا ہے؟''

''وہ تو اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اسے قتل کر دیا گیا ہے۔ زہر دے کر...... تم اپنی دنیا میں مگن رہو بھائی! خدا حافظ......'' یہ کہتے ہوئے ظہیر شاہ نے غصے سے رابطہ منقطع کر دیا اور ریحان بھونچکا... سا رہ گیا اور 'ہیلو...... ہیلو' کرتا رہا۔

''یہ کیا ہو گیا؟ شمشاد کو کس نے قتل کر ڈالا؟'' وہ سوچنے لگا۔

☆☆☆

وہ اپنے فلیٹ میں آئی تو اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔

اس نے میک اپ صاف کیا، واش روم میں فریش ہونے کے بعد وہ لاؤنج میں آ بیٹھی۔

''بس، اب ایک رہ گیا...... ظہیر شاہ......'' وہ نفرت خیز لہجے میں بڑبڑائی...... اس نے اپنا سر کرسی کی پشت گاہ سے ٹکا دیا۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ ماضی کا ایک منظر کسی فلمی ٹریلر کی طرح اس کی بند آنکھوں کے تصور اور دماغ کی اسکرین پر چلنا شروع ہو گیا۔

وہ ایک شادی کی تقریب تھی۔ دلہن کی رخصتی ہو رہی تھی۔ دونوں ہی ایک دوسرے کو پا کر بہت خوش نظر آ رہے تھے، کیونکہ یہ ان کی محبت کی شادی تھی۔ دولہا جمال اختر اور دلہن شبینہ اختر ایک دوسرے کو مسرور نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

شادی ہال سے دونوں بچ دھج کے ساتھ باہر آ رہے تھے، سامنے ہی ان کی پھولوں اور سنہری تاروں سے سجی کار کھڑی تھی۔ ابھی وہ سیڑھیوں پر ہی تھے۔ اچانک ایک طرف سے ایک کار انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ نمودار ہوئی، اس کی رفتار سے پتا لگتا تھا کہ اندر بیٹھے ہوئے افراد یا تو پیے ہوئے تھے یا پھر ان کی یہ دانستہ حرکت تھی، کیونکہ اگلے ہی لمحے ان کی کار ایک زوردار دھماکے سے دولہا دلہن کی سجی سجائی کار سے جا ٹکرائی، ٹکرانے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے بدمست کار کے ڈرائیور نے سجی ہوئی کار سے ٹکرانے سے اپنی کار کو بچانے کی کوشش چاہی تھی، مگر پھر بھی وہ ایک سائڈ سے ٹکرا گئی، ایک دھماکا ہوا...... لوگوں کی چیخیں اُبھریں...... پھر دوسرا دھماکا...... یہ پستول چلنے کا تھا...... اور دولہا جمال اختر کی چیخ اُبھری...... وہ گرا...... دلہن شبینہ اپنے دولہا کو سنبھالنے کو لپکی تھی کہ چند لوگوں نے اسے سنبھالا دیا۔ ٹکرانے والی کار جا چکی تھی۔ سجی ہوئی کار تباہ ہو چکی تھی۔

دولہا جمال اختر خون میں لت پت پڑا تھا۔ اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر سرخ روشندان تھا۔ دلہن شبینہ بس، چند لمحہ کے لیے سکتے میں مبتلا ہوئی اور پھر نجانے کہاں سے اس کے اندر پہاڑ جیسے حوصلے نے انگڑائی لی اور وہ کچھ ملی جلی آوازیں سننے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ ان آوازوں کو بھی نہیں جھٹلا سکتی تھی جو عینی شاہدین تھے۔ مگر بس تبصروں کی حد تک...... پولیس میں کسی نے بھی کوئی بیان دینے کی ہمت نہیں کی تھی۔

''قاتل اسی کار میں تھے...... تین بندے تھے...... کار کا نمبر...... میں نے نوٹ کر لیا تھا...... چھتیس، سینتیس اور اکتالیس...... میں نے اس کار کا رنگ نوٹ کیا تھا۔ ہلکے گرے رنگ میں کرولا تھی، ماڈل یہ تھا۔''

بس...... اس کے بعد دلہن شبینہ کو سب سنبھالنے لگے۔ وہ جیسے پتھر کی مورت میں بدل گئی تھی۔ ایسا پتھر جس کے نیچے اَن گنت چنگاریاں دبی رہ گئی تھیں...... انہی چنگاریوں میں سلگتی ہوئی... بدنصیب دلہن... شبینہ...... اُن

تینوں کار سواروں سے اپنے محبوب دولہا اپنے شوہر جمال اختر کے قتل کے انتقام کی قسم کھا چکی تھی۔

اس نے تھوڑے ہی عرصے میں مذکورہ نمبر والی کار کے تینوں سواروں کو تلاش کر لیا تھا۔ ان تینوں کے نام، بالترتیب، مدثر، ظہیر اور شمشاد تھے۔

اس کے بعد وہ ایک دم ماضی کے بھنور سے اُبھر آئی۔ اس کی سانسیں تیز چل رہی تھیں، ماضی کے اس جگر خراش باب کو یاد کرتے ہی اس کا حسین چہرہ سرخ اور آتشِ انتقام سے مسخ ہو کر رہ گیا تھا۔

''بس! اب ایک رہ گیا...... ظہیر شاہ...... تمہیں بھی زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ بہت جلد تم بھی اپنے باقی دونوں ساتھیوں کے پاس پہنچ جاؤ گے۔'' اس کی بڑبڑاہٹ میں زخمی شیرنی کی غراہٹ تھی۔

اگلے دن وہ اپنے تیسرے اور آخری شکار ظہیر شاہ کو ٹھکانے لگانے کے لیے پوری تیاری کے ساتھ فلیٹ سے نکلی تھی۔

☆☆☆

ریحان...... حسبِ سابق اپنے فلیٹ میں تنہا موجود تھا۔ اس کے دل و دماغ میں شبینہ کا خیال رقصاں تھا جبکہ سماعتوں میں...... ظہیر شاہ کے الفاظ گونج رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے دوستوں کے ساتھ آخر کیا ڈراما پیش آ رہا ہے اور کیوں؟ اگرچہ اسے ان کی کچھ زیادہ فکر نہ تھی، جیسا کہ مذکور ہو چکا ان سے وہ محض وقت گزاری کے لیے ہی مل لیا کرتا تھا، باقی اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ شبینہ جیسی ساتھی ملنے کے بعد وہ یہ ملنا بھی چھوڑ دے گا۔

شبینہ نے اُسے خوش خبری دے دی تھی کہ وہ اپنا ایک آخری کام نمٹا لے اس کے بعد وہ دونوں ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں گے۔ یہ تصور ہی اس کے لیے...... جاں فزا تھا، اسی لیے وہ، ظہیر شاہ کی باتوں پر زیادہ غور نہ کر سکا۔ وہ اس تصور سے ہی نہال ہوا جا رہا تھا کہ عنقریب وہ اور شبینہ شادی کے بندھن میں بندھنے والے تھے۔

☆☆☆

ظہیر شاہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر اُس کے دونوں دوستوں کی کس کے ساتھ دشمنی تھی؟ پہلے مدثر مرزا ہلاک ہوا، جس کی حادثاتی موت کو پولیس نے قتل کا عنوان دیا تھا، جبکہ ظہیر بھی یہی سمجھے ہوئے تھا کہ مدثر مرزا کو دھکا نہیں دیا گیا تھا بلکہ وہ خود ہی کسی غلطی کے سبب اپنے گیارھویں اپارٹمنٹ کی گیلری سے گرا تھا، پھر شمشاد کو زہر دے کر ہلاک کرنے کی خبر نے اسے دہلا کر رکھ دیا۔

وہ اپنے دماغ پر زور دیتا رہا کہ کیا میں بھی اُس نامعلوم قاتل کا نشانہ بننے والا ہوں؟ مگر کیوں......؟ ہو سکتا ہے، اس پُراسرار قاتل کی صرف مدثر مرزا اور شمشاد سے ہی دشمنی ہو، کوئی ضروری تو نہیں کہ مجھ سے بھی ہو......؟ وہ خود کو تسلیاں دیتا رہا۔ شہر چھوڑنے کا بھی کچھ عرصے کے لیے ارادہ باندھتا رہا...... وہ تنہا اپنے فلیٹ میں موجود انہی باتوں میں سر کھپا رہا تھا کہ اچانک کال بیل بجی اور وہ چونک گیا۔ تاہم وہ اُٹھ کر دروازے کی طرف گیا اور اندر سے ہی پوچھا۔

''کون؟''

''کیا مسز شاہد کمال کا یہی فلیٹ ہے؟'' باہر سے ایک نسوانی مترنم سی آواز آئی، جسے سنتے ہی ظہیر کا دل مچلا اور اس نے دروازہ کھول دیا، سامنے ایک حسین و جمیل اپسرا پر نظر پڑی مگر دوسرے ہی لمحے اس نے اس کے ہاتھ میں ایک ٹوٹو لیڈیز پسٹل بھی دیکھ لیا۔

''بغیر کوئی آواز نکالے اندر چلو...... فوراً۔'' حسینہ نے سرد لہجے میں کہا۔

''مم...... میں......'' اس کی آواز حلق میں اٹکنے لگی۔

''جلدی، ورنہ اِدھر ہی تمہارا کام تمام کر ڈالوں گی۔'' حسینہ نے دوبارہ تہدید کی۔ اس کی آنکھوں کی سنگ دلی اور

رنگینی

''آپ کی کہانی میں رنگینی بہت زیادہ ہے۔ معذرت خواہ ہیں ہم اسے نہیں چھاپ سکتے۔'' ایڈیٹر نے مسودہ مصنف کو واپس کرتے ہوئے کہا۔

''رنگینی؟'' مصنف نے حیرت سے کہا۔ ''میری کہانی میں آپ کو رنگینی کہاں نظر آ گئی؟''

''پہلے صفحے پر ہیروئن کے باپ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا دوسرے صفحے پر ہیروئن کے ہونٹ سردی سے نیلے پڑ گئے۔ تیسرے صفحے پر ہیرو کے دوست کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ گیا۔ چوتھے صفحے پر ہیروئن شرم سے سرخ ہو گئی۔ پانچویں صفحے پر ولن کا چہرہ غصے سے سیاہ نظر آنے لگا۔ چھٹے صفحے پر لڑائی میں ہیرو کے چہرے پر نیل پڑ گئے۔ اس سے زیادہ رنگینی اور کیا ہو سکتی ہے؟'' ایڈیٹر صاحب تلملا کے بولے۔

عفان آزاد کی کراچی سے رہنمائی

قطعی لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ اپنے خوف ناک ارادے پر عمل کرنے کے لیے ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگائے گی۔
ظہیر اُلٹے قدموں پیچھے پلٹ گیا اور شبینہ نے دروازہ بند کر دیا۔
ظہیر کو ایک کرسی پر بیٹھنے کا حکم ملا۔ وہ سخت خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔
''تمہارے دن گنے جا چکے ہیں ظہیر شاہ...... !مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' بالآخر شبینہ نے چنگاری برساتی نگاہوں سے اس کی طرف گھور کر کہا۔ اس کے لہجے سے ازحد نفرت و انتقام کے شعلے بھڑکتے محسوس ہوتے تھے۔
''لل...... لیکن......'' وہ اتنا ہی کہہ سکا تھا کہ دوسرے ہی لمحے اس کی جانب اٹھے ہوئے پسٹل کی نال سے شعلہ برآمد ہوا اور ظہیر کی پیشانی پر سرخ روشندان بن گیا۔
چھوٹے سے ٹو ٹو لیڈیز پسٹل سے ایسی ہی آواز نکلی تھی جیسے کوئی پٹاخا چلا ہو یا کسی نے جوس کے خالی ڈبے کو پاؤں کے نیچے رکھ کر دھماکا کیا ہو۔
وہ اپنا کام، تمام کر کے پلٹ گئی۔
☆☆☆
اپنے فلیٹ میں پہنچتے ہی اس نے سکون کا سانس لیا اور اس نے وہ ساری چیزیں جلا کر سنک میں بہا دیں جو اَب تک اپنے محبوب شوہر کے ان تینوں قاتلوں کے لیے مستعمل رہی تھیں۔ آلۂ قتل وہ پہلے ہی کسی گندے نالے میں پھینک چکی تھی۔
اب وہ اپنی اصل شکل و صورت میں ہی رہنا چاہتی تھی۔
دو دن بیت چلے۔ اخبارات میں خوب پولیس پر لے دے ہو رہی تھی۔ شبینہ تازہ اخبار ہاتھ میں لیے زہریلے طنز سے بڑبڑائی۔
''جمال اختر کے سلسلے میں بھی تو پولیس نے کچھ نہیں کیا تھا۔ بہت سے عینی شاہدین موجود تھے، کسی سے کچھ نہیں اُگلوا سکی تھی۔''
آج میرا انتقام پورا ہوا۔
تب ہی اچانک اُس کے تصور میں ریحان کی شبیہ اُبھری۔
''ہمم......'' ریحان کا خیال آتے ہی اُس کے ہونٹوں سے پُرسوچ انداز میں ایک ہمکاری برآمد ہوئی تھی۔
''اچھا ہے۔ مجھ سے بے اندازہ محبت کرتا ہے۔ زندگی تو گزارنی ہے نا...... کرلوں گی اپنے اس مجنوں کے ساتھ......''
☆☆☆
ریحان کے تو مارے خوشی کے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے تھے۔ کیونکہ اب ''چاند'' اس کے دامن میں اُترنے والا تھا۔
لیکن...... ابھی ایک حدِ فاصل باقی تھی ان کے درمیان...... شبینہ کو اپنا وعدہ پورا کرنا تھا، اپنی حقیقت بتا کر...... اور پھر سمندر کنارے واقع ایک اوپن ائر ریسٹورنٹ میں شبینہ نے بہت آہستہ آہستہ...... اسے سب بتا ڈالا۔ جسے سن کر ریحان ایک لمحے کو سن ہو کر رہ گیا، جس کی شبینہ کو بھی پوری توقع تھی۔
''تم اگر چاہو تو...... یہ حقیقت جان لینے کے بعد مجھ سے ہمیشہ کے لیے قطع تعلق کر سکتے ہو ریحان! مجھے کوئی افسوس نہیں ہو گا۔ ظاہر ہے میں بھی سمجھتی ہوں کہ میرے بارے...... میں سب جان لینے کے بعد تم کبھی نہیں چاہو گے کہ تم ایک قاتلہ کو اپنی بیوی بناؤ۔'' ساری حقیقت سن لینے کے بعد حسبِ توقع ریحان کو گم صم پا کر شبینہ نے سنجیدگی سے کہا تھا۔
''کیونکہ میں اپنے محبوب شوہر اختر جمال کی موت کا انتقام اُن تینوں سے لے چکی ہوں، اگر تم پولیس کو بھی بتا دو گے تب بھی مجھے کوئی پروا نہ ہو گی۔''
''یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو شبینہ؟'' ریحان جیسے اس کی آخری بات پر ایک دم چونک کر بولا۔
''میرے ذہن میں تمہارے متعلق ایسی کوئی بھی بات نہیں......''
یہ سن کر شبینہ کے نرم ہونٹوں پر ہلکی مسکراہٹ اُبھری تھی۔ جیسے اسے یہی سننے کی توقع تھی۔
''میں تمہیں پہلے بھی اتنا ہی چاہتا تھا اور اب بھی...... اتنا ہی چاہتا رہوں گا۔ بے شک یہ میرے لیے ایک شاک سہی...... مگر بس...... اب بھول جاؤ اور میرے ساتھ ایک نئی زندگی کی ابتدا کرو۔''
شبینہ کے ہونٹوں پر ہنوز وہی مسکراہٹ رقصاں تھی۔
☆☆☆
اُن دونوں نے ایک نئی زندگی کی ابتدا شادی کے بندھن میں بندھ جانے پر کر ڈالی۔
ریحان، شبینہ جیسی حسین بیوی کو پا کر بے حد خوش تھا، لیکن...... گزرتے دنوں کے تھوڑے ہی عرصے میں شبینہ

جان چکی تھی کہ...... اُس کا شوہر ریحان...... کسی دباؤ میں ہے۔ وہ کھٹک گئی۔ اسے لگا ریحان کے اندر ہی اندر کچھ ''پل'' رہا ہے، کچھ ایسا ''پک'' رہا ہے، جس کے سبب وہ کھل کر وہ کچھ نہیں کر پار ہا جیسا کہ...... اسے اس کی پہلے والی محبت کی گرمی اور گرم جوشی کی ...... توقع تھی۔ کیوں......؟ وہ اس سے محبت بھری باتیں کرتے کرتے ایک دم چپ ہو جاتا، کہیں کھو جاتا۔ کھونا تو اسے شبینہ جیسی نئی نویلی اور حسین بیوی کی محبت میں چاہیے تھا مگر وہ کہیں اور گم ہو جاتا۔

''میرا خیال ہے ریحان! شادی کا فیصلہ جذباتی تھا۔''

ایک دن شبینہ سے نہ رہا گیا۔ ''تم نے مجھ سے میری حقیقت جان لینے کے بعد جذبات میں آکر شادی تو کر لی، لیکن شاید اب تمہیں اس پر پچھتاوا ہو رہا ہے، ریحان! ٹھیک ہے، مجھے یہ بھی قبول ہے، تم مجھے چھوڑ سکتے ہو، میں بالکل بھی بُرا نہیں مناؤں گی۔''

شبینہ کا لہجہ ایک دم سرد ہو گیا۔ ریحان نے بے قراری سے اسے خود سے قریب کر لیا اور بے طرح تڑپ کر بولا۔

''یہ تم نے کیا کہہ دیا شبینہ! میں تو تمہارے بغیر رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا اور تم چھوڑ دینے کی بات کر رہی ہو، تم تو میری زندگی ہو میری روح ہو، بھلا روح کو خود کے اندر سے نکال کر میں کیسے زندہ رہ سکتا ہوں......؟ میں نے تم سے سچی محبت کی ہے۔''

''تو پھر...... تو پھر...... تمہارے پیار میں وہ پہلے والی گرم جوشی کیوں نہیں، ریحان؟ نہیں، کوئی تو بات ہے، جو تم مجھ سے چھپا رہے ہو۔ تم اگر مجھ سے سچی محبت کرتے ہو تو یہ کبھی بھی نہیں چاہو گے کہ ہمارے بیچ کوئی اَن دیکھی دیوار ہو جسے تم بھی محسوس نہ کرو۔ بتاؤ مجھے...... کیا بات ہے پھر؟''

شبینہ نے بھی صاف کہہ دیا۔ تاہم اسے ریحان کی محبت اور اس کے لہجے کی گرمی نے باور کرا دیا تھا کہ بات کچھ اور ہی ہے۔ ریحان اب بھی اسے اُتنا ہی چاہتا ہے۔

وہ دونوں اس وقت اپنے فلیٹ کے بیڈ روم میں تھے۔

ریحان پھر گم صم سا ہو گیا، یوں جیسے اب وہ کچھ بتانے کا فیصلہ کر چکا ہو۔ ''تم نے ٹھیک کہا شبینہ! اگر مجھے تم سے سچی محبت ہے تو مجھے بھی تم سے کچھ نہیں چھپانا چاہیے۔ یہ بھی ٹھیک کہا تم نے کہ ہمارے بیچ کوئی ان دیکھی دیوار بھی نہیں ہونی چاہیے، بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ تم جو محسوس کرو، وہ میں نہ کر پاؤں...... یہی ایک پھانس ہے جو ہمارے بیچ اٹک کر رہ گئی ہے۔ ٹھہرو......''

فیصلہ کن انداز میں یہ کہتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور پھر الماری کی جانب بڑھا، وہاں سیف تھا، اندر سے وہ کوئی شے نکال کر اس کے سامنے آیا تو شبینہ اس کے ہاتھ میں ایک چمکتا ہوا خوف ناک پستول دیکھ کر بُری طرح چونک پڑی۔

''یہ کیا ہے؟'' وہ اسے دیکھ کر بولی۔

''لو، پہلے یہ اپنے ہاتھ میں پکڑ لو...... بھرا ہوا ہے۔'' اس نے کہا اور وہ اس کی جانب بڑھا دیا۔ شبینہ کی آنکھوں میں اُلجھن تیر گئی۔ اس نے پستول اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''شبینہ! تم نے جن تین افراد کو انتقاماً قتل کیا ہے، وہ بے گناہ تھے۔''

''کیا مطلب؟'' شبینہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ چہرہ جلنے لگا، جبکہ...... ریحان کا چہرہ نیم مردہ اور بجھا بجھا سا نظر آنے لگا، یوں جیسے اس کے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔

''ہاں، شبینہ! تمہارے شوہر کے قاتل...... مدثر، شمشاد اور ظہیر نہیں تھے، بلکہ میں تھا......''

''کیا......؟'' اس کے انکشاف پر شبینہ کا منہ کھلا رہ گیا۔ وہ جیسے سکتے میں آ گئی۔

''میں تمہیں پوری بات بتاتا ہوں، سنتی جانا۔'' ریحان نے جیسے میکانیکی انداز میں کہنا شروع کیا۔

''لیکن پہلے ایک بات بتا دوں کہ مجھے آخر تک یہ بات پتا نہ تھی کہ جمال کی اُس روز جس لڑکی کے ساتھ شادی ہو رہی تھی، وہ تم تھیں، سنو......! جمال اور میں ایک کاروباری پارٹنر تھے۔ کسی بات پر ہمارا جھگڑا ہو گیا۔ جمال کا سرمایہ زیادہ تھا اور میرا تجربہ...... کیونکہ جس کاروبار کی ہم نے ابتدا کی تھی، اس کا مجھے زیادہ تجربہ تھا۔ اَن بَن ہونے کی صورت میں... جمال اپنا سرمایہ نکال کر مجھ سے جدا ہونا چاہتا تھا، اگر وہ ایسا کر لیتا تو میں نہ صرف سڑک پر آ جاتا بلکہ بہت سے لوگوں کا مقروض بھی ہو جاتا۔ مجھے جیل بھی ہو سکتی تھی۔ میں نے ایک دن اسے ہلاک کرنے کا پروگرام بنا لیا۔ اب یہ اتفاق ہی تھا کہ جس روز شادی ہال کے سامنے والی بلڈنگ سے میں اس کا نشانہ لے رہا تھا اسی وقت...... ایک کار نمودار ہوئی۔ اس میں مدثر، شمشاد اور ظہیر سوار تھے۔ میری اُن سے کم ہی دعا سلام تھی، تاہم ٹائم پاس کرنے کے لیے کبھی کبھی ان سے مل لیا کرتا تھا۔ جس وقت ان کی کار تیز رفتاری سے شور مچاتی ہوئی تمہاری سجی ہوئی کار سے ٹکرائی، اسی وقت

میں نے بھی ... جمال پر گولی چلادی اور وہاں سے فوراً ہی رفو چکر ہوگیا۔ سچویشن ایسی تھی کہ تم نے ان تینوں کو اپنے دولھا کا قاتل سمجھ لیا۔

"اس کے بعد پولیس نے مجھ سے تفتیش کی تھی، مگر میں نے سارا بندوبست کر رکھا تھا، وقوعے کے روز کسی دوسرے شہر میں، اپنی موجودگی کے کچھ جعلی دستاویزی ثبوت تیار کرا چکا تھا۔ میں صاف بچ گیا۔ آلہ قتل یہی پستول تھا، اس میں اب بھی ایک گولی کم ہے۔ شبینہ! جب تم نے مجھے اپنی حقیقت بتاتے ہوئے یہ سب بتایا تب ہی مجھے پتا چلا، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تمہاری اس داستان کا اصل کردار میں ہی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حقیقت کا علم ہوتے ہی کہ میں تمہارا مجرم ہوں، میں...... اندر سے بُری طرح گھائل ہو گیا۔"

"تم نے یہ سب حقیقت جان لینے کے باوجود مجھ سے پھر شادی کیوں کی؟" شبینہ نے جیسے ایک ٹک اس کی جانب گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"مجھے ڈر تھا کہ کہیں میں...... میں، تم...... تمہیں میں کھو نہ دوں...... کیونکہ میں تم سے جدائی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، میرے دل میں بے ایمانی آگئی تھی۔" وہ جواب میں کہنے لگا۔ "میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ تم سے بھی اپنی یہ حقیقت چھپائے رکھوں گا، ازالے کے طور پر تمہیں اس قدر خوشیاں دوں گا اتنی محبتیں دوں گا کہ...... تم اپنے ماضی کا غم بھلا دو گی، لیکن...... یہ میری بھول تھی شبینہ! تم سے شادی کے بعد جہاں میں خوش بھی تھا تو وہاں میرا دل بجھ سا بھی گیا، میری خوشی کو جیسے گھن لگ گیا، میرا ضمیر مجھے کچوکے لگانے لگا، ملامت کرنے لگا، شاید یہ اس سچی محبت کا ہی اثر...... تھا کہ میں اندر سے ملول اور شکستہ سا ہوگیا، ایک اہم بات اور...... میں اب بھی شاید تمہیں کچھ نہ بتاتا لیکن میں اپنی کیفیات تم سے چھپا بھی نہ سکا اور تم بھانپ گئیں، تم جب یہ سمجھنے لگیں کہ مجھے تم سے شادی کرکے کوئی پچھتاوا تو نہیں تو میں تڑپ گیا اور مجبور ہوگیا کہ تمہیں اس کی حقیقت بتادوں۔ اس بوجھ تلے میں اس قدر تنگ آگیا کہ مجھے یہ بھی پروا نہ رہی کہ تم نے جہاں تین افراد کا قتل کیا، اصل قاتل سامنے آتے ہی تم بھلا مجھے کہاں بخشوگی، میں نے محبت میں تمہارے ہاتھوں مرنا بھی قبول کرلیا ہے۔ فیصلہ تمہارے ہاتھوں میں ہے شبینہ...... ! میں نے اپنا بوجھ ہلکا کرلیا۔"

شبینہ کی لرزتی نگاہیں ریحان کے چہرے پر جم کر رہ گئی تھیں۔ ان میں تمنا کی تھی۔ ریحان کا چہرہ پژمردہ ہو رہا تھا، آنکھوں میں کوئی التجا کوئی منت نہ تھی، یہ تاثرات شبینہ نے بہت غور سے محسوس کیے تھے۔

"کرسی پر بیٹھ جاؤ۔" دفعتاً شبینہ کی سرد اور سپاٹ آواز ابھری۔ ریحان کرسی پر بیٹھ گیا۔ شبینہ نے پھر اس کے چہرے سے خوف یا التجا کے تاثرات کو بھانپنے کی کوشش چاہی تھی، مگر ایسا کچھ نہ تھا۔ اس نے ہونٹ بھینچ لیے اور بولی۔

"ریحان! اپنے مرحوم اور مقتول شوہر جمال کو میں کبھی نہیں بھلا سکتی۔ تم سے شادی کا مقصد بس ایک بہلاوا ہی تھا، کیونکہ تم مجھ سے محبت کرتے تھے۔ تم جرم وفا سے مجبور ہو اور میں...... جبر وفا سے، جو مجھے کسی کا مقروض کیے ہوئے ہے۔" کہتے ہوئے شبینہ نے پستول کی نال کا رخ اس کی جانب کردیا۔ اب بھی اس نے ریحان کے چہرے سے خوف کا ایک ذرا شائبہ تک نہیں نمودار ہوتے دیکھا۔ پل کے پل شبینہ کے نسوانی وجدان کو ادراک ہوگیا کہ ریحان کو واقعی اس سے محبت تھی اور نہ صرف یہ بلکہ...... وہ اس کے ہاتھوں مرنے کے لیے بھی تیار تھا۔

"آنکھیں بند کرلو ریحان...... !" اس نے دوبارہ کہا اور ریحان نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

تب ہی گولی چلنے کا دھماکا ہوا۔ ریحان کا چہرہ مسخ ہو گیا لیکن اس کی وجہ کوئی تکلیف نہ تھی، بلکہ گولی چلنے کی آواز پر اس کے چہرے کے تاثرات بدلے تھے، اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں اور ایک لرزہ خیز منظر اس کی نظروں کے سامنے تھا، جسے دیکھتے ہی ایک لمحے کو تو وہ سکتے میں آگیا۔

شبینہ...... فرش پر گری ہوئی تھی، پستول اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ذرا دور جا گرا تھا، اس کی پیشانی سے خون کی لکیر بہہ رہی تھی۔ اس نے ریحان کے بجائے خود کو گولی مار لی تھی۔

"شش...... شبینہ...... !" وہ حلق پھاڑ کر چیخا اور کرسی سے اُٹھ کر شبینہ کی لاش سے جا لپٹا۔

"ی ی...... یہ تم نے کیا کردیا شبینہ! میرے بجائے خود کو مار ڈالا......؟ میں تو تمہارے ہاتھوں بھی مرنے کو تیار تھا۔ یہ تم نے مجھ سے بہت بڑا انتقام لے لیا شبینہ...... ! مجھے...... مجھے جیتے جی مار ڈالا...... اب میں کس کے سہارے جیوں گا؟"

وہ کہتا جاتا اور شبینہ کی لاش سے لپٹا ہوا روتا جاتا تھا۔



حساس طبیعت رکھنے والوں کی... درد سے... یادوں سے اور اشکوں سے شناسائی بڑھتے بڑھتے ایک رشتے میں بدل جاتی ہے... ایسا تعلقِ خاطر جس کے بغیر ان کی شخصیت ادھوری سی رہتی ہے... ایک ایسے ہی ہمدرد شخص کی نرمی... دلجوئی... جو مصیبت زدوں کو ان کی مشکل سے نکالنا اپنی پہلی ذمّے داری سمجھتا تھا۔

انسان کے لہو میں گردش کرتی سب سے بڑی شرانگیز عفریت کا انکشاف

عفریت

عنائشہ چودھری



اپریل کی ایک سہانی شام تھی۔ مارٹی کی گھر واپسی ہوئی تو آسمان پر سیاہ بادلوں نے ڈیرا جما لیا تھا۔ نمی سے پُر ہوا اور فضا کی مخصوص مہک سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ بادل اپنے شکم میں پانی کی بہت سی ذخیرہ اندوزی کیے بیٹھے ہیں۔ بارش کا آغاز اب کسی بھی پل متوقع تھا۔

موسم کی اس کروٹ نے مارٹی کے دل میں بھی ترنگ جگا دی... وہ سیٹی پر ایک شوخ گانے کی دُھن بجاتے ہوئے دروازہ کھولنے لگا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی سناٹے

اور تنہائی نے اس کا استقبال کیا۔ یہ سناٹا اب اس کے لیے کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ چھ ماہ قبل علاقے میں پھوٹنے والی ایک وبا نے اس کی والدہ اور بڑے بھائی کو بھی اپنا نشانہ بنایا تھا۔ والد تو خیر بچپن میں ہی بڑی خوشی سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ بارٹی کے ذہن میں والد نامی اس شخص کی کوئی خوشگوار یاد نہیں تھی۔

مارٹی کی زندگی میں بہت عام سے رنگ تھے۔ اگر والد نے از خود گھر نہ چھوڑا ہوتا تو شاید کسی روز مارٹی اسے موت کے گھاٹ خود ہی اتار دیتا۔ اس دور دراز افریقی ریاست میں اولاد کے ہاتھوں والدین کا قتل بہرحال کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ مارٹی کے اس مختصر سے گھر میں دو کمرے اور ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے لائٹ جلائی۔ برآمدہ روشن کیا۔ دروازہ بند کرنے سے قبل ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے مزاج میں مزید فرحت پیدا کر دی۔

''آج تو بیئر پینے کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔'' اس نے مُسرور سے سوچا اور اپنے ہاتھ میں پکڑے شاپنگ بیگ سے بیئر کے ڈبے نکال کر کمرے میں لے گیا۔

کمرے کی کھڑکی سے ٹکراتی بارش کی ننھی بوندوں سے اندازہ ہو گیا کہ بادلوں نے اپنے کھیل کا آغاز کر دیا ہے۔ بیئر کا تیسرا ڈبا خالی ہونے تک بوندیں تیز بارش میں ڈھل گئیں۔ پانچویں ڈبے کے اختتام تک موسلا دھار بارش تیز موسیقی کی شکل اختیار کر چکی تھی۔

''یہ سال میری زندگی کا بہترین سال تھا۔ مجھے اپنی محنت کا پھل مل گیا ہے۔ کوئی مجھ سا خوش نصیب بھی ہو گا بھلا؟'' اس نے طمانیت سے سوچا۔

مارٹی کی یہ سوچ بہرحال کچھ غلط بھی نہ تھی۔ اس نے سال کے آغاز پر اپنے ذہن میں چند مقاصد کا تعین کیا تھا اور چند ہی ماہ میں یہ مقاصد حاصل بھی کر لیے تھے۔

''یہ خوش نصیبی تو اس وقت مکمل ہو گی مارٹی جب وہ حسینۂ دلنواز 'ایوا' بھی تمہارے پہلو میں ہو گی۔'' اس نے ترنگ بھرے موڈ میں ایک اور خوشگوار بات سوچی۔

''آئے گا، وہ دن بھی بہت جلد آئے گا۔ اب میں ایوا کو جلد ہی شادی کے لیے کہوں گا۔ مجھے یقین ہے وہ میری بات نہیں ٹال سکے گی۔ اب تو کبھی بھی نہیں......'' اس افریقی ریاست میں کم عمری کی شادی کا رواج عام تھا۔

بارش کی رفتار میں اور اضافہ ہونے لگا۔ مارٹی نے مزید ایک ڈبا معدے میں انڈیلا اور اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔ ایوا کا حسین سراپا اب بھی نظروں میں رقصاں تھا۔ اس کی رنگت میں مقامی افراد کی طرح چمکنی کے بجائے ملاحت تھی جو نظروں کو جکڑے رکھتی۔ بال بھی سخت گھنگھریالے ہونے کے برعکس بالکل ملائم اور سیدھے تھے۔ سیاہ آنکھوں کا سحر ان سب سے سوا تھا۔ مارٹی آج تک اسی کشمکش و پیچ میں تھا کہ وہ ایوا کے حُسن کا زیادہ اسیر ہے یا اس کی خوبصورت فطرت کا۔ وہ دیگر مقامی لڑکیوں کے برعکس کم گو، شائستہ مزاج اور اپنی ذات تک محدود تھی۔

''ایوا...... آہ...... ایوا...... بس اب مزید انتظار ممکن نہیں۔ میں صبح ہی تم سے بات کروں گا۔'' وہ سہانے خوابوں کے جال بننے لگا۔

بارش اب بھی تواتر سے برس رہی تھی۔ بوندوں کی جلترنگ اور شراب کے خمار سے وہ جلد ہی نیند کی وادی میں کھو گیا۔ اُس روز نیند بھی تو بہت مہربان تھی۔ خوابوں کی راہ گزر میں دولت اور ایوا کا ہی ساتھ تھا۔ ان خوابوں کے سنگ وہ جانے کتنی دیر محظوظ ہوتا رہا۔ یک لخت اس کا لاشعور کسی سرسراہٹ اور ناپسندیدہ احساس کے تحت بے چینی محسوس کرنے لگا۔ یہ کیفیات زیادہ دیر غالب نہ رہ سکیں۔ مارٹی کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اس کے اطراف میں گھپ اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

''لعنت ہو!'' اس نے کوفت سے کہا۔ ''اس کم بخت بجلی کو بھی ابھی جانا تھا۔ میں نے کسی موم بتی کا انتظام بھی نہیں کیا ہوا۔''

اس افریقی بستی میں غربت، بے روزگاری اور جرائم کے علاوہ بجلی ہی سب سے بڑا مسئلہ تھی۔ مارٹی کو اندھیرے سے خواہ مخواہ ہی دہشت محسوس ہوتی تھی۔ اس نے عادتاً اپنے تکیے کے دائیں جانب سے موبائل اٹھانا چاہا تو آخری لمحات میں یاد آیا کہ موبائل فون تو دو روز پہلے ہی خراب ہوا تھا۔ اس کی مرمت نہیں کرائی تھی۔ نئے فون کی خریداری اگلے روز تک مؤخر تھی۔ مارٹی کی کوفت مزید بڑھ گئی۔ یہ کیفیات زیادہ دیر طاری نہ رہ سکیں۔ بجلی کے درشن کچھ لمحوں بعد ہی نصیب ہو گئے۔ مارٹی نے سکون کا سانس لیا۔ مگر یہ سکون پل بھر میں ہی غارت ہو گیا۔ اس کی نظر دیوار میں نصب آئینے پر مرکوز تھی جہاں سرخ جلی حروف میں سہ لفظی فقرہ ایک ناقابلِ یقین نظارہ تھا۔ آئینے پر سرخ رنگ سے 'آئی ایم بیک' لکھا تھا۔ الفاظ کی بناوٹ اور لکھائی کا یہ انداز اس کے لیے بہت مانوس تھے۔ اس نے اپنی اٹھارہ سالہ زندگی میں چھوٹے اور بڑے حروف کجی کا یہ ملاپ صرف

ایک شخص کے پاس دیکھا تھا۔

''مائیکل...... نہیں...... بالکل نہیں...... یہ سب کیسے ہو سکتا ہے؟ مائیکل یہاں کس طرح...... ناممکن...... قطعی ناممکن۔'' وہ بڑبڑانے لگا۔

شراب کا خمار اور نیند ایک ہی پل میں ہوا ہو چکے تھے۔

☆☆☆

اگلے روز مارٹی کی آنکھ تقریباً بارہ بجے کھلی۔ بستر پر کروٹ کے بل لیٹے شعور کی گلیوں میں پہلا قدم رکھتے ذہن نے خودکار انداز میں اپنا نظام گزشتہ رات کے آخری واقعات سے جوڑ لیا۔ بجلی کی فراہمی کا تعطل اور آئینے پر لکھی عبارت اب ایک خواب سا محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے کروٹ بدلتے ہوئے نظریں گھما کر آئینے کی جانب دیکھا۔ سطح بالکل شفاف تھی۔ مارٹی کے اعصاب پُرسکون ہو گئے۔

''تو وہ سب واقعی خواب ہی تھا۔ اوہ یسوع مسیح! بہت شکریہ۔'' مارٹی نے سکون کا سانس بھرتے ہوئے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔

اب وہ خود کو ہشاش بشاش محسوس کر رہا تھا۔ اس نے بھرپور انگڑائی لیتے ہوئے بستر چھوڑا اور غسل کے لیے چل دیا۔ اپنے لیے ناشتا بناتے ہوئے مارٹی کا ذہن آج کے درپیش معاملات کے بارے میں جمع تفریق کر رہا تھا۔ سب سے پہلا اور ضروری کام موبائل کی خریداری تھا۔ اس نے توس اور اُبلے ہوئے انڈے جلدی جلدی نگلے اور برتن وہیں چھوڑ کر باہر نکل آیا۔

موسم بے حد خوشگوار تھا۔ مارٹی سُرور میں آ گیا۔ وہ اطمینان سے موٹر سائیکل چلاتا ہوا مارکیٹ پہنچا۔ قسمت بھرپور ساتھ دے رہی تھی۔ موبائل فون بھی اچھی قیمت پر مل گیا۔ قیمت چکانے کے بعد اس نے پرانی سم فون میں لگا لی۔ اب اسے ایوا سے ملاقات کرنی تھی۔ ذہن نے ایک بار اسے فون کر لینے کی راہ سُجھائی لیکن پھر خود ہی اپنا خیال رد کر دیا۔ وہ اچانک ملاقات کر کے اس کے تاثرات سے محظوظ ہونا چاہتا تھا۔ اسی لمحہ مارٹی کو فون کی گھنٹی بجتی سنائی دی۔ اس نے موٹر سائیکل ایک جانب روکی اور بلا تامل فون جیب سے نکال لیا۔ اسکرین پر دکھائی دینے والے اجنبی نمبر کی طرف دھیان دیے بغیر مارٹی نے فون کان سے لگایا اور متانت سے بولا۔

''ہیلو! کون بات کر رہا ہے؟''

''خر...... خر...... خر......'' اسپیکر سے پھوٹنے والی آواز ہولناک تھی۔

''ہیلو!'' مارٹی نے ٹھٹک کر کہا۔

''خر...... آئی...... خر...... ایم...... خر...... خر...... بیک۔''

مارٹی کا وجود بُری طرح سنسنا گیا۔ اس نے واضح طور پر مائیکل کی آواز سنی تھی۔ مارٹی نے فون کان سے ہٹا کر نمبر کا جائزہ لیا۔ اسے اپنے معدے میں اینٹھن سی محسوس ہوئی تھی۔ وہ بلاشبہ مائیکل ہی کے زیرِ استعمال رہنے والا ایک غیر اہم نمبر تھا۔

''ن...... نہیں...... ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ میں پھر سے کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔'' اس نے اپنا سر جھٹکا۔

''خر...... خر...... تم...... خر...... سے...... خر خر...... بہت جلد...... خر خر خر...... سامنا...... خر...... ہو گا...... خر خر خر۔''

مائیکل کی آواز ایک بار پھر ابھری۔

مارٹی کا دل چاہا کہ فون کہیں دور پھینک دے لیکن ظاہری بات ہے کہ اس خیال پر عمل کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس کی طبیعت میں پیدا ہونے والا رومان اور سرشاری اڑن چھو ہو گئے۔ اس نے اپنی موٹر سائیکل کا رخ واپس گھر کی جانب کر لیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی خوف اور دہشت نے اس کے قدم ایسی شدت سے جکڑے کہ رہائی ممکن ہی نہ رہی۔

دیواروں پر جا بجا خون کے چھینٹے بکھرے تھے۔ ان چھینٹوں کے درمیان لکھے گئے الفاظ اور ان کی مخصوص بناوٹ نے مارٹی کا لہو خشک کر دیا تھا۔

''انتقام...... احتساب...... انصاف...... میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا 'ٹی'۔''

مارٹی کو اس عرفیت 'ٹی' سے صرف مائیکل ہی پکارتا تھا۔ مارٹی کا ذہن جھنجھنا اٹھا۔ اس نے بلا سوچے سمجھے غسل خانہ سے پانی کی بھری بالٹی اٹھائی اور دیوار پر انڈیل دی۔ پانی اور لہو کی آمیزش لیے وہ سیال بہتا ہوا فرش پر بکھر گیا۔ مارٹی نے باقی دیواروں کی بھی اسی انداز میں صفائی کی اور فرش پر بکھرا سیال بھی صاف کر دیا۔ اس کے اعصاب شدید منتشر تھے۔ ایوا کا خیال ذہن سے یکسر فراموش ہو گیا تھا۔

''مائیکل...... لیکن کیسے؟ یہ لکھائی...... الفاظ کی بناوٹ...... آواز...... انداز...... سب کچھ مائیکل کا ہی ہے۔ آہ...... لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں یقیناً کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔'' اس نے خود کو تسلی دی۔

''لیکن اب تو میں نے شراب بھی نہیں پی۔ اب ایسا کوئی خواب کیسے دیکھ سکتا ہوں؟ یہ حقیقت ہے۔ مائیکل شاید واقعی......'' اس نے ہاتھ مسلے۔

''فضول بات۔ مائیکل مر چکا ہے۔ وہ کیسے واپس

آسکتا ہے؟ ایسا صرف فلموں میں ہوتا ہے۔ حقیقی زندگی میں بھوت پریت کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ سب ایک احمقانہ خیال ہے۔'' اس نے اپنی ہی بات رد کی۔

''لیکن فلمیں بھی تو حقیقی زندگی سے ہی جنم لیتی ہیں۔ کسی بھی انسان کا تخیل از خود کوئی پرواز کیسے بھر سکتا ہے؟ کسی نے ایسے سانحات و واقعات کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں ہوتے دیکھے ہی ہوں گے تو ایسی کہانیاں فلمایا جانا ممکن ہوسکا ہے نا۔'' مارٹی کے دل میں ایک اور خیال پیدا ہوا۔

''نہیں! یہ سب جھوٹ ہوتا ہے۔ بھوت ووت کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یہ سب مجھ سے کوئی مذاق کر رہا ہے۔'' اس نے سر جھٹکا۔

''لیکن کسی کو کیا خبر کہ مائیکل کو میں نے ہی مارا تھا۔ اس حقیقت سے تو ہم دونوں کے سوا کوئی واقف ہی نہیں۔'' ایک اور خیال ابھرا۔

''شاید اس وقت وہاں کوئی اور بھی موجود ہو۔'' جوابی خیال پیدا ہوا۔

''نہیں! وہاں کسی اور کا ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔''

ان سوال و جواب اور کشمکش و پیچ میں شام ہو گئی۔ اسے شراب کی شدید طلب محسوس ہو رہی تھی۔ گھر میں موجود شراب کا ذخیرہ دو روز پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ اس نے طلب سے مجبور ہو کر بار کا رخ کرنے کا فیصلہ کیا۔

بار میں ماحول بالکل روایتی اور پُرسکون تھا۔ موسم کی خوشگواریت کے پیشِ نظر گاہکوں کے مزاج میں بھی ترنگ تھی۔ گلاسوں کی کھنکھناہٹ، سگریٹ، سگار کی خوشبو، گفتگو کی بھنبھناہٹ اور قہقہے محسوس کرتا مارٹی اپنی مخصوص میز کی طرف بڑھ گیا۔ ویٹر کو اشارے سے اپنے پاس طلب کر کے مارٹی نے بیئر لانے کو کہا اور کرسی پر نیم دراز ہو کر آنکھیں موند لیں۔ اس کے ذہن میں اب بھی مائیکل کی مبینہ فون کال اور گھر میں دیواروں پر نقش عبارت ہی رقصاں تھی۔ بیئر لینے کے بعد ذہن قدرے پُرسکون ہو گیا۔

اس سرگرمی میں وقت گزرنے کا اندازہ بھی نہ ہوسکا۔ رات کے سائے گہرے ہونے لگے تو مارٹی بھی سُرور میں جھومتا ہوا بار سے نکل آیا۔ باہر آتے ہی اس کے قدم ساکت ہو گئے۔ بصارت پتھرا سی گئی۔ اسے چند فٹ کے فاصلے پر مائیکل کھڑا دکھائی دیا۔ ہاں وہ مائیکل ہی تھا۔ اسی مخصوص سفید لباس میں ملبوس جس میں مارٹی نے اسے آخری بار دیکھا تھا۔ اس کے سینے کے زخم سے لہو رِس کر لباس کو خاصا رنگین کر چکا تھا۔

مائیکل کی نظریں لمحہ بہ لمحہ رنگ بدل رہی تھیں۔ سپاٹ، کربناک، حیرت زدہ، نفرت انگیز اور جنونی تاثر دیتی وہ نظریں مارٹی کا پتا پانی کرنے لگیں۔

''بھاگ جاؤ مارٹی! یہاں سے بھاگ جاؤ۔'' اس کے اندر سے ایک طاقتور صدا ابھری لیکن منظر کی گرفت ایسی تھی کہ رہائی ممکن ہی نہ رہی۔

مائیکل نیم خوابیدہ سے انداز میں چلتا ہوا چند قدم آگے بڑھ آیا۔ مارٹی کی حالت مزید خراب ہونے لگی۔ مائیکل اب اس سے چند گز ہی دور تھا۔ اس کے چہرے پر زندگی کی کوئی رمق دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ہاتھوں کی جلد بھی بُری طرح کٹی پھٹی تھی۔ مارٹی کا دل چاہا کہ وہ دھواں بن کر تحلیل ہو جائے۔ اگر مائیکل یہاں مجسم اس کے سامنے موجود تھا تو دھواں بن کر تحلیل ہو جانا بھی کوئی ناممکن بات نہیں تھی۔ اسی لمحہ مائیکل کے لبوں میں جنبش پیدا ہوئی۔ مارٹی اسے بغور دیکھنے لگا۔

''کیوں ٹی؟ کیوں کیا ایسا؟ انتقام...... انصاف۔''

مارٹی کے وجود پر لرزش طاری ہو گئی۔ وہ گھٹنوں کے بل نیچے جھکا اور اپنا چہرہ چھپا لیا۔

''نہیں...... ایسا نہیں ہو سکتا...... نہیں۔'' وہ بڑبڑانے لگا۔

''کیا ہوا مارٹی؟ ایسے کیوں بیٹھے ہو؟'' چند لمحوں بعد ایک اور شناسا سا آواز سنائی دی تاہم ذہن پر زور دینے کے باوجود یاد نہ آیا کہ اس سے کون مخاطب ہے۔ اسے اپنے کندھے پر کسی لمس کا احساس ہوا۔ مارٹی نے ڈرتے ڈرتے سر اٹھایا۔ اس کے سامنے قصبے کا حجام والٹر موجود تھا۔

''میری...... طبیعت...... ٹھیک...... نہیں...... ہے۔'' وہ اٹکتے ہوئے بولا۔

''آؤ! میں تمہیں گھر چھوڑ دیتا ہوں۔'' والٹر نے پیشکش کی۔ وہ مارٹی کے سُتے ہوئے چہرے، آنکھوں کے گرد حلقوں اور پپڑی زدہ ہونٹ دیکھ کر حقیقتاً تشویش زدہ ہو رہا تھا۔

''نہیں شکریہ! مجھے ابھی ایک ضروری کام ہے۔'' وہ سانس زور سے کھینچنے لگا۔

''ٹھیک ہے! جیسے تمہاری مرضی۔'' والٹر نے کندھے اچکائے اور آگے بڑھ گیا۔

مارٹی بدقت اٹھا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

''ایسا نہیں چلے گا۔ ایسا بالکل نہیں چلے گا۔'' اس نے اپنا سر زور سے دائیں بائیں جھٹکا۔ ''میں اس معاملے کو آر یا

پار لگا کر ہی رہوں گا۔ آج یہ معاملہ ختم ہو کر ہی رہے گا۔ بس بہت ہو گیا۔''

مارٹی نے اپنا یہ فقرہ کم و بیش نصف درجن بار دہرایا اور ہمت مجتمع کرتے ہوئے بار کی شمالی سمت قدم بڑھا دیے۔ ہر اٹھتا قدم دھڑکن میں غیر معمولی اضافہ کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد مارٹی نے خود کو ایک قبرستان کے سامنے پایا۔ اب اس کے لیے قدم اٹھانا دوبھر ہو رہا تھا لیکن اس کشمکش سے نجات بہت ضروری ہو چکی تھی۔ اسے کسی بھی صورت خوف سے خلاصی اور ایوا کے ساتھ نئی زندگی کے آغاز پر پُرسکون اعصاب درکار تھے۔

فضا کی خنکی میں یکدم اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود مارٹی کو اپنے بدن میں حدت اور مساموں سے پسینہ اُمڈتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ لمبے ڈگ بھرتا قبرستان کے مشرقی کونے کی طرف بڑھتا گیا جہاں چند روز قبل ہی مائیکل کی تدفین ہوئی تھی۔ آسمان پر چھائے بادلوں کی اوٹ میں چاند بھی مکمل طور پر پوشیدہ تھا۔ مارٹی مطلوبہ مقام تک پہنچتے پہنچتے پسینے سے شرابور ہو گیا۔ اس کے دل میں موہوم سی امید تھی کہ یہ سب اس کا واہمہ اور شراب کے خمار کا ہی اثر ہو گا۔

یہ امیدیں ایک ناقابلِ یقین منظر کی دید سے دم توڑ گئیں۔ اس کے سامنے مائیکل سیلٹر کی قبر کھلی تھی۔ اس کھلی قبر کے اندر خالی تابوت اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ مارٹی کی ٹانگیں بے جان ہو گئیں۔ وہ خود کار سے انداز میں قبر کے کنارے بیٹھ کر اس بے مکین مکان کو دیکھنے لگا۔

''کسے ڈھونڈ رہے ہو؟'' ایک آواز سنائی دی۔ مارٹی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

''مجھے ہی ڈھونڈ رہے ہو نا؟ دیکھ لو! مجھے آج بھی تمہاری کتنی فکر ہے۔ میں تمہارے لیے اپنا ٹھکانا ترک کیے کھڑا ہوں۔'' مائیکل کی آواز میں کھڑکھڑاہٹ تھی۔

''کیا چاہتے ہو تم؟'' مارٹی نے تھوک نگلا۔

اسے اب اپنے واہموں کی تصدیق میں کوئی ابہام نہیں رہا تھا۔ اس کے سامنے مائیکل کا بھوت ہی کھڑا تھا۔ وہ مائیکل جسے اس نے بہت اہتمام اور منصوبہ بندی کے تحت موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

''انصاف چاہتا ہوں میں...... قطعی انصاف۔'' مائیکل نے سپاٹ انداز میں کہا۔

آسمان پر چھائے بادل مزید گہرے ہو گئے تھے۔ تیز ہوا کے ساتھ بجلی بھی چمکنے لگی۔ مارٹی بالکل گنگ ہو چکا تھا۔

''نہیں! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تم مائیکل کیسے؟'' مارٹی نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔

''ہاں! مجھے تو تم نے قتل کر دیا تھا۔ میں یہاں کیسے آ سکتا ہوں؟'' مائیکل عجیب سے انداز میں ہنسا۔ بادلوں کی گرج میں یکدم اضافہ ہوا۔

''ہاں! کیا تھا قتل۔ میں نے ہی تمہیں قتل کیا تھا۔ تم اسی قابل تھے۔ بالکل اسی قابل تھے۔'' مارٹی بھڑک گیا۔ گزشتہ رات سے دہشت اور خوف کے یہ لمحات برداشت کرتے ہوئے اس کے اعصاب شکستہ ہو گئے تھے۔

''آخر کیا بگاڑا تھا میں نے تمہارا؟'' مائیکل کی کھرکھراتی آواز نے اُسے مزید سیخ پا کر دیا۔

''لعنت ہو تم پر مائیکی! دنیا جہان کی لعنت ہو۔'' مارٹی چلّایا۔

''انتقام...... مجھے انصاف چاہیے۔'' مائیکل اس کی طرف بڑھنے لگا۔

''ملعون انسان! میں تمہیں ایک بار پھر جان سے مار دوں گا۔ تقدیر نے جتنی بار بھی موقع دیا، تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' مارٹی اس کی طرف پل پڑا۔ وہ مائیکل کو رگید کر دوبارہ قبر میں پھینکنا چاہتا تھا۔

''ہالٹ! رک جاؤ۔'' فضا ایک نامانوس آواز سے مرتعش ہوئی۔

مارٹی کو کسی بھی بات کی پروا نہ تھی۔ اس نے مائیکل کو زمین پر گرا لیا تھا۔ اسے اپنے ہاتھوں اور گھٹنوں تلے ایک ٹھوس جسم کا احساس ہو رہا تھا۔ یہ احساس دیوانگی بڑھانے لگا۔ اسی لمحے قبرستان کا وہ کونا تیز روشنی سے منور ہو گیا۔

''رک جاؤ مارٹی! تمہارا کھیل ختم ہو چکا ہے۔'' ایک طنزیہ آواز ابھری۔ اس کے سامنے علاقے کا شیرف اپنے تین ساتھیوں کے ہمراہ موجود تھا۔

''اوہ...... تو پولیس اسٹیشن کا سارا ہی عملہ میرے لیے یہاں تک چلا آیا ہے۔'' مارٹی نے اسے کینہ توز نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ عملے کے باقی دو اہلکار باہر کہیں گاڑی میں موجود ہوں گے۔

''ہاں! جب قانون کے پاس سہولیات ناکافی اور مبینہ ملزم کے پشت پناہ تمہارے کیمرون جیسے شاطر ہوں تو ہمیں بھی ایسے ہتھکنڈے استعمال کرنے ہی پڑتے ہیں۔'' شیرف کے انداز میں بے بسی و غصہ نمایاں تھا۔

دو اہلکاروں نے مارٹی کو جکڑتے ہوئے اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے۔ مارٹی کی نظریں مائیکل پر ہی مرکوز تھیں۔ وہ اس کی اصلیت کا ادراک ہی نہ کر پا رہا تھا۔

مائیکل اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہونٹوں پر بہت جاندار مسکراہٹ رینگ رہی تھی۔

☆☆☆

قصبے کے اس چھوٹے سے پولیس اسٹیشن میں شیرف جیمس اپنے چنیدہ اہلکاروں کے ساتھ موجود تھا۔ اس پولیس اسٹیشن کا ماحول بالکل روایتی اور پسماندہ تھا۔ فرنیچر کے نام پر بوسیدہ کرسیاں اور ایک چوکور میز تھی۔ میز پر کسی بھی کمپیوٹر یا جدید ساز و سامان کے بجائے قدرے زرد فائلیں اور کاغذات دکھائی دیتے۔

قصبے کی جیل کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ ترقی اور بہتری کی امید میں جیمس کی عمر بیت گئی تھی۔ اب تو ریٹائرمنٹ کا وقت قریب آ گیا۔ ان سوچوں میں غلطاں جیمس سوزین کی آمد سے چونکا۔

''مارننگ آفیسر!'' اس نے سنجیدگی سے جیمس کو مخاطب کیا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر لیکن پُرکشش سیاہ فام عورت تھی۔ اس کے چہرے پر افسردگی کی تہ نے دلکشی میں مزید اضافہ کیا ہوا تھا۔

''مارننگ! کیسی ہیں آپ؟'' جیمس نے کہا۔

''کیسی ہوسکتی ہوں؟'' اس نے جوابی سوال کیا۔

''میں آپ کا دکھ سمجھ سکتا ہوں۔ آپ کا نقصان بے شک بہت بڑا ہے۔'' جیمس نے خلوصِ دل سے کہا۔

''ناقابلِ تلافی کہیے آفیسر!'' سوزین نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ''مائیکل سے میری رفاقت دیرینہ تو نہیں البتہ گہرائی میں بے مثال تھی۔ ہماری ذہنی ہم آہنگی...... آہ......'' اس کی آنکھوں میں نمی چمکی۔

''یہ تو خیر ہم بھی جان ہی گئے ہیں کہ آپ دونوں کی رفاقت میں کیسی شدت تھی۔'' جیمس اس عورت کی محبت اور وفا سے کافی متاثر ہونے لگا۔ سوزین اور مائیکل بہت جلد رشتۂ ازدواج میں بندھنے والے تھے کہ مائیکل کے قتل کا واقعہ وقوع پذیر ہوگیا۔

''ملزم کہاں ہے آفیسر؟'' سوزین نے خود کو سنبھالا۔

''ملزم کہاں...... اُسے مجرم ہی سمجھیے۔ اس کے خلاف ثبوت ناقابلِ تردید ہیں۔'' جیمس پُراعتماد تھا۔

''اس مہم کا اصل ہیرو کہاں ہے؟'' سوزین نے تجسس سے پوچھا۔

''آپ نے یاد کیا۔ لیجیے میں حاضر ہوگیا۔'' کمرے کے دروازے سے ایک شخص کی آواز ابھری۔

سوزین اور جیمس نے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا۔ وہاں درمیانے قد و قامت، مناسب صحت اور قدرے لمبے بالوں کا مالک سیاہ فام شخص کھڑا تھا۔ اس کی عمر تقریباً پینتیس برس تھی۔ زرد آنکھوں میں ذہانت کی چمک عیاں تھی۔ وہ رچی آرتھر تھا۔ اسی قصبے کا ایک دیرینہ رہائشی جو اکثر و بیشتر حالتِ سفر میں ہی رہتا۔

''آیئے مسٹر رچی! مجھے آپ کا ہی انتظار تھا۔'' سوزین اسے دیکھ کر پُرجوش ہوگئی۔

رچی اپنے مخصوص انداز میں مسکراتا ہوا سوزین کے ساتھ ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے پردۂ تصور پر چند روز قبل سوزین سے ملاقات کے مناظر رقصاں تھے۔ رچی مائیکل کا دیرینہ دوست تھا۔ وہ اس کی تدفین کے وقت قصبے میں موجود نہ تھا اس لیے قبر پر پھولوں کا نذرانہ پیش کرنے چلا آیا تھا۔ اتفاقی طور پر سوزین بھی اس وقت مغموم حالت میں وہیں موجود تھی۔

''مجھے مائیکل کی موت کا بے حد افسوس ہے۔'' رچی نے تعزیت کا فریضہ نبھایا۔

''موت نہیں، قتل کہیے۔ مائیکل کو قتل کیا گیا ہے۔'' سوزین نے دکھ سے جواب دیا۔

''پولیس نے اس معاملے میں کوئی تفتیش نہیں کی کیا؟'' رچی چونکا۔

''ہمارے اس قصبے کی پولیس کا احوال آپ کو معلوم نہیں کیا؟'' وہ اسی کے انداز میں بولی۔

''معلوم تو ہے۔'' رچی نے سر ہلایا۔

''ان کے پاس اختیارات ہیں نہ ہی وسائل۔ ہم اس اکیسویں صدی میں بھی چار صدیاں پہلے کی زندگی جی رہے ہیں۔ شاید اُس وقت بھی حالات اب سے بہتر ہی ہوں گے۔ اب تو کہیں کوئی پُرسانِ حال نہیں۔'' سوزین سخت رنجیدہ تھی۔

''آپ کو کسی پر شک ہے کیا؟'' رچی نے پوچھا۔

''شک نہیں یقین ہے، مائیکل کا قتل کیمرون اور مارٹی کی ملی بھگت ہے۔''

''کیمرون...... وہ سابق پولیس افسر؟'' رچی چونکا۔

''ہاں! وہی کیمرون۔ وہ منشیات فروش بن چکا ہے۔ قصبے میں منشیات کی محفوظ ترسیل کے لیے اسے مناسب ٹھکانا درکار تھا۔ اس نے مارٹی کو اپنا کارندہ بنا کر مائیکل کے اسٹور پر بھیجا۔ مروت کے مارے مائیکل سے بھی انکار نہ ہوسکا۔ وہ تو اس قدر سادہ مزاج تھا کہ اسے کئی ماہ تک علم ہی نہ ہوسکا کہ اس کا چہیتا سیلز مین 'تی' ناک تلے کیا گل کھلا رہا ہے۔ وہ

اس بات سے ہی اندازہ لگا لیتا کہ مارٹی جیسے کمتر معاشی حیثیت کے مالک شخص کے پاس بائیک کیسے آگئی؟ وہ درحقیقت کیمرون نے ہی اسے بطور تحفہ دی تھی۔''

''تو مائیکل کو اس بات کا علم کیسے ہوا؟'' رچی نے تاسف سے پوچھا تھا۔

''چھوڑو بس! سانپ گزر گیا لکیر پیٹنے سے کیا فائدہ؟'' سوزین نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ''انجام تو بالآخر یہی ہوا کہ مائیکل اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ کیمرون نے قتل کے وقت مارٹی کی جائے وقوعہ سے غیر حاضری ثابت کر دی۔ اس کے لیے قبل از گرفتاری ضمانت تک حاصل کر لی اور اب اس کا اسٹور ہتھیانے کے چکروں میں ہے۔ وہ وقت دور نہیں جب مائیکل کی نیک نامی کی آڑ میں دھڑلے سے منشیات اور پھر شاید اسلحہ بھی فروخت ہونے لگے۔

''بہت گمبھیر صورتِ حال ہے۔ پولیس تو واقعی بے بس ہو چکی ہوگی۔'' رچی نے پُرسوچ انداز میں بھویں سکیڑیں۔

سوزین کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ رچی کچھ دیر خاموش رہا اور پھر سرگوشیانہ انداز میں گویا ہوا۔

''میں مائیکل کے قاتل کو بے نقاب کر سکتا ہوں۔''

''لیکن کیسے؟'' سوزین نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ رچی کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ رینگ گئی تھی۔

☆☆☆

''یہ سب آخر کیسے کیا تم نے رچی؟'' پولیس اسٹیشن میں بیٹھی سوزین نے اپنا سابقہ سوال دہرایا۔

رچی نے ایک بار پھر مسکراتے ہوئے کندھے اُچکا دیے۔

''میں بتاتا ہوں مس سوزین!'' جیمس نے گلا کھنکھارتے ہوئے گفتگو میں حصہ لیا۔ ''آپ سے ملاقات کے بعد رچی میرے پاس ہی آیا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک مکمل منصوبہ موجود تھا۔ اس نے جزئیات میرے سامنے رکھ دیں۔ میں رچی کی صلاحیتوں سے ذاتی طور پر واقف نہ ہوتا تو شاید اس مہم کا حصہ بننے پر بھی رضامند نہ ہوتا۔ مجھے علم ہے کہ رچی ایک اعلیٰ پائے کا اداکار ہی نہیں بلکہ جڑی بوٹیوں سے میک اَپ بنانے کا ماہر بھی ہے۔ یہ ایک ہرفن مولا شخص ہے۔ اس کے ذہن میں مارٹی کو ڈرا دھمکا کر سچ اُگلوانے کا منصوبہ تھا اور دیکھ لو! اس نے دو ہی روز میں اپنا منصوبہ مکمل بھی کر لیا۔ مارٹی کے گھر میں بھوت کی آمد کے نشانات میں

نے ہی بنائے تھے۔‘‘ جیمس مسکرایا۔

’’لیکن تمہیں یہ یقین کیوں تھا رچی کہ تمہارا یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے گا۔ اکیسویں صدی کے اس جدید دور میں بھوت پریت پر یقین رکھنے کا خیال ہی احمقانہ ہے۔‘‘ سوزین نے اپنی اُلجھن بیان کی۔ ایسی ہی اُلجھن اسے تب بھی درپیش تھی جب رچی نے اس سے مائیکل کی لکھائی کے متعلق مخصوص عادات دریافت کی تھیں۔

رچی یہ سن کر مسکرانے لگا۔ اس کے ذہن میں اپنا ایک مخصوص نظریۂ فلسفہ گردش کر رہا تھا جس کے متعلق وہ بلاتکان گھنٹوں گفتگو کر سکتا تھا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ وا کیا ہی تھا کہ جیمس کہنے لگا۔

’’ویسے سچ پوچھو رچی! مجھے تمہاری کامیابی پر اتنا یقین نہیں تھا۔‘‘ اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ’’لیکن اب میں تمہارے اس ایکٹ کو ماسٹر پیس قرار دوں گا۔‘‘

’’کوئی بھی فنکار اپنے فن کے کسی بھی مظاہرے سے کُلّی مطمئن نہیں ہو سکتا۔ جانے میرا دل کیوں کہتا ہے کہ میرا ماسٹر پیس تو ابھی باقی ہے۔‘‘ رچی خوابناک سے انداز میں بولا۔

’’تم ہمارے قصبے کا بہت قیمتی سرمایہ ہو۔‘‘ سوزین کہنے لگی۔ ’’کاش ہمارے پاس اتنے ریاستی وسائل ہوتے کہ تم اپنے ہنر کا مکمل طور پر مظاہرہ کر سکتے۔‘‘

’’ویسے رچی! تم نے زندگی میں اتنے سفر کیے ہیں۔ کبھی ہالی ووڈ کیوں نہیں گئے؟ تمہارا ہنر وہاں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔‘‘ جیمس نے تجویز دی۔

رچی نے مسکراتے ہوئے اپنے ہاتھوں کی جانب دیکھا۔

’’تمہاری بات بالکل درست ہے آفیسر! لیکن یہ ہنر جن ہاتھوں میں موجود ہے، بدقسمتی سے ان پر سیاہ کھال منڈھی ہے۔ سفید فام لوگ کسی سیاہ فام کے ہاتھوں اپنی آرائش گوارا نہیں کرتے۔‘‘

’’ہالی ووڈ میں کئی سیاہ فام موجود ہیں رچی!‘‘ سوزین نے تحریک دی۔

’’بے شک ہوں گے لیکن مجھے وہاں اپنے لیے کوئی امید نظر نہیں آتی۔‘‘

وہ اس موضوع پر مزید گفتگو نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سوزین بھی اس کا گریز بھانپ گئی۔ اس نے اپنے پرس سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور رچی کو تھماتے ہوئے کہا۔

’’ویسے دنیا صرف ہالی ووڈ پر ہی ختم نہیں ہو جاتی۔ ایشیائی ممالک کی فلمی منڈی بھی بہت مضبوط ہے۔ تم چاہو تو وہاں بھی کوشش کر سکتے ہو۔‘‘

سوزین کی یہ تجویز رچی کے دل کو لگتی محسوس ہوئی۔ اس نے خاموشی سے نوٹوں کی گڈی تھام لی۔

☆☆☆

رات کے سفر کا ابھی آغاز ہوا تھا۔

رچی اپنے ایک کمرے اور مختصر برآمدے پر مشتمل کاٹیج میں موجود تھا۔ مائیکل کے قاتل کی گرفتاری میں اپنے تعاون نے اسے دلی طور پر سرشاری بخشی تھی۔ سوزین کی طرف سے ملنے والا معاوضہ بھی تسکین بخش تھا۔ سوزین کی تجویز نے اسے اس حد تک متاثر کیا کہ وہ وہاں سے رخصت ہوتے ہی قصبے کی اکلوتی لائبریری روانہ ہو گیا۔ لائبریری میں انٹرنیٹ اور کمپیوٹر کی قدرے مناسب سہولیات موجود تھیں۔ اس نے ایشیائی خطے کی تفصیل اور فلمی صنعت کے متعلق معلومات حاصل کر لیں۔ اس خطے میں ایک ریاست ’خداداد نگر‘ خاصی اہمیت کی حامل تھی۔ انٹرنیٹ کے ذریعے اسے علم ہوا کہ ریاست خدادادنگر میں چند ماہ قبل ہولناک زلزلہ آیا تھا تاہم ہمت و حوصلے سے اس قدرتی آفت کا مقابلہ بھی کر لیا گیا۔ ان کی فلمی صنعت بھی ترقی کی منازل طے کر رہی تھی۔ رچی کو اس صورت حال میں کافی دلچسپی محسوس ہوئی۔ بستر پر لیٹے ہوئے رچی کے ذہن میں اب متفرق خیالات کی یورش تھی۔

کسی بھی فلمی منڈی سے منسلک ہونا اس کا دیرینہ خواب تھا۔ مائیکل کے قاتل کی نقاب کشائی میں اپنی کارکردگی اور نتائج نے آنکھیں خوابوں سے مزید بوجھل کر دی تھیں۔ اس کے باوجود دل میں امید اور ناامیدی کی ہی کیفیات تھیں۔ رچی کا ماننا تھا کہ فنکار ہمیشہ محروم اور مشکلات کا شکار ہی رہا کرتا ہے۔ اسے آسودگی اور فراغت بہت کم میسر آتی ہے۔ وہ خود بھی جس قدر ہنرمند تھا، اس سے کہیں زیادہ بدقسمت ثابت ہوا تھا۔ زندگی نے اسے کبھی کوئی آسائش دی ہی نہیں تھی۔ غربت زدہ خطے کا مفلوک الحال بچپن، کٹھن جوانی اور ہنر کی ناقدری نے اس کا اعتماد سرے سے ہی چکنا چور کر دیا تھا۔ یورپ میں قسمت آزمائی کے لیے اس نے اپنی تمام تر جمع پونجی صرف کر دی تھی۔ وہاں قیام کے دوران نسلی تعصب نے اس بُری طرح گھائل کیا کہ زندگی بھر کی کمائی کے ساتھ اپنا ذاتی وقار اور عزت نفس بھی گنوا بیٹھا۔ اس کے دل میں خدشات، واہمے اور خوف پہلے سے زیادہ راسخ ہو چکے تھے۔

ان خیالات کی یورش میں اس کا اعتماد مزید ڈگمگانے لگا۔ اسے اپنی قوتِ ارادی کا اچھی طرح علم تھا۔ اس خطے میں بھی ناکامی کا سامنا ہوتا تو شاید وہ دوبارہ کہیں اور رجوع کرنے کے قابل ہی نہ رہتا۔

''کوئی بات نہیں رچی! یہ آخری داؤ کھیل کر دیکھ لو۔ کیا پتا اس بار کوئی کامیابی ہی تمہاری منتظر ہو۔'' اس نے خود کو تسلی دیتے ہوئے ریاست خداداد نگر روانگی کا ارادہ کرلیا۔

☆☆☆

خداداد نگر ایک خوبصورت اور دلکش ریاست تھی۔ موسموں کے معاملے میں خوش قسمت ترین۔ فطری نظارے ایسے حسین کہ ارضِ جنت کا گمان ہوتا۔ رچی انٹرنیٹ پر مختلف علاقوں کی تصاویر دیکھ کر ہی شیدائی ہوگیا تھا۔ اس نے غیر اختیاری طور پر پہلا پڑاؤ ایسے علاقے میں کیا جو زلزلے کی تباہ کاریوں سے بہت متاثر ہوا تھا۔ وہاں حیران کن طور پر لوگوں نے اس قدرتی آفت کے بعد خود کو ناقابلِ یقین رفتار سے سنبھالا تھا۔

افریقی میدانی علاقوں کی جھلستی گرمی اور تپش برداشت کرنے والے رچی کے لیے ریاست کا خوشگوار پہاڑی ماحول کسی عظیم نعمت سے کم نہ تھا۔ وہ یہاں بے حد خوش تھا۔ اس پر مستزاد علاقے کے لوگ بہت خوش اخلاق اور مہمان نواز تھے۔ سرخ وسفید رنگت، بھورے بالوں اور طویل قامت وہ افراد بادیُ النظر میں کسی یورپی ملک کے باشندے معلوم ہوتے۔ تاہم یورپی افراد کے برعکس وہ کسی نسلی تعصب یا احساسِ برتری کا شکار نہیں تھے۔ رچی نے علاقے کے واحد ہوٹل میں کمرا حاصل کیا تھا۔ ہوٹل انتظامیہ نے اس سے خاصی خوش خلقی اور تپاک کا مظاہرہ کیا تھا۔ علاقہ گردی کے دوران بھی اسے بہت محبت، مہمان نوازی اور عزت ملی۔ رچی ان کے خلوص اور اخلاق کا گرویدہ ہوگیا تھا۔

اس علاقے میں ایک ہفتہ بہترین انداز میں گزارنے کے بعد وہ ایک میدانی علاقے میں چلا آیا۔ یہاں بھی ماحول، فضا اور موسم بہترین تھے۔ اہلِ علاقہ کے تپاک اور گرم جوشی میں رتی بھر بھی فرق نہ تھا۔ رچی کو اپنا فیصلہ بہترین محسوس ہونے لگا۔ اسی دوران اس کی ملاقات افضال نامی ایک بیرے سے ہوئی۔ افضال کی انگریزی سلیس تھی۔ اس سے گفتگو بہت اہم اور معلوماتی ثابت ہوئی۔

''آپ ایک بہترین جگہ پر آئے ہیں صاحب! یہاں آپ کو بہت قدردان ملیں گے۔'' افضال نے رچی کا ہنر جانتے ہی اُسے کہا۔

''مجھے بھی یہی امید ہے۔'' وہ مسکرایا۔

''ہماری ریاست بہترین ہے صاحب! ہم کسی کالے اور گورے میں کوئی فرق نہیں کرتے۔'' وہ فخر سے بتانے لگا۔

''اتنا تو مجھے بھی اندازہ ہوگیا ہے۔'' اس نے سراہا۔

''میرے ایک واقف کار نجی پروڈکشن سے منسلک ہیں۔ آپ پہلے چھوٹے پردے پر اپنی قسمت آزمایئے۔ اس کے بعد بڑے پردے پر اپنے ہنر کے جلوے بکھیریے گا۔''

''اگر ایسا ہو جائے تو میرا بہت بڑا خواب پورا ہو جائے گا۔'' رچی نے خوابناک انداز میں کہا۔

''ایسا بالکل ہوگا صاحب! ہماری ریاست میں بنی فلمیں اپنا لوہا منوا چکی ہیں۔ آپ فکر ہی نہ کریں۔ میں آپ کو اپنے اس واقف کار سے ضرور ملواؤں گا۔'' افضال پُر اعتماد تھا۔

رچی بھی قدرے پُرسکون ہوگیا لیکن وہ ایک بات فراموش کر بیٹھا تھا کہ فنکار کی آزمائش اور بدقسمتی پہلے ہی اپنے درشن دکھانے کے لیے بے چین ہوتی ہے۔ رچی کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اسے خوابوں کے ڈھیروں جگنو تھمانے والا افضال یکدم غائب ہوگیا۔ اس کی جگہ اب حشمت نامی بیرے نے سنبھال لی تھی۔

''افضال کہاں غائب ہے اتنے دن سے؟ مجھے اُس سے بہت ضروری کام تھا۔'' رچی نے حشمت سے استفسار کیا۔

''اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے صاحب! دل کا دورہ پڑا ہے اُسے۔'' حشمت نے اٹکتے ہوئے کہا۔

''اوہ...... کیا ہوا یکدم اُسے؟ وہ تو بالکل ٹھیک اور تندرست وتوانا تھا۔'' رچی حیرت سے بولا۔

اس سوال کے جواب میں حشمت نے اسے جو کچھ بتایا وہ رچی کے لیے ناقابلِ یقین تھا۔ حشمت کی کمزور زبان دانی کے باعث مدعا سمجھنے میں بھی دشواری کا سامنا تھا۔

''میں افضال سے ملنا چاہتا ہوں۔'' رچی نے حتمی انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے صاحب! میں کل صبح آپ کو لے چلوں گا۔'' حشمت نے ہامی بھرلی۔

☆☆☆

''کیسے ہو دوست؟'' رچی نے افضال کے سرہانے پھولوں کا ایک گلدستہ رکھتے ہوئے کہا۔
افضال اسپتال کے بستر پر چت لیٹا کسی لاش سے بھی بدتر دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی رنگت میں ڈھیروں زردی گھلی تھی۔
''آپ کے سامنے ہی ہوں صاحب! زندہ ہوں مگر پتا نہیں کیوں ہوں؟'' وہ نقاہت سے بولا۔
''تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے افضال!'' رچی نے تسلی دی۔
''ٹھیک ہو کر کیا کرنا ہے صاحب؟ میں تو دن رات دعائیں کرتا ہوں کہ موت مہربان ہو جائے۔ یہاں سے نکل کر دنیا کا سامنا کیسے کروں گا؟'' اس کی آنکھوں میں آنسو چمکے۔
''ایسا مت کہو۔ تم تو بہت بہادر انسان ہو۔'' رچی ملول ہوا۔
''اس مقام پر کسی کی بھی بہادری اور حوصلہ مات کھا جاتا ہے۔'' افضال تڑپا۔
''ہاں! شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہ ایسا ہی مقام ہے۔'' رچی افسردہ ہوا اور پھر اصل مدعا کی طرف آتے ہوئے کہنے لگا۔
''تمہاری کسی کے ساتھ دشمنی تو نہیں تھی؟''
''مجھ غریب شخص کی کسی کے ساتھ کیا دشمنی ہونی ہے صاحب؟'' وہ تلخی سے بولا۔
''میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں افضال!'' رچی نے سرگوشی میں کہا۔
''کس طرح صاحب؟'' افضال حیران ہوا۔
''وہ میرے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ تم صرف مجھے اتنا بتاؤ کہ تمہیں کسی پر شک تو نہیں؟'' اس نے پوچھا۔
''شک...... نہیں...... ہاں...... شاید...... نہیں۔'' افضال اُلجھ کر بولا۔

☆☆☆

افضال کی طبیعت میں بہتری آتے ہی تین روز بعد اُسے اسپتال سے چھٹی دے دی گئی۔ وہ دل کڑا کر کے گھر آیا تھا جہاں ملاقاتیوں کا ایک ہجوم اس کا منتظر تھا۔ ریاست خداداد میں مریض کی طبیعت کا خیال رکھے بغیر اس کی تیمارداری میں سبقت لے جانے کی سوچ ہمیشہ مقدم رہتی تھی۔ افضال کا خاندان مشترکہ تھا۔ اس کے دو بیٹوں اور تین بیٹیوں کی شادی ہو چکی تھی۔ سب کے درجن بھر بچوں کی عمر نو سال سے چھ ماہ کے درمیان تھی۔ ان کے علاوہ قریبی ہمسائے بھی عیادت کے لیے موجود تھے۔
گھر آتے ہی آہ و فغاں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔
''ابا جی! آپ آ گئے۔ کاش اسی طرح کرن بھی چلی آتی۔'' اس کے بڑے بیٹے قاسم نے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ افضال کا چہرہ متغیر ہو گیا۔
''یہ کرن کے جانے کی عمر تھوڑی تھی۔ ہائے ہماری پھول سی بچی!'' قاسم کی بیوی نے بین کیا۔
''صبر کرو۔ صبر کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ کرن کا خون رائگاں نہیں جائے گا۔'' افضال کی آواز بھینچی ہوئی تھی۔ وہ اس وقت رچی کی ہدایات پر عمل کر رہا تھا۔
''مظلوم کا خون کبھی رائگاں جا ہی نہیں سکتا۔ وہ ضرور رنگ لاتا ہے۔'' قاسم کی بیوی فریحہ کا لہجہ کرچی تھا۔ افضال اور رچی کی مشترکہ ملاقات کے بعد اسے بھی اعتماد میں لیا گیا تھا۔
''اس ظالم درندے نے میری بچی کے ساتھ جو بھی کیا لیکن اسے زندہ تو چھوڑ دیتا۔ میں اسے اپنے پروں میں سمیٹ لیتا۔ اسے اتنی محبت دیتا کہ وہ اپنے سب زخم بھول جاتی۔'' قاسم کو سات سالہ بیٹی کی عصمت دری اور قتل کے لرزہ خیز مناظر ایک بار پھر یاد آئے۔
''مجھے قدرت کے انصاف پر پورا یقین ہے۔ میری بچی کا خون رنگ لائے گا۔'' افضال کے آنسو چہرے پر پھسلنے لگے۔
دیگر اہلِ خانہ بھی اپنے غم و تاسف کا اظہار کرنے لگے۔ اسی اثنا میں بجلی کے جھماکے نے سب کو چونکا دیا۔ کمرے کے بلب بہت تیزی سے جل بجھ رہے تھے۔
''کوئی مین سوئچ ہی بند کر آئے۔ اس طرح تو بڑا نقصان ہو جائے گا۔'' افضال کی ایک اور بہو فاطمہ نے ہڑبڑا کر کہا۔
کچھ لمحوں میں مکمل تاریکی چھا گئی۔ کمرے میں موجود افراد اب انتظامیہ کو کوسنے میں مصروف ہو گئے۔
''دراز میں موم بتی رکھی ہے۔ ماچس بھی پاس ہی پڑی ہے۔'' ایک کونے سے آواز آئی۔
''مچھلی جل کی رانی ہے۔ جیون اس کا پانی ہے...... ہاتھ لگاؤ گے تو ڈر جائے گی۔ باہر نکالو گے تو مر جائے گی۔ ہاتھ لگاؤ گے تو ڈر جائے گی۔ باہر نکالو گے تو مر جائے گی۔'' ایک باریک اور مترنم آواز نے سب کی زبان پر قفل لگا

دیے۔

''یہ..... یہ ظلم تو..... کرن.....'' افضال نے تڑپ کر کہا۔

''ہاتھ لگاؤ گے تو ڈر جائے گی..... باہر نکالو گے تو مر جائے گی۔ باہر نکالو گے تو مر جائے گی۔'' کھڑکھڑاہٹ زدہ آواز ایک بار پھر ابھری۔ اس کے ساتھ ہی فضا میں نامانوس سی گرج بھی محسوس ہوئی تھی۔

فریحہ نے اس اثنا میں موم بتی جلالی تھی۔ کمرے میں مدھم روشنی پھیلی ہی تھی کہ دروازے پر دکھائی دینے والے منظر سے سب کے حواس باختہ ہو گئے۔ وہاں اُلٹے ہوئے چہرے، بکھرے بالوں اور لہو رنگ خراشوں سے بے حال کرن کھڑی تھی۔ وہ کرن جسے چند روز پہلے ہی دفنایا گیا تھا، ان کے سامنے زرد پھولوں والی وہی فراک پہنے کھڑی تھی جو اس نے غیاب کے وقت بھی پہن رکھی تھی۔ اس کے لباس پر بھی جا بجا لہو کے دھبے تھے۔ کرن کی آنکھوں میں وحشت کا ایک جہان آباد تھا۔ اسے دیکھتے ہی اہل خانہ اپنی چیخیں بمشکل ضبط کر پائے تھے۔ کئی ایک نے تو ہونٹ ہی کچل دیے تھے۔

''کرن میری بچی..... یہ تم ہی ہو ناں؟'' فریحہ تڑپ کر آگے بڑھی۔ دیگر افراد سکتہ زدہ تھے۔

''رک جائیں..... وہیں.....'' کرن نے یک دم کہا۔ اس کے لہجے و آواز میں عجیب کھڑکھڑاہٹ تھی۔

''کیوں میری بچی؟ مجھے اپنے پاس آنے دو۔ میں تمہیں اپنی آغوش میں لینا چاہتی ہوں۔'' فریحہ بلکنے لگی۔

''کاش یہ کام آپ نے پہلے کیا ہوتا۔ مجھے اپنے پاس ہی رکھا ہوتا۔ کہیں نہ جانے دیا ہوتا۔'' کرن کے لہجے کی کھڑکھڑاہٹ اہل خانہ کو عجیب طرح سنسنا رہی تھی۔

''کرن! میری بیٹی..... میں.....'' قاسم نے بھی آگے بڑھنا چاہا۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ یہ کرن کیسے ہو سکتی ہے؟ اسے تو دفنایا جا چکا ہے۔'' افضال نے سراسیمگی سے کہا۔ رچی کی ہدایات پر من و عن عمل ہو رہا تھا۔

''نہیں ابا جی! یہ میری کرن ہی ہے۔ آپ سب دیکھ تو رہے ہیں۔ یہ میری کرن ہی ہے۔'' فریحہ ہذیانی انداز میں بولی۔

''میں نے اپنے بڑوں سے سن رکھا ہے کہ بے چین روحیں بھٹکتی رہتی ہیں۔ شاید وہ سچ ہی کہتے تھے۔'' افضال کی آواز ڈوبنے لگی۔

اس کی بات پر کمرے میں موجود تمام لوگوں میں سراسیمگی پھیل گئی۔

''انصاف..... مجھے انصاف چاہیے۔'' کرن نے اپنے دونوں بازو ہوا میں لہرائے۔ اس کے بال چہرے پر بکھر گئے تھے۔

''میری بچی! مجھے بتا میں تیرے لیے کیا کر سکتی ہوں؟'' فریحہ گھٹنوں کے بل زمین بوس ہوئی۔ بیرونی فضا میں ہونے والی نامانوس گرج دل دہلا رہی تھی۔

''انصاف..... سکون..... انصاف۔'' اس کا انداز وحشت زدہ ہونے لگا۔

''کون ہے تیرا مجرم؟ مجھے بتاؤ تو سہی..... کون ہے تیرا مجرم؟'' افضال کی آواز کمرے میں گونجی۔

موم بتی کی مدھم روشنی میں لہراتے سائے، کرن کا پھڑپھڑاتا لباس، بکھرے بال، چڑھی ہوئی آنکھوں اور وحشت زدہ انداز نے کمرے کا ماحول بے حد ہولناک بنا دیا تھا۔

''مجرم..... ہاں! میں اپنا مجرم ہی تو لینے آئی ہوں۔ میں اُسے اپنے ساتھ لے جانے آئی ہوں۔'' کرن کی آنکھیں اب تیزی سے حلقوں میں گردش کر رہی تھیں۔

''کون ہے تیرا مجرم؟''

''خدا کا واسطہ ہے مجھے بتاؤ کون ہے تمہارا مجرم؟''

افضال اور قاسم بیک وقت چلّا اٹھے۔ کرن کی آنکھیں مزید چڑھی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ اس نے جنونی انداز میں اپنا سر اور بال لہرانے شروع کر دیے۔ فضا میں بلند ہاتھ تیزی سے نیچے آیا۔ انگشت شہادت ہوا میں اٹھی اور نہایت سست روی سے گردش کرنے لگی۔

''انصاف..... میں انصاف لینے آئی ہوں۔'' وہ بہ آواز بلند بولنے لگی۔ کھڑکھڑاہٹ تیز سے تیز تر ہو رہی تھی۔ گرج میں بھی شدید اضافہ ہو چلا تھا۔

''انصاف..... بدلہ..... انتقام.....'' انگلی دھیرے دھیرے مزید گردش میں آئی۔

اسی لمحے کمرے کے ایک کونے سے دھڑام کی آواز آئی۔ افضال سمیت ہر ایک کی نظریں اسی جانب اٹھ گئیں۔ زرد رنگت اور فق چہرہ سے اپنے سینے پر دہشت زدہ انداز میں ہاتھ رکھے زمین بوس ہونے والے ایک شخص کی دید نا قابلِ یقین منظر تھا۔

رچی کا اپنے ہنر کے متعلق دعویٰ بالکل درست ثابت ہوا تھا لیکن وہ مجرم.....

''آہ...... کاش یہ سب بھی اس کرن کی آمد کی طرح ایک فریب ہو...... آہ......'' افضال نے کرب سے سوچتے ہوئے اپنی آنکھیں موندلیں۔

☆☆☆

سرما کا اختتام ہو چکا تھا۔ بہار نے درختوں پر دلفریب پیوندکاری شروع کردی تھی۔ ہر نظارہ بے حد حسین تھا۔ سوزین ایک قریبی دکان سے ناشتے کا سامان لیے واپس آئی تو رچی کے گھر کا کھلا دروازہ دیکھ کر حیران ہوگئی۔ اس سے بھی زیادہ حیرت گھر کے مختصر سے صحن میں رکھے اوزاروں اور لکڑی کا سامان دیکھ کر ہوئی تھی۔

''رچی! مسٹر رچی کیا یہ تم ہو؟'' وہ تجسس سے بولی۔

''ہاں سوزین! میں ہی ہوں۔'' رچی کی سنجیدہ آواز اُبھری۔

''واپس کب آئے تم؟ اور یہ سب کیا ہے؟'' سوزین نے پوچھا۔

''کل رات ہی واپس آیا ہوں۔ اور یہ سب میرا نیا لیکن آبائی ذریعۂ روزگار ہے۔'' اس نے سادگی سے بتایا۔ اس کے مزاج و انداز پر ایک عجیب سا کہر چھایا محسوس ہو رہا تھا۔

''لیکن تم نے تو مجھے فون پر بتایا تھا کہ وہاں بہت خوش ہو اور عنقریب اپنے ہنر سے سب کو چونکا دو گے۔'' سوزین اُلجھی۔

''ہاں ایسا ہی تھا۔ لیکن میں مزید وہاں رہ ہی نہیں سکتا تھا۔'' رچی چڑ کر بولا۔

''ایسا کیا ہو گیا آخر؟'' کچھ تو بتاؤ مجھے۔'' سوزین وہیں برآمدے کی سیڑھیوں پر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ رچی قدرے جزبز ہونے لگا۔

''پلیز رچی!'' سوزین نے التجا کی۔ رچی نے ٹھنڈی آہ بھری اور اسے ماضی قریب کے ان لمحات میں لے گیا جب اسپتال میں افضال اور فریحہ سے ایک مشترکہ لائحہ عمل طے پایا تھا۔

☆☆☆

''یہ شخص کیا کہہ رہا ہے ابا جی؟ مجھے اس کی منطق سمجھ ہی نہیں آرہی۔'' غم و صدمہ سے بے حال فریحہ کا ذہن مکمل طور پر ٹرستا ہوا تھا۔

''یہ صرف اتنا کہہ رہا ہے کہ اسے کرن کی ہم عمر بچی اور ایک متبادل لباس درکار ہے جو اُس روز ہماری بچی نے پہن رکھا تھا۔'' افضال نے آہ بھرتے ہوئے ایک بار پھر وضاحت کی۔

''لیکن اس سے آخر ہوگا کیا؟ میری بچی تو واپس نہیں آئے گی نا۔'' فریحہ رونے لگی۔

''میں آپ کے دکھ میں یکساں طور پر شریک ہوں محترمہ!'' رچی نے حتی الامکان سلاست سے کہا۔ ''لیکن میرا یقین کیجیے۔ میں نے اس میدان میں کبھی ناکامی کا سامنا نہیں کیا۔ مجھے اپنا ہنر ایک بار پھر آزمانے کا موقع دیجیے۔''

''کرن کی ہم عمر بچی تو میری بھتیجی بھی ہے۔ اور بازار سے ویسا لباس لانا بھی مشکل کام نہیں لیکن......'' فریحہ اُلجھی۔

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ بس دو روز میں نتیجہ دیکھ کر آپ دونوں خود بھی حیران ہو جائیں گے۔'' رچی پُراعتماد تھا۔

''میری پوتی کا روپ اس بچی کو آخر کیسے دو گے تم؟ یہ سب کیسے ممکن ہوگا؟ آخر تم کرنا کیا چاہتے ہو؟ یہ سب ہوگا کیسے؟'' افضال نے بھی اپنے خدشات بیان کیے۔

''وہ سب میرے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ میں نہ صرف بچی کو مرحومہ کا ہو بہو روپ دے سکتا ہوں بلکہ اُس سے بھرپور اداکاری بھی کروا سکتا ہوں۔ میرا یقین کرو۔''

فریحہ مشکوک اور افضال بے بس نظروں سے اُسے دیکھ کر رہ گئے۔

☆☆☆

''تو تم نے اس عورت کی بھتیجی کو مقتولہ کا روپ دے دیا۔ اور پھر اس نے بھی اپنی کارکردگی کا خوب مظاہرہ کیا۔ لیکن تمہیں اندازہ کیسے ہوا کہ مجرم وہیں ملے گا۔'' سوزین نے تجسس سے دریافت کیا۔

''مجھے ایسا کوئی بھی اندازہ نہیں تھا۔'' رچی نے اعتراف کیا۔ ''میرا منصوبہ تو کچھ اور تھا۔ میں وہاں صرف سنسنی پیدا کر کے بچی کو غائب کر دیتا۔ پھر اگلے روز وہ بچی محلے میں دکھائی دیتی۔ عیادت کے لیے آئے محلہ داروں سے یہ خبر تو پہلے ہی باہر نکل گئی ہوتی کہ کرن کی بے چین روح اپنے مجرم کی تلاش میں ہے۔ اس طرح مجرم کوئی نہ کوئی غلطی کر کے خود ہی پکڑ میں آجاتا۔ وہاں یہ سارا ایکٹ آسان بھی بہت تھا۔ تعلیم اور پسماندہ سوچ کے معاملے میں وہ خطہ کم و بیش ہم جیسا ہی ہے۔ مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ مارٹی کی نسبت ایک ہی وار میں مجرم بے نقاب ہو جائے گا۔''

''مجرم کون تھا رچی؟'' سوزین سخت مضطرب تھی۔

رچی کے تصور میں ایک معزز، بارعب اور شفیق سراپا

لہراتے ہی افضال، فریحہ اور قاسم کا ہذیانی انداز بھی اُجاگر ہو گیا۔ اس نے اذیت سے آنکھیں میچ لیں۔

’’ایک ایسا رشتہ جس پر عموماً بہت اعتبار کیا جاتا ہے۔ مجھے اہلِ خانہ کی حرکات و سکنات سے ہی اتنا اندازہ ہوا تھا کہ مجرم کوئی خونی رشتے دار تھا۔‘‘ وہ بدقت بولا۔

’’مجرم کو تو فوری سزا دے دی گئی ہوگی؟‘‘ سوزین نے ایک اور زاویے سے سوال کیا۔

’’وہاں مجرم میں ہی بن گیا تھا سوزین! افضال میرا شکریہ ادا کرنے کے بجائے الٹا قصوروار ٹھہرانے لگا کہ میں نے ان کے لیے مشکلات مزید بڑھا دی ہیں۔ مجھے وہاں سے نکل جانے کا کہا اُس نے۔‘‘ رچی تلخی سے کہنے لگا۔ سوزین بھی صورت حال کی اس سنگینی پر کچھ دیر کے لیے خاموش رہ گئی۔

’’تم واپس کیوں چلے آئے؟ تمہیں تو وہاں رک کر مزید کامیابیاں سمیٹنی چاہیے تھیں۔‘‘ سوزین اس کے فیصلے پر اُلجھن میں تھی۔

رچی نے مضطربانہ انداز میں اپنے ہاتھ مسلے اور ایک توقف سے کہنے لگا۔

’’اس روز پولیس اسٹیشن میں بھی ایک بات کہتے رک گیا تھا۔ آج وہ مکمل کیے دیتا ہوں۔ میں نے اپنی زندگی میں ہمیشہ اس نظریہ کا پرچار کیا کہ انسانی زندگی میں سب سے بڑا... عفریت لالچ اور خوف ہے۔ انسان ہر ممکن ترقی کے باوجود ماضی کے کچھ پہلوؤں سے نجات حاصل نہیں کر سکا۔ انہی میں ایک پہلو ’خوف‘ ہے۔ انسان اپنی شہ زوری کے باوجود ایک خوفزدہ مخلوق ہے۔ وہ آج بھی بھوت پریت اور آسیب سے خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لو کہ انسان نے ستاروں پر کمند ڈالنے کی تیاری کر لی ہے لیکن وہ آج بھی دو عفریتوں ’خوف اور لالچ‘ کے زیرِاثر ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ کیمرون کے دیے گئے لالچ کا چارا نگل کر ماری دوسرے عفریت خوف سے مغلوب ہو گیا تھا۔ لیکن ریاست خداداد نگر میں میرا یہ نظریہ یا فلسفہ باطل ثابت ہو گیا۔‘‘ رچی اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

’’وہ کیسے رچی؟‘‘ سوزین فوراً بول اٹھی۔ ’’ابھی تو تم نے بتایا کہ بچی کا مجرم خوف ہی کے زیرِاثر بے نقاب ہوا تھا اور اس کے لواحقین نے کسی معاشرتی خوف ہی کے تحت اُسے قانون کے حوالے نہیں کیا تھا۔‘‘

’’بالکل ایسا ہی ہوا تھا لیکن سوزین! میں نے وہاں یہ بات جانی کہ انسان کی زندگی میں ایک اور عفریت بھی موجود ہے۔ ’جنس‘ کا عفریت جو کسی بھی انسان کو حیوانیت کے جانے میں لے آتا ہے۔ بچی کے مجرم کا آشکار ہونا میرے لیے ایک انقلابی لمحہ تھا۔ میں جان گیا ہوں کہ اس معاشرے میں یہ عفریت بہت تیزی سے اپنی جگہ بنائے گا۔ خداداد نگر کا معاشرہ کھوکھلا ہوتا جائے گا۔ آنے والے برسوں میں ان بچیوں اور بچوں کو اپنے ہی گھر میں درندے بھنبھوڑنے لگیں گے۔ میں اس ڈوبتے ہوئے جہاز میں اپنی بھی غرقابی کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ وہاں سب سے بڑا... عفریت جنس ہے سوزین! کیا پتا مجھے بھی یہ عفریت نگل لیتا۔ میں بھی وہی کچھ......‘‘ رچی جھرجھری لے کے رہ گیا۔

’’میں وہ ڈوبتا جہاز چھوڑ آیا ہوں۔ مجھے اب کہیں کسی فلمی منڈی میں اپنا ہنر نہیں آزمانا۔ میں بدقسمت اور محروم ہی اچھا ہوں۔‘‘ رچی یکدم ہذیانی انداز میں کہتا اٹھ کھڑا ہوا۔

’’کہاں جا رہے ہو اب؟‘‘ سوزین چونکی۔

’’لائبریری جا رہا ہوں۔ وہاں انٹرنیٹ استعمال کرتے ہوئے وہ بھی ویب سائٹس کھولوں گا جہاں میں نے اس ریاست کی تعریفوں کے پُل باندھے دیکھے اور پڑھے تھے۔‘‘ رچی نے رک کر اس کی جانب دیکھا۔

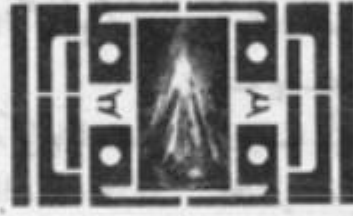
’’تم کرنا کیا چاہتے ہو آخر؟‘‘ سوزین کو کسی انہونی کا احساس ہونے لگا۔

’’میں وہاں یہ لکھوں گا کہ ریاست خداداد کا سب سے .... بدصورت عفریت جنس ہے۔ میں وہاں رہنے والے لوگوں سے درخواست کروں گا کہ جلد از جلد وہ ریاست چھوڑ دیں ورنہ یہ عفریت انہیں نگل لے گا۔‘‘ اس کا ہذیان برقرار تھا۔

’’رچی! ہوش میں آؤ۔ تمہیں ایسا کرنے کی آخر کیا ضرورت ہے؟‘‘ سوزین بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

’’ہوش میں ہی تو آیا ہوں۔ خواہ مخواہ اتنا عرصہ یہ سمجھتا رہا کہ انسانی زندگی کا سب سے بڑا... عفریت لالچ اور خوف ہے۔ جنس سے بڑا... کوئی عفریت نہیں۔ آہ وہ دلکش اور خوبصورت ریاست! ایسا کرتا ہوں کہ وہاں دوبارہ ...... جاتا ہوں۔ ایک ایک فرد کو بتاؤں گا کہ ریاست خداداد ایک بھیانک عفریت کی لپیٹ میں ہے۔ اسے بچا لیں۔ اسے بچا لیں۔‘‘ رچی کی آنکھوں میں سرخی اور چہرے کی وحشت نے سوزین کو گنگ کر دیا۔ وہ خاموشی سے اپنے گھر کی راہ پر ہو لی۔





ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

الاٹو... مرحوم کاشف زبیر کی آخری سلسلے وار تحریر ہے... جو انہوں نے..... قارئین کے لیے تحریر کرنا شروع کی تھی... لیکن دستِ قضا نے ان کو اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ چند سنسنی خیز اقساط لکھنے کے بعد اسے اختتام تک پہنچاتے... کسی بھی مصنف کی تحریر کو اسی کے رنگ و آہنگ میں لکھنا کڑا امتحان ہوتا ہے... الاٹو کو آگے بڑھانے کا فریضہ اب ڈاکٹر عبدالرب بھٹی انجام دیں گے... الاٹو ایکشن، تھرل اور سسپنس سے بھرپور داستان ہے... ایک مسیحا کو لوگوں کی مسیحائی سے دور کر کے درندگی کے گھناؤنے کھیل میں ایسا الجھایا کہ وہ زندگی کی ہر رنگینی کو بھلا بیٹھا... اب اس کا مقصد صرف اور صرف ان دشمنوں کی کھوج تھی جو سامنے ہوتے ہوئے بھی نگاہوں سے اوجھل تھے...

اٹھارھویں قسط



گذشتہ اقساط کا خلاصہ

پاکستانی ڈاکٹر سیف الدین، امارات کے ایک ہاسپٹل میں جاب کر رہا ہے، یوں دیگر ممالک سے آئے ہوئے ٹاپ پروفیشنل افراد میں بھارت سے تعلق رکھنے والے دو ڈاکٹرز رمیش اگروال اور رنبیر سنگھ بھی ہیں۔ کھلے دل کا مالک اور دوست نواز رنبیر سنگھ، ڈاکٹر سیف کا ایک اچھا دوست ہے لیکن ڈاکٹر رمیش اگروال ایک کینہ پرور آدمی ہے۔ پاکستان کے خلاف اس کے دل میں شدید نفرت بھری ہوئی ہے اور وہ ڈاکٹر سیف سے بھی اسی لیے عداوت رکھتا ہے کہ اس کا تعلق پاکستان سے ہے۔ یوں رمیش جان بوجھ کر سیف کے سامنے اس کے ملک پاکستان کی برائیاں کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان ہونے والے ایک کرکٹ میچ کے دوران جب بھارت کے ہاتھوں پاکستان کو شکست ہوئی تو بغض میں ڈاکٹر رمیش اگروال کو پاکستان کے خلاف زہر اگلنے کا خوب موقع ملا اور تب ہی ڈاکٹر سیف یہ برداشت نہ کر سکا اور زبانی کلامی اسے منہ توڑ جواب دے دیا۔ نوبت ہاتھا پائی تک آتی اگر دیگر کولیگز ان کے درمیان نہ آتے، اُنہوں نے بھی رمیش کو ہی اس کی بداخلاقی اور بدزبانی پر کوسا تھا جن میں رنبیر سنگھ سرفہرست تھا۔ بہ ظاہر بات آئی گئی ہو گئی لیکن رمیش نے دل میں رکھ لی۔ انہی دنوں سیف پر ایک بھیانک انکشاف ہوا کہ اسپتال میں چند جرائم پیشہ خفیہ طور پر انسانی اعضا کی غیر قانونی پیوندکاری میں ملوث تھے۔ اسپتال کے تیرہویں چودھویں فلور میں غلطی سے جانے پر سیف کو رمیش دانستہ کچھ باکسز کی جھلک دکھاتا ہے اور ساتھ ہی اسے بڑی کینہ توز اور منتقمانہ نظروں سے گھورتا ہے، سیف نہیں جانتا کہ اس باکسز میں اس کے چھوٹے معصوم بھائی عادل کو رمیش نے اپنی دشمنی کے غبار تلے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے فروخت کر دیا ہے۔ اس دوران سیف پر قاتلانہ حملے ہوتے ہیں، مگر قسمت اس کا ساتھ دیتی ہے اور اس کی جگہ اسی کا ہم وطن احسان مارا جاتا ہے، دوسرے حملے میں اس کا بھارتی دوست رنبیر سنگھ ہلاک ہو جاتا ہے۔ سیف پاکستان لوٹتا ہے اور اسے بھائی کی گمشدگی کا پتا چلتا ہے۔ ڈاکٹر سیف پنجاب (پاکستان) کے ایک سرحدی گاؤں کا باشندہ ہے۔ باپ زمین کے کچھ ٹکڑوں کا مالک ہے۔ بعد میں وہ پھیپھڑوں کی بیماری کی وجہ سے کوچ کر جاتا ہے۔ سیف کا چھوٹا بھائی عادل، ماجد کا دوست ہے اور ماجد، سیف کی کلاس فیلو ڈاکٹر حمیرا کا بھائی ہے۔ حمیرا کے باپ امجد کا لاہور میں کاروبار ہے۔ حمیرا اور سیف آپس میں ملتے ہیں اور ان کے درمیان پسندیدگی، پھر اُنسیت اور اس کے بعد تعلق خاطر محبت میں بدل جاتا ہے۔ وطن لوٹنے پر عادل کی گمشدگی پر سیف اس کی تلاش میں لگ جاتا ہے اس دوران اسے عادل کی لاش دیکھنا پڑتی ہے۔ ایسی لاش جو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق اندر سے خالی تھی۔ بدنصیب عادل کو لاش میں بدلنے سے پہلے مکروہ کھیل کے دوران اسے اہم اندرونی جسمانی اعضا سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ سیف بھائی کی قبر کی مٹی اٹھا کر قسم کھاتا ہے کہ جن لوگوں نے ایسا بے رحمانہ کھیل کھیلا ہے، وہ انہیں تصویرِ عبرت بنا کے چھوڑے گا۔ اس کے بعد سیف کی زندگی کا ڈھب بدل کر رہ جاتا ہے۔ ایسے میں طارق مجید نامی ایک کرائم رپورٹر جو بیک وقت لڑائی بھڑائی میں بھی طاق ہے اور اس کی پارٹنر رومانہ عرف رومی، جس نے کرمنالوجی میں ماسٹر کیا اور انٹرپول سے متعلق تھی، آج کل یہ دونوں آرگن پائریسی اور انسانی اعضا کی اسمگلنگ کے ٹاسک پر کام کر رہے تھے۔ سیف جیسے عام مسیحا کو ان دونوں ''ٹاپ پروفیشنل'' کی ہم راہی مل جاتی ہے تو وہ کندن بننے لگتا ہے۔ تاہم حالات کی تلخیاں اور زہرناکیاں اس کی نفسیات پر عجیب اثر بھی ڈالتی ہیں جہاں وہ ایک طارق اور رومی جیسے ٹاپ پروفیشنلو ساتھیوں کی سنگت داری میں جنگجو بننے لگتا ہے وہیں اس میں بذلہ سنجی بھی پروان چڑھنے لگتی ہے۔ اب ان تینوں اور انسانی اعضا کی غیر قانونی پیوندکاری کرنے والے بین الاقوامی خونی سوداگروں کے بیچ ایک دھواں دھار رن پڑ چکا ہے۔ ان تینوں ساتھیوں کی مضبوط تکڈم...... ان خونی بیوپاریوں کو نگنی کا ناچ نچاتی ہے، جن کا نیٹ ورک پاکستان میں بھی اس گھناؤنے کالازار میں مصروف کار ہے۔ پاکستان میں ان کا سرغنہ فیروز شاہ المعروف گوہر شاہ اور اس کے خاص کارپرداز تاج کے ساتھ جنگ جاری تھی۔ سیف کو پتا لگتا ہے کہ ڈاکٹر رمیش نے اپنی بھیانک دشمنی نکالنے کے لیے انہی دونوں مذکورہ افراد کو عادل کا پتا دیا تھا۔ ڈاکٹر رمیش اگروال خونی سوداگروں کی ''ہائیر اتھارٹیز'' سے تعلق رکھتا ہے اور اس میں اس کا باس سرجن امرناگ بھی شامل ہے۔ یہی لوگ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے نیٹ ورک کو چلا رہے ہیں اور ان خونی بیوپاریوں میں...... شنکر چانکیہ، سہراب مجوٹھ، بنکاک اور دیگر چند ممالک کے زونل چیف احکامات دیتے اور انسانی اعضا کو چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر خصوصی چارٹرڈ طیارے ہائر کرنے اور مذکورہ بیمار افراد کو کروڑوں روپوں کے عوض اعضا لگانے کے پابند ہیں۔ پاکستان میں گوہر شاہ کے ساتھ جنگ کے دوران یہ لوگ حمیرا کے گھر والوں کے بھی دشمن بن جاتے ہیں۔ سیف کا دوست ایس پی شاداب اس کی مدد میں شامل ہے۔ حمیرا اور اس کا باپ ان کے ڈر سے یو کے شفٹ ہو جاتے ہیں اور اس طرح سیف اور حمیرا کی راہیں جدا ہو جاتی ہیں۔ ان تینوں ساتھیوں کی کوششوں کے سبب...... پاکستان میں ان خونی بیوپاریوں کے نیٹ ورک کا قلع قمع ہونے لگتا ہے لیکن سیف کو ابھی اپنے بھائی کے قاتلوں کی تلاش ہے۔ رومی اور سیف امارات کا رخ کرتے ہیں، یہاں پر اسے بھائی کے ایک دشمن سرجن امرناگ کو سیف عبرتناک موت سے ہمکنار کرتا ہے لیکن اصل دشمن ڈاکٹر رمیش اگروال فرار ہو کے بھارت جا کر اپنے گرو گھنٹال شنکر چانکیہ کے چرنوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس کے تعاقب میں رومی اور سیف بھارت کا رخ کرنے والے ہیں لیکن بدقسمتی سے رومی تو بھارت چلی جاتی ہے لیکن سیف نہیں

جاسکتا۔ طارق اور رومی کے مشورے اور ہدایات کے مطابق ناچار سیف امارت سے پاکستان کا رخ کرتا ہے کہ طیارے کو کچھ نامعلوم دہشت گرد ہائی جیک کر لیتے ہیں۔ اندر کچھ ناخوش گوار واقعات کی وجہ سے طیارے کو کریش لینڈنگ کے عمل سے گزرنا پڑتا ہے اور وہ راجستھان کے صحرا میں تباہ ہو جاتا ہے۔ سیف اور اس کی دو بدنصیب مسافر ساتھی مالا اور شکنتلا زندہ بچتے ہیں مگر وائے نصیب کہ یہ تینوں صحرائی لٹیروں کے چنگل میں جا پھنستے ہیں۔ قبیلے میں آتے ہی ان تینوں کے ساتھ زیادہ برا سلوک نہیں ہوتا۔ سیف کیونکہ ڈاکٹر تھا اس لیے مہاراجا کی خصوصی توجہ حاصل کر لیتا ہے۔ مالا سے یہاں کا ماحول اور حالات برداشت نہیں ہو رہے تھے۔ موقع دیکھ کر وہ فرار ہو جاتی ہے اور عبرت ناک انجام سے دوچار ہو کے ہلاک ہو جاتی ہے۔ سیف اور شکنتلا بھی یہاں سے جلد نکل جانا چاہتے تھے مگر اس سے پہلے ہی مہاراجا کا دیہانت ہو جاتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

معاملہ یکایک گمبھیر ہو گیا تھا۔

محل میں ہڑبونگ مچ گئی۔ پورا شس گڑھ افسردگی کی لپیٹ میں آگیا۔ میں جانتا تھا کہ ابھی یہ سلسلۂ آہ و بکا مہینہ بھر تو ضرور چلے گا۔

ٹھاکر ہری داس جسے ''چری'' داس کہنا زیادہ بہتر تھا کے ''متوقع دیہانت'' کے بعد، جسے مہارانی دل آرام اپنے پُراندیش وسوسوں اور خطرات حتیٰ کہ اپنی بربادی سے بھی تعبیر کر چکی تھی، اب ان کے پورے شدومد کے ساتھ ظہور پذیر ہونے کی راہ ہموار ہو چکی تھی۔

مہارانی کی تباہی کا مطلب میرا یہاں سے گک آؤٹ ہونا تھا۔ جس پر میں ٹھاکر ہری داس کے مرنے سے پہلے ہی غور کر چکا تھا اور اب کُوچ کرنے کی منصوبہ بندی پر عمل شروع کرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اس کی موت واقع ہو گئی۔

اس سے پہلے کہ مہارانی دل آرام ایک بار پھر اپنا تازہ دُکھڑا لے کر میرے سامنے آتی، میں نے خود کو مہمان خانے تک ہی محدود کر لیا اور اپنا تھوڑا بہت جو بھی بوریا بستر تھا، وہ سمیٹ کر ایک کِٹ کی صورت میں پہلے ہی تیار کر رکھا تھا۔

معاملہ فوری طور پر کُوچ کرنے کا تھا اسی لیے جو ضروری شے رکھ سکا، وہ سنبھال لی۔

ہری داس کی موت پر اُن کے جوان بچوں یعنی منوج، وشنی، سرنج اور کورا...... کا ایک ٹولے کی صورت میں یہاں وارد ہونا لازمی تھا۔ سب سے پہلے تو وہ چاروں اپنے دل کی بھڑاس نکالتے اور اپنی سوتیلی ماں کا جانے اب کیا حشر کرتے البتہ مجھے وہ چاروں ضرور پہلے ٹیڑھی نگاہ اور پھر سیدھی نظروں سے گھورتے ہوئے باہر کا راستہ دکھائیں گے، کوئی بعید نہیں وہ مجھے...... اپنی سوتیلی ماں کے کسی ہوتے سوتے کا الزام لگا کر قرار واقعی سزا بھی دلوانے کی کوشش کرتے، ایسے میں مہارانی دل آرام کے اب کیا اختیارات تھے، یہ بعد از وقت تھا۔

القصہ میں اب ''تپلی گلی'' تلاش کر رہا تھا۔ ابھی تو رات تھی، کُوچ کا قصد میں نے صبح تک ملتوی رکھا۔

بہر کیف ...... یہاں ہوا وہی جس کا ڈر تھا، کوئی خادمہ بھاگی ہوئی میرے پاس آئی اور مجھے ساتھ چلنے کو کہا۔

اس کے ہمراہ ایک رعب داب والا تنومند آدمی بھی تھا۔ یہ یہاں میرا دیکھا ہوا تھا۔ یہ گرنام سنگھ تھا۔ محل کے محافظین کا سربراہ، عرفِ عام میں اسے چیف سیکیورٹی گارڈ ہی کہوں گا۔ قد اس کا چھ فٹ سے بھی نکلتا ہوا، بڑی بڑی مونچھیں اور داڑھی، بادی النظر میں سر، مونچھیں اور داڑھی کے بال ایک ہی محسوس ہوتے تھے۔ اس کی آنکھیں موٹی اور ڈیلے کسی ٹوڈمینڈک کی طرح اُبھرواں تھے۔ وہ خاصا جنگجو نظر آتا تھا۔

انہوں نے مجھے مہارانی کی طبیعت کی خرابی کا بتایا اور چل کر انہیں دیکھنے کا حکم جاری کیا۔

ناچار میں نے اپنا میڈیکل باکس سنبھالا اور ان کے ساتھ ہو لیا۔

ایک وسیع وعریض اور پُرآسائش کمرے کی جہازی سائز مسہری پر مہارانی دل آرام...... صاحب فراش انداز میں ہی لیٹی ہوئی تھی۔ کچھ خدمت گزار عورتیں اس کی مالش وغیرہ کرنے اور سنبھالا دینے میں مصروف کار تھیں، سب سے پہلے میں نے انہیں ایک جانب ہٹنے کا اشارہ کیا اور مہارانی کی جانب بڑھا۔

میں جلد از جلد اس کا چیک اَپ وغیرہ کرنے کے بعد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ بیوگی اور شوہر کے انتقال کے صدمے سے زیادہ اس پر شاید...... پیش آئندہ حالات کی

خطرناکی کا خوف طاری ہوگیا تھا اور اسی لیے اس پر غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔

میں نے مسکن آور انجکشن لگا کر اپنی جان چھڑائی اور...... واپسی کے لیے لپکنا چاہا تو گرانڈیل گرنام نے میرا راستہ روک لیا۔

”ڈاکٹر...... ! جب تک مہارانی صاحبہ کو پوری طرح ہوش نہیں آجاتا، تم اِدھر ہی رکو گے۔“ اس کا لہجہ سپاٹ اور کسی بھی قسم کے اخلاق سے عاری تھا۔ یہی نہیں اس سپاٹ پن میں ایک طرح کا حکم بھی شامل تھا۔

یہاں میں نے پیشہ ورانہ طبی ”حربہ“ کھیلا اور گرنام سنگھ سے سنجیدگی سے کہا۔

”اس وقت مہارانی صاحبہ کے کمرے میں، میں کیا بلکہ کسی کو بھی نہیں رہنا چاہیے، انہیں پورے سکون اور تنہائی کی ضرورت ہے۔ یہ اب بہتر ہیں، چنتا کی ضرورت نہیں۔“

جیسا کہ مذکور ہوا جیسا دیس ویسا بھیس کے مصداق میں یہاں ضرورتاً ہندی کے الفاظ بول لیتا تھا، جو چند تو میں نے انڈین فلموں اور ناولوں سے سیکھے تھے اور کچھ یہاں رہتے ہوئے۔ لیکن اس کم بخت گرنام نے نہ میرے ڈاکٹری مشورے کو اہمیت دی نہ ہی میری ہندی کو...... اسی سپاٹ پن اور حکمیانہ سے لہجے میں بولا۔

”ایک خادمہ اور تم اِدھر ہی رہو گے۔“

یہ اس نے یوں کہا جیسے کوئی روبوٹ رٹا رٹایا جملہ بولتا ہے۔ اس کے بعد وہ ناہنجار واپس پلٹ گیا۔

جس خادمہ کو وہاں میرے ساتھ روکا گیا تھا، وہ ایک جوان اور خوب صورت لڑکی تھی۔ اس نے گہرے اودے رنگ کا علاقائی لباس پہن رکھا تھا جو ایک تنگ اور خوب کسی ہوئی کرتی اور گھاگھرے پر مشتمل تھا۔ پیلی سی مہین چنریا اس نے بس رسماً ہی اوڑھ رکھی تھی۔ گھنیرے سیاہ بالوں کی ایک موٹی سی چٹیا بھی اس کی فراخ چھاتی پر لہرا رہی تھی۔ اس کا نام چنبیلی تھا۔

اس نابکار گرنام سنگھ کے یہ حکم صادر کر کے چلے جانے کے بعد جب میں وہیں کھڑا منہ بسور رہا تھا تو اس وقت وہ اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے مجھے گھورے جا رہی تھی اور اس کے عنابی ہونٹوں پر شرارت آمیز سی پرشوخ مسکراہٹ بھی تھی۔ یوں جیسے وہ میری بے بسی سے حظ اُٹھا رہی ہو۔ مجھے وہ زہر لگی، نجانے کیوں تقدیر کو میرا امتحان اسی صورت ہی سوجھتا ہے۔ میں کرسی پر براجمان ہوگیا۔

”کیا ہے؟ ایسے کیوں گھورے جا رہی ہو مجھے؟ کبھی دیکھا نہیں کسی آدمی کو......؟“

اسے بدستور گھورتا پا کے میں نے اسی پر ہی اپنا غبار نکال دیا۔ مجھے غصے میں دیکھ کر وہ ایک دم گھبرا گئی اور...... سکڑ سٹ کر مہارانی کی مسہری کے قریب فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھ گئی۔

مجھے بھوک اور پیاس کا احساس ہوا۔ گرنام کے حاکمانہ انداز کی کسر میں اس سے پوری کرنے لگا اور میں نے اسے کھانے پینے کا بندوبست کرنے کا کہا۔ اس نے فوراً ہی میرے حکم کی تعمیل کر ڈالی۔

کھانا ہمیشہ ہی یہاں بڑا پُرتکلف ہوتا تھا۔ میں نے خوب ڈٹ کر کھایا۔ گویا غصہ ہر شے پر نکالنا میرا مقصدِ اولین بننے لگا۔

کھانا کھاتے ہی ہمیشہ کی طرح مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی اور میں وہیں ایک شاہانہ طرز کی سیٹی (کاؤچ) پر دراز ہوگیا۔

دل تو چاہا اس راجستھانی حسینہ سے پاؤں بھی دبوانے کا کہہ دوں، غصہ اور غبار نکالنے کی یہی ایک کسر باقی رہ گئی تھی۔ لیکن میں اپنی عادت نہیں خراب کرنا چاہتا تھا۔ آنکھیں موند کر سوتا بن گیا۔

نجانے کب پھر میری آنکھ لگ گئی اور میں لگا خراٹے لینے۔ (یہ میرا خیال تھا)

جانے رات کے کس پہر میری اچانک آنکھ کھلی۔ یہ کسی کھٹکے کی آواز تھی۔ میں نے کاؤچ پر لیٹے لیٹے اپنی آنکھیں کھول دیں اور چھت کو خالی الذہنی کی حالت میں گھورنے لگا۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ گویا ابھی رات باقی تھی۔

میں نے کسی کی کھنکتی آواز سنی، کوئی سرگوشی میں باتیں کر رہا تھا۔ مجھ پر نیند کا بوجھل پن طاری تھا۔ جی نہیں کیا اُٹھنے کو لیکن حالات ایسے تھے کہ تجسس نے ستایا میں آہستگی کے ساتھ اُٹھنے پر مجبور ہوگیا۔

ایک سایہ میں نے کمرے کی مشرقی دیوار کی جانب کھڑے دیکھا۔ وہاں دریچہ تھا۔ میں دبے پاؤں اس طرف بڑھا اور ایک اُونچی الماری کی آڑ کے پاس آکر باتیں سننے لگا۔

یہ سایہ چنبیلی کا تھا۔ وہ دریچے سے لگی کسی سے باتیں ...... کر رہی تھی۔ میں غور سے سننے کی کوشش کرنے لگا۔

وہ کسی سے دھیمی آواز میں کہہ رہی تھی۔ ”دیکھ ذرا دھیرج سے...... ابھی تو صبح ہونے میں بہت سمے پڑا ہے۔

باہر چوبدار اور سارے محافظ چاق و چوبند موجود ہیں۔'' چنبیلی دریچے سے باہر جھانکتے ہوئے یہ کسی سے کہہ رہی تھی۔ میں ٹھٹک گیا اور میری دلچسپی سوا ہونے لگی۔ تب ہی جواب میں مجھے ایک سرگوشیانہ سی مردانہ آواز بھی سنائی دی۔

''پرسے نہیں ہے چنبیلی!'' یہ اسی پھکو کی ہی آواز تھی جسے چنبیلی نے ابھی تھوڑی دیر پہلے مخاطب کیا تھا۔ اس کی بھاری مگر دھیمی آواز میں عجلت آمیزی بھی تھی۔ آگے بولا۔ ''صبح منہ اندھیرے ہی راما پیر کا قافلہ روانہ ہو جائے گا۔ تُو نکلنے کی کوشش کر چنبیلی! اسے بالکل بھی نہیں ہے، یہاں کے حالات اب وہ نہیں رہے۔ موقع اچھا ہے نکلنے کا۔''

''بس۔ تُو چنتا مت کر، میری تیاری پوری ہے۔ موقع تاک کر میں کالی باؤلی والی جگہ پر پہنچ جاؤں گی اور بالکل سے پر قافلے میں شامل ہو جاؤں گی۔'' چنبیلی نے اسے پورے وثوق سے یقین دلایا اور پھر پھکو چلا گیا اور چنبیلی بھی دریچے سے ہٹ گئی لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی، اگر میں نے بروقت اس کے نازک منہ اور ہونٹوں پر اپنا ہاتھ نہ رکھ دیا ہوتا۔

''آواز مت نکالنا...... اور میری بات غور سے سنو، ورنہ تمہارا اور تمہارے اس پھکو کا راز فاش کر دوں گا۔'' میں نے اپنا منہ اس کے کان کی لو کے بالکل قریب کرتے ہوئے کہا۔

اس کم بخت کی جسمانی قربت، اس کے جوان انگ کی خوشبو میرے حواسوں پر چھانے لگی تھی اور میں نیم غنودہ سی کیفیت محسوس کرنے لگا۔

اس نے میری مٹھی میں بند اپنے منہ کو چہرے سمیت ہولے سے اثباتی جنبش دی تو میں نے آہستہ آہستہ اس کے منہ سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا، کہیں چیخ مارنے لگے تو دوبارہ دبا سکوں، مگر اس کا امکان کم ہی تھا۔

وہ ہانپنے لگی۔ پریشان اور ہراساں بھی ہو گئی تھی پھر ہکلاتے ہوئے بھنچی بھنچی آواز میں بولی۔

''تت...... تم کیا چاہتے ہو؟''

''وہی جو تم اور پھکو چاہتے ہو۔'' میں نے کہا۔ ہم دونوں وہیں دریچے کے قریب کھڑے راز و نیاز کرنے لگے تھے۔ دریچہ بند تھا۔

وولل...... لیکن تمہیں یہاں سے بھاگنے کی بھلا کیا ضرورت ہے؟ تم تو یہاں ٹھاٹ سے رہتے ہو؟''

''فالتو بکواس نہیں، جو کہا ہے اس کا جواب دو، ورنہ ابھی تیرا... اور پھکو کا بھانڈا پھوڑتا ہوں۔'' میں نے اسے دھمکی دی۔ وہ کچھ سنبھل چکی تھی۔ وجہ یہی تھی کہ وہ مجھے بھی اپنی کشتی کا سوار سمجھنے لگی تھی اور اسے قدرے اطمینان ہو چلا تھا کہ میں اُس کے ساتھ ساز باز پر آمادہ ہوں۔

''مجھے منظور ہے۔'' وہ ایک دم بولی۔

''یہ ہوئی نا بات...... اب یہ بتا...... یہ سب کس طرح، کیسے اور کب ممکن ہو سکتا ہے؟'' میں نے کہا۔

''اس کے لیے تمہیں ایک کولہی کا بھیس بھرنا پڑے گا۔'' اس نے کہا۔

''میں اپنے مقصد کی خاطر کوڑھی کا بھی بھیس بھرنے کو تیار ہوں، تم اپنے یا پھکو کے منصوبے کی تفصیل بتاؤ۔'' میں بولا۔

''ادھر آ جاؤ، کہیں مہارانی ہماری باتیں سن کر جاگ نہ جائے۔'' وہ بولی۔

میں نے اس کا نرم و نازک ہاتھ تھاما اور اسے لیے کمرے کے قدرے بعید ترین کونے میں آ گیا۔

''یہاں سے ہر سال راما پیر کے عرس پر کولہی اور میگھواڑ قبیلوں کا قافلہ ممبئی یاترا کو جاتا ہے۔ یہ جودھ پور سے روانہ ہو چکا ہے اور یہاں سے صبح منہ اندھیرے گزرے گا، پھر مارلی، اودے پور اور رتلام سے ہوتے ہوئے ممبئی میں داخل ہوگا۔'' وہ اتنا بتا کر خاموش ہو گئی۔

چنبیلی اور پھکو...... کی خفیہ گفتگو سننے کے بعد ہی میرے ذہن میں اچانک یہ منصوبہ اُبھرا تھا، کیوں نہ میں بھی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لوں، رومی اور طارق بھی ممبئی میں ہی کہیں تھے۔ کہاں؟ یہ ابھی معلوم نہیں تھا۔

میں نے چنبیلی سے کہا۔ ''اب ذرا تُو مجھے اپنے اور پھکو کے بارے میں بتا۔ وہ تیرا کیا لگتا ہے اور دونوں کے آگے کے کیا ارادے ہیں؟''

وہ جواب میں تھوڑا شرمانے کی روایتی اداکاری کرتی رہی، جب میں نے اسے سرگوشی میں جھڑکا تو وہ ایک دم بول پڑی۔

''وہ جی پھکو میرا...... میرا مطلب ہے مجھ سے پیار کرتا ہے۔ ہم دونوں کا دنیا میں ایک دوسرے کے سوا اور کوئی نہیں ہے، اسی نے مجھے ترغیب دی تھی کہ ریاست کے حالات اب خراب ہونے والے ہیں، ہمارے لیے یہاں جگہ نہیں، ہم کب تک ان لوگوں کی غلامی کرتے رہیں گے، قافلے میں شامل ہو کے ہم اودے پور پہنچ کر قافلے سے الگ ہو جائیں گے اور ہم شادی کر لیں گے پھر وہیں رہیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ اب یہ بتا میرے بارے میں پھکو کو کیا بتائے گی؟ ایسا تو نہیں وہ راستے میں میرے ساتھ کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کرے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ ایسا نہیں ہے، میں اُسے جو کہوں گی، وہ وہی کرے گا۔''

''اچھا!'' میں نے کہا۔

''اور مجھے اس سے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے، میں اسے صاف صاف بتا دوں گی تُو ایک ڈاکٹر ہے اور ہماری طرح یہاں سے تنگ آ کر ممبئی بھاگ جانا چاہتا ہے۔''

''تجھے پورا یقین ہے کہ وہ کوئی گڑبڑ نہیں کرے گا میرے ساتھ راستے میں؟''

''بالکل نہیں۔'' وہ پورے یقین سے بولی۔

''ٹھیک ہے، اگر تُو کہتی ہے تو اعتبار کر لیتا ہوں، لیکن یاد رکھنا اگر اس نے یا تُو نے میرے ساتھ کوئی شرارت کرنے کی کوشش کی بھی تو...... یہ تجھے پتا چل ہی جائے گا۔''

میں نے آخر میں دھمکی دینا ضروری سمجھا۔ اگرچہ یہ دھمکی ایسی ہی تھی جیسے کوئی خالی ڈبے میں ٹھیکری گھماتا ہے۔ ظاہر ہے میں بھلا کیا کر سکتا تھا۔ لیکن رسک لینے کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

چنبیلی نے میری بات کا بُرا نہیں منایا اور پوری تسلی سے مسکرا کر بولی۔ ''تُو ایک بھلا مانس آدمی ہے۔ مجھ پر وشواش کر، پھکو بھی شریف ہے۔ ہم تیرے ساتھ کچھ نہیں ہونے دیں گے۔''

اس کی بات سن کر پہلے تو میں نے سوچا کہ ریشہ خطمی ہو جاؤں لیکن پھر خود پر قابو پایا اور سپاٹ لہجے میں بولا۔

''یہ تو وقت بتائے گا۔ اب کیا پروگرام ہے؟''

''بس، نکلتے ہیں، میں ذرا اپنی بُغچی سنبھال لوں۔'' وہ بولی۔

اگلے نصف گھنٹے کے اندر میں چنبیلی کے ساتھ ساتھ حویلی کے چور راستوں...... جنہیں میں بھی حیرت سے دیکھتا جاتا تھا، کے ذریعے باہر تھا۔

ہر سُو تاریک سناٹے کا راج تھا۔ فضا میں یخ بستگی شامل تھی۔ اس مناسبت سے ہم دونوں نے گرم لباس پہن رکھے تھے۔ کولہیوں والا لباس مجھے چنبیلی نے دے دیا تھا۔ اپنا ڈھنگ کا لباس میں نے اُتار کر چنبیلی کی طرح ایک بُغچی بنا کر اس میں رکھ لیا تھا، کیونکہ آگے یہ بھی کام آ سکتا تھا۔

چنبیلی نے پھکو سے متعلق مجھے سمجھا دیا تھا کہ اس کو میرے بارے میں کیا بتاتا تھا۔

ہم ٹھٹھرتی رات کا حصہ بنے دو چور سایوں کے مانند...... ایک طرف کو چل پڑے۔ گلیوں اور گھروں کی بے ترتیب قطاروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے بالآخر ہم کالی باؤلی کے پاس پہنچ کر رک گئے۔

ہمارے آس پاس سناٹا تھا۔ ہمارے عقب میں گھروں کے ہیولے تاریکی میں عجیب سے دکھائی دے رہے تھے۔ آسمان صاف تھا اور تاروں کی یلغار تلے...... سرد چاندنی ضوفشاں تھی۔ دائیں بائیں حدِ نگاہ صحرا چٹکی ہوئی چاندنی میں نہایا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ ہمارے قریب میں خشک اور کہیں ہری بھری جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔

اچانک کہیں سے اُلو کی آواز اُبھری۔ میں بدکا۔ چنبیلی نے نیچی آواز میں کہا۔

''پھکو آ گیا۔''

''یہ کیا اُلو کی جون میں آتا ہے؟'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ وہ ہنس پڑی۔

''اگلے جنم میں شاید وہ اُلو بن جائے لیکن ابھی وہ منش کے روپ میں ہے۔ یہ اس کا اشارہ ہے۔''

ذرا ہی دیر بعد ہمارے دائیں جانب کی جھاڑیوں سے کوئی تیرتی ہوئی شے نمودار ہوئی۔

''پھکو!'' چنبیلی نے اسے ہولے سے پکارا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ اگر یہ پھکو ہی تھا تو یہ تیرتا ہوا کیوں آ رہا تھا؟ عقدہ کھلا کہ وہ ایک موٹی تازی سانڈنی پر سوار تھا۔

''چنبیلی! یہ میں ہی ہوں، پر یہ کون ہے، تیرے ساتھ؟'' سائے نے ذرا دور ہی سے ٹھہر کر پوچھا۔

''قریب آ جا پھکو! یہ میرا بھائی ہے۔'' چنبیلی نے ''ہدایات'' کے مطابق اس سے کہا۔ میں آنکھیں سکیڑے اس کی طرف گھور رہا تھا۔ وہ سانڈنی سمیت قریب آ گیا اور سانڈنی سے نیچے اُترا۔ ناٹے سے قد کے پھکو کا ڈیل ڈول خاصا کسرتی محسوس ہوا۔ اس نے اُوپر نیچے کیا کیا الا بلا اُوڑھ رکھا تھا۔

پھکو قریب آ کر مجھے غور سے دیکھنے لگا پھر قریب کھڑی چنبیلی سے اُلجھ کر بولا۔

''بھائی؟ پر تیرا کون سا بھائی تھا؟''

''نہیں تھا تو اب ہو گیا نا...... منہ بولے بھائی نہیں ہوتے کیا؟ اس نے میری بہت مدد کی ہے۔'' چنبیلی اس سے بولی۔ ''اسی کی مدد سے میں وہ اُس نرگ سے نکل پائی ہوں۔''

میں چنبیلی کی عقل سے زیادہ اس کے جھوٹ پر اش اش کر اُٹھا۔ کیونکہ وہ اس کے برعکس تھا۔

''تو کیا یہ بھی ہمارے ساتھ چلے گا؟'' پھکو نے سوال کیا۔

''ہاں! تو کیا ہوا؟ یہ رتلام تک جائے گا پر ہم تو اودے پور سے الگ ہو جائیں گے۔'' چنبیلی نے بتایا تو پھکو سوچنے لگا۔

''اب کیا سوچنے لگا؟ سمے نہیں ہے۔ کوئی ادھر آ گیا تو معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔'' چنبیلی نے اسے جھنجوڑا تو پھکو نے .... صرف اسے سانڈنی پر سوار ہونے کا اشارہ کیا اور خود بھی اُچک کر سوار ہو گیا۔ پھر اس بدبخت نے مجھے پیدل سانڈنی کے ساتھ ساتھ چلنے کو کہا اور ناچار میں دانت پیستا ہوا ان کے ہمراہ چل پڑا۔

ہم ایک طرف تاریکی میں بڑھتے چلے گئے۔

☆☆☆

لگ بھگ کوئی چالیس پچاس گام کے بعد وہ ہمیں لے کر ایک پڑاؤ میں پہنچا۔ پتا چلا کہ یہی وہ قافلہ تھا جو دھ پور سے روانہ ہوا تھا اور اب یہاں ذرا ستانے کے بعد آگے کوچ کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔

ہم تینوں بھی ان میں شامل ہو گئے۔ اب میں دل ہی دل میں یہی دعائیں مانگ رہا تھا کہ جلد از جلد یہ قافلہ یہاں سے روانہ ہو جائے۔ دیکھا جاتا تو اب میں پوری طرح چنبیلی کے رحم و کرم پر ہی تھا۔ وہ اور اس کا محبوب پھکو میرے ساتھ دھوکا بھی کر سکتے تھے۔

لہٰذا ان دونوں پر زیادہ دیر تکیہ کرنا بے وقوفی ہی ہوتی۔ اصل مسئلہ ان دونوں کی مدد سے قافلے میں شمولیت کا تھا۔ وہ حل ہو گیا تھا۔ یوں میں نے راہ بدل لی اور ان میں رل مل گیا۔ ڈھنگ کے کپڑوں کی گٹھڑی میں نے اپنی بغل میں دبا رکھی تھی۔

قافلہ روانہ ہو چکا تھا۔ یہ قافلہ ایک اندازے کے مطابق تیس چالیس افراد پر مشتمل تھا۔ ان میں ایک ہی خاندان کے کئی افراد بھی تھے اور کچھ میری طرح اکیلے دکیلے بھی۔ کچھ اُونٹنیوں پر سوار تھے اور چند سانڈنیوں پر، کچھ گدھے سوار بھی تھے۔ باقی پیادہ تھے۔

میں چنبیلی اور پھکو سے دور ہو کر سب سے آخر میں آ گیا تھا۔ ابھی تاریکی تھی اور سب خاموشی سے چلے جا رہے تھے۔

مجھے ڈر ہوا کہ دن کی روشنی میں کہیں میرا بھانڈا نہ پھوٹ جائے۔ لہٰذا بہتر تھا کہ میں اس دوران کسی سے صاحب سلامت استوار کر لیتا تاکہ مجھے دیگر لوگ ''اپنا'' ہی تصور کرتے۔

اس کے لیے مجھے جلد ہی ایک جوڑا مل گیا۔ یہ ادھیڑ عمر میاں بیوی تھے، جو ایک چوبی ریڑھے پر ایک چھتنا رسا ہودہ بنا کے سوار تھے۔ ہودے کا اُوپری حصہ کھلا ہوا تھا، جو بہ وقت ضرورت بند بھی کیا جا سکتا تھا، جب دھوپ نکلتی۔ اس ریڑھے میں ایک سانڈ جوتا ہوا تھا۔ اس کی راسیں بوڑھے نے سنبھال رکھی تھیں۔ ایک لالٹین چوبی تختے کے نیچے جھول رہی تھی۔ یوں جیسے یہ ریل گاڑی کی آخری بوگی ہو۔

وہ دونوں بوڑھے میاں بیوی کھانستے بھی جاتے اور آپس میں بک بک جھک جھک بھی کرتے جاتے۔

میں ان کے ریڑھے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا تو..... تو بُڑھیا کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور یہی میں چاہتا بھی تھا۔ وہ فوراً اپنے مرد سے بولی۔

''اے ہے...... پربھو! یہ بے چارہ پاؤں پیر چلے ہے، تھک جاوت ہو، سفر لمبا ہے، اسے سوار کیوں نہیں کر لیتے؟''

''اری پربھن! تُو اس کی چنتا مت کر، اور بھی جوان پاؤں پیر چلت ہیں، یہ کوئی بڑی بات نہیں۔''

میں نے دل میں پربھن کو دعائیں دیں اور اس کے پربھو پر لعنت بھیجی۔

''ارے نہیں اسے اُٹھا لیو، یہ ریڑھا چلائے گا۔'' پربھن نے کہا۔

اب یہاں لوہا گرم دیکھ کر مجھے بھی کچھ کرنا چاہیے تھا لیکن میں ان کی بولی اور لہجہ نہیں اپنا سکتا تھا۔ اسی لیے ایک چال میرے دماغ میں پہلے ہی سے سمائی ہوئی تھی۔

میں گونگا بن گیا اور ہاتھوں کے اشاروں اور ''غوں غاں'' سے انہیں بتایا کہ میں سوار ہونا چاہتا ہوں نیز یہ کہ میں ریڑھا بھی چلا سکتا ہوں۔

پربھو کو مجھ پر رحم آ گیا یا پھر اس نے اپنی پربھن کی بات رکھنی چاہی تھی کہ اس نے مجھے اپنے ریڑھے پر سوار ہونے کا اشارہ کر دیا اور میں ایک ہی چھلانگ میں ریڑھے پر جا سوار ہوا۔

گٹھڑی ایک جانب بغل میں پھنسائی اور باگیں میں نے پربھو سے لے کر سنبھال لیں۔ وہ مجھے حیرت اور کچھ برہم سی نظروں سے گھورنے لگا تو پیچھے بیٹھی پربھن نے اپنے شوہر کو پھر ہانک لگائی۔

''ہے بھگوان! یہ اتنا کڑیل جوان اور گونگا...... چل پربھو اِدھر آ کے بیٹھ اب آرام سے۔''

پربھو آرام سے بیٹھنے کے لیے اپنی پربھن کے پاس کھسک گیا اور میں مزے سے چوبی تختے پر ریڑھے کی رسی سنبھالے بیٹھا تھا۔

کسی نے صحیح کہا ہے کہ حرکت میں برکت ہے اور دنیا عقل والوں کی ہے یا پھر قسمت والوں کی......

میں بھی اپنی عقل اور قسمت سے خواہ ایک سانڈ ریڑھا سہی، حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور یوں مجھے...... ایک سہارا بھی مل گیا تھا، لیکن باوجود اس کے مجھے ایک کمی کا پھر بھی احساس ہوا، مجھے ان کے ساتھ کوئی رشتہ بھی جوڑنا تھا۔ وہ کیسے ہوتا؟ اس کے لیے میں سانڈ کی رسی سنبھالے سوچتا رہا۔ رسی کیا سنبھالنا تھی، سانڈ خود ہی چلے جا رہا تھا، ساتھ میرا دھیان عقب میں ان دونوں کی باتوں پر بھی لگا رہا۔ پربھن مجھے اپنے پربھو کے مقابلے میں کچھ رحم دل لگی تھی۔

''ہے، بے چارہ اکیلا ہے؟ پر کسی کی تو اولاد ہو گا؟'' معاً پربھن کی آواز آئی، وہ اپنے پربھو سے ہی مخاطب تھی اور اشارہ میری طرف ہی تھا۔ بس، پھر کیا تھا میں نے فوراً اپنے چہرے پر یتیمی طاری کی، رونی صورت بنائی اور...... لگا ہچکیاں لے لے کر بچوں کی طرح رونے......

''ہائے...... ہائے...... اس کو کیا ہو گیا؟'' پربھن زور سے بولی تو میں نے سانڈ کی رسی چھوڑ، ایک چھلانگ مار کے ان کے ہودے میں آ گیا، دوسری چھلانگ پربھن کے پاس سے اس کے پربھو نے گھبراہٹ میں لگائی اور اس چوبی تختے پر جا بیٹھا جہاں میں سانڈ کی رسی چھوڑ آیا تھا۔ وہ اب اس نے منہ بسورتے ہوئے سنبھالی تھی۔

میں نے پربھن کے پیر پکڑ لیے اور لگا رونے......

''ہائے، بے چارے کو ماتا یاد آ گئی ہو گی۔'' حسبِ توقع پربھن نے میرے بارے میں درد بھرے انداز سے تبصرہ کیا اور لگی میرے سر پر ممتا بھرے انداز میں ہاتھ پھیرنے۔ میں نے بھی رونے کے انداز میں اور زیادہ غوں غاں کرنا شروع کر دی اور ساتھ ہی اپنا سر بھی اثبات میں ہلاتا جاتا جیسے پربھن کے خیال کی تصدیق کر رہا ہوں۔

''نہ رو...... نہ رو میرے...... بچن! تو آج سے میرا بچن ہے۔'' وہ مجھے پچکارتی ہوئی کہتی جاتی۔ نجانے یہ بچن کی اولاد کیا تھا اور ان کا کیا لگتا تھا۔

''دیکھ رے...... پربھو! ہمیں ہمارا بچن مل گیا۔'' پربھن بھی روہانسے انداز میں بولی۔ تختے پر بیٹھے پربھو نے جوابی ہانک لگائی۔

''بچن تو مل گیا مگر یہ سانڈ جانے لگا آگے...... اور تو جانتی ہے آگے سانڈ لے جانے کی سخت پابندی ہے۔ وہاں سانڈنیاں ہیں اور اس نے جو وہاں جا کر اُودھم مچانی تھی تو بس پھر سرپنچ ہمیں قافلے سے ہی نکال باہر کر دیتا۔''

اس کم بخت پربھو کو اپنی پڑی ہوئی تھی۔ مجھے اس پر سخت غصہ آیا۔ سوچا اب یہ جذباتی ڈراما موقوف کر دینا چاہیے۔ لپک کر میں دوبارہ چوبی تختے پر آ گیا اور ''کھی کھی'' کرتے ہوئے پربھو سے رسی جھپٹ لی۔

پربھو جسے پہلے ہی شاید میری دماغی حالت پر شبہ تھا، گھبرا کے اس نے دوبارہ رسی مجھے تھما دی اور عقب میں کھسک گیا، میرے کان انہی کی باتوں پر لگے ہوئے تھے اور گاہے بہ گاہے میں کن انکھیوں سے ان کی طرف دیکھ بھی لیتا تھا۔ پھر میں نے پربھو کو اپنی پربھن سے کہتے سنا۔

''تو کیا ہر کسی کو اپنا بچن بنا لیتی ہے۔ یہ تو مجھے کوئی خطرناک پاگل لگتا ہے۔''

میں نے کن انکھیوں سے دیکھا، پربھن نے غصے میں اپنے ہاتھ کی پانچ انگلیوں کی لعنت بنا کر اپنے پربھو کو دکھائی اور بولی۔

''تیرے منہ میں خاک...... یہ پاگل ہے کوئی؟ دیکھا نہیں میری ممتا بھری آواز سن کر کیسے دل گیر ہو کے رو پڑا تھا اور میرے چرن چھو لیے تھے اس بے چارے نے...... بس، ہو گیا فیصلہ، یہ ہمارا بچن ہے۔''

مجھے پربھن کے اس فیصلے پر گہری طمانیت کا احساس ہوا تھا۔

''اچھا، اچھا، پر اب اپنے اس بچن کو بتا دے، یوں ایک دم سانڈ کی رسی نہ چھوڑے۔ ورنہ تو جانتی ہے نا...... آگے کتنی سانڈنیاں ساتھ چل رہی ہیں۔''

''اے ہٹ پرے، شرم نہیں آتی اس عمر میں مجاق کرتے ہوئے۔'' پربھن کو میں نے بھونڈے انداز میں شرماتے دیکھا۔ پربھو دانت پیستے ہوئے بولا۔

''تو نہیں سمجھے گی، کبھی نہیں سمجھے گی۔ ہنہ۔'' وہ منہ بنا کر بیٹھ رہا لیکن اگلے ہی لمحے اس نے ہانک لگاتے ہوئے مجھے خبردار کیا۔

''اوئے بالکے...... ! ایب کے رسی مت چھوڑنا...... سمجھ گیا؟''

میں نے اس کی طرف گردن موڑ کے زور زور سے

اُوپر نیچے سر کو حرکت دی۔

سفر جاری تھا۔ پو پھٹنے لگی تھی۔ دور صحرائی مشرق کی طرف شفق کی سرخی پھیلنے لگی تھی۔ پھر کچھ ہی دیر بعد اجالا بھی ہونے لگا۔ گرمی کا احساس بڑھتا محسوس ہوا۔ عجیب فضا ہوتی ہے صحرائی سرزمین کی۔ دن میں گرمی اور رات میں سردی۔

خیال غالب تھا کہ سرپنچ یعنی میر کارواں...... شاید قافلے کو رُکنے کا حکم دیتا مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔

سفر مسلسل دن بھر جاری رہا۔ جب سورج بالکل سوا نیزے پر آ گیا تو قافلے کو رکنے کا حکم ملا۔ مجھے پریشانی تھی کہ یوں پیادہ قافلہ (ایک طرح سے پیادہ ہی تھا) آخر کب تک اپنی منزل طے کر سکتا تھا؟ میں اس تگ و دو میں تھا کہ کوئی ایک ایسا بڑا قصبہ یا قصبہ نما شہر آ جائے تو میں ان سے الگ ہو کے کسی موٹر گاڑی یا ٹرین کے ذریعے ممبئی پہنچنے کی کوشش کروں یا پھر کسی ہوٹل میں رہتے ہوئے طارق یا رومی سے ہی رابطہ کرنے کی کوشش کروں، کیونکہ اب میرا خیال تھا کہ انہیں یہ حقیقت بتا دینا ضروری ہوتا کہ میں بھی اِدھر ہی موجود ہوں۔ یہ سن کر ان دونوں پر حیرتوں کے جو پہاڑ ٹوٹنے تھے، وہ الگ بات تھی مگر میں ان کے ساتھ شامل ہو کے بہت سے متوقع مسائل سے محفوظ رہ سکتا تھا۔

حمیرا کو میں بھولنا چاہتا تھا لیکن اس کے آئے ہوئے برقی پیغامات نے مجھے پھر بے چین کر دیا تھا جس میں اس نے...... کہا تھا کہ وہ یوکے سے عنقریب بمبئی ایک سیمینار میں شرکت کے لیے آنے والی تھی۔ اب بار بار میرا خیال اس طرف کو جاتا تھا کہ یہ کیا اتفاق تھا، یا تقدیر کی کوئی نئی طرفہ کاری...... اب رومی اور طارق کی طرح بھلا حمیرا کو بھی کیا پتا تھا کہ میں بھی انڈیا ہی کی خاک چھاننے یہاں آ رہا ہوں۔

مجھے کچھ اندازہ نہ تھا کہ قصبے اور شہر ایک دوسرے سے کتنی مسافتوں پر تھے۔ ان قافلوں سے تو میں نے بھی اندازہ لگایا تھا کہ وہ زیادہ دوری پر نہیں ہو سکتے تھے۔ ورنہ تو فی زمانہ ان قافلوں کا کیا تصور تھا؟ اگرچہ آگے چل کر میرا یہ اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا تھا۔

سر دست تو ہم جلتے بلتے سورج کے عین نیچے چھپر تلے پڑاؤ ڈالے بیٹھے تھے۔ لوگ باگ کھانے پکانے میں مصروف ہو گئے، جتے ہوئے جانوروں کو کھلا چھوڑ کر چرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ کیونکہ جہاں ہم نے پڑاؤ ڈالا تھا، وہ ایک نخلستان ہی تھا۔ یہاں ایک قدرتی جھیل بھی تھی۔ ایک چھوٹے پاٹ والی نہر بھی بہتی نظر آئی۔ کچھ گھاس اور درخت بھی تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ایستادہ دکھائی دیتے تھے۔

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

اب پربھن میرے بارے میں ہر کسی کو یہی بتاتی کہ میں اس کا ''بچن'' تھا۔ نجانے بچن سے اس کی کون سی یادیں وابستہ تھیں، یہ تو میں بھی دریافت نہیں کرسکتا تھا، کیونکہ میں نے خود کو گونگا ظاہر کررکھا تھا۔ یونہی اگر پربھن اور پربھو کے درمیان اس سے متعلق کوئی ''مکالمہ'' ہوجاتا تو اور بات تھی۔ ویسے میرا اندازہ یہی تھا کہ بچن اس بے چاری پربھن کا کوئی جوان بیٹا ہوگا، جو یا تو دنیا سے کوچ کرگیا ہوگا یا پھر یہ دونوں ماں باپ اولاد کی روایتی بے حسی کا شکار ہوں گے۔ پر بچن کو پھر بھی نہیں بھولے تھے۔

اسی دوران مجھے معلوم ہوا کہ مارلی تیس کلومیٹر کی مسافت پر ہے۔ وہاں انہیں ایک مندر کے باہر قیام کرنا تھا اس کی زیارت دو دنوں تک مقرر تھی۔

میں اب مارلی کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا مگر کس طرح؟ یہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

سوچا، چلو مارلی تو پہنچے پھر دیکھا جائے گا، جو اَب دور ہی کتنا تھا۔

پربھن اور پربھو دونوں مل کر ہانڈی چولھا میں مصروف ہوگئے۔ عورتیں نہر اور جھیل کے کنارے کپڑے اور بچوں کے پوتڑے دھونے لگیں۔

یہاں قریب میں کوئی آبادی نظر نہیں آتی تھی۔ مجھے پینے کا پانی مل گیا تھا۔ یہ لوگ سبزی ترکاری بنانے میں لگ گئے تھے مگر ظاہر ہے میں یہاں ان کے پاس سے کچھ کھانے پینے کے موڈ میں نہ تھا۔ اسی لیے میں نے نخلستان میں واقع ہرے بھرے درختوں کا رخ کرلیا۔ وہاں کچھ لوگ ناریل اور پیلے رنگ کے ڈوکے توڑنے میں مصروف تھے۔

میرے حصے میں بھی ایک دو ناریل آہی گئے جنہیں میں نے توڑ کر پہلے ان کا میٹھا اور خوش ذائقہ پانی پیا اس کے بعد ناریل کھا کر پیٹ کی آگ بجھائی۔

''ارے...... ! تم کدھر غائب ہو گئے تھے؟'' اچانک ایک شناسا آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ مڑ کر دیکھا تو وہ چنبیلی تھی۔

میں نے چوروں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھا پھر اس کے دُم چھلّے پھکو کو ساتھ نہ پاکر اطمینان کی سانس لی اور اس سے بولا۔

''میں اِدھر ہی تھا۔''

''مگر تم ہم سے الگ کیوں ہو گئے؟'' چنبیلی نے سوال کیا۔

''میں تم پر بوجھ نہیں بننا چاہتا تھا۔'' میں نے اسے ٹالنے کی غرض سے کہا۔ دل اسے دیکھ کر گھبرا بھی رہا تھا کہ کہیں یہ میرا بھانڈا ہی نہ پھوڑ ڈالے۔ تاہم میں نے پوچھا۔ ''ہماری منزل کتنی دور ہے؟''

''بہت دور ہے۔'' وہ بولی۔ ''ابھی تو ہمیں مارلی میں رکنا ہے۔ پورے دو دن، اگر گنتی قطار نہیں لگی تو مارلی تو ہم جلد پہنچ ہی جائیں گے۔''

''گنتی قطار......'' میں نے اُلجھی ہوئی سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''گنتی قطار...... کا مطلب ہے فوجی لوگ چیکنگ کرتے ہیں۔ اس میں بہت دیر ہوجاتی ہے۔'' اس نے بتایا اور میں پریشان ہوگیا۔

''اچھا!'' میرے منہ سے بے اختیار تفکّر آمیز برآمد ہوا تھا کہ وہ یک دم معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔

''تُو کیوں چنتا کرتا ہے رے...... مفت میں مزے تو کررہا ہے۔''

''مزے کہاں، پریشانی ہے مجھے۔ کبھی اتنا لمبا سفر پیدل نہیں کیا۔'' میں نے بات بنائی، ورنہ حقیقت یہی تھی کہ فوجی چیکنگ کا سن کر میں پریشان ہی نہیں، ایک گہری تشویش میں مبتلا ہوگیا تھا۔

''ہم بنجارے تو اسی طرح ہی سفر کرتے آئے ہیں، یہ ہماری برسوں پرانی زندگی کا حصہ بن چکا ہے اور یاترا کا بھی۔''

''اچھا یہ بتا مارلی کتنا بڑا قصبہ ہے؟ میرا مطلب ہے وہاں سے کوئی موٹر گاڑی جیسی سواری مل سکتی ہے آگے جانے کے لیے......؟''

''مجھے پتا تھا، تُو یہی کرنے والا ہے۔'' وہ شرارت سے ہنسی۔

''ہاں! میں قافلے میں زیادہ دیر تک سفر نہیں کر سکتا۔''

''مارلی میں ایک ریل چلتی ہے، کوئلے کے انجن والی، مانڈلے تک...... وہاں سے تجھے بڑے شہروں کی طرف جانے والی کوئی بھی ٹرین مل جائے گی۔''

''اچھا!'' میں خوش ہوگیا۔

اس نے ہاتھ میں کچھ پکڑ رکھا تھا۔ وہ میری جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔

''یہ ترکاری میں نے بنائی تھی، پھلکے کے ساتھ کھائے گا؟''

''نہیں، میں نے پیٹ بھر لیا ہے۔''

''اچھا، چلتی ہوں۔'' وہ جانے کے لیے مڑی تو میں نے اسے آواز دی، وہ رک گئی۔

''دیکھ، پھکو کو ابھی میرے بارے میں مت بتانا کہ میں ابھی تک اسی قافلے میں ہوں۔''

''کیوں؟'' اس نے شرارت بھرے انداز میں اپنی کشادہ آنکھیں گھمائیں۔

''بس، کہا جو......'' میں نے گھورا پھر سوچا یہ مناسب نہیں۔ ایک دم نرم پڑ کے بولا۔ ''دیکھ نا، وہ مجھے تیرے ساتھ کب پسند کرتا تھا، جب اسے پتا چلے گا کہ میں اِدھر ہی ہوں تو وہ یہی کھجے گا کہ میں اب بھی تجھ سے مل رہا ہوں۔''

''چھوڑ اس بات کو، پھکو سے مت ڈر، وہ سیدھا سادہ منش ہے۔ پر مجھے تیری بھی چنتا ہے۔ تُو کسی ایسے ویسے پر یہاں وشواس نہ کر بیٹھنا۔ سرپنچ کو تیری شکایت ہوگئی تو میری بھی مصیبت آجائے گی۔''

''کیوں تیری کیوں مصیبت آجائے گی؟'' میں نے پوچھا۔

''ظاہر ہے تُو اسے یہی بتائے گا کہ میں نے تجھے اس قافلے میں بغیر اجازت کے شامل کیا تھا۔ غیر قوم کے آدمی کو اس طرح شامل کرنے کی سزا بہت سخت ہوتی ہے۔''

''میں اتنا احسان فراموش نہیں ہوں کہ تیرا نام لے دوں گا۔'' میں نے منہ بنا کر کہا۔ وہ ایک دم چہک اُٹھی۔

''سچ۔ پر دیکھ، تو خیال رکھ...... ویسے تجھ سے ابھی تک کسی نے کوئی بات وات تو نہیں کی؟''

''کی ہے، تو میری چنتا مت کر'' میں نے اپنا ٹھیک ٹھاک بہروپ بندوبست کر لیا ہے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

''اچھی بات ہے۔ چلتی ہوں اب۔'' وہ مطمئن ہو کے چل دی۔

شام ڈھلتے ہی قافلہ پھر روانہ ہوگیا۔

بقول چنبیلی مارلی اب زیادہ دور نہ تھا، راتوں رات میں یا پو پھٹنے تک پہنچنے کے امکانات تھے یا اس سے پہلے بھی۔

اب وہی منظر تھا۔ قافلہ رواں دواں تھا۔ میں پربھن اور پربھو کے ریڑھے پر سانڈ کی رسی سنبھالے بیٹھا تھا۔ آسمان پر پورا چاند نکلا ہوا تھا اور تاروں کی فوج نے ایک کہکشاں سی اس کے گرد بنا رکھی تھی۔ صحرائی مناظر اب...... چھدری چھدری جھاڑیوں، درختوں اور...... اُونچے نیچے ٹیلوں میں بدل چکے تھے۔ راجھستان کے بالائی علاقوں کو کافی ترقی یافتہ بنا دیا گیا تھا، نہیں بنایا تھا تو ایک ہمارے ملک کے تھرپارکر کو اور چولستان کو...... حالانکہ راجھستان، تھرپارکر اور چولستان...... یہ ایک ہی علاقہ تھا، لیکن چونکہ تقسیم ہند کے بعد صحرا کا بیشتر اور سرسبز علاقہ راجھستان کی صورت میں بھارت کے پاس چلا گیا تھا، اور انہوں نے اسے کسی حد تک ترقی دی تھی۔ جبکہ ہمارے تھر اور چولستان کو تو آج بھی وہی خشک سالی، فاقہ مستی، پیاس اور مختلف قسم کی بیماریوں نے گھیر رکھا تھا۔ وہاں زندگی آج بھی بلک رہی تھی۔ پانی کی ایک بوند کو ترس رہی تھی۔

بہرکیف...... جی جلانے سے کیا فائدہ، دُکھ اس بات کا ہوتا ہے کہ آخر کو یہ بھی تو ہمارے ہی پیارے وطن کا حصہ ہیں۔ صحرا کی اپنی خوب صورتی ہوتی ہے۔ لیکن صرف سیر و تفریح کرنے والوں کے لیے...... یا پھر میرے جیسے جنہوں نے اخباروں اور... ڈاکومینٹری فلموں میں یہ سب پڑھا اور دیکھ رکھا ہوتا ہے۔

قافلہ رواں تھا۔ رات جوبن پر تھی۔ پربھو اور پربھن اپنے ہودے میں بیٹھے گڑگڑی جمارہے تھے کہ اچانک چلتے چلتے قافلہ رکنے لگا، جس کا طریقہ کار یہ ہوتا تھا کہ...... سب سے آگے میر کارواں (سرپنچ) کے ساتھ چلنے والے لوگوں میں سے کوئی ایک نرسنگا بجاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی لوگ رکنا شروع ہوجاتے تھے۔ پھر اسی طرح آگے والوں میں سے تین چار افراد اپنے عقب والوں کو بتاتے کہ معاملہ کیا ہے اور یوں آخر تک لوگوں کو قافلے کے اچانک اور بے وقت رکنے کی وجہ لمحوں میں معلوم ہوجاتی تھی۔

یوں قافلے کے اچانک رُکنے کی جو وجہ اچانک معلوم ہوئی تھی اسے سن کر میری روح فنا ہونے لگی۔

وہی ہوا جس خدشے کا اظہار چنبیلی مجھ سے کر چکی تھی۔ قافلے کو بھارتی چیک پوسٹ کے اہلکاروں نے ''گنتی قطار'' لگانے کا حکم دے دیا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اب وہ قافلے میں شامل ایک ایک فرد کی تلاشی اور چیکنگ کریں گے۔ ایسا کبھی کبھار ہوتا تھا، جب انہیں کوئی شبہ ہوتا یا انٹیلی جنس کو اچانک کوئی مشتبہ قسم کی خفیہ رپورٹ ملتی۔

قافلہ رک گیا۔ لوگ گردنیں اُچکا کر گھما کر اِدھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے بھی اپنے سانڈ کی باگیں کھینچ لی تھیں۔

اگرچہ مجھے قافلے کے اس طرح رکنے کے بارے میں چنبیلی نے بتا رکھا تھا لیکن پھر بھی مجھے یاد آنے میں وقت

لگا کہ معاملہ کیا تھا۔ جب تک پتا چلا، میرا سانڈ تھوڑا اور آگے جاچکا تھا، جو قافلے کی قطار کی مقررہ حد سے متجاوز تھا۔ جن کے سانڈ تھے انہیں سب سے پیچھے رہنے اور رکھنے کی ہدایت تھی۔

خیر، اب تو جو ہوا وہ ہو گیا، قافلہ رک گیا۔ میں نے بھی ریڑھے کے ایک نسبتاً اُونچے چوبی تختے پر چڑھ کر ادھر اُدھر دیکھا تو سامنے قدرے دائیں جانب روشنیاں دکھائی دیں۔ انسانی ہیولے بھی نظر آنے لگے جنہوں نے چست لباس زیب تن کر رکھے تھے۔

بقول چنبیلی کے، یہ چیک پوسٹ کے فوجی اہلکار تھے جو اندرونِ شہر آنے جانے والوں کی بھی کبھار چیکنگ کرلیا کرتے تھے۔ وہ اب شروع ہو چکی تھی اور اس کے لیے پورے قافلے کی ناکابندی کرلی گئی تھی۔ مسلح اہلکاروں نے پورے قافلے کو گھیر لیا تھا۔ اسی دوران میں نے قافلے میں کسی کو یہ کہتے سنا تو مزید پریشان ہو گیا۔

''اس بار تو بڑی سخت قطار لگی ہے بھیو! لگت ہو کوئی رپٹ ملی ہے ان سسروں کو، وخت گیا۔''

اس کا مطلب تھا کہ کسی نے اس قافلے کے متعلق پہلے ہی انہیں انفارمیشن پہنچادی تھی کہ کوئی مشکوک آدمی اس قافلے میں کولی یا میگھواڑ کے بھیس میں موجود ہے۔

یہ سنتے ہی میں سناٹے میں آگیا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں سخت خطرے میں گھر چکا تھا۔ نکلنے کی کوشش بھی کرتا تو یہ ممکن نہ رہا تھا۔ میں خود کو اب بری طرح پھنسا ہوا محسوس کرنے لگا۔ ممکن تھا یہ مخبری مہارانی دل آرام کی ہی حویلی سے کسی چھپے ہوئے سازشی نے نہ کردی ہو جو مجھے ان کا ہمدرد سمجھے ہوئے تھا۔ کیونکہ اب وہاں سوتیلی اولاد کا تصرف قائم ہونے والا تھا، بلکہ میں نے تو یہاں تک بھی سن رکھا تھا کہ مہارانی دل آرام کو اس کے مرحوم شوہر ٹھاکر کے ساتھ ''ستی'' بھی کیا جاسکتا تھا۔

اب میری پریشانی اور تشویش میں اضافہ ہونے لگا اور...... تب ہی میں نے وہی کیا جو ایسے نازک مواقع پر، اکثر کرتا تھا۔ دو تین خوب گہرے سانس لیے۔

دل و دماغ سے پریشان کن خیالات کو آسیب کی طرح جھٹکا، اللہ کا نام لیا اور اس مشکل سے نکلنے کی کوئی راہ سوچنے لگا۔

اہلکاروں نے دو طرف سے چیکنگ شروع کردی تھی۔ یعنی آگے اور پیچھے سے...... ہمارے دائیں بائیں بھی چند اہلکار گنیں تانے چوکس کھڑے تھے تاکہ کوئی بھاگنے کی بھی کوشش کرتا تو...... اس پر فائر کھول دیتے۔ انہوں نے طاقتور ٹارچیں بھی ہاتھوں میں پکڑ رکھی تھیں۔

میری باری آنے والی تھی۔ اچانک میری نظر سانڈ پر پڑی، وہ بار بار دُم ہلا رہا تھا اور اپنے اگلے دونوں کھر بھی بے چینی کے انداز میں زور زور سے ریتیلی زمین پر مار رہا تھا۔

میں نے بھویں سکیڑ کر اس کی حرکت کا مطلب جاننے کی کوشش چاہی تو عقدہ کھلا، میرے رسی تاخیر سے کھینچنے پر چونکہ وہ مقررہ حد سے آگے جا کر رکا تھا اور وہاں ایک نہیں بلکہ دو سانڈنیاں ایک چوبی تختوں والی گاڑی سے جتی ہوئی تھیں۔

دفعتاً ہی میرے ذہن رسا کو ایک ''کمینی'' سی حرکت کرنے کا خیال سوجھا۔ میں نے رسی تھوڑی ڈھیلی چھوڑی۔ سانڈ تھوڑا سرکا، ذرا ہلچل ہوئی۔ اردگرد والوں نے مجھے گھورا۔ اہلکار بھی بدکے...... میں جو پہلے ہی اپنے ریڑھے میں جتے سانڈ کی ''بے چینی'' کو بھانپ چکا تھا، ایک دم چیخا، یہ جاننے کے باوجود کہ میں نے خود کو گونگا ظاہر کیا ہوا ہے۔

''ہائے...... میرا سانڈ...... بدمست ہورہا ہے۔'' یہ کہتے ہی میں نے سانڈ کی رسی مزید ڈھیلی چھوڑ دی۔

اِدھر پربھو اور پربھن...... جو میری چیخ سنتے ہی حیرت سے آنکھیں اور منہ پھاڑے اپنے ہودے سے باہر نکل آئے تھے...... یہاں سانڈ تب تک سرک سرک کر دونوں سانڈنیوں کے قریب جاچکا تھا اور شاید ''پسندیدگی'' کے چکر میں کم بخت تھوڑا اُلجھا ہوا اور بے چین بھی ہورہا تھا کہ بالآخر ایک سانڈنی کا انتخاب کر کے اس پر اس نے اُچھال ماری...... نتیجے میں ریڑھا عمودی ہوا۔ میں نے سانڈ کی ''متوقع مستی'' کو پہلے ہی بھانپتے ہوئے چوبی نالوں کا سہارا لے رکھا تھا مگر پربھو اور پربھن...... اپنا توازن نہ سنبھال سکے اور ایک دوسرے کو ''چھپا'' ڈال کر ریتیلی زمین پر آرہے۔

اِدھر میں دکھاوے کی خاطر...... سانڈ کی باگیں کھینچ اور ڈھیلی کررہا تھا اُدھر سانڈ اپنی مستی میں محو، سانڈنی والے ریڑھے پر حملہ آور ہو چکا تھا، اسے ریڑھا نظر نہیں آرہا تھا جس میں اس کی دل پسند سانڈنی جتی ہوئی تھی، وہ جانور تھا، ایک ہی شے اسے نظر آرہی تھی اور وہ اسی کے درپے پاگل ہو رہا تھا۔ یوں قافلے میں بھگدڑ مچ گئی۔ سانڈنیاں بھی سانڈ کو پاگل پا کر دوڑ پڑیں...... اس کے سواروں نے بھی شاید جانوروں کی بدمستیاں بھانپ لی تھیں اور وہ چیخیں مارتے

ہوئے سانڈنیوں کے ریڑھے سے چھلانگیں مار کے زمین پر گرے تھے۔

اب گویا ایک رات کی چٹکی ہوئی چاندنی میں یہ منظر کسی ایکشن اور تھرل فلم سے کم نہ تھا۔ میرا سانڈ ریڑھا لیے اندھا دھند دوڑے جارہا تھا، جبکہ سانڈنیوں والا ریڑھا بھی اپنے بے خبر سواروں کو گرا کر طوفانی رفتار سے دوڑ رہی تھیں...... پل کے پل صورت حال کچھ سے کچھ ہوگئی۔ فوجی اہلکار یہی سمجھ کر ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے کہ...... سانڈ اور سانڈنیوں کے اس "معاشقے" کا تعاقب کیا جائے یا جانور سمجھ کر چھوڑ دیا جائے۔ سر دست تو مجھے یہی نظر آرہا تھا۔

کوئی میرے تعاقب میں نہ تھا۔ لیکن یہ ضروری بھی نہ تھا، آگے چل کر کوئی اہلکار شبے کا اندازہ کرتے ہی میرے تعاقب میں لگ سکتا تھا۔

لہٰذا میں سانڈ کی رسی کو بدستور ڈھیلی چھوڑے ہوئے تھا۔ اس کی جیسے مراد بر آئی تھی۔ وہ سانڈنیوں کے پیچھے مسلسل دوڑتا رہا...... یہاں تک کے آناً فاناً کہاں سے کہاں نکل گیا......

اس کے ذرا دیر بعد جب مجھے آبادی کے آثار ہیولوں کی صورت میں نظر آنے لگے تو میں نے اپنی گٹھڑی بلی سے نکال کر اپنی بغل میں دبائی اور ریڑھے پر سے چھلانگ لگادی۔

چلتے ریڑھے سے چھلانگ لگاتے ہی میں ریتیلی زمین پر تھوڑی دور تک گیند کی طرح لڑھکتا چلا گیا، کپڑوں کی گٹھڑی بھی بغل سے نکل گئی، لیکن پھر فوراً ہی سنبھالا لیتے ہوئے میں نے اپنا توازن قائم کیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ گٹھڑی قریب پڑی نظر آئی۔ وہ میں نے اُچک لی اور ایک نسبتاً بلند ٹیلے کی آڑ میں چلا گیا۔

دفعتاً میں چونکا۔ قافلے کی سمت سے ایک تیز روشنی حرکت کرتی نظر آئی۔ میرا دل اُچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ بھارتی فوجی اہلکار سانڈ اور سانڈنیوں کے تعاقب میں آگئے تھے۔ ادھر میں نے دیکھا کہ میرا سانڈ رک گیا تھا، وجہ اس کی بڑی خوش گوار تبدیلی تھی۔ سانڈنیاں بھی رکی ہوئی تھیں۔ وہ ایک ذرا میدانی علاقہ تھا اور وہاں خاصی ہری بھری گھاس اُگی ہوئی تھی۔

پیٹ کی بھوک "سیکس" پر غالب آچکی تھی اور وہ ایک دوسرے کو بھلا کر گھاس چرنے میں مصروف ہو گئے۔ اہلکاروں کی جیپ قریب آگئی۔ سانڈ سانڈنیاں بدستور ریڑھوں میں بجتے رہے۔ جیپ سے فوجی اہلکار اُتر آئے۔ میں ٹیلے کی ڈھلانی اوٹ سے ان بے وقوفوں کا تماشا دیکھ رہا تھا جو اِدھر اُدھر نظریں گھمانے کے بجائے...... بیل گاڑیوں کا جائزہ لینے میں محو تھے۔

میں انہیں مصروف چھوڑ کر پلٹ گیا اور...... پھر نہیں رکا۔ کیونکہ اپنے عقب میں مجھے آبادی کے آثار دکھائی دینے لگے تھے۔

موقع تاک کر یہاں سے کھسک گیا اور سیدھا آبادی کا رخ کیا۔ مجھے چاندنی میں نہایا ہوا یہ قصبہ بڑا ہرا بھرا محسوس ہوا۔ یہاں ہر طرف سناٹا پھیلا ہوا تھا، دیہاتی قسم کا قصبہ تھا لوگ شاید سرِ شام ہی گہری نیند میں جا چکے تھے۔ آوارہ کتوں کے کہیں دور قریب بھونکنے کی آواز اُبھرتی اور پھر وہی سناٹا چھا جاتا۔

کچے پکے گھر، گلیوں کی بے ترتیب قطاریں اور...... ان کے پار کھیتوں کے سلسلے اور جنگل سے میدان بھی دکھتے تھے۔ میں اِدھر اُدھر پناہ کی تلاش میں چھپتا پھرتا مٹر گشت کرتا رہا، یہاں تک کہ مجھے ایک ہوٹل نما سرائے دکھائی دی۔

حالت تو اس کی نہایت بوسیدہ ہو رہی تھی، مگر ایسے میں یہ بھی غنیمت ہی ہوتا، مگر اچانک ایک خیال میرے ذہن میں بجلی کی سی تیزی سے کوندا، کہ اگر...... وہ فوجی اہلکار یہاں تلاشی یا چیکنگ کے لیے آگئے تو میرا بہ آسانی پتا لگ جانا ممکن ہوتا، ظاہر ہے اندر سرائے میں کوئی رجسٹر کھولے بیٹھا بھی ہوگا اور میرا نام، وقت وغیرہ اندراج کر کے ہی مجھے کوئی کمرا دے گا۔

سوچا یہ کام کل صبح کرنا چاہیے، ابھی فرار کا واقعہ تازہ ہے۔ میں سرائے کی عقبی سمت آگیا، یہاں جنگل سا تھا اور جا بجا جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔

سرائے کے اُوپر بنی ٹینکی کے نیچے تک پانی اور رفو ہونے کے لیے ایک خلا بنا رکھا تھا۔ یہ جگہ مجھے صبح تک دبکے رہنے کے لیے مناسب لگی اور میں اس میں گھس کر بیٹھ رہا۔

سرائے کی عمارت مستطیل تھی۔ اس کی بوسیدہ دیواروں سے جھانکتی ہوئی کھڑکیوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اندر دڑبے نما کمرے تھے۔

وہ رات خیریت سے گزر گئی۔ صبح صادق کا سویرا ہوتے ہی میں مارلی کے اس قصبے کی خوب صورتی دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

مارلی کی صبح مجھے بڑی ہی دیدہ زیب، دلفریب اور

قدرتی مناظر سے بھرپور محسوس ہوئی۔ ہلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، آسمان پر سفید بادلوں کی ٹکڑیاں تیرتی راج ہنسوں کی طرح نظر آتیں، اریب قریب کے جنگل، جھاڑیوں اور درختوں پر پرندے چہچہا رہے تھے۔

لوگوں کی آوک جاوک شروع ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے جسم سے کولھیوں والا... الابلا لباس اُتار کے پھینکا اور گٹھڑی کھول کر اس میں سے ڈھنگ کا لباس نکال کر پہن لیا اور اس کی جگہ کولھیوں والا لباس لپیٹ دیا، کیا خبر آگے یہ بھی کسی موقع پر کام آجاتا۔

اب میں کچھ بہتر حالت میں تھا۔

نیند تو میں لے چکا تھا، اسی لیے اب ہوٹل میں جانے کا ارادہ ترک کر دیا، بلاوجہ کیوں یہاں اپنی رجسٹری کرواتا۔ یوں بھی یہ ہوٹل کیا تھا بس، سرائے کے نام پر ہوٹل کہلاتا تھا۔

مجھے یہ بھی نہیں پتا تھا کہ کیا خبر رات کے کسی پہر فوجی اہلکار یہاں کسی مشکوک آدمی کی تلاش میں بھی آئے ہوں، لیکن جب میں...... ہوٹل یا سرائے کے عقبی حصے سے نکل کر سامنے آیا تو زمین پر مجھے جابجا جیپ کے ٹائروں کے نشانات ضرور دکھائی دیے اور یہ نشان دیکھ کر ہی میرے پورے وجود میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ میرا خدشہ درست ثابت ہوا تھا۔ وہ یہاں کسی مشکوک آدمی (میری) تلاش میں آئے تھے اور یہ قدرت کی طرف سے ہی میرے دل میں خیال اُبھرا تھا کہ سرائے میں جانے کے بجائے اس کے کسی چور گوشے میں رات گزار دی جائے۔ گویا موت میرے قریب سے ہو کر گزر چکی تھی اور میں سوتا رہا تھا۔ بے شک مارنے والے سے بچانے والا زیادہ طاقتور ہے۔ میں نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا اور اب مزید محتاط ہو گیا۔

یونہی عام سے انداز میں گھومتے گھامتے لوگوں سے پوچھتے ہوئے میں نے مارلی کے ریلوے اسٹیشن کا رخ کیا۔

اسٹیشن کی مختصر سی عمارت ایسی ہی تھی جیسی اس طرح کے قصبے کی ہونی چاہیے تھی۔ میں نے ایک مشہور انڈین فلم دیکھی تھی۔ ''شعلے'' یہ اسی طرح کے ہی ایک قصبے کی کہانی تھی اور ایسا ہی ریلوے اسٹیشن تھا۔ کبھی میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ تقدیر مجھے کہاں سے کہاں لا پھینکے گی۔

تن بہ تقدیر ہو کے میں نے یہاں ٹرینوں کی آمدورفت کے بارے میں معلومات لی تھی۔ پتا چلا کہ مانڈلے یہاں سے...... پچاس ساٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا اور روزانہ دو ریل کاریں مختلف اوقات میں صرف مانڈلے تک چلا کرتی تھیں۔ ایک صبح دس بجے اور دوسری شام چھ بجے۔ یہی ٹرین واپس آکر دوبارہ مانڈلے عازم سفر ہوتی تھی۔

مارلی سے مانڈلے تک ریل کار یہ سفر ڈھائی سے تین گھنٹوں میں طے کرتی تھی۔

میرے پاس بھارتی کرنسی خاصی تعداد میں تھی۔ وہی میں بروئے کار لا رہا تھا۔

مانڈلے سے میرا ارادہ کسی بڑی ایکسپریس ٹرین کے ذریعے ممبئی پہنچنے کا تو تھا مگر ڈر بھی لگ رہا تھا، کیونکہ میرے پاس سفری کاغذات کے نام پر کچھ بھی نہ تھا۔ بے سروسامانی تو اس بدنصیب طیارے کی تباہی کے بعد سے ہی شروع ہو چکی تھی، اگرچہ مہارانی دل آرام کی حویلی میں تھوڑا بہت آسرا ہو گیا تھا مگر اب وہاں سے بھی اسی طرح خالی ہاتھوں مجبوراً نکلنا پڑا تھا۔

اب میں پلیٹ فارم پر ٹرین کے انتظار میں کھڑا تھا۔ وقت گھڑیال میں دیکھ لیا تھا، نو بج رہے تھے اور ریل کے آنے میں ابھی ایک گھنٹا باقی تھا۔

اسٹیشن پر بمشکل ایک دو ہی ٹریک تھے، پلیٹ فارم اور پٹڑیوں پر کوے کائیں کائیں کرتے پھدک رہے تھے، کچھ بجلی کی تاروں پر بھی تشریف فرما تھے۔ دور کہیں ہلکی سی گھنٹی بجی تھی۔

عجیب ہی کلاسیکل قسم کا ماحول تھا۔ پانی تو میں نے نلکے سے پی لیا تھا لیکن اب بھوک ستا رہی تھی۔ دو تین ریڑھے والے کھڑے تھے، انہوں نے ایک کالی سلیٹ پر چاک سے ''ترکاری پھلکا، دال گھوٹالا'' لکھ کر ریڑھے پر نصب کر رکھا تھا۔

میں ذرا جائزہ لینے کے لیے ریڑھے کی جانب بڑھا تو وہاں مجھے نہ پلیٹیں نظر آئیں نہ ہی چمچ وغیرہ۔ دیکھا تو ایک بڑے سے تھال پر چنے کا سالن، دال کا بھرتا سا شاید گھوٹالہ اور سبزی تھی۔ پھلکے بھی گول دائرے کی صورت میں لگے ہوئے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ...... یہ ساری چیزیں کس میں ڈال کر گاہکوں کو پیش کرتا ہوگا؟

خیر، یہ اس کا دردِ سر تھا، میں نے اسے آرڈر دیا۔ اس نے اپنے دائیں جانب رکھے کھارے میں سے ایک بڑا سا خشک پتا اُٹھایا اور اس پر پھلکا رکھا، پھلکے پر چنے، دال کا بھرتا اور مجھے تھما دیا۔ میں ہولے سے مسکرایا اور وہیں کھڑے کھڑے کھانے لگا تو حیران رہ گیا۔ اس قدر لذیذ

ذائقہ دار تھا کہ میں کھاتا ہی چلا گیا اور خالی پتّا اس کی جانب بڑھایا تو وہ مسکرا کر بولا۔

"نائیں بابو! اسے پھینک دو......"

"او اچھا! معاف کرنا۔" کہتے ہوئے میں نے پتّا ایک طرف پھینک دیا۔

"لگتے ہو مارلی میں نئے ہو......" کچھی سے دکان دار نے سوال کیا۔

"نیا ہی سمجھو۔" میں مسکرایا اور جلدی سے پیسے پوچھے تاکہ وہ زیادہ مجھ سے کچھ نہ پوچھ سکے......

اس نے پیسے بتائے وہ میں نے دے دیے اور پلٹ گیا۔ نل کے پاس گیا، جھک کر پانی پیا اور سیدھا کھڑا ہوا تو دیکھا ریڑھے والا وہ کچھی غائب تھا۔ البتہ ریڑھا جوں کا توں موجود تھا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ ابھی میں اِدھر اُدھر گردن گھما کر دیکھنے ہی والا تھا کہ اسی کچھی کی آواز اُبھری۔

"کملیش کے آدمی ہو تو بولو...... بہت سے بیت گیا، ڈھونڈتے ڈھونڈتے۔"

میں نے چونک کر اپنی گردن گھمانے کے بجائے پورا ہی اس کی طرف گھوم گیا۔

"آں...... ہاں...... کملیش کا ہی آدمی ہوں، پر...... تم نے مجھے پہچانا کیوں نہیں تھا اب تک......؟" میں نے بھی اسی کے انداز کا جواب داغ ڈالا۔ فوری فیصلہ اور بروقت حاضر دماغی میں تو میں یگانہ ہو چکا تھا۔ وجہ اس کی وہ حالات تھے جن سے میں گزر رہا ہوں۔

"پہچان تو گیا تھا، جب تم نے میرے سوال کے جواب میں "نیا ہی سمجھو" کہا تھا، مگر احتیاط بھی اچھی چیز ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔" کچھی نے کہا اور میں اس کے ساتھ ہولیا۔

"نیا ہی سمجھو" یہ کوڈ غالباً اتفاقاً ہی لگ گیا تھا۔

وہ ریڑھے کو ایسے ہی خالی چھوڑے اسٹیشن کی بوسیدہ دیوار پر بنے آدم گزار سوراخ سے مجھے دوسری جانب لے آیا۔

یہاں میں نے دیکھا جابجا جھونپڑ نما گھر اور کوارٹرز سے بنے ہوئے تھے۔ وہ مجھے ایک جھونپڑ نما گھر میں لے گیا۔

میں محتاط بھی تھا، کیا خبر...... یہ مجھ سے کوئی دھوکا کر رہا ہو۔ اندر دو تاریک سے کوٹھری نما کمرے بنے ہوئے تھے۔ وہ مجھے مختصر سے صحن سے گزارتا ہوا ایک کوٹھری میں لے گیا۔

اندر اس نے روشنی کر دی۔ میں یہ دیکھ کر بُری طرح چونکا تھا، وہاں دو عدد ڈیپ فریزر رکھے ہوئے تھے۔ یہ بادی النظر میں ایسے ہی نظر آتے تھے جیسے اس کے اندر کولڈ ڈرنکس رکھی گئی ہوں۔

اس کچھی نے مجھے بیٹھنے کو بھی نہیں کہا اور ان ڈیپ فریزرز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"سے بالکل بھی نہیں ہے، رندھیکر...... اریل کار گزر جانے کے بعد رتلام جانے والی مال گاڑی پہنچنے والی ہے۔ بس، مال اٹھاؤ اور چلتے بنو۔"

میں اس کی بات سن کر ظاہری نہیں مگر اندر سے شش و پنج کا شکار ہو گیا، لگتا تھا بھانڈا پھوٹنے والا ہے، وہ مجھے جانے کس کملیش نامی شخص کا آدمی سمجھا تھا اور اس نے کیا کہنا اور کیا کرنا تھا، میں بالکل نہیں جانتا تھا۔ میں نے تو اندھیرے میں تیر چھوڑ دیا تھا۔ یوں ایسے میں مجھے اسی کی زبانی اپنا نام "رندھیکر" بھی معلوم ہو گیا۔ یہ بھی ایک اچھی بات ثابت ہوئی تھی۔ بولا۔

"ٹھیک ہے، میں تیار ہوں۔"

وہ میری بات سن کر آگے بڑھا۔ ایک ڈیپ فریزر کا ڈھکن اُٹھایا اور اندر سے مجھے سرد بھاپ کا دھواں اُٹھتا دکھائی دیا۔ میرا دل تیز تیز دھڑک رہا تھا اور ذہن بھی اسی تیزی کے ساتھ کام کر رہا تھا۔

اس نے اندر ہاتھ ڈال کر دو آئس باکسز نکالے۔ یہ بس اسی قدر سائز میں تھے جیسے ویکسین کا چھوٹا چوکور باکس ہوتا ہے، یا پیزا وغیرہ ڈیلیوری کرنے والوں کا۔

"لے سنبھال اور نکل چل...... میرا کام ختم......"

وہ دونوں باکسز اس نے مجھے تھماتے ہوئے کہا اور جلدی سے فریزر کا ڈھکن گرا دیا۔ میرے اندر زبردست ہلچل مچی ہوئی تھی۔

وہ مجھے لیے باہر آ گیا اور اب خاصا عجلت میں تھا۔ ہم دوبارہ پلیٹ فارم پر آ گئے اور وہ مجھ سے جدا ہو گیا۔

میں باکسز سنبھالے عجیب مخمصے کا شکار تھا، خدا جانے یہ کیا مصیبت اس نے مجھے تھما دی تھی؟ اور رتلام میں کسے دینا تھی۔ خوامخواہ ایڈونچر کا شوق چرایا تھا اور یہ مصیبت گلے لگ گئی تھی۔

ریل کار آچکی تھی اور اب روانہ بھی ہونے والی تھی، اس نئی اور نامعلوم سی مہم جوئی کے بعد اب میرا جواز ریل کار میں سوار ہونے کا نہیں بچا تھا، ورنہ وہ کچھی بدک جاتا۔ کیونکہ اسی کے مطابق مجھے مال گاڑی میں ہی سوار ہونا تھا۔

ایک بار تو جی میں آئی کہ باکسز پھینکوں اور...... ریل کار میں سوار ہو کے اپنی منزل پکڑوں، لیکن میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ ماجرا آخر تھا کیا......؟

آئس باکسز میں کیا تھا؟ غالب خیال تھا کہ یا تو تقدیر نے مجھے ان خونی سوداگروں کے کسی ذیلی نیٹ ورک میں اُلجھا دیا ہے یا پھر یہ کوئی اور معاملہ ہے؟

ریل کار روانہ ہوگئی۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد...... مال گاڑی آگئی۔ اس میں مال کی سات آٹھ بوگیاں ہی شامل تھیں۔ مجھے سب سے آخر والی بوگی، جو غالباً واچ مین یا گارڈ کی کہلاتی ہے، میں سوار ہونا تھا۔

مال گاڑی کے رکتے ہی میں آخری والی بوگی کی طرف بڑھا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔

یہ بہت چھوٹی بوگی تھی، بالکل اسی طرح جو عموماً کسی بھی مال گاڑی کے سب سے آخر میں ہوتی ہے۔

میں اس میں سوار ہو گیا۔ اندازہ تو تھا کہ اس میں بھی انہی کا آدمی مجھے ملے گا۔

وہی ہوا، گارڈ کی نیلی اور سفید وردی میں ملبوس ایک مضبوط تن وتوش کا آدمی اندر بنک سیٹ پر براجمان تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔

''کسی کو شک تو نہیں ہوا تم پر؟'' وہ بار بار میرے ہاتھوں میں تھمے ہوئے آئس باکسز کو دیکھے جاتا تھا۔

''ہرگز نہیں...... سب ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔

''برف کا مسئلہ ہوگا، میں نے جگدیش سے کہا بھی تھا کہ مجھے ایک دو برف کی سلیں رکھوا دے مگر...... چل چھوڑ دیکھ لیتے ہیں۔'' وہ اُلجھا پھر مجھے باکسز ایک طرف رکھنے کو کہا، وہ میں نے کونے میں رکھ دیے۔

مجھے ابھی تک نہیں معلوم تھا کہ اس میں ہے کیا؟ تجسس اپنی جگہ لیکن میں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہتا تھا۔

تھوڑی دیر گزری، اس نے اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا، پھر قریب رکھی سگنل لالٹین اُٹھائی اور کیبن سے باہر آیا اور ریلنگ پر کھڑے ہو کر وہ اس نے لہرا دی اور اس کے ساتھ ہی منہ میں دبی وسل بجائی۔

مال گاڑی نے رینگنا شروع کر دیا۔ ذرا دیر بعد وہ اندر آگیا اور اپنی جیب سے سگریٹ کی ڈبی نکالی اور میری طرف بڑھا دی، میں نے شکریہ کے ساتھ ایک سگریٹ نکالی اور ہونٹوں میں داب لی، اس نے بھی یہی کیا اور لائٹر نکال کر پہلے میری اس کے بعد اپنی سگریٹ سُلگا کر گہرا کش لیا اور بڑبڑانے کے انداز میں بولا۔

''کملیش غلطی کر رہا ہے، مگر باس کا پیارا ہے، ہم اُسے اور کیا کہہ سکتے ہیں۔''

''ابھی تو اس نے کوئی غلطی نہیں کی؟'' میں نے یونہی تیر پھینکا۔

''کوئی ایسی ویسی۔'' وہ منہ بنا کر بولا۔ ''پہلے اس نے...... ادھوری انفارمیشن بھیجی، جس کے نتیجے میں ہم اخباری نمائندوں کی زد میں آنے سے بال بال بچے، دوسری غلطی اس نے ممبئی کی اہم شخصیت کو چھیڑ کر کر ڈالی، اس کے بھتیجے کو اغوا کر لیا جو اودے پور اپنی نانی کے ہاں آیا ہوا تھا، حالانکہ اسے ڈاجکر نے تاکید بھی کی تھی کہ اس دھندے کے لیے عام اور غربا ہی زیادہ بہتر رہتے ہیں، مگر وہ تو بس...... کام نکالنے کی کرتا ہے۔ اب بتاؤ، اس اہم شخصیت کے بھتیجے کے ساتھ یہ حشر کرنا کوئی معمولی بات......؟ پوری صوبائی مشنری ہمارے پیچھے لگ چکی ہے۔ رتلام کا اسپتال الگ ان کی نظروں میں آچکا، تم بھی اس کے بھتیجے کو ذرا دھیان سے پہنچانا رتلام جی میموریل ہاسپٹل میں۔''

اس نے آخر میں مجھ سے تاکید کرنے کے انداز میں کہا اور ساتھ ہی ان دونوں باکسز کی طرف اشارہ کر دیا، جو میں لایا تھا۔

میں لرز گیا۔ تو گویا اس مذکورہ اہم شخصیت کا جواں سال بھتیجا غالباً ٹکڑوں کی شکل میں باکسز میں تھا۔

''تم کوئی چنتا مت کرو، مجھے کملیش نے سب کچھ سمجھا کر بھیجا ہے۔'' میں اپنے لرزیدہ تاثرات اس سے چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولا۔

''ہمم۔'' اس کے حلق سے گومگو انداز میں برآمد ہوا اور سگریٹ کے کش لیتا رہا۔ اس دوران مجھے اس کا نام...... شنکر داس معلوم ہوا تھا اور اسی کی زبانی مجھے اسی پچھی سے ریڑھے والے کا نام بھی معلوم ہوا، نارائن نام تھا اس کا......

یوں میں نے روا روی کے انداز میں اس اہم شخصیت کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ جسونت رائے نام ہے اس کا، ممبئی کی ایک بہت بڑی کاروباری شخصیت ہے۔ حکومتی سطح پر بھی اس کی بہت چلتی ہے بلکہ اس کے لیے تو یہ تک کہا جاتا ہے کہ جسونت رائے کاروباری دنیا کی ایک پوری مافیا چلاتا ہے، ایک بڑا ڈان ہے وہ...... اب تم خود ہی اندازہ لگا لو، اس نے اپنے لاڈلے اکلوتے بھتیجے کی تلاش میں کیا کچھ نہیں کیا ہوگا! اور جب اسے اس حقیقت کا پتا چلے گا کہ اس کے جوان بھتیجے کو تو کھول کر بانٹ کے کھا گئے تو وہ قبر تک ہمیں نہیں چھوڑے گا۔''

میں نے اس کی بات سن کر اپنی بھویں اُچکالیں۔

مال گاڑی اپنی مقررہ درمیانی رفتار سے دوڑی جارہی تھی۔ مجھے ہر لمحے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ میرا اندھیرے میں چھوڑا ہوا تیر زیادہ دور تک نہیں چل سکتا تھا اسی لیے میری کوشش تھی کہ میں اس سارے چکر کے بارے میں پوری طرح آگاہی حاصل کرلوں۔

خونی سوداگروں کے خلاف میں ہر محاذ پر خود کو مستحکم رکھنا چاہتا تھا۔ طارق اور رومی کی کوششیں اپنی جگہ، لیکن میں بھی اس نیک مقصد اور مہم میں پیچھے رہنا نہیں چاہتا تھا۔

جیسا کہ مذکورہ ہو چکا، جب میں نے کسی غلط فہمی سے بچنے کی خاطر ٹھاکر ہری داس اور مہارانی دل آرام کو ان خونی سوداگروں کی حقیقت بتائی تھی تو انہوں نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا کہ ایسی خبریں بالخصوص بھارت کے حوالے سے...... وہ بھی سنتے رہے ہیں، جن میں مالی اور رتلام سرِفہرست تھے۔ اب میں کملیش اور ڈاجکر کے بارے میں جان کاری حاصل کرنا چاہتا تھا اور رتلام جی میموریل ہاسپٹل تک تو میری رسائی ازخود ہی ممکن ہونے والی تھی۔ وہاں سے مجھے ان کے نیٹ ورک کا پتا چل سکتا تھا کہ وہ کہاں تک پھیلا ہوا تھا۔

مصدقہ معلومات کے مطابق یہاں کا نیٹ ورک شنکر چانکیہ کے سپرد تھا، جس کی بیخ کنی کے لیے طارق اور رومی پہلے ہی خفیہ طور پر ممبئی پہنچ چکے تھے۔

تقدیر میرا اس نیک مقصد میں ساتھ دے رہی تھی تو میں کیوں پیچھے رہتا۔

میں نے گارڈ کے روپ میں ان خونی سوداگروں کے ساتھی کی طرف دیکھا اور شناسائی کی خاطر اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کردیں پھر بولا۔

''کیا ضروری تھا کہ رتلام جی میموریل ہاسپٹل تک مجھے اسی سست رفتار مال گاڑی سے ہی روانہ کیا جاتا؟ حالانکہ ہم سب جانتے ہیں، انسانی اعضا جسم سے نکالنے کے بعد فوراً مقررہ جگہ پر پہنچانے ضروری ہوتے ہیں۔''

''ایسا مجبوری کی بنا پر کیا گیا ہے۔'' اس نے سگریٹ کا آخری کش لگاتے ہوئے کھڑکی سے ٹوٹا باہر اُچھالتے ہوئے کہا۔ ''جس مشہور شخصیت کے بھتیجے کو اغوا کیا گیا تھا، اس نے مسافر ٹرینوں سمیت، ہر اڈے پر ناکابندی کروادی ہے۔ مال گاڑی پر کسی کو شبہ نہیں ہوگا۔''

''یعنی رتلام گڑھ اسٹیشن پہنچنے پر مجھے بھی خطرہ ہو گا؟'' میں نے خیال ظاہر کرنے کے انداز میں کہا۔ وہ میری طرف دیکھ کر ہولے سے ہنسا پھر بولا۔

''کملیش کی اس عقل مندی نے خطرے کو نہ ہونے کے برابر کر دیا ہے۔ یہ مال گاڑی ہے۔ پلیٹ فارم کے بجائے یہ گودام یارڈ والے پلیٹ فارم پر رکتی ہے۔ میرا ڈبا آخر میں ہونے کی وجہ سے یہ مزید محفوظ ہے۔ جدھر یہ رکے گا، وہاں اسٹیشن کا آخری پھاٹک ہے، اس طرف ٹرک وغیرہ ہی کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک گاڑی تمہیں لینے کے لیے وہاں پہنچی ہوئی ہوگی۔''

''اچھا!'' میں نے طمانیت بھرے انداز میں سر ہلا دیا۔ وہ پھر سگریٹ پینے لگا۔ اس بار اس نے مجھے اس کی پیشکش نہیں کی۔

ایک کش لگانے کے بعد بولا۔ ''لیکن تب بھی احتیاط کی ضرورت ہے۔ خفیہ پولیس کا ایک گھاگ افسر ارن پال، جسونت رائے کا داماد ہے۔ اس نے پورے بھارت کے محکمہ گیرائی کو ہمارے پیچھے لگا دیا ہے۔''

وہ بولتا جارہا تھا اور میں بظاہر تشویش...... کے انداز میں اپنے سر کو جنبش دیتا رہا مگر اندر سے میں یہ سارے نام، کملیش، ڈاجکر، جسونت رائے، ارن پال وغیرہ ذہن نشین کرتا جارہا تھا۔ مالی کے اس ریلوے اسٹیشن کے ریڑھے والے چیچی سے آدمی، اور اس گارڈ شنکری کو بھی نہیں بھولا تھا۔

سفر جاری رہا۔ رتلام پیچھے چھوٹ گیا، یہاں مجھے اُتر کے کوئی ایکسپریس ٹرین پکڑنا تھی، لیکن اب میری ازخود منزل رتلام قرار پائی تھی۔ اس کے دو، تین گھنٹے بعد ہی رتلام گڑھ کے ریلوے اسٹیشن کی حدود میں ہم داخل ہو رہے تھے۔ پٹریاں بدلنے کا مخصوص ردھم بڑا دلکش معلوم ہو رہا تھا۔

''تم ابھی بیٹھے رہو۔'' شنکری بولا۔ ''گاڑی رکنے کے بعد میں پہلے نیچے اُتر کر جائزہ لوں گا۔ پھر تم نیچے اُترنا۔'' میں نے اس کی ہدایت پر ہولے سے! بات میں اپنے سر کو جنبش دے ڈالی۔

وہ نیچے اُتر گیا۔ دیکھا جاتا تو اس وقت میں بھی خطرے میں تھا۔ یوں پکڑا جاتا تو مجھے بھی انھی کا ساتھی سمجھا جاتا اور اس جسونت رائے نے، جس میں اس کا داماد بھی بہ نفسِ نفیس شامل ہوتا، پھر میرا جو حشر کرتا، اس کے آگے سوچنا ہی میرے لیے محال تھا۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ میں تو خود غائبانہ ان کی مدد کر رہا تھا۔ کوئی میری بات پر یقین نہیں کرتا کہ میں تو خود ان خونی سوداگروں کی بیخ کنی کے لیے کمربستہ ہوں۔

یہ خیال آتے ہی مجھے اب ان خونی سوداگروں سے

زیادہ جسونت رائے اور اس کے داماد انسپکٹر ارن پال سے خوف محسوس ہونے لگا۔ اسی عالم میں، میں نے قریب دھرے ان منحوس آئس باکسز پر نظر ڈالی، جس کے اندر جسونت رائے کا لاڈلا جواں سال مگر بد نصیب بھتیجا ٹکڑوں کی صورت میں موجود تھا، تو میرے پورے وجود میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے ابھی ان باکسز سے برآمد ہوگا اور چیختا چلّاتا ہوا میرا نام پکارتا دوڑ پڑے گا۔

''پکڑلو...... اِسے...... یہ بھی ان خونی سوداگروں کا ساتھی ہے، جو مجھے یہاں تک لایا ہے۔''

میں نے جھرجھری سی لے کر اللہ کو یاد کیا اور اپنے اندر ایک نیا حوصلہ محسوس ہونے لگا۔ یوں ربِ کریم نے ہمت دی ہوئی تھی اور میں بھی تن بہ تقدیر تھا۔ مال گاڑی رکی ہوئی تھی۔ دور سے اس کے تھکے ہوئے انجن کی مخصوص ''گھرررر...... گھررر......'' کی آواز آرہی تھی۔

میں لوہے کی بنک سیٹ پر ہی بیٹھا کھڑکی سے باہر کا جائزہ لینے لگا۔ یہاں مجھے گودام کے طویل شیڈ بنے نظر آرہے تھے، ایک بڑا سا میدان تھا اور وہاں چھوٹے بڑے ٹرک کھڑے تھے۔ کچھ لوگ بھی نظر آرہے تھے۔ یہاں پلیٹ فارم اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ ہر سو خاموشی طاری تھی۔ دن کا وقت تھا۔ دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ایک جانب مجھے درخت اور باغیچہ سا بھی نظر آیا، اس طرف شاید ریلوے آفیسرز کے سرکاری بنگلے تھے۔

دوسری جانب وہ پلیٹ فارم تھا جہاں مسافر ٹرینیں رکتی تھیں، اس طرف دفتروں کی دو تین عمارتیں بنی ہوئی تھیں۔ گارڈ شنکری اس طرف نہیں گیا تھا۔

ابھی تک مجھے کوئی پولیس کی گاڑی یا کوئی ایسا آدمی مٹرگشت کرتا نظر نہ آیا جو مجھے خفیہ پولیس کا محسوس ہوتا۔ البتہ مجھے ایک اچنبھا ضرور ہوا تھا کہ...... گارڈ شنکری نے تو مجھ سے کہا تھا کہ مجھے لے جانے والوں کی گاڑی منتظر ہوگی، مگر وہ نظر نہیں آرہی تھی اور نہ ہی اب شنکری دکھائی دے رہا تھا۔ دور ایک دیوار تھی، جو خستہ حالی کی وجہ جھکی ہوئی نظر آتی تھی، اُدھر ہی سے مجھے شنکری تیز تیز قدموں سے آتا نظر آیا۔ اسے آتا دیکھ کر میں فوراً سنبھل کر بیٹھ گیا۔ کیونکہ یہ خدشہ مجھے لاحق تھا کہ میرا بھید کسی بھی وقت کھل سکتا تھا۔

ایسے میں مجھے کیا کرنا تھا، یہ بھی میں نے سوچ رکھا تھا اسی لیے میں اندر سے بے حد محتاط تھا۔

قریب پہنچنے پر میں نے دیکھا کہ شنکری کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ وہ لوہے کی ریلنگ لگی سیڑھیوں سے اُوپر کھلی بوگی کے تختے پر آیا جہاں میں اسے دیکھ کر آن کھڑا ہوا تھا۔

وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ اس نے اُوپر چڑھتے ہی مجھے تیز نظروں سے گھورا اور اسی لہجے میں بولا۔

''تم باہر کیوں نکل آئے؟ اندر چلو۔''

میں اندر آگیا۔ وہ بھی میرے عقب میں تھا۔

''تمہیں پریشان دیکھ کر میں نکل آیا تھا۔'' میں نے بات بنائی۔ ''ہوا کیا ہے؟ خیریت تو ہے نا؟ کیا وہ لوگ نہیں آئے؟''

''خفیہ پولیس کے لوگ سادہ وردی اِدھر بھی موجود ہیں۔ مجھے ابھی لوگوں نے بتایا ہے۔'' وہ اپنی پھولی ہوئی سانسیں درست کرتے ہوئے بولا۔

''اوہو...... یہ تو برا ہوگیا۔ اب کیا ہوگا؟'' میں نے پریشانی ظاہر کی جس میں کچھ حقیقت بھی تھی، اس طرح میرا کام بھی کھٹائی میں پڑسکتا تھا۔

''چنتا کی ضرورت نہیں، یہ تو شکر کرو کہ بروقت علم ہو گیا۔ نئے لائحہ عمل کے بارے میں وہ مجھے تھوڑی دیر میں بتاتے ہیں، تم ایسا کرو......'' کہتے ہوئے اس نے اپنی جیب سے ایک گھڑی اُتار کر مجھے دی اور کہا۔

''یہ ان کے ایک آدمی نے جو باہر پھاٹک پر فقیر کے بھیس میں موجود تھا، مجھے دی ہے فوری رابطے کے لیے۔''

''یہ ہے کیا؟'' میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دستی گھڑی کو دیکھتے ہوئے اپنے ہاتھ میں لے کر پوچھا۔

''تو بھی پورا گھونچو ہے، پتا نہیں اس سالے کملیش نے کس طرح تیرے جیسے گھامڑ کو اتنے اہم اور خطرناک کام کے لیے چنا ہے۔'' وہ جھلّا کر بولا۔ میں خجل سا مسکرا کے رہ گیا تو وہ آگے بولا۔

''یہ خفیہ واچ ٹرانسمیٹر ہے...... اس کی فریکوئنسی اے ٹو ایٹ ہے۔ وہ تجھے کال کریں گے اس پر پھر تُو فوراً میرا انتظار کیے بنا نکل جانا اُن کی طرف۔''

''تم کہاں جارہے ہو؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا، جواَب دیوار گیر آہنی کیبنٹ سے ایک موٹا رجسٹر، قلم اور ٹوپی نکال رہا تھا۔

''مال گاڑی رک چکی ہے، اس سے پہلے کہ کوئی عملے کا آدمی میری تلاش میں یہاں پہنچے اور تجھے دیکھ لے، مجھے دفتر پہنچ جانا چاہیے...... اس مال گاڑی کی رپورٹ جو دینی ہے...... گھونچو!''

وہ یہ ساری چیزیں سنبھالتا ہوا چلا گیا۔ میں نے خفیہ

ٹرانسمیٹر والی گھڑی بائیں ہاتھ میں پہن لی اور دھڑکتے دل سے ان کی کال کا منتظر ہو رہا۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ کیبن کے محدود ماحول میں ہلکی ''بپ'' کی آواز اُبھری۔ میں سمجھا شاید کوئی جنگلی مکھا اندر در آیا ہے اور لگا اِدھر اُدھر دیکھنے، عقدہ تو تب کھلا جب میری کلائی پر جہاں وہ دستی گھڑی بندھی ہوئی تھی، کوئی پن سی چبھنا شروع ہوئی۔

میں چونک پڑا۔ بپ کی آواز اسی میں سے آرہی تھی۔ شنکری مجھے اسے آپریٹ کرنا بتا گیا تھا۔ میں نے فوراً کلائی اپنے منہ کے قریب کرتے ہوئے اس کی ننھی سی پن کھینچی اور کہا۔

''رندھیکر کالنگ......!''

''یس، رندھیکر! شیام کالنگ یو۔'' دوسری جانب سے گمبھیر آواز اُبھری۔ ''میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور اعصاب پوری طرح تن گئے تھے۔ وہ آگے بول رہا تھا۔

''میرا ایک آدمی منھوچر تمہاری طرف آرہا ہے، ایک فقیر کے بھیس میں، کوڈ ہے، سات رنگ...... تم اس کے ساتھ چلے آنا۔ محتاط رہنا خفیہ پولیس کا یہاں بھی گھیرا تنگ ہے، وہ لوگ باربردار مزدوروں اور قلیوں کے بہروپ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اوور۔''

''آپ کوئی چنتا نہ کریں سر! میں پوری طرح سے محتاط ہوں۔'' میں نے اپنے لہجے میں جوش سمانے کی پوری کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اگرچہ میرا حلق خشک ہو رہا تھا اور کسی حد تک خون بھی......

''گڈ جاب! اوور اینڈ آل۔'' دوسری جانب سے توصیفی لہجے میں یہ کہتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

گارڈ شنکری اپنی ڈیوٹی رپورٹ دینے کے لیے دفتروں والے مسافر پلیٹ فارم کی طرف جا چکا تھا۔ میں مال گاڑی کی آخری بوگی میں موجود تھا۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ ایک آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔

''بھگوان کے نام پر مجھ بھوکے کو کھانا کھلا دو۔'' میں اس آواز پر چونکا اور کھڑکی کھول کر، جو میں نے شنکری کی ہدایت پر بند کر رکھی تھی۔ ایک دم کھول کر باہر جھانکا۔

ایک مفلوک الحال فقیر وہاں کھڑا تھا۔ اس نے جھلنگا سا کپڑا اوڑھ رکھا تھا اور...... گلے میں اَن گنت مالائیں جھول رہی تھیں۔ ایک ہاتھ میں کشکول تھا اور دوسرے بازو کی بغل میں گٹھڑی دبی ہوئی تھی۔ شاید یہی منھوچر تھا۔

میں اُٹھ کر بوگی کے دروازے سے ریلنگ والی جگہ پر آ گیا اور اسے قریب آنے کا اشارہ دیا۔

اس نے محتاط نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور اُوپر چڑھ آیا۔

''کوڈ؟'' میں نے ہولے سے کہا۔

''سات رنگ۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔

''اندر آجاؤ۔'' کہتے ہوئے میں اسے کیبن میں لے آیا۔

''مال کہاں ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ رہا۔'' میں نے کونے میں رکھے دونوں آئس باکسز کی طرف اشارہ کر دیا۔

''گڈ!'' وہ بولا۔

''لیکن، شیام بتا رہا تھا کہ باہر خفیہ پولیس کے لوگ مختلف بھیس میں موجود ہیں۔''

''ہاں! محتاط رہنا۔'' منھوچر نے کہا۔ پھر اپنی بغل میں دبی ہوئی گٹھڑی کھول کر اس کے اندر سے ایک اور جھلنگا سا فقیروں والا لباس نکال کر مجھے پہننے کو دیا بلکہ یہ اُوڑھا جا سکتا تھا۔ میں نے فوراً وہ پہن لیا۔ کچھ مالائیں بھی تھما دیں، وہ بھی میں نے اپنے گلے میں ڈال لیں۔ ایک کشکول بھی تھا۔ پھر بولا۔

''سے بالکل نہیں ہے، دیری ہوگئی تو مال پھوکٹ ہو جائے گا۔'' منھوچر عجلت میں مجھ سے بولا۔ ''اب ایک باکس تم اُٹھاؤ اور دوسرا میں اُٹھاتا ہوں، میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ، بلاضرورت بات نہیں کرنی ہے۔''

ذرا دیر بعد ہی ہم دونوں مال گاڑی کی بوگی سے نیچے اُتر آئے۔ ہم گاڑی کی دوسری جانب سے اُترے تھے۔ یہاں ٹریکس پھیلے ہوئے تھے۔

منھوچر میرے آگے تھا اور میں اُس کے پیچھے...... ہم لمبی سی مال گاڑی کی دوسری جانب کی آڑ لیے تیز تیز قدموں سے آگے بڑھتے رہے۔ یہاں بھی چند ایک قدیم طرزِ تعمیر کے چوبی اور ڈھلوانی چھتوں والے شیڈز اور بنگلا نما عمارتیں نظر آرہی تھیں۔

ایک کچا راستہ بل کھاتا پٹریوں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ ہم اس پر آ گئے۔ یہ راستہ پٹریوں کے پار جنگل جھاڑیوں کی طرف جاتا نظر آیا۔ ہم اب اسی پر ہو لیے۔

میں نے بہرحال...... ایک اندھے کنوئیں میں چھلانگ تو لگا دی تھی مگر اب...... میرے اندر ہلچل سی مچتا

شروع ہوگئی تھی۔ ان خونی سوداگروں کے ہرکاروں کے ساتھ میں محوِ سفر تھا۔

ان کا رخ یقیناً رتلام میموریل ہاسپٹل کی جانب تھا۔ میں دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اب تک ''سب ٹھیک'' تھا، یعنی میرا ابھی تک بھانڈا نہیں پھوٹا تھا۔ تب بھی ایک لرزتا خیال میرے پریشان ذہن میں ضرور ابھرتا تھا کہ کیا خبر انہیں اصل رندھیکر نے میری اصلیت کے بارے میں بتا دیا ہو؟ وہ دیر سے ہی مگر اس نے مالی کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچنا تو تھا ہی...... عین ممکن تھا کہ میری حقیقت جاننے کے باوجود انہوں نے ''مصلحتی'' خاموشی اختیار کر لی ہوتا کہ ان کا مال اور میں بھی...... ان تک پہنچ جاؤں اور اس کے بعد وہ میرا قلع قمع کرنے کی کوشش کرتے۔ وہ مجھے خفیہ پولیس کا جاسوس ہی سمجھ سکتے تھے۔

میں بھی ہر طرح سے محتاط اور چوکس تھا، یوں خطرے میں، گلے گلے تک میں ڈوبا ہوا تھا۔

ابھی تک تو مجھے سب ٹھیک لگ رہا تھا لیکن مجھے اس بات پر لامحالہ حیرت بھی ہو رہی تھی کہ ان کا اصل آدمی، یعنی ٹمکلیش کا آدمی...... رندھیکر کہاں مر گیا تھا؟ مر ہی گیا ہو تو اچھا ہے۔ میں نے دل میں اسے کوسا۔ کم بخت نے نامعلوم سی سنسنی پھیلائی ہوئی تھی اور ہر لحہ مجھے ایک دھڑکے میں مبتلا کر رکھا تھا۔

تھوڑی دور مزید چند قدم چلنے کے بعد ایک چھوٹا جھاڑی دار میدان سا آگیا اور وہاں میں نے ایک کار کھڑی دیکھی۔

کار کے اندر دو افراد موجود تھے۔ ایک ڈرائیور اور اس کے برابر میں دوسرا آدمی...... یہ لوگ ہماری ہی طرف دیکھ رہے تھے۔ کار کے انجن کے اسٹارٹ ہونے کی بھی آواز ابھری۔ شاید ہمیں دیکھتے ہی وقت بچانے کی خاطر ڈرائیور نے ایسا کیا تھا۔

منہوچہ اس کار کی جانب بڑھا۔ پھر اس نے ڈگی اُٹھائی۔ وہ اس میں شاید باکسز رکھنا چاہتا تھا، ابھی وہ اپنا ہی باکس اُوپر اُٹھا پایا تھا کہ ایک جانب سے بڑے زور کی بلند اور کڑک دار آواز اُبھری۔

''ہالٹ......!''

میں ایک دم اپنی جگہ پر ٹن ہوگیا۔ گھوم کر دیکھا تو ہاتھوں کے طوطے اُڑنے لگے، باکس زمین پر گر پڑا۔ ہمیں ایک طرف سے تقریباً سات آٹھ پولیس اہلکاروں نے گھیر رکھا تھا...... ایک دراز قامت اور کسرتی جسم کا شخص ان کے درمیان چوکس کھڑا تھا۔ پستول اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں دبوچ رکھے ہوئے تھے۔ اس کے جسم پر انسپکٹر کی وردی نظر آتی تھی۔

اسی وقت...... کار حرکت میں آئی...... گویا انہیں اپنی پڑ گئی۔ منہوچہ نے کار کی آڑ لی تو بجلی کی سی تیزی سے میں نے حرکت کی، لیکن بے فائدہ...... کیونکہ خطرہ بھانپتے ہی ڈرائیور کار کو گیئر میں ڈال کر بھگا چکا تھا۔

''فائر'' اسی کسرتی جسم کے انسپکٹر نے چلا کر کہا۔

منہوچہ اور میں یک دم زمین پر گر پڑے۔

پولیس جمیعت نے اندھا دھند گولیوں کی بوچھاڑ کر ڈالی۔ مجھے اپنا آخری وقت نظر آنے لگا تھا۔

''زٹ...... زنا...... زٹ...... تڑاخ...... تڑوخ......

کی سمع خراش آوازیں سنائی دیں اور دل کو بے اختیار تسلی ہوئی کہ گولیوں کی یہ خوفناک بوچھاڑ منہوچہ اور میرے بجائے کار پر کی گئی تھی۔ شاید اس لیے کہ ہم تو تقریباً دھر ہی لیے گئے تھے۔

دوڑتی ڈولتی کار کی باڈی میں یک بیک گولیاں پیوست ہوئی تھیں اور کھڑکی اور بیک اسکرین پر بھی لگی تھیں۔ اگلے ہی لمحے کار میں ایک سماعت شکن دھماکا ہوا اور اس میں آگ لگ گئی۔

منہوچہ خوف زدہ ہو کے پیچھے کو بھاگا۔ یک بیک گولیوں کی اس پر بھی باڑ پڑی اور وہ چھلنی ہو کے گر پڑا۔

رہ گیا میں...... منہوچہ کی یہ تقلید میں نے نہیں کی تھی، جانتا تھا میں کہ میرا بھی یہی حشر ہوتا۔

گویا اب تینوں خونی سوداگروں میں، میں ہی بچا تھا اور...... اب دنیا کی کوئی طاقت مجھ پر یقین نہیں کر سکتی تھی کہ میں ان کا ساتھی ہرگز نہیں تھا۔ اس پر مستزاد...... جسونت رائے نامی بااثر شخصیت کے جواں سال لاڈلے بھتیجے کے ٹکڑے بھی مجھ سے ہی برآمد ہونے والے تھے۔

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں...... مجھے گرفتار کر لیا گیا تھا۔

☆☆☆

میرے سر پر بڑا سا توبڑا ڈال دیا گیا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے پھانسی گھاٹ پر تختہ دار چڑھائے جانے والے سزائے موت کے مجرم کے سر پر چڑھا دیا جاتا ہے۔ شاید ہی کوئی تصور کر سکے کہ یہ میرے لیے کس قدر بھیانک صورت حال تھی۔ مجھے اسی حالت میں گولی بھی ماری جا سکتی تھی۔ میں موت کے بے رحم پنجوں کے رحم و کرم پر تھا۔ زندگی بس کچھ

ہی لمحوں کی مہمان محسوس ہونے لگی تھی۔
مجھے دائیں بائیں بازوؤں سے دو پولیس اہلکاروں نے دبوچ رکھا تھا۔ تب ہی اسی خرانٹ انسپکٹر کی آواز ابھری۔
”باکسز چیک کرو، اس میں کیا ہے؟“
”سر! چیک کر لیے گئے ہیں۔“ ایک اہلکار کی آواز ابھری۔ ”ہے بھگوان...... ! ہر باکس کے اندر دو چار رکھے ہوئے ہیں سر...... ! اور...... اور...... ان میں انسانی اعضا پڑے ہوئے ہیں۔“
”او مائی گاڈ! اس کا مطلب ہے ہماری اطلاع غلط نہیں تھی۔“ اسی انسپکٹر کی آواز مجھے سنائی دی۔
”توبہ...... توبہ...... سر! کس قدر ظالم لوگ ہیں یہ۔ لگ...... کیا یہ...... جسونت رائے صاحب کے بھیجے۔“ اہلکار سے اس سے آگے نہ بولا گیا۔
میری سماعتوں سے اچانک ہی چند ایک اہلکار کی ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے وہ قے کر رہے ہوں......
”سنبھالو تم لوگ خود کو......“ وہی کسرتی جسم والا جوان سامرد انسپکٹر دہاڑا۔ اس کے بعد شاید وہ میرے بہت قریب آگیا تھا۔ کیونکہ اس کے منہ سے نکلنے والے بھپکارے مجھے تو بڑے کے اندر سے بھی صاف آتے محسوس ہو رہے تھے۔ صاف ظاہر تھا وہ مجھ پر بھرا ہوا بیٹھا ہے۔ تب ہی مجھے اس کی پُر طیش غراہٹ آمیز آواز سنائی دی۔ وہ مجھ سے ہی مخاطب تھا۔
”کاش! میرے اختیار میں ہوتا کہ میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے سزا دیتا اور ایسی موت مارتا کہ تم مجھ سے زندگی کے بجائے موت کی بھیک مانگتے۔“
”انسپکٹر صاحب...... !“ میں نے اتنا ہی کہنے کی کوشش چاہی تھی کہ اس نے حلق کے بل دہاڑ کر میری بات کاٹ دی۔
”خاموش...... ایک لفظ بھی بولنے کا تم جیسے سنگ دلوں کو حق نہیں دوں گا میں۔“ ساتھ ہی اس نے...... مجھ پر لاتوں اور مکوں کی بارش کر دی۔ اپنے دل کی بھڑاس اس نے نکال کر ہی چھوڑی...... میرے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ میں زمین پر گر پڑا اور درد و اذیت کے مارے چیختا چلاتا رہا۔
”سرکار...... اسے کھوتا نہ کریں...... یہ مرغا اب کہیں نہیں جانے کا، واپس چلنے کی کریں۔“ میری ڈوبتی ابھرتی سماعتوں میں ایک اہلکار کی آواز مجھے دنیا کی سب سے شیریں آواز محسوس ہونے لگی، لیکن فوراً ہی مجھے اسی کرخت مزاج اور غصہ ور انسپکٹر کی کھردری آواز سنائی دی۔ وہ اپنے ساتھی اہلکاروں کو ہدایت دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
”خیال رکھنا، ابھی یہ خبر میڈیا پر نہیں جانی چاہیے، اپنے ہی دیش کی بدنامی کے سوا کچھ نہیں، ہم ان مورکھ خونی لوگوں سے خود ہی اور آہنی ہاتھوں سے نمٹیں گے۔“
اس کے بعد مزید تختہ مشق بنانے کا کام کسی اور وقت کے لیے چھوڑ کر مجھے بیدردی سے گھسیٹ کر کسی گاڑی میں لا پھینکا گیا، یہ جانے بغیر کے میں بھی ایک گوشت پوست کا انسان تھا کوئی بوری نہیں...... کیونکہ یوں بوری کی طرح لادنے سے مجھے چوٹیں بھی آئیں اور میری درد بھری کراہیں جاری رہیں۔
اس کے بعد گاڑی چل پڑی تھی۔ مجھے جھٹکے لگ رہے تھے اور جسم جو پہلے ہی اس کسرتی بدن والے انسپکٹر کی مار تلے بُری طرح دُکھ رہا تھا مزید دردناک بننے لگا۔ یہ بھی شاید سزا کی ایک قسم تھی کہ کسی کو میرے اس کرب و اذیت کی پروا نہ تھی۔
تھوڑی دیر بعد گاڑی کسی مقام پر رکی اور مجھے اسی طرح گھسیٹ کر اُتارا گیا جس طرح سوار کرایا گیا تھا۔
میں اب نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ آوازیں اسی طرح سنائی دے رہی تھیں جیسے پرانے زمانے کے کسی ریکارڈ پلیئر میں کوئی کیسٹ رک رک کر چلتی ہے اور عجیب سی آوازیں آتی ہیں۔
ہوش تب آیا جب میرے چہرے پر ٹھنڈے ٹھار پانی کی گویا بالٹی الٹ دی گئی۔ مجھے غوطہ بھی لگ گیا، کیونکہ اس وقت شاید میں گہرے گہرے سانس کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔
میں بُری طرح کھانسنے لگا۔ نظریں دُھندلانے لگیں اور ذہن پر بھی ہنوز نیم غشی سی طاری تھی۔
میں ایک سیلن زدہ اور ننگی اینٹوں والے اُدھڑے پچڑے گندے سے فرش پر پڑا تھا۔ میری دھندلائی ہوئی آنکھوں کے سامنے سلاخ دار دروازہ لہراتا محسوس ہوا۔ اندر دو اہلکار کھڑے تھے، میرے قریب، ایک کے ہاتھ میں بالٹی تھی، جو اس نے مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر اب فرش پر رکھ دی تھی۔
”اوئے...... ! اداکاری کیے بغیر پوری طرح ہوش میں آجا...... ابھی تجھے انسپکٹر ارن پال کے سامنے پیش ہونا ہے۔“ ایک سپاہی نے بڑک مارنے کے انداز میں کہا اور

میں لرز سا گیا۔
انسپکٹر ارن پال کا نام، جیسا کہ مذکور ہوا میں جسونت رائے کے داماد کی حیثیت سے سن چکا تھا۔
''مم...... میں پوری طرح ہوش میں ہوں، لے چلو مجھے ارن پال کے پاس۔'' میں نے کراہتے ہوئے کہا تو پہلے والا طنزیہ لہجے میں بولا۔
''ہم...... سالا......! بول تو ایسے رہا ہے جیسے ارن پال اسے مٹھائیاں کھانے کو دے گا۔ چل او ئے، تارے! دھکیل اسے۔'' آخر میں اس نے اپنے ساتھی سے کہا۔
القصہ...... مجھے اسی خرانٹ اور غصہ ور انسپکٹر ارن پال کے سامنے پیش کر دیا گیا۔
ارن پال سامنے ایک بڑی سی گھومنے والی کرسی پر ٹھسا بیٹھا تھا۔ سامنے ایک میز تھی۔ اس پر سیاہ رول رکھا ہوا تھا۔ پہلے تو وہ مجھے دانت اور ہونٹ بھینچے بڑی قہر آلودہ نظروں سے گھورتا رہا، پھر رول اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔
میرے دائیں بائیں دونوں سپاہی الرٹ کھڑے تھے۔ انسپکٹر ارن پال بدستور اسی طرح زہریلی اور نفرت انگیز نظروں سے مجھے گھورتا چند قدم چلتا میرے بالکل قریب آگیا اور انتہائی نفرت خیز لہجے میں بولا۔
''تم انسانیت کے نام پر ایک دھبا ہو، داغ ہو تم...... تمہیں انسان کہتے ہوئے بھی مجھے شرم آرہی ہے۔''
وہ نجانے کون سی نئی انڈین فلم دیکھ کر آیا تھا اور اسی کے ہی جوشیلے ڈائیلاگ دہرانے کی کوشش کر رہا تھا۔
''تمہیں ذرا بھی رحم نہ آیا ایک معصوم لڑکے کی جان لیتے ہوئے اور پھر اس کے جسم کے اندر سے انسانی اعضا کو اُدھیڑتے ہوئے، یاد رکھو۔'' اس کا جوشیلا بیان جاری تھا۔ آخر میں اس نے رول میری آنکھوں کے سامنے بھی لہرایا تھا۔ بولا۔
''پہلے میں اور بعد میں جسونت رائے تمہیں اُدھیڑیں گے، اسی طرح جس طرح تم معصوم انسانوں کے ساتھ کرتے ہو۔''
''انسپکٹر صاحب! مجھے بولنے کا موقع دیں۔'' میں نے ہولے سے کہا۔ ''میں آپ کو ان سب کے نام بتا دوں گا اور ان کے ٹھکانے بھی۔''
''وہ تو تمہیں بتانا ہی ہوں گے...... ذلیل انسان!'' انسپکٹر ارن پال نے طیش زدہ لہجے میں کہا اور رول کی ایک زوردار ضرب میرے سینے پر رسید کر ڈالی۔ مجھے اپنا سینہ تڑختا ہوا محسوس ہوا۔ میرے منہ سے کراہ نکل گئی، میں جھک گیا۔ اس نے اپنے ایک ہاتھ کی مٹھی سے میرے سر کے بال پکڑ لیے اور میرا جھکا ہوا سر اُونچا کیا۔
میں اپنے حواس سنبھالنے اور وہ الفاظ تلاشنے میں کوشاں تھا کہ کسی طرح اس جھلّائے اور خار کھائے ہوئے ارن پال کو مطمئن کر سکوں جو سرِدست مجھے ممکن نظر نہیں آرہا تھا۔
اس نے اپنا بھنّایا ہوا اور سرخ چہرہ میرے چہرے کے اس قدر قریب کر لیا جیسے مجھے کھا ہی جانا چاہتا ہو۔
''یاد رکھو! تمہیں میں عبرت کا نشانہ بنا دوں گا۔''
اس خبیث نے ابھی تک میرے سر کے بال اپنی مٹھی میں دبوچ رکھے تھے۔
''ارن پال! اگر تم اسی طرح ڈائیلاگ بولنے اور غصہ دکھانے میں وقت ضائع کرتے رہے تو اصل مجرم فرار ہونے میں دیر نہیں لگائیں گے۔'' بالآخر میں نے بھی اتنی مار اور تذلیل سہنے کے بعد اپنا غبار نکال ہی دیا۔ اس پر ارن پال کی آنکھیں مزید چڑھ گئیں، اس کا چہرہ میرے اس طنز پر اور لال بھبھوکا ہو گیا۔ وہ اسی لہجے میں دانت پیس کر بولا۔
''تمہارا خیال ہے میں یہاں فلمی ڈائیلاگ بول رہا ہوں؟ اداکار ہوں، ہدایت کار ہوں میں کسی فلم کا......؟ ہیں......!'' یہ کہتے ہوئے اس نے مٹھی میں جکڑے ہوئے میرے بالوں کو سر سمیت جھٹکے دے کر دائیں بائیں ہلانا شروع کر دیا۔ کم بخت کی جکڑ بہت سخت تھی اور کچھ میرے بالوں کا بھی قصور تھا جن میں ایک تو تیل نہیں چپڑا ہوا تھا دوسرے وہ کچھ گھنے بھی تھے، آسانی سے اس کی مٹھی میں آگئے تھے۔ مارے اذیت کے میری آنکھوں سے پانی جاری ہو گیا۔ تب ہی میری دھندلائی ہوئی آنکھوں نے ماتحت اہلکار کو انسپکٹر ارن پال کے کان پر جھکتے محسوس کیا۔
ارن پال نے میرے بال چھوڑ دیے۔ میں اپنی پانی اُتری آنکھوں کو بھی پونچھنے سے قاصر تھا۔ اسی لیے میں بار بار اپنی آنکھیں کھول میچ رہا تھا تو کسی حد تک دیکھنے کے قابل ہوا۔
میں نے دیکھا ارن پال اپنے ماتحت اہلکار کے مشورے سے مجھے گھورتا ہوا، واپس اپنی کرسی کی جانب پلٹ گیا اور رول میز پر رکھنے کے بعد خود بھی کرسی پر بیٹھ گیا۔
''میں صرف سچ سننا پسند کروں گا...... اب بغیر رُکے بولتے رہو۔''
سب سے پہلے تو میں نے اسے کچھ دن پہلے والے طیارے کی ہائی جیکنگ اور بعد میں راجستھان کے صحرا میں

کریش ہونے کے بارے میں بتایا، یہ میرے بچاؤ کے لیے ایک ''پلس پوائنٹ'' تھا۔ وہاں سے میں نے کہانی اس طرح رنگ آمیزی کے ساتھ بیان کر ڈالی کہ وہ آدھے جھوٹ اور آدھے سچ کی پوٹ میں حقیقت بھی لگے، بلکہ دیکھا جاتا تو ساری حقیقت ہی پر مبنی تھی، بس خیال یہ رکھا تھا میں نے کہ اسے ذرا بھی اس بات کا احساس نہ ہونے پائے کہ میں پاکستانی ہوں، ورنہ بھارتی افسروں کا کیا تھا، فوراً مجھ پر پاکستانی جاسوس کا الزام عائد کر کے فخر سے اپنی عوام پر اپنی قابلیت کا سکہ بٹھانے کی کوشش کرتے جو اُن کے لیے پہلے ہی کارِ محال عمل رہا تھا۔

وہاں سے میں نے مہارانی کی کہانی چھوڑ کر اسے بتا دیا کہ کس طرح میں مارلی کے پیچھی ریڑھے والے سے...... بھلا کا ترکاری خرید کر کھانے لگا تو میرا کہا ہوا ایک لفظ ان کے کسی طے شدہ کوڈ سے مل گیا۔ وغیرہ......

''واہ...... کیا خوب رتنا کماری کی جیون کتھا سنائی ہے تم نے۔''

کم بخت میری حقیقت پر مبنی کہانی کا یہ حشر کرتے ہوئے وہ دانت پیس کر بولا اور ایک بار پھر مارے طیش کے اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں اس کے ارادے دیکھ کر فوراً بول اٹھا۔

''انسپکٹر صاحب...... ارتنا کماری کی جیون کہانی بھی تو حقیقت پر مبنی تھی......''

''ابے چپ......! احمق کی اولاد......! تجھ سے میں نے کہانی پر تبصرہ کرنے کا نہیں کہا ہے۔'' اس نے دہاڑ کر اس بار رول اُٹھا کر میرے سینے کے بجائے میز کی سطح پر بجایا۔

پھر دوبارہ چند قدم چل کر میرے قریب آ کے بولا۔

''لیکن جو نام اور مقام تم نے اپنے ساتھیوں کے بتائے ہیں، وہ غلط نہیں ہو سکتے، اس لیے کہ وہ تمہارے ہی ساتھی ہیں اور ظاہر ہے تم خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے ان کے نام غلط نہیں بتاؤ گے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ یوں فخریہ انداز میں مسکرایا جیسے بڑی ذہانت سے اس نے میرے سچ اور جھوٹ کا تجزیہ کیا ہو۔

''کیا طیارے کے اغوا اور کریش ہونے والا واقعہ بھی جھوٹ تھا؟'' میں نے اپنے اندر کے اُبال پر قابو پاتے ہوئے اس سے کہا۔ وہ پھر غصے سے بھنّانے لگا اور اسی لہجے میں بولا۔

''اس واقعے کی خبر تو پوری دنیا میں پھیل چکی ہے۔ تم چالاکی سے اس واقعے کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کر سکتے ہو۔''

میں بے بسی سے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ یہ اس کے سیل فون کی تھی۔ اپنی جیب سے فون نکال کر اس نے کان سے لگا کر ہیلو کہا اور دوسری جانب سے کسی کی آواز سنتے ہی یک دم مؤدبانہ ہو کر بولا۔

''جی جی...... رائے صاحب! آپ کوئی چنتا نہ کریں، میں نے ان کے ایک اہم ساتھی کو گرفتار کر لیا ہے اور اس نے اپنے ساتھیوں کے نام بھی میرے سامنے اُگل دیے ہیں، بس اب میں کمشنر صاحب کو رپورٹ دینے والا ہوں اور آپ کے سورگ باش بھتیجے کے ان ظالم قاتلوں کو بھی گرفت میں لینے والا ہوں۔''

'رائے صاحب' کے نام پر میں بھی چونکا تھا۔

''کک...... کیا کہا جناب؟ آپ...... یہاں شریف لا رہے ہیں؟ لیکن یہ زحمت آپ کیوں کر رہے ہیں...... ٹھ...... ٹھیک ہے رائے صاحب! جیسے آپ کی مرضی' میری کیا مجال...... میں منتظر ہوں آپ کا۔''

اس کے بعد وہ مجھے گھورنے لگا اور پھر وہاں موجود اپنے دونوں ماتحت اہلکاروں سے تحکمانہ بولا۔

''جسونت رائے صاحب اپنے ذاتی ہیلی کاپٹر پر خود یہاں پہنچ رہے ہیں...... ممکن ہے کمشنر صاحب بھی وارد ہو جائیں، ان کے استقبال کی تیاری پکڑو اور اسے......'' آخر میں اس نے میری جانب گھور کے اپنا جملہ مکمل کیا۔

''سرکاری مہمان خانے میں لے جا کر خوب دُھنائی کرو، تاکہ انہیں پتا چل سکے کہ میں نے کتنی مشکلوں سے اس کی زبان کھلوائی ہے۔''

میں اس نا اہل انسپکٹر کی اس بات پر غصے سے بل کھا کر رہ گیا اور چلا کر بولا۔ ''انسپکٹر! یہ تم غلط کر رہے ہو، میں نے تمہیں...... سب سچ بتا دیا ہے۔ بغیر کسی پولیس تشدد کے...... تم اب یہ ڈراما نہیں کر سکتے میرے ساتھ۔''

''لے جاؤ اسے...... میری بھڑاس اب...... مہمان خانے کا...... بل ڈاگ نکالے گا۔'' وہ حلق کے بل دہاڑا اور دونوں اہلکار مجھے بازوؤں سے پکڑ کے گھسیٹ کر لے گئے۔

بل ڈاگ کے نام پر میں چونکا ضرور تھا، کیا یہ بدبخت نا اہل آفیسر مجھے کسی خوف ناک کتے کے حوالے کرنے والا تھا؟

مہمان خانہ لاک اَپ والے مختصر کوریڈور کے سب سے آخری سرے پر واقع تھا۔ مجھے اندر دھکیل کر وہ دونوں اہلکار واپس پلٹ گئے۔ دروازہ انہوں نے ہی بند کیا تھا۔

میرے دونوں ہاتھ ہنوز پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ میں دھکا لگنے سے اندر جا پڑا تھا اور توازن برقرار نہ رکھ سکا، منہ کے بل گرا۔

سیلن زدہ فرش پر پھیلی جانے کتنے دنوں کی پرانی سخت اور ناگوار بُو نے میرا دماغ شل کر دیا۔ چوٹ بھی آئی، جس سبب میرے منہ سے چیخ خارج ہوگئی۔ بڑا ہی خوف ناک ماحول تھا۔ کہنے کو مہمان خانہ تھا مگر یہ دیکھنے میں مذبح خانہ بلکہ تشدد خانہ نظر آرہا تھا اور واقعی ایسا تھا بھی...... مہمان خانے کا لفظ طنزاً ہی استعمال کیا گیا تھا۔

مستطیل سا کمرا تھا جس کی دیواروں پر پلستر بھی اُکھڑا ہوا تھا۔ جا بجا سیاہی مائل داغ دھبے بھی نظر آرہے تھے، جو غالباً یہاں قیدیوں پر تشدد کرنے والوں کے خون کے ہی ہوسکتے تھے جو پرانے ہو کے سیاہ پڑ چکے تھے۔

ننگا فرش تھا، کوئی روشندان نہ تھا، نہ پنکھا۔ سپاٹ دیواریں تھیں اور چھت تھی۔

آخری سرے پر ایک سنگل پٹ کا دروازہ تھا، جو بند تھا۔ وہ کھلا اور کسی کے اندر داخل ہونے سے پہلے غراہٹیں سنائی دیں تو میرا دل مارے خوف کے اُچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ میں سمجھا شاید واقعی یہاں سے کوئی بڑی نسل کا خوف ناک بل ڈاگ ہی برآمد ہوگا۔

میں فرش پر اُوندھے منہ پڑا تھا مگر سر اُٹھا کر اسی طرف تکے جاتا۔ کیا دیکھتا ہوں وہاں سے ایک کیم شحیم اور چوڑے ہاتھوں پیروں اور بڑے سے منہ والا ایک آدمی برآمد ہوا۔ رنگ اس کا کالا سیاہ تھا، اُوپری بدن برہنہ اور نیچے چست پتلون پہنی ہوئی تھی، جس پر موٹا سا بیلٹ لگا ہوا تھا۔

وہ میرے قریب آکر غراتا ہوا کھڑا ہوگیا، مجھے اب اس کی پھیلی ہوئی ٹانگیں ہی نظر آرہی تھیں۔ تب ہی اس نے...... اپنے ایک ہاتھ سے پتلون کی بیلٹ کھینچی اور اسے آخری سرے سے پکڑا، لوہے کا بکل مارنے کے رخ پر رکھا تھا۔

”شٹ اپ...... شٹ اپ......“ اس نے مجھے پیٹنا شروع کر دیا۔ میرے حلق سے لرزہ خیز چیخیں خارج ہونے لگیں۔ وہ بڑا سخت جان تھا اور اس کا ہاتھ ہی نہیں تھکتا تھا، کسی مشین کی طرح چلتا ہی رہا، یہاں تک کہ میں ہانپتا ہوا درد کی اذیتیں سہتا بے ہوش ہوگیا۔

ایک زوردار چھپاکے سے میری آنکھ دوبارہ کھلی، میں پانی سے شرابور تھا۔ بالٹی اس نے پھینکی اور پھر شروع ہوگیا۔

جب میرے مضروب جسم پر اس نے خوب خراشیں ڈال دیں تو اس پر وہ کوئی مصالحہ چھڑکنے لگا، میری چیخیں اب آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ کپڑے بیلٹ کی ضربات سے تار تار ہو چکے تھے، زخموں سے خون رسنے لگا تھا۔ انہی زخموں پر میرے، یہ بل ڈاگ نمک پاشی بھی کیے جا رہا تھا، میں نڈھال ہو کے بے ہوش ہونے لگتا تو دوبارہ وہ مجھ پر پانی پھینک کر ہوش میں لے آتا۔

اس بہیمانہ تشدد تلے تو میری سانسیں بھی رکتی محسوس ہو رہی تھیں۔ جب دیکھا کہ میں آخری سانسوں پر ہونے والا ہوں، اس نے ہاتھ روک دیا اور میرے سر پر پانی ڈالنے لگا۔

مجھ سے تو اب ہانپا بھی نہیں جا رہا تھا۔ نیم غنودہ رہا اور اسی حالت میں پھر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگیا۔

☆☆☆

اس بار میری آنکھ انسپکٹر ارن پال کے کمرے میں کھلی تھی...... مجھے دو اہلکاروں نے بازوؤں کی مدد سے جکڑ رکھا تھا اور میں نیم غشی کی حالت میں اپنا سر اِدھر اُدھر مار رہا تھا۔ کھڑے ہونے کی بھی مجھ میں سکت نہ تھی، لیکن مجھے زبردستی بھینچ کر کھڑا کر رکھا تھا۔

سامنے کچھ دھندلے دھندلے ہیولے کھڑے نظر آرہے تھے مگر میں ان چہروں کے نقوش دیکھنے سے قاصر ہی رہا۔

”اس کی حالت تو بہتر کرو ارن پال! یہ تو بولنے کے قابل بھی نہیں ہو رہا۔“ میری ڈوبتی اُبھرتی سماعتوں سے ایک بھاری سی آواز ٹکرائی۔

”یہ ایکٹنگ کر رہا ہے سر! بہت چالاک مجرم ہے، یہ تو میں نے اسے بولنے پر مجبور کیا ورنہ تو...... اس نے میرے دماغ کی چولیں ہلا دی تھیں۔“ مجھے انسپکٹر ارن پال کی شوخی زدہ آواز سنائی دی۔ اس کے سفید جھوٹ پر میرے اندر ایک اُبال سا اُٹھا۔ میں نے تو اسے صاف صاف بتا دیا تھا بغیر کسی تشدد کے...... مگر اپنے کسی افسر کے سامنے نمبر بڑھانے کے لیے اس بے حس اور ظالم نے مجھ پر بلاوجہ کا بے رحمانہ تشدد کیا تا کہ اپنے افسروں کو دکھا سکے کہ اسے کتنی محنت کرنا پڑی۔

اس جوشِ غیظ نے میرے اندر ایک عجیب سی طاقت اور قوتِ ارادی بھری۔ میں نے فوراً سنبھالا لیا اور...... اپنے سر کو دو تین جھٹکے دیے تو پوری طرح دیکھنے کے کچھ قابل ہوا۔

سامنے ایک دو رعب داب والے افراد کھڑے تھے۔ ان میں ایک درمیانی عمر کا وردی پوش شخص تھا، جس کی نفیس قسم کی وردی بتاتی تھی کہ وہ کوئی اعلیٰ افسر تھا، جبکہ دوسرا ایک بیش قیمت شلوار کرتے میں ملبوس ادھیڑ عمر کا آدمی، جس کی پوشاک اسے کوئی معزز اور گمبھیر سی شخصیت ظاہر کر رہی تھی۔ باقی کچھ دوسرے لوگ مؤدبانہ کھڑے تھے۔ ان دونوں کے بارے میں مجھے اندازہ ہونے لگا کہ ان میں ایک جسونت رائے اور دوسرا پولیس کمشنر تھا جس کے بارے میں ارن پال ذکر کر چکا تھا کہ وہ یہاں پہنچنے والے تھے۔

''یہ...... یہ...... سفید جھوٹ بول رہا ہے، سر......!'' بالآخر میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔ میرا اشارہ انسپکٹر ارن پال کی طرف ہی تھا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا اور وہ دانت پیس کر جارحانہ انداز میں میری جانب بڑھا تھا کہ اچانک جو شلوار کرتے میں رعب داب والا آدمی کھڑا تھا، اس نے ارن پال کو بُری طرح ٹوکتے ہوئے کہا۔

''آفیسر! اسے بولنے دو...... ہم یہاں تمہاری مارا ماری دیکھنے نہیں آئے ہیں، خود ملزم کے منہ سے حقیقت سننے کے لیے آئے ہیں۔''

ارن پال جھینپ کر رہ گیا۔

''شکریہ سر! آپ لوگوں کا...... میں تو خود چاہتا تھا کہ کسی ذمے دار آفیسر سے سامنا ہو تو انہیں حقیقت بتاؤں۔'' میں نے ان دونوں بارعب ہستیوں سے مخاطب ہو کے کہا۔

''دیکھو۔'' وردی والے نے گمبھیر لہجے میں مجھ سے کہا۔ ''تم رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہو۔ تمہارے پاس جھوٹ بولنے کے لیے کچھ بھی نہیں رہا ہے۔ اب جو بولنا ہے، بتاتے چلو۔''

میں نے ان کے سامنے بھی وہی حقیقت بیان کر دی، جو ارن پال کے سامنے بیان کر چکا تھا۔

''میں... یہ سب باتیں خود ہی انسپکٹر ارن پال کو بتا چکا ہوں اور میں نے بغیر کسی تشدد کے انہیں بتا... دی تھیں، لیکن جب انہوں نے آپ دونوں کے ہیلی کاپٹر کے ذریعے یہاں پہنچنے کی خبر سنی تو آپ دونوں پر اپنی اہلیت جتانے کی خاطر اس نے مجھ پر بلاوجہ تشدد کروایا۔''

آخر میں، میں نے یہ بھی بتا دیا۔ ساتھ ہی گھور کر قریب کھڑے اس نسلِ خنزیر انسپکٹر ارن پال کی جانب بھی دیکھا تھا۔ جس کے منحوس چہرے پر اب غضب ناک تاثرات کے علاوہ پریشانی کے بھی آثار نمودار ہو چلے تھے۔ اس نے کچھ بولنے کی کوشش چاہی تھی لیکن کمشنر نے اسے ہاتھ کے اشارے سے بولنے سے روک دیا۔

''تم ہو کون......؟ کیا نام ہے تمہارا......؟'' اس بار جسونت رائے نے مجھ سے براہ راست سوال کیا۔

''میرا نام سیف الدین ہے اور میں پیشے کے لحاظ سے ایک ڈاکٹر ہوں، امارت کے ایک اسپتال میں جاب کرتا تھا، ایک میڈیکل سیمینار کے سلسلے میں امارات سے...... اٹلی جا رہا تھا کہ ہمارا طیارہ پہلے ہائی جیک ہوا اس کے بعد کریش ہو گیا۔

''مجھے ڈر تھا کہ یہاں مجھے گرفتار نہ کر لیا جائے اسی لیے میں ممبئی پہنچ کر اپنے قونصل خانے رابطہ کرنا چاہتا تھا کہ راستے میں مجرموں کے ملاپ اور ان کی باتوں سے مجھے اس دردبھری حقیقت کا علم ہوا تو اتفاقاً ہی میں ان کے ساتھ رل مل گیا تاکہ رتلام ہاسپٹل پہنچ کر ان کے اس گھناؤنے کاروبار کے بارے میں پولیس کو خبر کر سکوں مگر میری بدقسمتی کہ میں...... ایسے وقت میں پھنس گیا کہ پولیس مجرموں پر ریڈ کر چکی تھی اور میں بھی یوں دھر لیا گیا۔ بظاہر یہی لگتا ہے کہ میں انہی کا ساتھی ہوں مگر یہ حقیقت نہیں ہے۔''

بالآخر میں نے ایک بار پھر صراحت سے اپنا بیان دے دیا۔

کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ ارن پال کو دوبارہ بیچ میں بولنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی البتہ وہ میرے بیان پر بار بار پولیس کمشنر کی طرف کن انکھیوں سے دیکھ لیتا تھا، یوں، جیسے وہ اسے کچھ اشارہ دینا چاہتا ہو، جسونت رائے میری جانب ہی بہ غور تکے جا رہا تھا۔ پولیس کمشنر جس کا نام کمشنر راجیشور گڈوانی تھا، وہ میرے بجائے قریب کھڑے جسونت رائے کی جانب ہی گاہے بہ گاہے دیکھ لیتا۔ تب ہی کمشنر نے ہولے سے کھنکارا اور جسونت رائے سے خیال طلب لہجے میں مخاطب ہو کر بولا۔

''میرا خیال ہے، اس سلسلے میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ یہ بہت خطرناک مجرم ہے، ہمیں جُل دینے کی کوشش کر رہا ہے، خیر، سارے مجرم یہی کرتے ہیں۔'' کہتے ہوئے اس نے انسپکٹر ارن پال سے تحکمانہ انداز میں مخاطب ہو کر کہا۔

''ارن پال!''

''یس سر!'' اس نے یک دم سیلوٹ جھاڑا۔

''تم اس سے مزید تفتیش جاری رکھو...... اور......''

''ایک منٹ ٹھہرو...... کمشنر......!'' دفعتاً ہی خاموش اور کسی سوچ میں مستغرق جسونت رائے نے گمبھیر لہجے میں کہا

اور کمشنر سمیت ارن پال اس کی جانب تکنے لگے۔

مجھے کمشنر راجیشور گڈوانی...... کی بات بدبختی پر مبنی لگی۔ مجھے اس پر بے حد غصہ آنے لگا۔ میں نے بھی جسونت رائے کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ وہ اتنا کہنے کے بعد اپنی جیب سے سگار نکال کر سلگانے لگا۔ اس کے دائیں بائیں دو لمبے تڑنگے گارڈ ہنوز مستعد کھڑے تھے۔

وہ میری جانب گہری نظروں سے تکتے ہوئے سگار کا ایک گہرا کش لینے کے بعد بولا۔

''میں اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہوں گا۔''

اس کی بات پر پولیس کمشنر گڈوانی ہی نہیں انسپکٹر ارن پال بھی پریشان سا نظر آنے لگا۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہ...... جسونت رائے کے دباؤ میں آئے ہوئے تھے۔

جسونت رائے کاروباری دنیا کا ایک بڑا نام ہی نہیں بلکہ درونِ خانہ ایک مافیائی ڈان کے طور پر بھی شہرت رکھتا تھا۔ سیاسی حلقوں کے علاوہ اسے حکومتی سطح پر بھی اپروچ حاصل تھی۔ گویا خاصے اثر ورسوخ کا حامل تھا۔

کمشنر اور ارن پال کچھ کہنا چاہتے تھے کہ اس دوران جسونت رائے نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ ''میڈیا پر ابھی یہ بات نہیں جانی چاہیے، ورنہ انسانی اعضا کا یہ کالا دھندا کرنے والے بھی محتاط ہو جائیں گے۔ اس حساس معاملے میں مجھے مکمل رازداری چاہیے۔ اگر ایک بات بھی میڈیا تو کیا حکامِ بالا تک بھی پہنچی تو تم دونوں خود کو نوکریوں سے ہی نہیں بلکہ اپنی زندگیوں سے بھی فارغ سمجھنا۔''

ارن پال کو تو اس کے سامنے بولنے کی جرأت نہ ہو سکی البتہ کمشنر ہمت کرنے کے سے انداز میں بولا۔

''جج...... جناب، رائے صاحب! آپ کو بھلا زحمت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ آپ جیسے سیدھے سادے کاروباری آدمی کو چکما دینے کی کوشش کرے گا۔'' اس کا اشارہ میری طرف ہی تھا۔ اس پر جسونت رائے نے بڑی خشمگیں نظروں سے کمشنر کی طرف دیکھا اور اسی لہجے میں بولا۔

''گڈوانی! تمہارے محکمے میں اُلٹی گنگا بہتی ہے۔ چکما یہ لوگ نہیں تم لوگ دیتے ہو عوام کو...... مت بھولو کہ میرے لاڈلے بھتیجے...... وجے کو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور اعضا فروشی کا یہ کالا دھندا تمہاری ناک کے نیچے نجانے کب سے ہو رہا ہے۔ وجے، کسی معمولی آدمی کا نہیں، جسونت رائے کا بھتیجا تھا۔'' کمشنر سے تلخ اور ناگوار لہجے میں یہ کہنے کے بعد اس نے اپنے داماد کی طرف گھور کر دیکھا۔

''ارن پال! ہمیں تم پر نہیں بلکہ خود پر ساری زندگی افسوس رہے گا تمہیں ایک معمولی سے پولیسے کی پوسٹ سے بغیر کسی قابلیت اور کارنامے کے انسپکٹری کے بڑے عہدے پر پہنچا کر ہم سے سنگین اور بھیانک غلطی ہوگئی ہے۔''

''جج...... جناب!'' ارن پال نے گھبرا کر اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش چاہی تھی کہ جسونت رائے نے اسے بُری طرح جھڑک دیا۔

''شٹ اَپ۔''

ارن پال ایک دم گنگ ہوگیا۔

''اس کے ہاتھوں کی فوراً ہتھکڑیاں کھولو اور میرے حوالے کرنے کی تیاری کرو۔''

یہ حکم دینے کے بعد جسونت رائے نے اپنے ساتھ کھڑے اپنے دونوں باڈی گارڈز کو مخصوص اشارہ کیا اور تیز تیز قدموں سے باہر نکلتا چلا گیا۔

کمشنر اور ارن پال بے بسی سے تلملاتے رہ گئے۔

تھوڑی دیر بعد میں آزاد تھا اور ہیلی کاپٹر میں سوار جسونت رائے سمیت آزاد فضاؤں میں پرواز کر رہا تھا۔ پائلٹ سمیت ہم کل پانچ افراد ہیلی کاپٹر میں موجود تھے۔ جسونت رائے پائلٹ کے برابر والی سیٹ پر براجمان تھا اور ابھی تک اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔

میں سمجھ سکتا تھا کہ پولیس کے مقابلے میں جسونت رائے میرا معاملہ سمجھنے کی اہلیت رکھتا تھا۔ پولیس ہمیشہ ہی صحیح بات کو غلط رنگ دینے کی کوشش کرتی ہے اور اس کے وتیرے سے کون واقف نہیں تھا۔

جسونت رائے کی کسٹڈی میں آکر مجھے کچھ طمانیت کا احساس ہو رہا تھا۔ کسی سیانے نے کہا ہے لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔ جسونت رائے پولیس کی ہیرا پھیری سے واقف تھا، وہ ان خونی سوداگروں سے بھی نمٹنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ میں نے اس کے لہجے اور اس کی آنکھوں میں بھڑکتی ہوئی آتشِ انتقام بھانپ لی تھی۔

اس نے ہیلی کاپٹر میں مجھ سے کوئی بھی بات نہ کی تھی۔ اب اس کا مطلب یہ بھی نہ تھا کہ مجھے ایک نئی گلے پڑی مصیبت سے نجات مل چکی تھی۔ جسونت رائے انڈین پولیس سے زیادہ میرے لیے مصیبت بن سکتا تھا۔ وہ ایک ڈان تھا۔ اب پتا نہیں وہ خود میرے بیانات کی روشنی میں اپنے ذاتی اثر ورسوخ کو بروئے کار لاتا یا پھر کوئی اور معاملہ

تھا، مجھے بہرحال اسے مطمئن کرنا تھا۔ بہ صورت دیگر میں اس کے ہاتھوں یوں مارا جاتا جیسے تاریک راہوں میں لوگ مار دیے یا مرواد یے جاتے ہیں۔

ہیلی کاپٹر لامحدود فضاؤں میں محوِ پرواز تھا۔ تھوڑی دیر تک نیچے جنگل پہاڑ دکھائی دیتے رہے تھے۔ پھر سمندر نظر آنے لگا اور ان کے درمیان کہیں کہیں۔ آبادی اور اس کے ساتھ ہی گنجان شہری آبادی۔

ہیلی کاپٹر عموماً نیچی پرواز ہی کرتے ہیں۔ اس دوران جسونت اپنے ایک ٹرانسمیٹر ڈیوائس پر کسی سے گفتگو کرتا رہا، جسے میں صحیح طرح نہیں سن سکا۔ یوں بھی اس کا دورانیہ چند ایک منٹوں تک ہی رہا تھا۔

اب مجھے نیچے بھرے پُرے شہری آبادی کے آثار نظر آرہے تھے۔ ہیلی کاپٹر بتدریج اب مزید نیچی پرواز کرنے لگا۔ سڑکوں کا جال سا پھیلا دکھائی دیا اور اس کے بعد پھر جنگل اور مضافاتی اراضی کا نقشہ سا دکھائی دینے لگا۔ اس کے بعد ہیلی کاپٹر مزید نیچی پرواز میں آنے لگا اور اس کے بعد ہی وہ..... سرسبز پہاڑیوں کی ایک وسیع وعریض وادی میں غوطہ لگانے لگا تو مجھے ایک نسبتاً ..... اونچے ہرے بھرے مقام پر..... محل نما عمارت سی دکھائی دینے لگی جس کے گرد خاردار باڑھ والا احاطہ اور گھاس کا وسیع میدان پھیلا ہوا تھا۔

عمارت کے عقبی علاقے میں ایک بڑا سا ہیلی پیڈ بھی نظر آنے لگا۔ ہیلی کاپٹر نے سیدھا وہیں جا کر لینڈ کیا تھا۔

جب تک ہم نیچے اُترے، ایک لمبی سی کار تیزی سے عمارت کے عقبی گوشے سے نکل کر ہماری جانب لپکی تھی۔ قریب آکر وہ رک گئی اور .... دو سوٹ پوش افراد نہایت مستعدی سے کار کے اندر سے برآمد ہوئے۔ ان میں ایک پُرکشش عورت بھی تھی جس کی آنکھیں کشادہ اور حسین تھیں۔ اس کے ہمراہ بھی جو مرد تھا، وہ جوان، خوبرو اور کسرتی جسم کا مالک تھا۔ ان کے انداز و اطوار سے مستعدی اور ذمے دارانہ پختگی عیاں تھی۔

عورت کے ایک کان میں کوئی کلپ ڈیوائس لگی ہوئی تھی اور جو شاید وائرلیس مائیک تھا، وہ اس میں کسی سے جلدی جلدی باتیں کرتی جاتی تھی۔

جب ہم نیچے اُترے تو وہ ہماری جانب متوجہ ہوئی۔ دونوں نے ہی سب سے پہلے نہایت مؤدبانہ انداز میں...... جسونت رائے کو جھک کر سلام پیش کیا تھا۔

''کانفرنس روم۔'' جسونت رائے نے بہت گمبھیرتا سنجیدگی سے کہا۔

''سر! اٹس ریڈی، پلیز۔'' عورت نے اسی طرح ہولے سے خم کھاتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی لمبی سی کار کی جانب اشارہ کر دیا۔

ذرا ہی دیر بعد ہم کار میں سوار ہو چکے تھے۔ اس بار صرف میں اور جسونت رائے تھے اور ساتھ ہی وہ مرد اور عورت تھی۔ باقی افراد وہیں رہ گئے۔

کار مرد ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کے برابر میں جسونت رائے براجمان تھا۔ اس کا چہرہ اب بھی اتھاہ سوچوں میں گم رہا۔ میں اس عورت کے ساتھ عقبی نشست پر بیٹھا تھا۔ عورت نے ایک ذرا بھی توجہ یا نگاہ بھر کے میری جانب دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

عمارت قریب آ گئی اور جیسے ہی بڑے سے سیاہ آہنی گیٹ کے قریب پہنچی تو وہ خودکار انداز میں دائیں بائیں سلائڈ ہوتا چلا گیا۔ گیٹ کے اندر باہر باوردی اور مسلح گارڈ مستعد کھڑے تھے۔

کار اندر ماربل سے بنے ایک احاطے میں داخل ہوئی اور ایک جانب رک گئی۔

عورت نے پھرتی سے نیچے اُترنے کی کوشش چاہی تھی تاکہ جسونت رائے کی طرف والا دروازہ کھول سکے، لیکن وہ خود ہی اسے کھول کر نیچے اُتر آیا۔

اسی اثنا میں دو مزید چست لباس میں ملبوس افراد آگے بڑھے تھے، ہم چاروں انہی کی معیت میں اندر داخل ہوئے اور جب مرکزی دروازے سے ہوتے ہوئے ایک ہال سے لاؤنج میں پہنچے تو جسونت رائے نے انہی آخرالذکر دونوں افراد سے میرے... بارے میں کچھ کہا۔ ان دونوں نے مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

وہ اب میرے دائیں بائیں مستعدی سے دائیں جانب والے ایک کوریڈور کی طرف بڑھ گئے۔ وہاں بے شمار کمروں کے دروازے نظر آتے تھے۔ ایک کمرا چھوڑ کر دوسرے کمرے کے دروازے کے قریب پہنچ کر مجھے رکنے کا حکم ملا۔ پھر ایک نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ دوسرا مجھے لیے اندر چلا۔

کمرا کشادہ اور ضرورت کی اشیا سے آراستہ و پیراستہ نظر آتا تھا۔ ایک جانب کونے میں نفیس قسم کی ڈائننگ ٹیبل تھی۔

پہلے والے آدمی نے مجھ سے مشینی انداز میں سامنے باتھ روم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہاں جا کر غسل کرو۔۔۔اندر ہی کپڑوں کی الماری ہے۔ جو تمہارے ناپ کے ہوں پہن کر باہر آجاؤ، ہم ادھر ہی تمہارے منتظر ہیں اور دیر مت لگانا۔"

میں باتھ روم میں گھس گیا۔ شاندار باتھ روم تھا بلکہ ایسا تو بیڈروم ہونا چاہیے تھا۔ میں نے پرانے گندے بوسیدہ کپڑے اُتار کر پھینک دیے۔ نہانے کے بعد میں نے وہیں الماری میں اپنے ناپ کے کپڑوں کا انتخاب کیا اور ایک لائٹ گرے رنگ کی پینٹ شرٹ پہن لی۔ شفاف اور بڑے سے آئینے میں اپنا تنقیدی نظروں سے جائزہ لیا اور خود کو ذرا نکھرا اور ہشاش بشاش پا کر...... سکون محسوس کیا۔ اس کے بعد شاہانہ طرز کے باتھ روم سے باہر نکلا تو سیدھی میری نگاہ ڈائننگ ٹیبل پر پڑی۔ وہاں اب انواع اقسام کے کھانے چنے ہوئے تھے۔

وہ دونوں آدمی صوفوں پر دھنسے بیٹھے میرے ہی منتظر تھے۔ ایک نے ٹیبل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "وہاں بیٹھ کر پیٹ پوجا کرو، تمہارے پاس اب صرف بیس منٹ ہیں۔"

مجھے یہ سب عجیب اور ایک خواب سا لگا...... کہاں تو میں صحراؤں اور جنگلوں کی خاک چھانتا پھر رہا تھا، پھر پولیس کے نرغے میں آگیا۔ پھر ماریں کھائیں اور اب یک دم کایا کلپ ہوئی اور ایسی ہوئی کہ...... یقین ہی نہیں آتا، ہاں البتہ معاملہ اب بھی نازک اور حساس ہی تھا، ممکن تھا کہ میں پولیس سے زیادہ خطرناک آدمی کے نرغے میں آچکا ہوں، یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں پہلے سے زیادہ بُرے حالات کے شکنجے میں جکڑا جانے لگا ہوں۔ کیا ہو سکتا ہے کیا نہیں، سچی بات یہی تھی کہ میں ابھی اسی تگ وتاز میں ہی تھا۔

بہرکیف...... میں نجانے کب سے بھوکا پیاسا تھا۔ پُرتکلف کھانے سے پورا پورا انصاف کیا اور پھر یہ دونوں افراد مجھے ایک اور کمرے کے دروازے سے اندر لے گئے۔ یہ ایک نسبتاً بڑا اور کشادہ ہال کمرا تھا۔ وہ دونوں مجھے یہاں چھوڑ کر واپس پلٹ گئے تھے۔

یہاں مجھے ایک ہنگامی میٹنگ کا ماحول محسوس ہونے لگا تھا۔ شاید یہی کانفرنس روم تھا۔ جسونت رائے بھی موجود تھا اور اول الذکر وہ دونوں اسمارٹ اور ہینڈسم مرد وعورت بھی، جنہوں نے ہمیں ہیلی کاپٹر سے ریسیو کیا تھا۔

یہاں اب ہم چاروں کے سوائے کوئی اور نہ تھا۔ ہال میں دو میزیں تھیں۔ ایک بڑی اور دوسری چھوٹی۔ ہم چھوٹی میز پر جا بیٹھے تھے۔

مجھے ایک طرف تنہا کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا گیا تھا۔ مرد اور عورت میرے سامنے کی دو کرسیوں پر براجمان تھے۔ جسونت رائے سربراہی کرسی پر تھا اور بیک وقت ہم سے مخاطب ہو سکتا تھا۔ میز پر ان کے سامنے لیپ ٹاپ، فون، مانیٹر اور وائرلیس ٹائپ کی الیکٹرانک اشیا رکھی تھیں۔

میں خاموشی سے بیٹھا رہا۔ میرا خیال تھا کہ میرے کرسی پر براجمان ہوتے ہی مجھ سے کوئی نہ کوئی مخاطب ضرور ہوگا لیکن...... مجھے ایک پُراسراری حیرت محسوس ہوئی۔

وہ دونوں عورت اور مرد، جو تھوڑی دیر پہلے میری طرف ایک ذرا دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کیے ہوئے تھے، اب جیسے ٹکٹکی باندھے میری جانب تکے جا رہے تھے، انہیں یوں اپنی جانب ایک ٹک گھورتا پا کر میں کچھ نروس اور بوکھلا سا رہا تھا...... ایک لمحے کو تو مجھے یوں لگا جیسے یہ دونوں بدبخت مجھے ہپناٹائز کر رہے ہوں۔

تب ہی میں نے جسونت رائے کے چہرے کی طرف دیکھا تو چونکا، وہ بھی کچھ ایسی ہی عجیب نظروں سے میرے بجائے اپنے انہی دونوں ساتھیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"نوسر......!" اچانک عورت نے میرے چہرے سے نگاہیں ہٹا کر جسونت رائے کی طرف دیکھ کر نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ میں چونکا۔

"تم......؟" جسونت رائے نے عورت کو چھوڑ کر اس کے ساتھ بیٹھے مرد سے استفسار یہ کہا۔

"نوسر......!" مرد نے بھی اپنی ساتھی عورت کی طرح نفی سر ہلا کر کہا۔

"گڈ......! میرا ابھی یہی خیال تھا۔" جسونت رائے نے ایک دم کہا۔ اس کا چہرہ پُرجوش سا نظر آرہا تھا۔

مجھے یہ چیستیاں سمجھ سے باہر ہی نہیں بلکہ عجیب بھی لگی۔ نجانے یہ باری باری ان کے "نوسر...... نوسر......" کہنے والی کیا "نوسربازی" تھی؟ جس پر جسونت رائے نے بھی سر ہلا کر تبصرہ کیا تھا کہ "میرا ابھی یہی خیال تھا۔" تاہم مجھے ایسا ضرور محسوس ہوا تھا جیسے میرے باتھ روم جانے اور غسل کر کے نکلنے سے کھانا وغیرہ کھانے کے بعد یہاں کانفرنس روم میں پہنچنے تک ان تینوں افراد کے درمیان میرے ہی متعلق کوئی گمبھیر سی گفتگو ہوتی رہی ہو۔ لیکن تب بھی مجھے ان کی یہ مبہم بات سمجھ نہ آسکی۔

"میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا......" بالآخر میں اپنی جھلاہٹ پر قابو پاتے ہوئے ان کی طرف دیکھ کر بولا۔

"سمجھنے کی ضرورت ہمیں ہے، تمہیں نہیں مسٹر سیف!" جسونت رائے نے سرد و سپاٹ لہجے میں مجھ سے کہا۔

"شاید میرے بارے میں آپ تینوں نے اپنے ہی طور پر سیلف آبزرویشن کی مدد سے خود ہی کوئی رائے قائم کر لی ہے؟" میں نے کہا۔ ماحول اور حالات سے میری سمجھ میں جو آسکا، وہ میں نے کہہ ڈالا۔

"یہ تو ذہین بھی ہے سر!" عورت نے پھر میرے بارے میں مختصراً کہا۔ تخاطب جسونت رائے ہی تھا۔

"میں نے تم پر وشواش کیا ہے سیف! اس لیے کہ تم میری مدد کر سکو۔" جسونت رائے بالآخر اتنا سسپنس پھیلانے کے بعد مجھ سے اصل بات کی طرف آیا۔

"میں تیار ہوں، یہی تو میں بھی چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"لیکن تم یہ کیوں چاہو گے؟" مرد نے اچانک مجھ سے سوال داغا۔

"اس لیے کہ میں امارات سے یہ مشن لے کر ہی چلا تھا کہ ان خونی سوداگروں کو کیفرِ کردار تک پہنچاؤں گا، جنھوں نے میرے معصوم بھائی عادل کے ساتھ یہ گھناؤنا کھیل کھیلا تھا۔ ان خونی سوداگروں کی ایک اہم قیادت بھارت سے تعلق رکھتی ہے، ایک ذیلی قیادت پاکستان میں بھی خفیہ طور پر سرگرم عمل تھی۔" کہتے ہوئے میں نے انہیں وہاں کی بھی تفصیل بتا ڈالی، ساتھ ہی امرناگ کے عبرت ناک انجام...... گوہر شاہ کا اپنے مقرب خاص کارپرداز تاج کے ساتھ یہاں فرار ہو کے آجانا اور...... شنکر چانکیہ اور ڈاکٹر رمیش اگروال کا... چرنوں میں پڑنا، سب صراحت کے ساتھ بتا ڈالا تا کہ انہیں میری طرف سے کسی اور قسم کا شبہ نہ ہو سکے۔

عقدہ کھلا کہ...... یہ لوگ میرے بارے میں پہلے ہی سیر حاصل معلومات لے چکے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ پرانے واقعات، نیٹ اور اخبارات میں موجود...... ان رپورٹس کی اسٹڈی بھی ان کے علم میں آچکی تھی۔

میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ...... حقیقت بتا دینے میں ہی...... عافیت تھی۔ البتہ تب بھی میں نے انہیں طارق اور رومی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا، یوں میں آخر میں ایک گہری سانس خارج کر کے بولا۔

"اگر پولیس عین وقت پر کام خراب نہ کرتی تو میں ان کے ساتھ انہی کے ساتھی کے بھیس میں رتلام میموریل اسپتال بھی پہنچ جاتا اور وہیں ان سب کی قبر کھودتا۔"

وہ تینوں میری باتیں بغور سنتے رہے۔ جسونت رائے میری طرف دیکھ کر بولا۔ "ہمیں تم پر پورا وشواس ہو چکا ہے۔ اسی لیے میں تمہیں اپنی صوابدید پر پولیس کے چنگل سے چھڑا لایا ہوں۔"

"میں اس بھروسے اور اعتبار کے لیے آپ کا مشکور رہوں گا، اب ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ مالی کے اس سبزی ترکاری بیچنے والے...... نارائن اور مال گاڑی کے اس گارڈ شنکری داس کو اگر قابو میں کر لیا جائے تو آپ کے بھتیجے وجے کے ان اصل خونی قاتلوں تک پہنچا جا سکتا ہے۔"

"میں انہیں عبرت کی تصویر بنانے کے لیے تم سے ہر طرح کا تعاون کرنے کے لیے تیار ہوں۔" جسونت رائے بولا اور آخر میں ایک اہم انکشاف بھی کرتے ہوئے بولا۔

"شنکر چانکیہ کا ذکر کر کے تم نے اپنے بھروسے کی ہی نہیں بلکہ اپنی باتوں کی سچائی کی بھی تصدیق کر ڈالی ہے۔ شنکر چانکیہ میرا پرانا حریف ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ اسی نے میرے بھتیجے وجے کے ساتھ یہ کھلواڑ کیا ہوگا۔"

"ہو سکتا ہے۔" میں نے بھی اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے کہا۔ "میرے معصوم بھائی عادل کو بھی ڈاکٹر رمیش اگروال نے مجھ سے ایک دیرینہ بغض اور عناد کی وجہ سے نشانہ بنایا تھا۔"

میرا کام آسان ہونے لگا تھا۔ ساتھ ہی یہاں کی پولیس کے فالتو بکھیڑوں سے بھی مجھے اپنی جان چھوٹتی محسوس ہو رہی تھی۔

"مس ریٹا اور تم...... ڈوجا...... ! سیف کے ساتھ رہو گے۔" جسونت رائے نے آخر میں اپنے انہی دونوں قریبی ساتھیوں سے مخاطب ہو کے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"صرف چوبیس گھنٹے کی مہلت دیتا ہوں، مالی کے اس ریڑھے والے نارائن اور مال گاڑی کے گارڈ شنکری داس...... کو دبوچ کر یہاں حاضر کرو۔"

اگلے ایک گھنٹے میں ہم تینوں خاصی سنسنی خیز تیاریوں کے ساتھ ایک تیز رفتار بند وین میں مانڈلے ریلوے اسٹیشن پہنچے، کیونکہ ہماری معلومات کے مطابق مال گاڑی اسی طرف روانہ ہو چکی تھی۔

وہاں پہنچے تو مال گاڑی موجود تھی۔ مگر آخری والی بوگی میں گارڈ شنکری موجود نہ تھا اس کی جگہ کوئی اور تھا۔ ریٹا اور ڈوجا، کامیابی کے جوش کی ترنگ میں اس پر ہاتھ ڈالنے ہی والے تھے کہ میرے اس انکشاف پر تھم گئے۔

ہم نے اسی گارڈ سے شنکری کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ یہاں اس کی ڈیوٹی بدل گئی ہے اور وہ اس وقت اپنے کوارٹر میں ہوگا۔

اس کے کوارٹر کا پتا پوچھ کر ہم تینوں وہاں پہنچے اور اُسے چھاپ لیا۔

ریتا، اس کارکردگی کی تمام رپورٹ .... جسونت رائے کو ٹیلی فونک رابطوں کے ذریعے دیتی جا رہی تھی۔

شنکری داس کو قابو کرنے کے بعد ہم مالی کے ریلوے اسٹیشن... پہنچے، نارائن کا جھونپڑ نما گھر میرا دیکھا ہوا تھا، لیکن وہ ہمیں پلیٹ فارم پر ہی ریڑھا کھینچتے ہوئے نظر آ گیا۔

اسے بھی ہم نے وین میں بٹھا لیا......

ریتا اور ڈوجا کا ارادہ اب واپسی کا تھا۔ میں نے کہا۔

''ابھی ایک شخص باقی ہے۔''

''وہ کون؟'' ریتا نے پوچھا۔

''کملیش۔''

''تو پھر تم ہی پوچھو اس سے۔'' ڈوجا نے نارائن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

ان دونوں کو ہم نے وین کے پچھلے حصے میں باندھ کر بٹھا رکھا تھا۔ میں عقبی حصے میں آ گیا اور ان سے بولا۔

''دیکھو......! جسونت رائے کو سب علم ہو چکا ہے اور میں بھی اسی کا آدمی ہوں۔'' میں نے جھوٹ بولا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ تم دونوں کو نہیں پتا تھا کہ وجے جسونت رائے کا بھتیجا تھا، لیکن کملیش کو معلوم تھا اور اس نے کسی دشمنی کی بنا پر ایسا کیا ہوگا۔ اب اگر تم جسونت رائے سے رعایت چاہتے ہو تو کملیش کے ٹھکانے سے آگاہ کر دو، میں تم دونوں کی سفارش کر دوں گا رائے صاحب سے۔''

میرا تیر نشانے پر بیٹھا۔ کیونکہ وہ دونوں پہلے ہی پولیس سے زیادہ جسونت رائے سے خوف زدہ ہو کر بیٹھے تھے۔ ریتا اور ڈوجا اگلی نشستوں پر براجمان تھے اور دونوں ہی گردن موڑے اس طرف دیکھ رہے تھے۔

شنکری نے فوراً کچھی سے نارائن کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''مجھ سے زیادہ یہی اُس کے بارے میں جانتا ہے۔ اسی سے پوچھو۔''

تب میں نے نارائن کی طرف گھورا تو وہ فوراً میرے آگے ہاتھ جوڑ کر بولا۔

ایمپائر کے دوست

چیئرمین کی خدمت میں انٹرویو کے لیے ان افراد کو طلب کیا گیا جو اگلی ٹیسٹ سیریز میں ایمپائر کے فرائض سرانجام دینا چاہتے تھے۔ چپراسی نے اندر جا کر چیئرمین کو بتایا۔

''ایک صاحب اپنے دو دوستوں کے ہمراہ حاضر ہوئے ہیں اور اپنے آپ کو ایمپائر بتاتے ہیں۔ اجازت ہو تو انہیں اندر بھیج دوں؟''

''جھوٹا شخص ہے۔'' چیئرمین نے کہا۔ ''اسے باہر ہی باہر سے بھگا دو۔''

چپراسی نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔

''آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ صاحب جھوٹ بول رہے ہیں؟''

چیئرمین نے کرسی سے ٹیک لگالی اور مسکرا کر بولے۔

''بھلا ایمپائر کا بھی کوئی دوست ہوا ہے۔''

سرفراز احمد کا لاہور سے تعاون

''بھائیو! میرا اس میں کوئی دوش نہیں ہے، میں ایک گریب آدمی ہوں، نجانے کیسے میں سُسرا اس موئے کملیش کے چکر میں آ گیا۔''

''بابا! چکر میں آ گئے ہو تو اب بھگتو بھی۔'' میں نے غصے سے کہا۔ ''اب رعایت چاہتے ہو تو کملیش کے بارے میں بتاؤ جلدی، اگر وہ ہمارے ہاتھ نہ آیا تو یاد رکھنا رائے صاحب اس کا غضب بھی تم دونوں پر ہی اُتاریں گے۔''

میں نے دھمکایا تو گارڈ شنکری نے کچھی سے نارائن کو ٹھوکا دیا۔ ''اب بتا بھی دے اپنے باپ کے بارے میں...... چپ کیوں ہو گیا رے۔''

نارائن بولا۔ ''وہ میرے پاس کل صبح آوے گا۔ میرے جھونپڑ پر...... سالا آئے تو تم لوگ اُسے دھر لینا۔''

''ہم۔'' میرے منہ سے پُرسوچ انداز میں ہمکاری برآمد ہوئی۔ ''تم اس سے رابطہ کیسے کرتے ہو؟''

''کوئی رابطہ نہیں ہے۔'' نارائن جواب میں بولا۔ ''بس، وہ خود آ جاتا ہے اور دوبارہ آنے کا دن اور وقت بتا

دیتا ہے۔‘‘
میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچے پھر گردن موڑ کر ریٹا اور ڈوجا کی طرف دیکھا، جو خاموشی کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھے میری کارروائی دیکھ اور سن رہے تھے۔

’’کیا خیال ہے پھر؟ آج کی رات نارائن کا مہمان بن جانا چاہیے؟‘‘ میں نے کہا۔

’’اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔‘‘ ریٹا نے میری بات کی تائید کی۔ تو ڈوجا بولا۔

’’لیکن ہمیں رائے صاحب کو آگاہ کرنا ہوگا۔‘‘

’’تو کردو انہیں آگاہ۔‘‘ میں نے کہا۔

وہ ایک آلے پر ان سے رابطہ کرنے لگ گیا۔ میں پچھلے حصے سے اگلی سیٹ سے عقب والی سیٹ پر آن بیٹھا۔

ڈوجا رابطہ کرتے ہی جسونت رائے سے مؤدبانہ بولا۔ ’’سر! مشن کامیابی سے جاری ہے۔ ڈاکٹر سیف پورا تعاون کررہا ہے ہم سے...... دو افراد ہم نے دھر لیے ہیں، آخری کملیش رہ گیا ہے اور اس کے لیے ہمیں صبح تک انتظار کرنا پڑے گا۔ اوور۔‘‘

پھر وہ دوسری جانب سے خاموشی کے ساتھ جسونت رائے کی بات سنتا رہا پھر بولا۔

’’اوکے سر! ہمیں بھی اس بات کا اندازہ ہے کہ کملیش ہی اصل مجرم ہے۔ اس نے آپ کے ساتھ کسی پرانی دشمنی کے انتقامی چکر میں یہ سب کیا ہے۔ اوور اینڈ آل۔‘‘

’’میرے ساتھ بھی اس خبیث ڈاکٹر رمیش اگروال نے دشمنی اور بغض کی خاطر ہی یہ سب کیا تھا۔‘‘ میں نے ان سے کہا۔

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور وین اسٹارٹ کرکے نارائن کے جھونپڑ گھر کی جانب موڑ دی۔

القصہ...... وہاں ہم رک گئے۔ شکری کو تو ہم نے وین میں ہی بند رکھا تھا اور وین ہم نے نارائن کے گھر سے ذرا فاصلے پر کسی پیلی اور سفید دیوار کی آڑ میں کھڑی کردی تھی۔

پھر میں، ریٹا اور ڈوجا، نارائن کو لیے اس کے گھر میں آبیٹھے۔

وہ رات جیسے تیسے بورنگ انداز میں بیت گئی۔ میں تو تھکا ہوا تھا، سو گیا تھا۔ ریٹا اور ڈوجا باری باری جاگ کر ڈیوٹی دیتے رہے۔

صبح ہوتے ہی ہم سب جاگ گئے۔ نارائن نے کہا۔

’’اب ہوشیار رہو...... وہ آنے ہی والا ہے۔‘‘

ابھی اُس نے اتنا ہی کہا تھا کہ...... باہر ہلکی سی سیٹی کی آواز گونجی۔

’’وہ آگیا۔ ہوشیار۔‘‘ نارائن نے کہا اور...... ہم تینوں چوکس ہوگئے۔ ریٹا اور ڈوجا نے تو پستول بھی نکال لیے تھے۔

نارائن دروازہ کھولنے کے لیے بڑھا۔ میں ایک طرف جا کھڑا ہوا تھا کیونکہ اب جو کچھ کرنا تھا وہ...... ریٹا اور ڈوجا نے ہی کرنا تھا۔

’’ارے آؤ...... آؤ...... کملیش بابو...... ! آہ...... آہ۔‘‘ نارائن کی پہلے استقبالیہ آواز اُبھری مگر اس کے ساتھ ہی وہ آواز ایک کرب ناک سی کراہوں میں بدل گئی......

میں لپک کر اپنے گوشے سے نکلا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں، نارائن خون میں لت پت اپنا پیٹ پکڑے زمین پر گرا تڑپ رہا تھا اور کھلے دروازے کی چوکھٹ پر ایک دبلا پتلا مگر تیز اور پھرتیلا دکھائی دینے والا جوان سا آدمی...... اپنے ایک ہاتھ میں تیز دھار خنجر جو اَب خون آلودہ بھی ہورہا تھا، تھامے کھڑا اِدھر اُدھر محتاط نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

مرتے مرتے بھی نارائن بتا گیا تھا کہ یہی ہمارا مطلوبہ آدمی تھا۔

پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ چونکا بھی تھا اور مجھے نہتا دیکھ کر وہی خونی خنجر لہراتا ہوا میری جانب لپکا۔ میں اپنی جگہ سے ٹس سے مس بھی نہیں ہوا تھا۔

اسی وقت وہی ہوا جس کی مجھے توقع تھی۔

اچانک دائیں بائیں کی آڑ سے...... ریٹا اور ڈوجا برآمد ہوئے اور بیک وقت دونوں ہی اس خونی قاتل پر پل پڑے۔ میں آرام سے اسی طرح مختصر صحن کے ایک سرے پر ہاتھ باندھے اور ٹانگیں پھیلائے کھڑا یہ تماشا دیکھنے میں محو تھا۔

ریٹا اور ڈوجا ٹاپ پروفیشنل تھے۔ کملیش بھی کم نہ تھا۔ اس نے خود کو ان کی گرفت سے چھڑانے کی بھرپور کوشش چاہی تھی، مگر ریٹا اور ڈوجا نے نہ صرف اس کا خون آلودہ خنجر چھین کر ایک طرف پھینک دیا، بلکہ اس پر قابو بھی پا لیا اور نہایت پھرتی اور چابکدستی کے ساتھ اس کے دونوں ہاتھ پشت کی طرف لے جا کر آٹو کلپ ہتھکڑی بھی لگا دی۔

میں نے دیکھا، کملیش ایک لمحہ کو ہکا بکا سا رہ گیا۔ اسے توقع ہی نہ تھی کہ اس کے ساتھ یہ سب ہوگا۔ تاہم ایک بات مجھے سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ آخر...... اس نے اپنے ہی ساتھی نارائن کا کیوں خون کر ڈالا تھا؟

جب ہم اُسے لیے بندوین کی طرف آئے اور پچھلے حصے میں شنکری کے ساتھ بٹھادیا تو وہ اسے دیکھ کر چونکا۔

شنکری نے بھویں اُچکا کر غصیلی نظروں سے اس کی طرف گھورا اور دانت پیس کر کہا۔ ''اور لو پنگا بڑے لوگوں سے...... دیکھ لیا نتیجہ۔''

''شٹ اَپ...... تم دو ٹکے کے آدمی بکنے میں کیا دیر لگاتے ہو۔'' کملیش نے اسے جھڑک دیا۔

''تم نے نارائن کو کیوں ہلاک کیا؟'' میں نے عقبی سیٹ سے گردن موڑ کر اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تم اپنی چونچ بند رکھو...... پولیس کے مخبر کتے......!'' کملیش نے مجھے بھی ڈانٹ پلا دی۔ وہ خاصا منہ زور، غصیلا اور نڈر واقع ہو رہا تھا، لیکن ایک خطرناک غلط فہمی کا شکار تھا۔

اس کی یہ غلط فہمی شنکری نے دور کرتے ہوئے اس سے طنزیہ انداز میں کہا۔

''خیر مناؤ، کملیش بابو...... ! یہ پولیس کے آدمی نہیں ہیں...... جسونت رائے کے آدمی ہیں، وہی جسونت رائے، جس کے لاڈلے بھتیجے وجے کے ساتھ تم نے خونی کھلواڑ کیا ہے۔''

میں نے دیکھا اس انکشاف پر کملیش کے چہرے پر ایک لرزتا سا رنگ آکر گزر گیا۔ پھر اس نے کھا جانے والی نظروں سے شنکری کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ وجے کا ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

''تم نے نارائن بے چارے غریب کا خون بھی اسی لیے کیا تھا کہ...... یہ آدمی تمہاری مخبری کرتے ہوئے اس کے پاس جا پہنچا تھا۔'' شنکری نے آخر میں اپنے تئیں اندازہ لگاتے ہوئے میری جانب اشارہ کر کے کملیش سے مزید کہا۔

کملیش اب صحیح معنوں میں پریشان اور تشویش زدہ نظر آنے لگا، اس کی وجہ یہی تھی کہ پہلے وہ ہمیں پولیس کا ہی آدمی سمجھے ہوئے تھا۔ اسے تسلی تھی کہ اس کے ''بڑوں'' کے لیے پولیس کے نرغے سے نکالنا کیا مشکل ہوگا، مگر اب جسونت رائے کا سن کر اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگی تھیں۔ یقینی طور پر وہ بھی جسونت رائے کی حقیقت سے اچھی طرح واقف تھا۔

مجھے اپنے سوال کا جواب مل چکا تھا اسی لیے میں پلٹ کر سیٹ سے پشت ٹکائے آنکھیں موندے بیٹھ گیا۔

☆☆☆

اندر ایک کمرے میں کملیش کی دل دہلا دینے والی چیخیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں، جبکہ ہم چاروں اسی کمرے سے ملحقہ دوسرے آرام دہ کمرے میں موجود تھے۔

یہاں آتے ہی کملیش کا منہ کھلوانے کے لیے جسونت رائے نے اسے اپنے دو جلاد صفت آدمیوں کے حوالے کر دیا تھا، وہ تھوڑی دیر بعد آکر اس کا ''رزلٹ'' بتانے والے تھے۔

یوں کملیش کی دل دہلا دینے والی چیخوں کی آوازوں سے حظ اُٹھاتے ہوئے...... جسونت رائے بہت مطمئن اور خوش نظر آرہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بیش قیمت سگار دبا ہوا تھا اور میرا دل بھی نجانے کیوں سگریٹ سے اب سگار پینے کی طرف مچل رہا تھا مگر کم بخت نے مجھے سگار کی دعوت ہی نہیں

دی۔

اس وقت میں سامنے والے صوفے پر بیٹھا تھا۔ میرے دائیں جانب والے صوفے پر ریٹا اور ڈوجا دھنسے ہوئے تھے اور مذکورہ کمرے کے دروازے کے قریب بائیں جانب والے فیملی صوفے پر جسونت رائے پشت لگائے ہوئے تھا۔

''ہماری پولیس کبھی بھی اس انداز میں کام نہیں کرسکتی تھی، بلکہ اسے اور بگاڑ کر گنجلک بنادیتی اور یوں اصل مجرم اپنے بچاؤ کی جب تک کوئی نہ کوئی تدبیر کر چکے ہوتے۔''

جسونت رائے نے فاتحانہ انداز میں ہم تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، ساتھ ہی سگار کا کثیف دھواں بھی اُگلا اور میں اس کی باتوں پر دھیان دینے کے بجائے لچھے دار دائرے بناتے فضا میں اُڑتے سگار کے دھوئیں کو گھورتا رہا۔

''تم کیا کہتے ہو ڈاکٹر سیف......!'' وہ اچانک مجھ سے مخاطب ہوا۔

''شاندار سگار کا شاندار دھواں۔''

''کیا مطلب؟'' جسونت رائے نے میری طرف بھویں سکیڑ کر دیکھا تو میں جیسے گڑبڑا کر بات بنانے کے انداز میں بولا۔

''تم...... میرا مطلب تھا کہ...... آپ نے نہایت ہی شاندار کام کیا ہے۔ پولیس تو معاملات کو مزید اُلجھاتی ہے۔''

ڈوجا نے بھی لقمہ دیا۔ ''یس سر! مکلیش پہلے یہ جان کر مطمئن ہو رہا تھا کہ ہم شاید پولیس کے آدمی ہیں مگر جب اسے آپ کا معلوم ہوا تو اس کی حالت بُری ہوگئی۔''

''ہاں! یہ خبیث جانتا تھا کہ...... اس کا گرو گھنٹال اور ہمارا دشمن نمبرون...... شنکر جانکیہ اسے آزاد کروالے گا، مگر ہماری بات اور ہے۔'' جسونت رائے نے پُرغرور لہجے میں کہا اور اسی وقت ایک آدمی اندر داخل ہوا اور مؤدبانہ انداز میں سیل فون جھک کر جسونت رائے کو پیش کرتے ہوئے بولا۔

''سر! کمشنر راجیشور گڈوانی کا فون ہے۔''

میں چونکا اور میرے دل کو انجانی تشویش اور وسوسوں نے گھیر لیا۔

''ہاں، بولو کمشنر!'' جسونت رائے نے فون اپنے کان سے لگاتے ہوئے رعونت بھرے لہجے میں کہا اور پھر دوسری جانب اس کی بات سنتا رہا۔ میری دھڑکتی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے دوسری جانب سے میرے بارے میں ہی کچھ سنا تھا اسی لیے فون پر کچھ سنتے ہوئے اس نے میری جانب بھی دیکھا تھا۔ وہ پھر بولا۔

''ہمم...... یہ بھی مجھے کسی کی شرارت لگتی ہے...... خیر، اب یوں بھی یہ ہمارے کام کا نہیں رہا، تمہیں چنتا کرنے کی ضرورت نہیں ہے گڈوانی! آؤ اور اپنے قیدی کو لے جاؤ۔''

یہ کہتے ہی جسونت رائے نے رابطہ منقطع کر دیا۔

''کک...... کیا کہہ رہا تھا گڈوانی؟'' میں نے جسونت رائے سے پوچھا۔

اس نے میری جانب مسکرا کر دیکھا اور پورے اطمینان کے ساتھ سگار کا ایک کش لگایا۔ مجھے جانے کیوں اس کی مسکراہٹ میں ایک مکاری اور فریب پن کی جھلک محسوس ہوئی تھی۔ وہ بولا۔

''آرمی کے کسی اعلیٰ افسر کو تمہارے بارے میں علم ہوا ہے کہ تم پڑوسی ملک کے ایک خطرناک جاسوس ہو...... کمشنر کو فوری طور پر حکم ملا ہے کہ تمہیں اس کے حوالے کر دیا جائے اسی لیے وہ کمشنر تمہیں لینے کے لیے آرہا ہے۔''

''کیا......؟'' میں چونک پڑا۔ میری سانسیں تیز تیز چلنے لگیں۔ ''یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں رائے صاحب؟ میں تو...... میں تو آپ کے اتنا کام آیا ہوں...... اور...... اور اب آپ......''

''خاموش۔'' اس خبیث نے سرد لہجے میں مجھے جھڑک دیا۔ اس کے لہجے میں بھیڑیے جیسی غراہٹ تھی۔ ''معاملہ انڈین آرمی کے ہاتھ میں جاچکا ہے...... یوں بھی اب تم کو ہمارے لیے جو کرنا تھا، وہ کر چکے...... اب وہ جانیں اور تم۔''

میں اس کی دغابازی پر ایک دم غصے سے لال پیلا ہو کے اُٹھ کھڑا ہوا تو...... ریٹا اور...... ڈوجا بھی ایک دم کھڑے ہوگئے۔

اُن دونوں کے ہاتھوں میں سیاہ رنگ کے پستول دبے ہوئے تھے اور نال کا رخ میری جانب تھا۔

مجھے اپنے پورے بدن میں لاتعداد چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہونے لگیں۔ میں ٹشو پیپر کی طرح استعمال کر کے پھینک دیا گیا تھا...... میری ساری خوش فہمیوں اور خوش اُمیدیوں پر اوس پڑنا شروع ہوگئی تھی۔

ان دیکھی دشمنی کے جال میں جکڑے نوجوان کی مزید مشکلات آئندہ ماہ پڑھیں

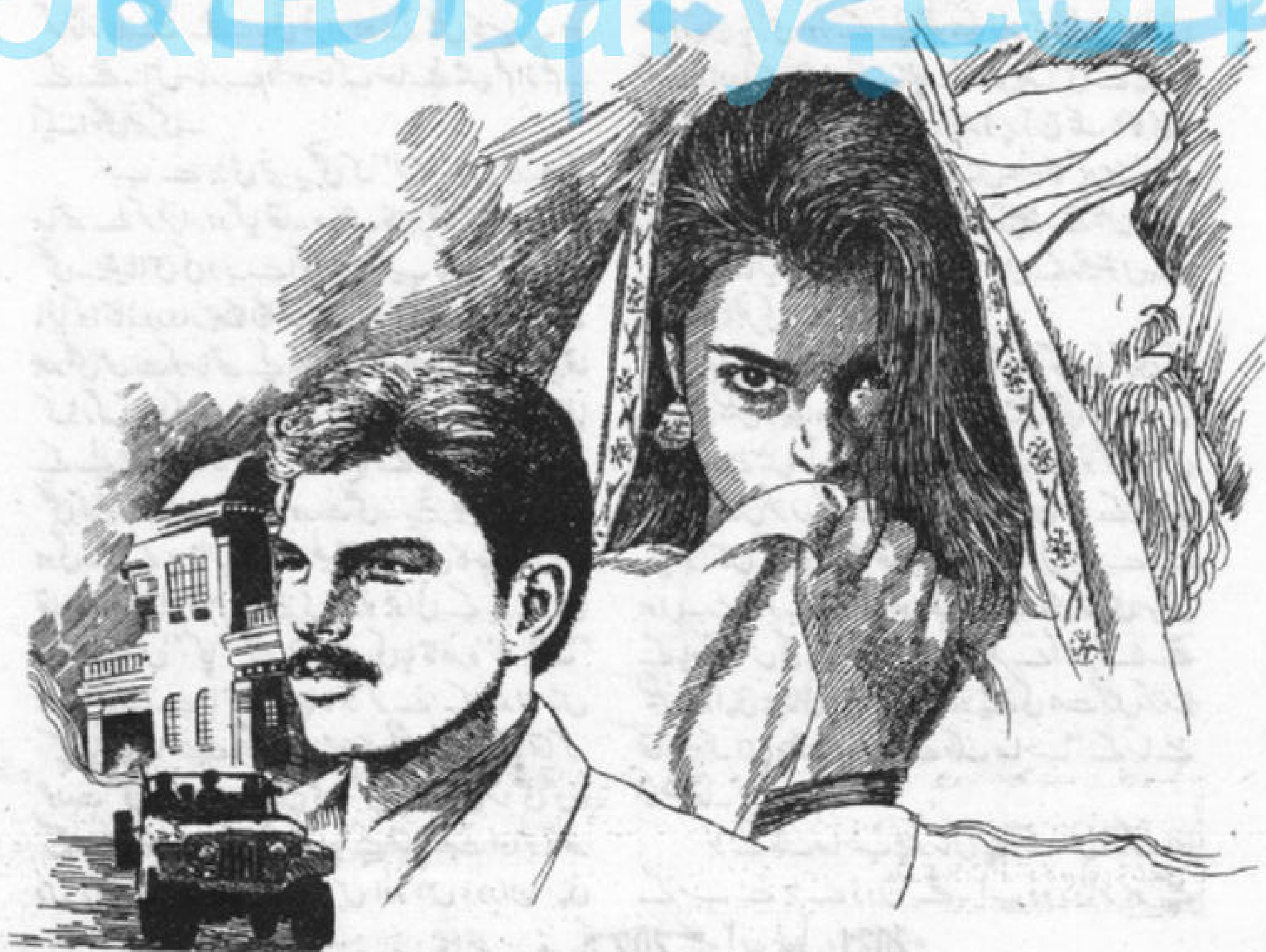
صحیح طور پر نہیں کہا جاسکتا تھا کہ لڑکا اس عورت کو بھگا کر لے گیا تھا یا عورت، لڑکے کو بھگا کر لے گئی تھی مگر یہ بات بہرحال طے تھی کہ عورت نے لڑکے سے ساری باتیں اگلوالی تھیں۔ لڑکا شاید کچھ زیادہ ہی بُری طرح اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اس نے سارے راز اگل دیے تھے۔ اس نے عورت کو بتا دیا تھا کہ پڑوس کے ایک چھوٹے سے ملک سے ہیروئن کی بہت بڑی کھیپ کس راستے سے آ رہی تھی اور پھر کس

محبت اور مخبری

نجمہ مودی

کاروبار کا دارومدار نفع و نقصان پر ہوتا ہے... مگر بعض کاروبار کرنے والوں کے نزدیک نفع و نقصان سے زیادہ اہم اصول ہوتے ہیں... لوگوں کی زندگیوں سے کھیلنے والے سفاک اور پتھر دل رکھنے والوں کی دل دوز کارروائیاں... اُن کی دنیا میں محبت... ایثار اور قربانی جیسے کسی احساس کا داخلہ ممنوع تھا...

موت کا انتخاب کرنے والے دو محبت گزیدوں کا انجام



طرح، کئی حصوں میں، ایک ڈیڑھ ماہ کے عرصے میں اسے امریکا پہنچایا جاتا تھا۔

صوبے کی سب سے بڑی ڈرگ مافیا کا یہ منصوبہ بالکل فول پروف تھا۔ سب انتظامات مکمل تھے۔ اس سارے ''آپریشن'' کے دوران جن مقامات پر تعینات سرکاری افسروں کو ''تعاون'' کرنا تھا، ان کے نام، ڈیوٹی کے مقامات اور ٹائمنگ وغیرہ کی تمام تفصیلات ڈرگ مافیا کو مل چکی تھیں۔ ننانوے فیصد امید یہی تھی کہ پورا آپریشن طے شدہ تفصیلات کے مطابق ''بہ خیر و خوبی'' مکمل ہو جائے گا اور ڈرگ مافیا کی شاندار تاریخ میں ایک اور ''سنہرے باب'' کا اضافہ ہو جائے گا۔

کسے معلوم تھا کہ وہ لڑکا، جسے آج کل ڈرگ مافیا میں اہم ترین ذمے داریاں سونپی جا رہی تھیں، غداری کر جائے گا۔ اسے راستے میں کوئی عورت مل جائے گی۔ وہ اسے اپنی محبت کے جال میں پھنسا لے گی اور لڑکا اس کے سامنے سب کچھ اگل دے گا جس کے نتیجے میں ہیروئن کی اتنی بڑی کھیپ سرحد پر ہی پکڑی جائے گی اور ڈرگ مافیا کا کم از کم سو کروڑ روپیہ ڈوب جائے گا۔ مافیا کا صرف بھاری مالی نقصان ہی نہیں ہوا تھا بلکہ دو اہم کارندے بھی گرفتار ہو گئے تھے۔ باقی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اس سارے افسوسناک معاملے میں کم از کم یہ ایک اچھی خبر تھی۔

سب سے بڑی خبر یہ تھی کہ ''لڑکا'' اس عورت کو ساتھ لے کر فرار ہو گیا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ عورت مخبر تھی۔ یقیناً اسی کی وجہ سے اتنی بڑی کھیپ پکڑی گئی تھی اور مافیا کو اتنا زوردار جھٹکا لگا تھا لیکن اگر لڑکا فرار ہونے کے بعد بھی عورت کو ساتھ لیے پھر رہا تھا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ ڈرگ مافیا کو مزید خطرات لاحق تھے۔ وہ عورت، مافیا کے لیے چلتا پھرتا ٹائم بم تھی۔ مافیا کے مخبروں نے خبر دی تھی کہ عورت بہت خوب صورت تھی۔ یہ خبر یقیناً ٹھیک ہی ہو گی۔ لڑکے پر غالباً اس کے غیر معمولی حسن کا جادو چل گیا تھا ورنہ وہ اپنی تمام تر نوخیزی اور نوجوانی کے باوجود ان معاملات میں ''کچا'' نہیں تھا۔ اس کی باقاعدہ ''ٹریننگ'' ہوئی تھی۔ اسے باقاعدہ ہپناٹائز کرنے کے انداز میں سمجھایا گیا تھا، بہت اچھی طرح ذہن نشین کرایا گیا تھا کہ عورت قطعی کوئی اہم چیز نہیں تھی، بس راتوں کی ساتھی تھی، صبح ہوتے ہی اسے بھول جانا چاہیے تھا۔ بہت ہوا تو آٹھ دس راتیں اس کے نام کر دیں اور اس دوران اپنی اصلیت کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں دینا تھا۔ ٹریننگ دینے والوں کا کہنا تھا کہ ٹریننگ بہت کامیاب رہی تھی۔ لڑکا ''پکا'' ہو گیا تھا، کسی لڑکی سے اس حد تک متاثر نہیں ہو سکتا تھا کہ مافیا کے مفادات کو نقصان پہنچانے کے بارے میں سوچ بھی سکتا۔

مگر وقت نے ثابت کر دیا کہ ٹریننگ دینے والوں کے اندازے غلط تھے۔

دراصل وہ کوئی خاص عورت ہوتی ہے جس کا جادو کسی خاص مرد پر چلنا ہوتا ہے اور کچھ پتا نہیں ہوتا کہ زندگی کے کس موڑ پر وہ خاص عورت اس خاص مرد سے ٹکرائے گی۔ اس لڑکے کی بدقسمتی تھی کہ اسے جو خاص عورت ٹکرائی، وہ مخبر تھی اور لڑکے کی حماقت کی وجہ سے مافیا کو جو نقصان پہنچا، وہ گزشتہ دس برسوں کے دوران سب سے بڑا نقصان تھا۔ معاملہ صرف مالی نقصان تک ہی محدود نہیں تھا، مافیا کے دو نہایت اہم اور بے حد کارآمد آدمی بھی اینٹی نارکوٹکس فورس کے ہتھے چڑھ کر جیل پہنچ گئے تھے۔

لڑکے اور عورت کو تلاش کرنے کی ذمے داری مافیا کی جانب سے رمیز اور داؤد کو سونپی گئی تھی۔ وہ مافیا میں اس کے ''اسپیشلسٹ'' سمجھے جاتے تھے۔ مافیا کے غداروں، مفروروں یا کسی اور کے لیے مخبر بن جانے والوں کو تلاش کرنے اور انہیں انجام تک پہنچانے کا فریضہ انہی کے سپرد کیا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں ان کے ریکارڈ پر آج تک ناکامی کا کوئی داغ نہیں آیا تھا۔ گویا مافیا میں ان کا کیریئر ''بے داغ'' تھا البتہ اس پر خون کے بے شمار چھینٹے تھے لیکن، ظاہر ہے، ڈرگ مافیا میں ریکارڈ یا کیریئر کا خون کے چھینٹوں سے آلودہ ہونا فخر کی بات تھی۔

یوں تو مافیا میں سنگدل اور سفاک لوگوں کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن رمیز اور داؤد کے بارے میں تو کہا جاتا تھا کہ ان کے سینے میں دل کی جگہ پتھر ہے۔ جذبات تو گویا انہیں چھو کر بھی نہیں گزرے تھے مگر جب تازہ مشن ان کے سپرد کیا گیا تو انہیں کچھ یوں لگا تھا جیسے ان کے دل بیٹھ سے گئے ہوں۔ رمیز کو تو یہ شک بھی ہوا تھا کہ شاید اچھی خاصی سردی کے باوجود اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے اُبھر آئے تھے لیکن وہ اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیر کر دیکھنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا، کیونکہ اس وقت وہ ''بڑے ملک صاحب'' کے سامنے حاضر تھا۔

بڑے ملک صاحب چند سال پہلے تک اس ڈرگ مافیا کے سب سے بڑے ڈون تھے۔ اب وہ ریٹائر ہو چکے

تھے۔ ان کی عمر تقریباً اسی سال تھی۔ مافیا کی باگ ڈور ان کے پچاس سالہ بیٹے ارباز نے سنبھال لی تھی۔ مافیا میں اسے ''چھوٹے ملک صاحب'' کہا جاتا تھا۔ مافیا کو اب وہی چلا رہا تھا لیکن بعض بہت ہی خاص فیصلے اب بھی بڑے ملک صاحب ہی کرتے تھے۔ ان کی بڑی سی داڑھی بالکل سفید تھی۔ بال بھی اسی طرح چمکیلے سفید اور تقریباً کندھوں تک آئے ہوئے تھے۔ ان بالوں کا بیشتر حصہ سیاہ یا ڈارک براؤن پگڑی میں چھپا ہوتا تھا۔

ان کا قد چھ فٹ سے بھی نکلتا ہوا تھا لیکن اس عمر میں بھی ان کی کمر ذرا نہیں جھکی تھی۔ بلوری آنکھوں میں معمولی سی دھندلاہٹ آگئی تھی لیکن اب بھی ان کے بیٹے تک میں ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔ غصے میں اب بھی یہ آنکھیں انگاروں کی طرح دہکنے لگتی تھیں لیکن غصہ انہیں شاذونادر ہی آتا تھا...... یا پھر شاید یہ کہنا زیادہ درست تھا کہ وہ اپنے غصے کا اظہار شاذونادر ہی کرتے تھے۔ مافیا کے لوگ ان سے بات کرتے وقت زیادہ تر ان کے سامنے سر جھکائے کھڑے رہتے تھے۔ بہت کم لوگ تھے جو سر اٹھا کر، ان کے چہرے کی طرف دیکھ کر بات کرتے تھے، حالانکہ دیکھنے والوں کے خیال میں ان کا سرخ و سپید چہرہ اچھا خاصا نورانی معلوم ہوتا تھا۔

جس سرسبز پہاڑی علاقے میں ہریالی سے بھرپور ایک بلند جگہ پر ان کا طویل و عریض، محل نما مکان تھا، اس کے اردگرد وادی میں رہنے والے سادہ لوح لوگ تو انہیں کوئی ''پہنچا ہوا'' بزرگ اور بے حد نیک انسان سمجھتے تھے۔ جب سے ان کی داڑھی سفید ہوئی تھی، کئی بار انہیں کہیں باہر آتے جاتے دیکھ کر بعض لوگوں نے راستے میں روک کر، اپنے مصائب اور مسائل کے حل کے سلسلے میں دعا کرنے، بلکہ تعویذ گنڈے تک کی بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن بڑے ملک صاحب نے نرمی سے انہیں منع کر دیا تھا۔ گو کہ ایک آدھ مرتبہ انہیں خیال آیا تھا کہ لوگ اگر انہیں پیر فقیر یا پہنچے ہوئے بزرگ کا درجہ دینے کے لیے تیار بیٹھے تھے تو انہیں خود کو اس درجے پر فائز کر لینا چاہیے تھا۔ اس طرح انہیں علاقے میں ایک اور طرح کی طاقت بھی حاصل ہو سکتی تھی لیکن پھر کچھ سوچ کر انہوں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا تھا۔

اب تو انہوں نے پیدل اپنے طویل و عریض مکان کے سبزہ زاروں کی حدود سے باہر جانا کئی برس سے تقریباً چھوڑ ہی دیا تھا۔ کہیں جانا بھی ہوتا تھا تو ان کی مخصوص، سیاہ پراڈو، مکان کے طویل و عریض برآمدے کے عین قریب آجاتی تھی اور وہ وہیں سے اس میں سوار ہو جاتے تھے۔ ونڈ اسکرین اور ڈرائیور سائڈ کے شیشے کے علاوہ اس کے باقی سب شیشے بھی سیاہ تھے۔ جسیم قسم کے، کسی حد تک خونخوار سے چہروں والے مسلح محافظوں سے بھری ایک ڈبل کیبن گاڑی اس کے پیچھے چلتی تھی۔ علاقے کے لوگوں نے کئی سال سے بڑے ملک صاحب کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔

ان کا لباس بھی قدیم قسم کی ''فاخرانہ اور شاہانہ خلعت'' سے مشابہ معلوم ہوتا تھا لیکن ان کی شخصیت پر خوب جچتا تھا۔ لگتا تھا، واقعی پرانے زمانے کا کوئی بادشاہ تاریخ کے اوراق سے نکل کر سامنے آ گیا تھا۔ وہی شاہانہ جاہ و جلال، وہی خدوخال، وہی انداز اور وہی سراپا۔ اس میں کوئی شک بھی نہیں تھا۔ وہ سچ مچ ایک چھوٹی موٹی سلطنت کے مالک تو تھے لیکن وہ ایک خفیہ سلطنت تھی۔ اس کا کوئی نام نہیں تھا۔ قانون بہرحال اس قسم کی سلطنت کو ایک نام ضرور دیتا تھا اور وہ نام تھا ''ڈرگ مافیا'' عوام اور میڈیا میں بھی اس کے لیے یہی نام استعمال ہوتا تھا۔

مفرور اور ''غدار'' لڑکے کو تلاش کرنے کا کام جب رمیز اور داؤد کے سپرد کیا گیا تو وہ دہشت زدہ سے ہو گئے تھے۔ حالانکہ وہ ان لوگوں میں سے تھے جن سے مافیا کے دوسرے لوگ دہشت زدہ رہتے تھے۔ رمیز اور داؤد کا دہشت زدہ ہونا معمولی بات نہیں تھی۔ وہ اس دہشت اور خوف کا اظہار بھی نہیں کر سکتے تھے اور اس کام سے انکار کرنے کا بھی تصور تک نہیں کر سکتے تھے۔ بات صرف اتنی تھی کہ مفرور اور غدار لڑکا بڑے ملک صاحب کا اکلوتا پوتا تھا۔ یہ گویا کچھ ایسی ہی بات تھی کہ ''اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔''

بڑے ملک صاحب کا بیٹا بھی اکلوتا تھا۔ سردست وہی مافیا کا سربراہ تھا لیکن نہ جانے کیا سوچ کر بڑے ملک صاحب نے مافیا کے تمام اہم لوگوں کو بتا رکھا تھا کہ ان کے بیٹے کو زیادہ بڑھاپے تک مافیا کا سربراہ نہیں رہنا تھا۔ چند برس بعد بڑے ملک صاحب کے پوتے کو مافیا کا سربراہ بننا تھا۔ سردست اس کی ٹریننگ چل رہی تھی۔ دادا کا خیال تھا کہ ان کے پوتے کو صرف چند سال کی ٹریننگ کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد وہ اپنے باپ اور دادا سے بھی زیادہ اچھے انداز میں مافیا کی قیادت سنبھال سکتا تھا کیونکہ اس کا تعلق نئی نسل سے تھا، وہ نئے زمانے کا لڑکا تھا، وہ مافیا میں ایسے

انقلابات لا سکتا تھا جو اس کے دادا اور اس کے والد نہیں لا سکے تھے۔

انہوں نے بہر حال اپنے اپنے وقت اور زمانے کے حساب سے مافیا کو اچھی طرح سنبھالا تھا، بہترین انداز میں چلایا تھا، خوب وسعت دی تھی، کیا سے کیا بنا دیا تھا، چند لوگوں کے گروہ کو صوبے کی سب سے بڑی مافیا بنا دیا تھا لیکن بڑے ملک صاحب کے خیال میں اب مافیا کو نئے خون کی ضرورت تھی۔ انہیں امید تھی کہ ان کا پوتا مافیا کو صوبائی سطح سے یکدم انٹرنیشنل لیول پر لے جائے گا۔ نئی نسل کی بات ہی اور تھی۔ یہ نسل پڑھی لکھی تھی، بین الاقوامی معاملات کو زیادہ بہتر طور پر سمجھتی تھی، ہر قسم کی ٹیکنالوجی کے استعمال میں زیادہ ماہر تھی۔

مگر یہ کیا ہوا...... پوتے نے تو ٹریننگ کے دوران ہی لٹیا ڈبو دی تھی۔

مافیا کو جو مالی نقصان پہنچا تھا، جو دھچکا لگا تھا، وہ اپنی جگہ تھا لیکن بڑے ملک صاحب کو غالباً سب سے زیادہ صدمہ اپنے اندازے غلط ثابت ہونے کا تھا۔ اندازے بھی خود اپنے ہی خون کے بارے میں غلط ثابت ہوئے تھے۔

رمیز اور داؤد کو اندازہ تھا کہ جو کام ان کے سپرد کیا جا رہا تھا، اس کے تین مرحلے تھے۔ سب سے پہلے تو انہیں لڑکے کو تلاش کرنا تھا۔ اس کا نام امان ملک تھا لیکن اب شاید اسے دنیا میں کہیں بھی امان نہیں مل سکتی تھی۔ اگر عورت ابھی تک اس کے ساتھ تھی تو اسے بھی پکڑنا تھا۔ دونوں کو علاقہ غیر کے ایک خاص مکان میں پہنچانا تھا جو مافیا کی ملکیت تھا اور قید خانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ ان دونوں کو وہاں قید کر کے رمیز اور داؤد کو ایک بار پھر بڑے ملک صاحب کی خدمت میں حاضر ہونا تھا اور ان کا فیصلہ سننا تھا کہ دونوں قیدیوں کے ساتھ کیا کیا جائے۔

بڑے ملک صاحب کو سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہیے تھا۔ انہیں اُمید تھی کہ اس وقت تک وہ فیصلے پر پہنچ جائیں گے۔ رمیز اور داؤد کو ہدایت کی گئی تھی کہ اس دوران وہ کوئی بھی اطلاع دینے کے لیے یا کوئی بھی بات پوچھنے کے لیے فون ہرگز استعمال نہیں کریں گے۔ جو بھی بات ہوگی، زبانی ہوگی، آمنے سامنے ہوگی۔ مہم کا تیسرا مرحلہ یہ ہوگا کہ بڑے ملک صاحب اپنے پوتے اور اس عورت کے بارے میں جو بھی حکم دیں گے، اس پر عمل درآمد بھی رمیز اور داؤد کو ہی کرنا ہوگا۔

رمیز اور داؤد یہ احکام سننے کے بعد مہم پر روانہ ہو گئے تھے۔ امان کو ڈھونڈنا ان کے لیے کچھ زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا۔ وہ اپنے کام میں ماہر تھے جبکہ امان ابھی اتنا ہوشیار نہیں ہوا تھا۔ ابھی اس کی اتنی زیادہ ٹریننگ نہیں ہوئی تھی۔ اس نے ایک بے وقوفی یہ کی تھی کہ ابھی تک اپنی پراڈو نہیں چھوڑی تھی، اسی میں سفر کر رہا تھا۔ اگر وہ بسوں یا ویگنوں میں سفر کرتا تو آسانی سے غائب ہو سکتا تھا۔

دوسری حماقت اس نے یہ کی تھی کہ عورت کو اب تک نہیں چھوڑا تھا۔ اپنے ساتھ ہی رکھا تھا، جبکہ وہ ایک حسین عورت تھی۔ سرسری نظر سے اسے دیکھنے والے کے لیے بھی اسے ایک آدھ دن میں ہی ذہن سے جھٹک دینا اور فراموش کر دینا بہت مشکل تھا۔ عورت نے بھی نہ جانے کیوں یہ حماقت کی تھی کہ اپنا چہرہ چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اگر وہ برقع پہن کر لڑکے کے ساتھ رہتی تو کسی کو بھی یاد نہ ہوتی...... بلکہ ان علاقوں میں تو وہ شٹل کاک برقع پہن کر زیادہ بے شناخت ہو سکتی تھی۔ وہ مخبر تھی۔ یقیناً بہت چالاک ہوگی۔ عمر میں بھی لڑکے سے بڑی تھی۔ نہ جانے کیوں اس نے اپنے آپ کو بے نقاب رکھا تھا۔ شاید اسے ابھی خطرے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔

رمیز اور داؤد ان کا سراغ لگاتے، سفر کرتے آخر ان تک جا پہنچے۔ چھوٹے سے پڑوسی ملک کی سرحد کے قریب، ایک سرسبز پہاڑی علاقے میں، ایک گاؤں کے قریب وہ ہوٹل میں مقیم تھے۔ ہوٹل اچھا خاصا شاندار تھا اور ایک پہاڑی کے دامن میں واقع تھا۔ اس علاقے سے ناآشنا کوئی شخص اس پسماندہ سے گاؤں کو دیکھتا اور پھر اس ہوٹل کو دیکھتا تو یقیناً حیران ہوئے بغیر نہ رہتا کہ ایک ایسی جگہ پر اچھے خاصے شاندار ہوٹل کی موجودگی کا کیا جواز تھا؟

''میں جب نیا نیا پارٹی میں آیا اور مجھے پہلی مرتبہ اس علاقے میں آنے کا اتفاق ہوا تو میں بھی حیران ہوا تھا کہ ایسے غربت زدہ گاؤں کے قریب یہ اچھا خاصا شاندار ہوٹل کیوں موجود ہے؟'' رمیز اپنے ماضی کی احمقانہ سوچ پر خود ہی ہنستے ہوئے بولا۔ ''لیکن جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ میں بے وقوفوں کی طرح سوچ رہا تھا۔ ظاہر ہے اس ہوٹل میں گاؤں کے لوگ تو نہیں ٹھہرتے نا۔'' وہ لوگ مافیا کے لیے ''پارٹی'' کا لفظ استعمال کرتے تھے۔

''ہاں، البتہ گاؤں کے بہت سے لوگ اس ہوٹل میں ملازم ضرور ہیں۔'' داؤد اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''چھوٹے موٹے کام کرتے ہیں۔ ہوٹل کی وجہ سے گاؤں کے لوگوں کو تھوڑا بہت روزگار ملا ہوا ہے۔ اس میں قیام کرنے والے تو زیادہ تر ہم تم جیسے لوگ ہوتے ہیں یا پھر بعض ایسے خوش حال لوگ، جو کسی وجہ سے اپنے پروگرام کے مطابق سرحد عبور نہیں کر پاتے۔ حالانکہ ساٹھ ستر ہزار لوگ روزانہ بلا روک ٹوک، کسی قسم کے کاغذات کے بغیر روزانہ اس سرحد کے ایک طرف سے دوسری طرف آتے جاتے رہتے ہیں لیکن بعض اوقات کسی کو اچانک اور غیر متوقع طور پر کوئی رکاوٹ پیش آجاتی ہے اور بعض اوقات کوئی، کسی خطرے کی بو سونگھ کر خود ہی رک جاتا ہے۔''

''شاید امان اور اس عورت کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا ہے۔'' رمیز بولا۔ ''یا پھر شاید ہماری قسمت اچھی تھی کہ یہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہوئے ابھی تک یہیں پڑے ہیں۔ اگر یہ سرحد عبور کر جاتے تو ہمارے لیے مشکل ہو جاتی۔''

''خیر...... ہم وہاں سے بھی انہیں کھینچ لاتے۔'' داؤد بے پروائی سے بولا۔ ''دوسری طرف بھی تو اپنے لوگ موجود ہیں، وہ کب کام آتے؟''

''پھر بھی کام مشکل ہو جاتا۔ وہاں تو قدم قدم پر ''پارٹی'' ہے۔ شاید وہ کسی ''پارٹی'' کی پناہ میں چلے جاتے۔ بڑا مسئلہ ہو جاتا۔ بڑے ملک صاحب نے یہ کام بہرحال ہم سے ہی کرانا تھا۔'' رمیز نے گویا موجودہ صورتِ حال پر طمانیت کی سانس لی۔

وہ دونوں ابھی ہوٹل کی پارکنگ میں اپنی جیپ میں ہی بیٹھے تھے۔ انہیں اندر جانے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ انہیں معلوم تھا، امان اور وہ عورت، دونوں اب بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر رمیز تھا۔ اس نے انجن بند کر کے سگریٹ سلگا لیا تھا اور جیپ کا اپنی سائڈ کا دروازہ کھول لیا تھا۔ وہ ایک خاص قسم کی، بند جیپ تھی۔ سائز میں عام جیپ سے کافی بڑی تھی اور انتہائی دشوار گزار پہاڑی، برفانی اور پھسلن زدہ راستوں پر چڑھنے کی اس کی صلاحیت عام جیپ سے کہیں زیادہ تھی۔ اس کی ونڈ اسکرین اور کھڑکیوں کے شیشے تک بلٹ پروف تھے۔ اس میں فاضل اسلحے کے لیے خفیہ خانے بھی موجود تھے۔

رمیز نے سگریٹ آدھا پی کر باہر پھینک دیا۔ چاروں طرف سکوت اور اندھیرا تھا۔ موسم سرد اور کہر آلود سا تھا۔ ہوٹل کی فاضل لائٹس اس وقت آف تھیں جو چند لائٹس روشن تھیں، وہ بھی کہر کی وجہ سے دھندلی سی دکھائی دے رہی تھیں۔ رمیز نے اپنی ڈھیلی ڈھالی قمیص کے نیچے چھپا ہوا ماؤزر نکال کر اس کا میگزین چیک کیا پھر اسے دوبارہ چھپا لیا۔ داؤد کے پاس نائن ایم ایم پسٹل تھا۔ اس نے بھی اسے چیک کر لیا۔ دونوں ڈھیلے ڈھالے شلوار قمیص میں تھے۔ اوپر چمڑے کی بھاری بھرکم جیکٹیں تھیں۔ سروں پر چترالی ٹوپیاں تھیں۔ دونوں کا حلیہ ویسا ہی تھا جیسا ان علاقوں میں نظر آنے والے زیادہ تر مردوں کا ہوتا تھا لیکن اگر کوئی ایک لمحے کے لیے بھی ذرا توجہ سے ان کے چہروں کی طرف دیکھ لیتا تو شاید اسے احساس ہو جاتا کہ وہ عام لوگ نہیں تھے۔ ان کے چہروں میں، نین نقش میں کوئی نہ کوئی خاص بات تھی۔

دونوں اپنے ہتھیار چھپانے کے بعد گاڑی سے اُتر آئے اور ہوٹل کے عقبی حصے کی طرف چل دیے۔ انہیں امان اور اس کی ساتھی عورت کا کمرا نمبر بھی معلوم تھا۔ کمرے تک پہنچنے میں بھی انہیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ ہوٹل کے خاص خاص لوگ جانتے تھے کہ وہ کون ہیں اور کیا ہیں۔ کسی میں انہیں روکنے کی جرأت نہیں تھی۔ انہیں تو کمرے کے دروازے کا تالا توڑنے کی بھی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ڈپلیکیٹ چابی ان کی خدمت میں پیش کر دی گئی۔

داؤد نے کمرے میں پہنچ کر لائٹ آن کی، تب امان اور اس عورت کی آنکھ کھلی۔ دونوں بستر میں تھے۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ اچانک روشنی ہونے سے ایک لمحے کے لیے عورت کی آنکھیں چندھیا سی گئیں مگر دوسرے ہی لمحے خوف سے پھیل گئیں۔ اس نے کمبل ٹھوڑی تک کھینچ لیا۔ خوف زدہ تو امان بھی ہو چکا تھا لیکن وہ پوری کوشش کر رہا تھا کہ خوف زدہ نظر نہ آئے۔ وہ ایک ہینڈسم نوجوان تھا۔ اس کی آنکھیں نیلی، بال بھورے اور رنگت سرخ و سپید تھی۔ پہلی نظر میں تو اس پر ہالی ووڈ کے کسی نووارد ہیرو کا گمان گزرتا تھا۔

''آخر کار تم لوگ ہم تک پہنچ ہی گئے۔'' آخر امان نے گہری سانس لے کر کہا۔ وہ اپنی آواز کے ارتعاش کو پوری طرح چھپانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

''ہاں، ہمیں تو پہنچنا ہی تھا، چاہے ہمیں دنیا کے آخری سرے تک جانا پڑتا۔'' داؤد نے دھیمے لہجے میں کہا۔ وہ سگریٹ نہیں پیتا تھا لیکن اس وقت ماچس کی ایک تیلی کا سرا دانتوں میں دبائے اسے دھیرے دھیرے گھما رہا تھا۔ وہ اور رمیز، ڈھیلے ڈھالے انداز میں کھڑے تھے جیسے کوئی

سرسری، مختصر اور غیر اہم سی گفتگو کرنے آئے ہوں۔ دونوں کے ہاتھوں میں گن تھیں لیکن ان کا رخ امان یا اس عورت کی طرف نہیں تھا۔ وہ دونوں بازو لٹکائے، گن کا رخ فرش کی طرف کیے، انہیں یوں تھامے ہوئے تھے جیسے انہیں معلوم ہی نہ ہو کہ ان کے ہاتھ میں گن ہے لیکن امان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر اس نے اپنے تکیے کے نیچے رکھی گن کی طرف ہاتھ بڑھانے کی ذراسی کوشش کی تو دوسرے ہی لمحے وہ بیڈ پر مردہ پڑا ہوگا۔

''اگر کل بارڈر پر ایک دشمن پارٹی کے آدمی سے سامنا نہ ہوتا اور اس نے بارڈر پر گڑبڑ نہ کی ہوتی تو ہم نکل گئے ہوتے۔ تمہیں یہاں نہ ملتے۔'' امان بہ ظاہر مسکراتے ہوئے بولا لیکن اس کی مسکراہٹ روح سے خالی تھی۔

''ہاں، ہم بھی اسی بات پر حیران تھے۔'' داؤد نے تسلیم کیا۔ ''ہمارا خیال یہی تھا کہ تم بارڈر کراس کر چکے ہو۔''

''ہمیں صبح دس بجے بارڈر کراس کرنا تھا۔'' امان ایک نظر وال کلاک کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''میں نے راستہ صاف کرالیا تھا۔''

''مگر ہم پہنچ گئے۔'' رمیز نے ٹھنڈی سانس لے کر کچھ ایسے لہجے میں کہا جیسے امان سے اظہارِ ہمدردی کر رہا ہو۔

''ہاں، تم میرے اندازے سے بہت پہلے پہنچ گئے۔'' امان نے تسلیم کیا۔ ''میرا خیال تھا کہ میں تمہیں پیچھے چھوڑنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔''

''تم ابھی کم عمر ہو، نادان ہو۔ ابھی تمہیں بہت زیادہ ٹریننگ کی ضرورت ہے...... جو شاید اب تمہیں نہ مل سکے۔'' داؤد کا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی متاسفانہ سا ہو گیا۔

اس دوران عورت بے آواز سی سسکیاں لیتے ہوئے رونے لگی تھی۔ وہ بلاشبہ ایک حسین عورت تھی لیکن اس وقت خوف کے باعث گویا اس کا حسن پھیکا پڑ گیا تھا۔ وہ لڑکے سے یقیناً عمر میں سات آٹھ سال بڑی تھی لیکن پھر بھی اس کے ساتھ جچ رہی تھی۔ ان کی جوڑی کو بلاشبہ ایک حسین اور آئیڈیل جوڑی کہا جا سکتا تھا۔

اسی دوران رمیز ہوا کے بے آواز جھونکے کی طرح حرکت میں آیا۔ دوسرے ہی لمحے امان کے تکیے کے نیچے چھپا ہوا اسٹیل گرے کلر کا پسٹل رمیز کے ہاتھ میں آچکا تھا۔ وہ ایک شاندار جرمن پسٹل تھا اور نیا معلوم ہوتا تھا۔ رمیز نے اسے یوں تکیے کے نیچے سے، نہایت صفائی سے، ایک لمحے میں نکالا تھا جیسے اس کی آنکھیں ایکسرے مشین تھیں اور اس نے دیکھ لیا تھا کہ پسٹل کہاں اور کس زاویے سے رکھا ہوا ہے۔ رمیز نے فوراً ہی اسے اپنی ڈھیلی ڈھالی قمیص کے نیچے کہیں چھپا لیا۔

''کیا تم لوگ ہمیں مار دو گے؟'' عورت کے حلق سے عجیب کھرکھراتی سی آواز نکلی۔ شاید موت کی دہشت نے اس کی آواز بگاڑ دی تھی۔

''نہیں...... فی الحال ہمیں اس کا حکم نہیں ملا ہے۔'' داؤد نے جواب دیا۔

امان اور عورت کے چہروں پر کسی حد تک زندگی کا رنگ لوٹ آیا۔ اگر وہ زندگی کا رنگ نہیں، تو کم از کم امید کا رنگ ضرور تھا۔

''لڑکی! تمہارا نام کیا ہے؟'' رمیز نے اچانک پوچھا۔ اس نے جان بوجھ کر اس عورت کو لڑکی کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اسے خیال آیا کہ عورت کہنا کہیں اسے ناگوار نہ گزرے۔ وہ ان دونوں میں سے کسی کی دل آزاری کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ ان کی کتنی زندگی باقی تھی۔

''نیلم۔'' رمیز نے دہرایا۔ ''نیلم تو پتھر ہوتا ہے۔ بے شک قیمتی ہوتا ہے لیکن بہرحال پتھر ہوتا ہے۔ تم تو......'' وہ کہنا چاہتا تھا۔ تم تو پھول کی طرح خوب صورت اور نرم و نازک ہو۔ مگر اسے بروقت احساس ہو گیا تھا کہ یہ اس قسم کی باتیں کرنے کا موقع نہیں تھا۔ سچی بات تو یہ تھی کہ یہ کسی بھی قسم کی فالتو باتیں کرنے کا موقع نہیں تھا۔ یہ تو صرف کام کی بات کرنے کا موقع تھا اور وہ بھی مختصر الفاظ میں۔

لڑکی یقیناً بہت ذہین تھی۔ سمجھ گئی تھی کہ رمیز کیا کہتے کہتے رک گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی رمق ابھری۔ اس نے قربان جانے والی نظروں سے امان کی طرف دیکھا اور اپنا مرمریں بازو اس کی گردن میں حمائل کرتے ہوئے مخمور سے لہجے میں بولی۔ ''امان سے ملنے سے پہلے میں پتھر ہی تھی۔ اب پھول بن گئی ہوں۔''

رمیز اور داؤد کے چہروں پر قدرے استہزائیہ سی مسکراہٹ ابھر آئی لیکن ان میں سے کسی نے بھی لڑکی کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ داؤد بولا۔ ''لڑکی! تم نے ''پارٹی'' کو جو نقصان پہنچانا تھا، پہنچا دیا تھا۔ تمہارا کام ختم ہو گیا تھا۔ تم بھاگ بھی سکتی تھیں۔ تم امان کے ساتھ کیوں لگی رہیں؟''

لڑکی نے خفگی سے اس کی طرف دیکھا اور گویا بُرا مناتے ہوئے بولی۔ ''میں بھلا امان کو چھوڑ کر کیسے بھاگ سکتی

تھی؟ اب تو نہ میں اسے چھوڑ کر بھاگ سکتی ہوں اور نہ ہی یہ مجھے چھوڑ کر بھاگ سکتا ہے۔ ہمیں ایک دوسرے سے محبت ہوگئی ہے۔ ہم نے ساتھ جینے مرنے کی قسم کھائی ہے۔''

رمیز اور داؤد نے بے یقینی اور تعجب سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ یہ گویا ان کے لیے کسی اور ہی دنیا کی باتیں تھیں۔ انہوں نے اب تک جس طرح کی زندگی گزاری تھی اور جس قسم کی تربیت سے وہ گزرے تھے، اس کے بعد ان کے ذہنوں میں عورت کا بس ایک ہی مصرف رہ گیا تھا۔ ان کا ذہن کبھی اس طرف گیا ہی نہیں تھا کہ عورت کو مرد سے، مرد کو عورت سے یا پھر دونوں کو ایک دوسرے سے ایسی محبت بھی ہوسکتی تھی جس میں ایک دوسرے کے لیے جان بھی دی جاسکتی تھی۔

اس لمحے امان بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بول اٹھا۔ ''یہ لڑکی یونہی خواہ مخواہ بیچ میں ٹانگ اڑا رہی ہے اور جذباتی باتیں کررہی ہے۔ اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ اسے میں نے قریبی گاؤں سے بلوایا ہے۔ صرف آج رات کے لیے۔ میں بہت تنہائی محسوس کررہا تھا۔ تمہیں معلوم ہے، کبھی کبھی انسان اپنے آپ کو بہت اکیلا محسوس کرتا ہے۔ قصوروار صرف میں ہوں۔ اس لڑکی کی کوئی غلطی نہیں۔ اس بے چاری کو تو کچھ معلوم بھی نہیں۔'' اس نے التجائیہ سے انداز میں باری باری رمیز اور داؤد کی طرف دیکھا۔

وہ دونوں بت کی طرح ساکت کھڑے تھے اور پلکیں جھپکائے بغیر امان کو دیکھ رہے تھے۔ دونوں میں سے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

امان نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر گویا انہیں قائل کرنے کی مزید کوشش کی۔ ''سب کچھ صرف میری غلطی سے ہوا، اور وہ غلطی مجھ سے نہ جانے کیوں اور کیسے ہوگئی۔ میں نے ایک اجنبی پر بھروسا کرلیا۔ بہرحال تم مجھے بابا کے پاس لے چلو، میں خود ان سے بات کرلوں گا۔ مجھے معلوم ہے، وہ مجھے معاف کردیں گے۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے، میں ان کا اکلوتا پوتا ہوں۔ تم بہرحال اس لڑکی کو جانے دو۔ اس کو اس معاملے میں گھسیٹنے کی ضرورت نہیں۔''

لڑکی نے اس دوران صرف ایک بار شکوہ آمیز سی نظروں سے امان کی طرف دیکھا لیکن کچھ بولی نہیں۔ رمیز گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ دل ہی دل میں سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ لڑکا واقعی بے وقوف تھا۔ کم از کم اپنی باتوں سے وہ بڑے ملک صاحب کا پوتا اور چھوٹے ملک صاحب کا بیٹا لگتا

گاواچی گان

''چین کی دھار مک کتھاؤں (مذہبی کہانیوں) میں اس کا ذکر کہیں موجود نہیں اور آج کی جدید نسل بھی اس عظیم کردار کی ادبی خدمات سے واقفیت نہیں رکھتی، کیونکہ اس پر تحقیق نہ ہونے کے برابر ہوئی۔ مشہور دانشور کنفیوشس بھی اس کا کسی نہ کسی وقت میں احسان مند ضرور رہا تھا۔ اس کو صرف نام کی مناسبت سے چین سے نسبت دی گئی ہے ورنہ یہ عالمی سرمایہ ہے ملکی یا علاقائی نہیں۔ گاواچی گان ایک گمشدہ دانشور تھی جس کے عظیم مقالات اور افکار آج بھی بہت ساری جگہ رائج ہیں جس میں صبر اور استقامت سرِفہرست ہیں، یہ بات الگ ہے کہ وہ اس سے واقف نہیں۔ اس کی عظمت کے لیے یہ دلیل کافی ہے کہ قدیم تہذیب کے کچھ پیروکار آج بھی اس کو مقدس سمجھتے ہیں۔ تاریخ کے اوراق اس کے متعلق خاموش ہیں مگر جابجا اس کے آثار ضرور ملتے ہیں۔ خصوصاً برصغیر پاک و ہند، جنوبی ایشیا، مشرق وسطیٰ اور عموماً پوری دنیا کے ممالک میں اس کے انتہائی عقیدت مند موجود ہیں۔ اس کی کوئی تصنیف منظرِعام پر نہیں آسکی اور نہ ہی ایسی کوشش کی گئی بلکہ اس کا طرزِعمل دیکھ کر ہی لوگوں نے اس سے زندگی گزارنے کا فن سیکھا۔ اس کے رویے اور معاونت سے اپنے مسائل کو حل کیا۔ فطرت سے اس کی وابستگی بہت دیدنی تھی اس لیے اس کا زیادہ وقت باغات اور کھیتوں کے درمیان گزرتا تھا۔ اسے علاقائی ادب میں ارادتاً اور غیرارادتاً بھی تضحیک کا نشانہ بھی بنایا گیا مگر اس کے پایۂ استقامت میں کوئی لغزش نہیں آئی۔ اسے بطور ضرب المثل اور مزاح کے لیے بھی استعمال کیا گیا۔ اردو ادب کی تاریخ میں اس کو کتنا سراہا گیا اس کے متعلق میری اپنی تحقیق زیادہ نہیں مگر علامہ محمد اقبال جیسے عظیم شاعر نے بھی اس کو موضوعِ کلام رکھا تھا اور اس پر نظم لکھی تھی جس کا عنوان تھا ''گائے اور بکری'' آپ شاید سوچ رہے ہیں اس پوری نظم میں اس کا ذکر کہاں ہے تو جناب اس کا نام ذرا دوبارہ ملاحظہ فرمائیں۔ ''گواچی گاں'' گمشدہ گائے یعنی... the lost cow''

تحقیق و جستجو، سید شکیل حسین کاظمی

ہی نہیں تھا۔ اس کی اب تک جتنی ٹریننگ ہوئی تھی، رمیز کے خیال میں وہ ضائع ہی گئی تھی۔

امان کی باتوں کا کوئی جواب دیے بغیر رمیز اپنی گن کو انگلی پر گھماتے ہوئے نرمی سے بولا۔ ”تم دونوں بستر سے نکلو۔ کپڑے پہنو اور دس منٹ میں تیار ہو جاؤ۔ تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہے۔ داؤد اتنی دیر میں نیچے جا کر ہوٹل کا حساب کلیئر کر آئے گا۔ ہمیں تھوڑا سا سفر کرنا ہے۔ فوراً اٹھ جاؤ۔“

امان کے چہرے پر مایوسی کا سایہ لہرا گیا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کی کوئی بات نہیں سنی جائے گی۔ رمیز اور داؤد، بڑے ملک صاحب کے انتہائی خاص آدمی تھے۔ انہیں کسی انتہائی خاص مشن پر ہی بھیجا جاتا تھا۔ جس کام کے لیے بیس آدمیوں کو بھیجنا ضروری معلوم ہوتا تھا، اسے کرنے کے لیے وہ دو ہی کافی ثابت ہوتے تھے۔

امان نے عورت کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں بستر سے نکلنے لگے تو داؤد گھوم کر دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ وہ ہوٹل کا حساب کلیئر کرنے گیا تھا۔ رمیز بھی پیچھے ہٹ کر، دروازے کے قریب جا کر دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اب وہ بظاہر امان اور نیلم کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا لیکن امان کو معلوم تھا کہ رمیز اور داؤد کے جسم پر گویا بہت سی آنکھیں تھیں۔ امان تھوڑا سا بے وقوف، یا شاید ناتجربہ کار تو تھا لیکن اتنا وہ بھی جانتا تھا کہ جب رمیز اور داؤد کسی مشن پر ہوں اور ان کے ہاتھ میں گن ہو، تو وہ خواہ کسی طرف بھی دیکھ رہے ہوں، کسی نہتے آدمی کو تو کیا، کسی مسلح آدمی کو بھی ان کے حکم کے خلاف کوئی حرکت کرنے کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہیے۔

جب تک داؤد، ہوٹل کا حساب کلیئر کر کے آیا، تب تک امان اور نیلم تیار ہو چکے تھے۔ لڑکی کے چہرے سے تازگی غائب ہو چکی تھی۔ اس کی رنگت اڑی اڑی اور ہونٹ خشک دکھائی دے رہے تھے۔ امان بے خوف اور پُرسکون نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ امان اور نیلم کے پاس ایک، ایک چھوٹا سفری بیگ تھا جن میں پہیے لگے ہوئے تھے۔ وہ انہیں کھینچتے خود ہی آگے آگے چل دیے۔ رمیز اور داؤد ان کے پیچھے تھے۔ دونوں کے ہاتھ جیکٹوں کی جیبوں میں تھے لیکن امان اور نیلم کو معلوم تھا کہ جیکٹوں کی جیبوں میں چھپی ہوئی گنوں کا رخ ان کی طرف تھا۔

چند منٹ بعد وہ سفر شروع ہو گیا جو نیلم کے خیال میں موت کا سفر تھا مگر امان کے دل میں اُمید کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔

☆☆☆

جیپ ایک بڑے سے آہنی گیٹ کے سامنے جا کر رکی۔ اس وقت سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ گیٹ ایک بڑی سی چار دیواری میں نصب تھا جو گارے کی بنی ہوئی تھی لیکن اتنی موٹی اور اونچی تھی کہ کسی قلعے کی فصیل سے مشابہ معلوم ہوتی تھی۔

رمیز نے ہارن دیا تو چند لمحے بعد گیٹ کے اندر موجود ایک چھوٹا سا گیٹ کھلا۔ کسی شخص نے باہر جھانکا۔ وہ محض ایک ہیولے کی طرح دکھائی دے رہا تھا لیکن اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ ایک کیم شحیم آدمی تھا۔ اس کے کندھے پر خاصی بڑی سی گن تھی۔ غالباً ہلکی مشین گن تھی۔ اس نے طاقتور ٹارچ کی روشنی جیپ پر ڈالی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے داؤد کو دیکھا اور ٹارچ بجھا دی۔ چند سیکنڈ بعد بڑا گیٹ بے آواز طریقے سے کھل گیا۔ جیپ اندر چلی گئی۔

اندر تاریکی تھی لیکن جیپ اندر پہنچی اور گیٹ بند ہوا تو اندر روشنی پھیل گئی۔ گیٹ اتنا بڑا تھا کہ اس سے جہازی سائز کے ٹرک اور ٹریلر بھی گزر سکتے تھے۔ وہ جگہ ایک بڑا سا کمپاؤنڈ معلوم ہوتی تھی، جہاں سامنے ہی پختہ اینٹوں سے بنے کمروں کی قطار نظر آ رہی تھی۔ سب کمرے ایک جیسے تھے۔ ان میں ایک جیسے، لوہے کے دروازے اور لوہے کی سلاخوں والی کھڑکیاں تھیں۔ انہیں دیکھتے ہی کسی قسم کے قید خانے کا تصور ذہن میں آتا تھا۔ یہ مافیا کے بہت سے ٹھکانوں میں سے ایک ٹھکانا تھا جسے قید خانے کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا تھا لیکن اس وقت یہاں کوئی قیدی موجود نہیں تھا۔ یہ کمپاؤنڈ ایک قصبے سے کچھ فاصلے پر تھا۔ اس کے عقب میں سرخی مائل سی مٹی کے چند ٹیلے اور جھاڑ جھنکاڑ پھیلے ہوئے تھے۔ امان اور نیلم کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر انہیں یہاں تک لایا گیا تھا۔ اس جگہ کے بارے میں ابھی امان کو کچھ علم نہیں تھا۔ اندر پہنچ کر دونوں کی آنکھوں سے پٹیاں کھول دی گئی تھیں۔

گیٹ کھولنے والے کیم شحیم آدمی جیسا ہی ایک اور شخص بھی کمپاؤنڈ میں موجود تھا۔ اس کے پاس بھی سب مشین گن تھی۔ جیپ کا انجن بند ہو گیا اور چاروں افراد جیپ سے اُتر آئے۔ امان کو دیکھ کر وہ دونوں محافظ قسم کے کیم شحیم آدمی تعظیم کے لیے سینوں پر ہاتھ رکھ کر جھکے لیکن پھر شاید امان کے ہاتھوں میں المونیم کی ہتھکڑی دیکھ کر انہیں حیرت کا جھٹکا لگا۔ دونوں ایک جھٹکے سے بیک وقت سیدھے ہو گئے۔ ان

کے چہرے سپاٹ نظر آنے لگے۔ نیلم کے ہاتھوں میں بھی المونیم کی ہتھکڑیاں تھیں۔ دونوں محافظوں کے چہرے تو سپاٹ نظر آنے لگے تھے لیکن ان کی آنکھوں میں ایک سوال تھا۔

''چھوٹے ملک صاحب بھی اس وقت قیدی ہیں۔'' داؤد نے گویا گارڈز کے خاموش سوال کا جواب دیا۔

''تم اگر پہلے مجھے دادا جان کے پاس لے چلتے تو اچھا تھا۔'' امان نے کھنکھار کر گلا صاف کرنے کے بعد داؤد کو مخاطب کیا۔

''ہم اس طرح کر رہے ہیں جو بڑے ملک صاحب نے ہمیں حکم دیا ہے۔'' داؤد نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''اب آگے کیا کرنا ہے، یہ پوچھنے کے لیے ہمیں دوبارہ ان کے پاس جانا ہے۔''

''میرا خیال ہے، تم ٹھیک نہیں کر رہے۔'' امان بولا۔ اس کا چہرہ سُتا ہوا سا لگ رہا تھا۔

داؤد خاموش رہا۔

''اچھا چلو...... نیلم کو تو چھوڑ دو، میں نے تمہیں بتایا نا کہ......'' امان کا جملہ ادھورا رہ گیا۔

نیلم اس کی بات کاٹتے ہوئے مضبوط لہجے میں بول اٹھی۔ ''میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔''

ایک لمحے کے لیے کمپاؤنڈ میں گہرا سناٹا چھا گیا۔ پھر رمیز نے دروازہ کھٹکھٹانے کے سے انداز میں عقب سے داؤد کے کندھے پر آہستگی سے ہاتھ مارا اور گویا محفل برخاست کرتے ہوئے کہا۔ ''چلو...... چلیں۔''

اس نے ہتھکڑیوں کی چابیاں ایک گارڈ کے حوالے کر دیں۔ وہ دونوں دوبارہ جیپ میں جا بیٹھے۔ گارڈ نے گیٹ کھول دیا اور جیپ ریورس میں ہی کمپاؤنڈ سے نکل گئی۔

☆☆☆

رمیز اور داؤد جب بڑے ملک صاحب کے گھر پہنچے تو تازہ دم تھے۔ وہ ایک رات آرام کرنے کے بعد وہاں پہنچے تھے۔ بڑے ملک صاحب کا محل نما گھر ایک سرسبز پہاڑی پر واقع تھا۔ وہ تاج محل تو نہیں تھا لیکن بہرحال تاج محل کی طرح سارے کا سارا سنگِ مرمر سے بنا ہوا تھا۔ دن کی روپہلی دھوپ میں وہ چاندی کے محل کی طرح چمکتا تھا لیکن ڈوبتے سورج کی کندنی دھوپ میں سونے کے محل کی طرح دکھائی دینے لگتا تھا۔ یعنی دن میں اس کا رنگ کچھ اور ہوتا تھا، شام ہوتے ہوتے کچھ اور دکھائی دینے لگتا تھا۔

بڑے ملک صاحب یہاں اپنے اکلوتے بیٹے، اس کی بیوی، یعنی اپنی بہو اور اکلوتے پوتے امان کے ساتھ رہتے تھے، جو فی الحال قید خانے میں تھا۔ بڑے ملک صاحب کے بیٹے ارباز کو صرف ''ملک صاحب'' کہا جاتا تھا۔ رسمی طور پر وہی اب مافیا یا ''پارٹی'' کا سربراہ تھا۔ روٹین کے کام اس کے حکم سے چل رہے تھے۔ خاص کاموں میں اب بھی بڑے ملک صاحب کا حکم چلتا تھا۔ بڑے فیصلوں کا اختیار انہی کے پاس تھا۔ ایک طرح سے مافیا کے اصل سربراہ اب بھی وہی تھے، صرف اپنا بوجھ کم کرنے کے لیے انہوں نے روٹین کے کام ''ملک صاحب'' کے سپرد کر دیے تھے۔

امان کو ''چھوٹے ملک صاحب'' کہا جاتا تھا۔ ''پارٹی'' کے بعض خاص لوگوں کا خیال تھا کہ بڑے ملک صاحب اپنا ''اقتدار'' دراصل اپنے پوتے امان، یعنی چھوٹے ملک صاحب کو سونپنے کا فیصلہ تو کر چکے تھے، بس اس کا اعلان کرنے کے لیے انہیں کسی موزوں وقت کا انتظار تھا۔

مگر اب تو سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا تھا۔

گارڈز نے جب محل نما مکان کا بلند و بالا گیٹ ریموٹ سے کھولا اور رمیز نے جیپ ڈرائیو وے کی طرف گھمائی تو داؤد سحر زدہ سے انداز میں چاروں طرف دیکھتے

مشورہ

ایک صاحب نے نوجوان گداگر کا دستِ سوال دراز دیکھ کر ملامت بھرے لہجے میں کہا۔ ''ہٹے کٹے اور جوان آدمی ہو۔ بڑھے ہوئے بال اور داڑھی ترشوا کر صاف ستھرے کپڑے پہن لو تو معقول آدمی نظر آؤ گے... تم کو آسانی سے کہیں بھی ملازمت مل جائے گی... بھیک کیوں مانگتے ہو؟''

''کچھ دینا ہے تو دو ورنہ چلتے بنو۔'' گداگر نے اس سے زیادہ زہریلے انداز میں جواب دیا۔ ''مجھے تمہارے مشوروں کی کوئی ضرورت نہیں... پہلے میں بھی ایمانداری سے سرکاری نوکری کرتا تھا... اب اس سے کئی گنا زیادہ کماتا ہوں... منہ اٹھا کر چلے آتے ہیں الٹے سیدھے مشورے دینے۔''

مرسلہ: عبدالغفار، کوثر کالونی اورنگی ٹاؤن

ہوئے بولا۔ ''میں جب بھی یہاں آتا ہوں، مجھے لگتا ہے جیسے میں چاند پر پہنچ گیا ہوں۔''

''فی الحال ہمیں بڑے ملک صاحب کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم زمین پر ہی رہو۔'' رمیز خشک لہجے میں بولا۔ اس کے انداز سے کچھ ایسا لگ رہا تھا، جیسے اس وقت اس کا ذہن کہیں اور تھا۔

بڑے ملک صاحب کو ان کی آمد کی اطلاع تھی۔ انہیں بیضوی شکل کے ایک بڑے سے ہال میں پہنچا دیا جہاں اس سرد موسم کو مزید سرد بنانے کے لیے دو چلرز آن تھے۔ رمیز اور داؤد اس کمرے میں پہنچے تھے تو انہیں بہت ٹھنڈ لگتی تھی لیکن چند منٹ بعد سردی کا احساس بہت کم ہو جاتا تھا اور انہیں وہ ٹھنڈک خوشگوار لگنے لگتی تھی۔ آرام دہ صوفے پر بیٹھے انہیں چند ہی منٹ گزرے تھے کہ ان کے لیے گرما گرم کافی آ گئی۔

انہوں نے کافی ختم ہی کی تھی کہ بڑے ملک صاحب آ گئے۔ رمیز اور داؤد ہڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ بڑے ملک صاحب کی آمد کا انداز اور حلیہ حسبِ معمول شاہانہ تھا لیکن ان کے چہرے پر خلافِ معمول کچھ افسردگی تھی۔ انہوں نے رمیز اور داؤد کو بیٹھنے کا اشارہ کیا تو ان کا انداز کچھ مضمحل سا تھا۔ وہ اپنے مخصوص، شاہانہ قسم کے صوفے پر بیٹھ گئے۔ کوئی بات کرنے سے پہلے ان کا سر ایک لمحے کے لیے جھک گیا۔ یہ بات بھی خلافِ معمول تھی۔ تاہم جب انہوں نے سر اٹھایا تو وہ گویا اندر ہی اندر سنبھل چکے تھے۔

''میرا اندازہ ہے کہ تمہیں ان دونوں کو ڈھونڈنے میں کچھ زیادہ مشکل پیش نہیں آئی؟'' ان کی بھاری آواز وسیع ہال نما کمرے میں گونجی۔ اس کمرے میں سبھی کی آواز کچھ گونجتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

''جی نہیں، ہماری خوش قسمتی تھی کہ وہ پہلی کوشش میں بارڈر کراس کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے اور دوسری کوشش کا انہیں موقع نہیں ملا۔'' داؤد نے جواب دیا۔

''عورت اسے چھوڑ کر نہیں گئی؟'' بڑے ملک صاحب کی کشادہ پیشانی پر شکنیں اُبھر آئیں۔

''جی نہیں...... اور لگتا ہے کہ وہ جائے گی بھی نہیں...... کسی بھی حال میں۔'' داؤد نے جواب دیا۔

''چاہے اسے بتا دیا جائے کہ اگر وہ نہیں گئی تو اسے گولی مار دی جائے گی؟'' بڑے ملک صاحب نے تصدیق چاہی۔

''جی ہاں، ان دونوں نے ساتھ جینے، ساتھ مرنے کی قسم کھالی ہے۔'' داؤد نے سر جھکا کر کہا۔

''اوہ میرے خدا......'' بڑے ملک صاحب کو گویا خفیف سا جھٹکا لگا۔ ''یہ کیا وہی نامراد محبت کا چکر ہے؟ پہلی نظر میں محبت والا قصہ ہے؟''

داؤد نے رمیز کی طرف دیکھا۔ گویا چاہ رہا ہو کہ اس سوال کا جواب وہ دے۔ رمیز نے ہولے سے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور حتی الامکان محتاط لہجے میں بولا۔ ''جی...... کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ پہلی نظر کی محبت نہ سہی...... پہلی پہلی ملاقاتوں یا پھر شاید پہلی پہلی راتوں کی محبت ہے۔ جو کچھ بھی ہے، بہرحال وہ اس معاملے میں بہت سنجیدہ لگتی ہے۔''

''اور امان بھی سنجیدہ ہے؟'' بڑے ملک صاحب نے پلکیں جھپکائے بغیر پوچھا۔

''وہ تو عورت سے بھی زیادہ سنجیدہ معلوم ہوتے ہیں۔'' رمیز نے جواب دیا۔

بڑے ملک صاحب نے گہری اور متاسفانہ سی سانس لی۔ ''یہ کم بخت محبت نام کی ناگن نوجوانی میں ہر ایک کو کم از کم...... ایک بار ضرور ڈستی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے ان کا سر جھک گیا اور دیر تک جھکا ہی رہا۔ وہ گویا مراقبے میں چلے گئے تھے۔ کمرے میں گہرا سکوت چھا گیا جیسے وہاں کوئی بھی موجود نہ ہو۔

آخر رمیز نے ہمت کر کے ایک بار پھر کھنکھار کر گلا صاف کیا اور دھیمے لہجے میں پوچھا۔ ''ہمارے لیے کیا حکم ہے صاحب؟''

بڑے ملک صاحب نے سر اٹھایا تو نہ جانے کیوں ان کی آنکھیں قدرے سرخ نظر آ رہی تھیں اور چہرہ پتھرایا ہوا سا لگ رہا تھا۔ ان کی آواز گویا کسی غار سے آئی۔

''دونوں کے لیے سزائے موت......''

رمیز اور داؤد کو کچھ یوں لگا جیسے فرش ان کے پیروں تلے سے اچانک ہٹ گیا ہو اور وہ کسی گہری کھائی میں جا گرے ہوں۔ چند سیکنڈ کے لیے تو ان میں سے کوئی کچھ نہ بول سکا۔ ان کی زبانیں گویا مفلوج ہو گئی تھیں۔

رمیز نے بڑی ہمت کر کے مشکل سے پوچھا۔ ''صاحب! چھوٹے ملک صاحب کو بھی......؟''

''ہاں، اس کے لیے تو سزائے موت زیادہ ضروری ہے۔'' بڑے ملک صاحب کے لہجے میں ہلکی سی افسردگی ضرور تھی لیکن وہ لہجہ بہرحال اٹل اور فیصلہ کن تھا۔ ''عام اور



خاص، سب کارکنوں کے لیے پارٹی سے غداری یا پارٹی کے مفاد کے خلاف کام کرنے کی سزا موت ہے۔ جو سزا سب لوگوں کے لیے ہے، وہی چھوٹے ملک صاحب کے لیے ہو گی۔ رہی بات اس عورت کی...... وہ مخبر ہے۔ اسے مارنے میں کافی خطرات ہیں...... لیکن کیا کریں؟ اس کے سر پر بھی اگر محبت کا بھوت سوار ہے اور وہ مرنے کے لیے تیار ہے تو اسے مرنے دو۔ ہم کیا کر سکتے ہیں۔''

بڑے ملک صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک لمحے کے لیے یوں لگا جیسے وہ اپنے کندھوں پر منوں وزن لے کر اٹھے ہوں۔ ان کا انداز ایک کمزور آدمی کا انداز محسوس ہوا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل گئے اور ہمیشہ کی طرح ایک مضبوط انسان دکھائی دینے لگے۔

''جب کام ختم ہو جائے تو سیٹلائٹ فون کے ذریعے مجھے خبر دینا۔ عام موبائل فون استعمال نہیں کرنا...... اور ہاں...... عورت کی لاش کسی کو ملنی نہیں چاہیے۔'' انہوں نے ٹھہرے لہجے میں ہدایات دیں اور اندر جانے کے لیے مڑ گئے۔

رمیز اور داؤد اس وقت تک گم صم سے کھڑے رہے تھے۔

☆☆☆

ایک بار پھر رمیز اور داؤد اسی چار دیواری کے اندر کھڑے تھے جو گارے، مٹی کی بنی ہوئی تھی مگر کسی چھوٹے موٹے قلعے کی فصیل سے مشابہ تھی۔ اس بار وہ زیادہ لمبا سفر کر کے نہیں آئے تھے لیکن پہلے سے زیادہ تھکے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے کندھے جھکے ہوئے تھے۔ بڑے ملک صاحب کے حکم پر عمل درآمد کرنا ان کے لیے کوئی آسان کام نہیں تھا۔ امان کو وہ دونوں پسند کرتے تھے۔ ان کی نظر میں وہ ایک اچھا لڑکا تھا لیکن اس نے جو غلطی کی تھی، اس کی توقع انہیں بھی نہیں تھی۔

وہ دونوں اس وقت کمروں کی قطاروں کے پیچھے، کھلے حصے میں کھڑے تھے جو کسی چھوٹے موٹے میدان سے کم نہیں تھا۔ یہاں کی زمین کچی تھی۔ اس پر کہیں کہیں خود رو گھاس اگی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر میں گارڈز دونوں قیدیوں کو لے آئے۔ یہ گارڈز وہ نہیں تھے جن سے رمیز اور داؤد کا پچھلی مرتبہ سامنا ہوا تھا لیکن یہ بھی انہی کی طرح کیم شحیم تھے اور ان کے چہروں پر بھی کرختگی تھی۔ امان اور نیلم کے ہاتھوں میں اس وقت ہتھکڑیاں نہیں تھیں۔ دونوں گارڈ سب مشین گنز لیے ان دونوں کے پیچھے پیچھے آرہے تھے۔

دونوں قیدیوں کے چہروں پر گہری سنجیدگی تھی، تاہم وہ خوف زدہ اب بھی نہیں تھے۔

رمیز اور داؤد سے چھ سات فٹ کے فاصلے پر دونوں قیدی رک گئے۔ گارڈز ان کے پیچھے سے ہٹ کر، دائیں بائیں، تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے چہرے سپاٹ تھے۔ امان نے باری باری رمیز اور داؤد کے چہروں کا جائزہ لیا۔ ان کے چہروں پر گو کہ کوئی تاثر نہیں تھا لیکن امان مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں سمجھ گیا ہوں، تم دادا کا کیا پیغام لائے ہو۔'' پھر اس نے گویا تصحیح کی ''پیغام نہیں بلکہ فیصلہ......''

رمیز اور داؤد خاموش رہے۔ وہ دونوں کچھ ایسا محسوس کر رہے تھے جیسے ان کے پاس بولنے کے لیے کوئی لفظ ہی نہ رہا ہو۔ دل کی گہرائی میں کہیں افسردگی کی کوئی لہر تھی۔

''لڑکی! تم چاہو تو جا سکتی ہو۔'' چند لمحوں کی کشیدگی زدہ خاموشی کے بعد داؤد بولا۔ ''ہمارا کوئی آدمی تمہاری آنکھوں پر پٹی باندھ کر تمہیں یہاں سے، بہت دور چھوڑ آئے گا۔''

''امان کے بغیر میں کہیں نہیں جاؤں گی۔'' نیلم کا لہجہ اٹل تھا۔

امان، نیلم کی طرف دیکھ کر یوں مسکرایا جیسے اسے نیلم پر فخر محسوس ہوا ہو لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اس سے مخاطب

ہوا تو اس کے لہجے میں ہلکی سی افسردگی تھی۔ ''تم چلی جاؤ نیلم! تمہارا تو کوئی قصور نہیں، کوئی غلطی نہیں۔ تم تو اپنا کام کر رہی تھیں، جو کئی سال سے کرتی آ رہی ہو۔ غلطی تو میری تھی۔ میں نے اپنی ٹریننگ سے کچھ نہیں سیکھا۔ مجھے یاد نہیں رہا کہ معاملہ صرف نفع نقصان کا نہیں تھا۔ نفع نقصان سے کہیں زیادہ اہم دادا کے اصول تھے، پارٹی کے قوانین تھے۔ ہمارا اپنا ایک آئین ہے جو ہمارے لیے دوسرے ہر آئین سے زیادہ اہم ہے۔ میں تمہیں حکم دے رہا ہوں، تم چلی جاؤ۔''

''میں تمہارا یہ حکم نہیں مانوں گی۔ اس کے علاوہ کوئی بھی حکم دے دو۔'' نیلم کے لہجے میں ذرا بھی لچک نہیں تھی۔

رمیز اور داؤد کی ڈھیلی ڈھالی قمیصوں کے نیچے سے گنز باہر آ گئیں۔ امان نے ایک گہری اور شکست خوردہ سی سانس لے کر نیلم کی طرف سے نظر ہٹالی۔ نیلم یکدم اس کے سامنے آ گئی اور گویا اس کی ڈھال بن گئی۔

''پہلے مجھے گولی مارو۔'' وہ دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولی۔

پہلے اور بعد کا کوئی سوال ہی نہ رہا۔ رمیز اور داؤد کی گنز بیک وقت گرجیں۔ گولیاں نیلم اور امان کے جسموں سے ایک ساتھ پار ہو گئیں۔ شاید دونوں کے دل سے گزری تھیں۔ دونوں اس طرح کچی زمین پر گرے کہ نیلم کا سر امان کے سینے پر تھا۔

''گواہ رہنا...... کہ ہم جیسی...... لڑکیاں بھی وفا...... کرنا جانتی...... ہیں......'' نیلم کے حلق سے نکلنے والی خرخراتی اور ٹوٹتی ہوئی سی آواز رمیز اور داؤد نے بھی سنی۔ پھر نیلم کے منہ سے خون ابل پڑا اور اس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔

امان کچھ نہ بول سکا، تاہم اس نے بازو یوں بلند کیے جیسے نیلم کو بانہوں میں سمیٹ لینا چاہتا ہو، لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ اس کے بازو ڈھیلے ڈھالے انداز میں زمین پر آ گرے اور آنکھیں بند ہو گئیں۔ اس کا منہ بھی بند تھا لیکن اس کی باچھوں سے خون بہہ رہا تھا۔ رمیز اور داؤد کی گنز دوبارہ قمیصوں کے نیچے چلی گئیں۔ لاشیں گرانا اور لاشیں دیکھنا ان کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن اس وقت گویا وہ ان دو لاشوں کی طرف دیکھ نہیں پا رہے تھے۔

وہ واپس جانے کے لیے گھوم گئے اور گارڈز کو دیکھے بغیر ان سے مخاطب ہوئے۔ ''دونوں کو یہیں دفن کرا دینا۔''

انہوں نے گارڈز کے جواب کا انتظار نہیں کیا اور کمپاؤنڈ کے سامنے والے حصے کی طرف چل دیے جہاں ان کی جیپ کھڑی تھی۔ اس عقبی احاطے میں اور بھی کئی لاشیں دفن تھیں لیکن کسی کی کوئی قبر نہیں بنائی گئی تھی۔ کچی زمین ہموار تھی۔

جیپ کمپاؤنڈ سے باہر آئی تو سورج غروب ہونے لگا تھا۔ رمیز خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ داؤد بھی چپ تھا۔ ویران اور اونچے نیچے پہاڑی راستوں پر جیپ کی ہلکی سی گھرگھراہٹ کے علاوہ کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

خاصے طویل سکوت کے بعد داؤد اچانک بول اٹھا۔ ''یار...... یہ محبت کیا ہوتی ہے؟''

''مجھے کیا پتا یار......'' رمیز ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ''میرے لیے بھی یہ اسی طرح کوئی انجانی چیز ہے، جس طرح تمہارے لیے......''

''ہاں، ٹھیک کہہ رہے ہو، مجھے یہ سوال تم سے کرنا ہی نہیں چاہیے تھا۔'' داؤد معذرت خواہانہ سے لہجے میں بولا۔ ''ہم شاید کسی اور دنیا کے لوگ ہیں۔ محبت کرنے والے کسی اور دنیا کے لوگ ہوتے ہیں۔''

ایک لمحے کی ہچکچاہٹ آمیز خاموشی کے بعد رمیز بولا۔ ''مگر امان تو ہماری ہی دنیا کا آدمی تھا۔''

''ہاں، یہ بھی تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' داؤد نے تسلیم کیا اور ایک لمحے کے توقف کے بعد بولا۔ ''یوں تو نیلم بھی ایک طرح سے، ہم سے ہی کچھ ملتی جلتی دنیا کی عورت تھی۔ ہم میں اور اس میں یہی فرق تھا کہ اس کی دنیا، لکیر کے اس طرف تھی اور ہماری دنیا لکیر کے اس طرف۔''

''کچھ بھی ہو...... بہرحال...... آج ان دونوں کو گولی مار کر دل اُداس ہو گیا۔'' رمیز کے لہجے سے واقعی افسردگی جھلک رہی تھی۔ ''اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔''

''ہاں یار! یہ بات تو ہے۔'' داؤد نے اس سے اتفاق کیا اور چہرہ کھڑکی کی طرف کر لیا۔ گو کہ اس وقت تک سرمئی شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے اور جیپ کے اندر تقریباً اندھیرا ہی تھا، پھر بھی داؤد کو اندیشہ تھا کہ اس کی آنکھوں میں جھلملاتی نمی کو رمیز نہ دیکھ لے۔

دور کہیں کسی پرندے کی تیز سی آواز اچانک اُبھری اور فوراً ہی معدوم ہو گئی۔ داؤد کو یہ آواز کسی انسانی چیخ جیسی محسوس ہوئی۔ شاید کسی شاخ پر موجود پرندے کو جنگلی بلی یا کسی اور درندے نے دبوچ لیا تھا۔

❖❖❖

دھچکا

جمال دستی

رشتوں کی تلاش وقت کے ساتھ مشکل سے مشکل ہوتی جارہی ہے۔ شریف النفس اور پُرخلوص لوگ ہی پہلا انتخاب قرار پاتے ہیں۔ ایک ایسے ہی شخص کا ماجرا جو اپنی ازدواجی زندگی کا آغاز چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں خوش قسمتی سے ایک من چاہی عورت اس سے ٹکراگئی...

خوشحالی کے راستوں کو ہموار کرنے کے لیے لالچ کا سہارا لینے والوں کا حیرت انگیز انجام

میرج بیورووالے نثار احمد نے سفیر احمد کو چالیس سے پینتالیس سالہ کاشفہ صدیقی کے رشتے سے مطلع کرتے ہوئے بتایا تھا کہ اس کے آگے پیچھے کوئی موجود نہیں۔ وسیع و عریض بنگلے میں اکیلی رہتی ہے اس لیے باقی کے معاملات ان دونوں کو خود طے کرنا ہوں گے۔ اس نے ڈور بیل پر ہاتھ رکھ دیا۔ کچھ دیر بعد جس عورت نے دروازہ کھولا، اس کی شکل وصورت معمولی، رنگ سانولا اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ وہ قیمتی کپڑوں میں ملبوس تھی۔ نثار احمد کا حوالہ



دیتے ہوئے اس نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔ عورت نے اسے اندر آنے کے لیے کہا۔ وہ اس کے پیچھے چلتا ہوا ڈرائنگ روم میں آگیا۔ قیمتی صوفوں کے درمیان شیشے کی میز پر چائے کے لوازمات موجود تھے۔ وہ صوفے پر بیٹھ گیا تو عورت بولی۔ ''میں کاشفہ صدیقی ہوں اور حلقۂ احباب میں کاشی کے نام سے جانی جاتی ہوں۔ نثار احمد سے تمہارے متعلق تفصیلی بات چیت ہو چکی ہے اس لیے تکلفات کو برطرف رکھتے ہوئے اگر معاملات پر کھل کر بات چیت کرلی جائے تو میرے خیال میں بہتر ہوگا۔''

سفیر احمد نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ نکال کے اسے سلگاتے ہوئے بتایا۔ ''میں حال ہی میں اپنی بیوی کو طلاق دے چکا ہوں اور ماضی میں ہونے والی غلطیوں کو دہرانا نہیں چاہتا اس لیے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے تمہیں چند باتوں کے متعلق بتانا ضروری خیال کرتا ہوں۔ مجھے محنت مشقت سے قطعی دلچسپی نہیں۔ باہر کا کام تمہیں سنبھالنا ہوگا اور اپنی انکم میں سے تیس ہزار کی رقم مجھے ماہانہ دینا ہوگی۔''

''میں اس کے لیے بہ خوشی تیار ہوں۔ تمہیں سب کچھ گھر بیٹھے مل جائے گا۔ دولت کی میرے پاس کمی نہیں۔ صرف اچھے اور مخلص ساتھی کی ضرورت ہے۔''

سفیر احمد تلخ لہجے میں بولا۔ ''میری بات مکمل نہیں ہوئی۔ بے تحاشا سگریٹ نوشی نے میرے پھیپھڑوں کو تباہ کر دیا ہے...... محنت طلب کام نہیں کر سکتا لیکن تم پر بوجھ نہیں بننا چاہتا۔ اس لیے کوئی مناسب کام کرنا چاہتا ہوں اور اس کے لیے میرے پاس رقم نہیں ہے۔''

''تمہیں کتنی رقم درکار ہے؟'' کاشی نے پوچھا۔

''میں ایک چلتے ہوئے اسکول کو مع عمارت خریدنا چاہتا ہوں۔ اسکول تین لاکھ روپے ماہانہ کا منافع دے رہا ہے اور اس کی قیمت پچاس لاکھ روپے ہے۔''

کاشی بولی۔ ''میں اتنی بے وقوف نہیں ہوں جو اتنی آسانی سے تمہیں رقم دے دوں اور تم رقم لے کر فرار ہو جاؤ۔''

''مجھے رقم نہیں چاہیے۔ اسکول اور اس کی زمین کے کاغذات کی مالک تم ہوگی۔ میں صرف پرنسپل کی کرسی سنبھال کر کام کروں گا اور اس کے عوض تم مجھے تیس ہزار روپے ماہانہ دو گی۔''

کاشی سوچ میں پڑ گئی۔ بات معقول تھی۔ اگر ماہانہ منافع تین لاکھ تھا تو رقم لگانے میں مضائقہ نہیں تھا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے پوچھا۔ ''مجھے تفصیل بتاؤ، اسکول کے اخراجات کتنے ہیں۔ اسٹاف کو کس تناسب سے تنخواہ دی جا رہی ہے اور بچوں کی تعداد کتنی ہے؟''

''بچوں کی تعداد پانچ سو ہے اور فی بچہ ہزار روپے فیس وصول کی جا رہی ہے۔ ڈیڑھ لاکھ تنخواہوں کی مد میں ٹیچروں کو دے دیا جاتا ہے اور پچاس ہزار کی رقم پانی، گیس، بجلی اور ٹیلی فون کے بلوں کی نذر ہو جاتی ہے۔ یوں لگی بندھی تین لاکھ کی رقم منافع میں شمار ہوتی ہے۔''

کاشی کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''اگر کاروبار میں نقصان ہوا تو تمہارا تو کچھ نہیں جائے گا۔ میری تمام رقم برباد ہو جائے گی۔''

سفیر احمد نے بتایا۔ ''ہم عمارت خریدنے سے قبل ایک ایگریمنٹ سائن کریں گے جس کے مطابق اگر اسکول دیوالیا ہوا۔ تب میں تمہیں پچاس لاکھ کی رقم دوں گا۔''

کاشی نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ ''اور تم یہ رقم کہاں سے لاؤ گے؟''

''میں اتنا گیا گزرا بھی نہیں ہوں۔ جتنا تم نے خیال کر لیا ہے۔ میری رہائش گاہ کی قیمت ڈیڑھ کروڑ ہے۔ میں اسے فروخت نہیں کرنا چاہتا۔ تاہم اگر نقصان ہوا تب آخری اقدام کی صورت میں فروخت کر کے تمہاری رقم ادا کروں گا۔''

کاشی کے چہرے پر اطمینان کے تاثرات نمودار ہوئے اور اس نے تھرموس میں سے چائے نکال کر کپ سفیر احمد کے سامنے رکھ دیا۔

''ابھی میری بات مکمل نہیں ہوئی۔'' سفیر احمد بولا۔ ''ہم دونوں ایک دوسرے کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ اپنے متعلق بتانے کے لیے میرے پاس اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ میری بیوی شفا علی کو اخبار کے رپورٹر سے محبت ہوئی اور اس نے مجھ سے طلاق کا تقاضا کیا۔ میں اُسے طلاق نہیں دینا چاہتا تھا لیکن اس کے اصرار پر مجھے مجبوراً طلاق دینا پڑی۔''

کاشی تاسف بھرے لہجے میں بولی۔ ''اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ طلاق کے بعد تم تو تنہا ہو کر رہ گئے ہو گے؟''

''مجھے تنہائی سے محبت ہے اور میرے پاس اچھا وقت گزارنے کے بہترین اسباب موجود ہیں۔ وہ صبح نوکری پر جاتی تھی۔ اس کی واپسی پانچ بجے ہوتی تھی۔ اس دوران میں گھر میں عموماً اکیلا ہوتا تھا۔'' اس نے انگلیوں میں انگارا بنتے ہوئے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل دیا پھر سوالیہ لہجے میں پوچھا۔ ''اور تمہاری شادی ناکام کیوں

ہوئی؟''

کاشی نے بتایا۔''شادی سے قبل اُسے میری شکل و صورت پر اعتراض نہیں تھا لیکن دو ماہ گزرنے کے بعد خامیاں دکھائی دینے لگیں۔ بات بات پر لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے۔ میں نے نبھانے کی بے حد کوشش کی لیکن نبھ نہ سکی اور اس نے مجھے طلاق دے دی۔ ایک ہفتہ قبل نثار احمد سے تمہارے متعلق بات چیت ہوئی۔ آج دوپہر اس نے تمہاری تصویر سینڈ کی اور میں نے ملاقات کا وقت دے دیا۔''

سفیر احمد خاموشی کے ساتھ چائے پینے لگا۔ چائے کاشی کی شخصیت کے مانند پھیکی اور بدمزہ تھی لیکن اسے اس کی شخصیت سے سروکار نہیں تھا۔ وہ صرف اسکول کی عمارت خرید کر شفا علی کو مرعوب کرنا چاہتا تھا۔ اسے سبق دینے کے بعد وہ کاشی کو طلاق دے کر فارغ کرسکتا تھا۔ چائے پینے کے دوران خاموشی طاری رہی پھر سفیر احمد نے جلد ملاقات کا وعدہ کرتے ہوئے رخصت لی اور بنگلے سے نکل آیا۔

☆☆☆

اُن کی دوسری ملاقات ایک ہفتے کے بعد ہوئی۔ اس نے کاشی کو رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ آسامی تگڑی تھی اس لیے کھانے میں خوب اہتمام کیا۔ گزشتہ روز اس کی بات چیت اپنی پہلی بیوی شفا علی سے ہوئی۔ وہ دوسرے شوہر کے ساتھ ہنی مون منانے کی نیت سے شمالی علاقہ جات جانے والی تھی۔ دورانِ گفتگو اس کے لہجے کی شوخی اور تحقیر آمیز انداز نے سفیر کو آگ بگولا کر دیا اور وہ تلخ لہجے میں بولا۔''میں جلد از جلد تمہارے اسکول کی عمارت کو خریدنے والا ہوں۔ اگر تم ہنی مون پر جانے کا ارادہ ملتوی کر دو تو تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔''

شفا علی کی طنزیہ آواز سنائی دی۔''اسکول کی عمارت میں خرید چکی ہوں۔ رقم کی ادائیگی سال کے بعد کر دوں گی۔ تاہم اگر اس عرصے کے دوران تم اسکول کی عمارت خریدنا چاہتے ہو تو پچاس لاکھ سے اوپر کا انتظام کر کے خرید سکتے ہو، مجھے اعتراض نہیں۔''

''رقم کا انتظام میں کر چکا ہوں۔ میری بیوی کروڑ پتی عورت ہے۔ وہ ساٹھ لاکھ میں بھی عمارت خریدنے کے لیے تیار ہے۔ تم اپنی فکر کرو۔ عمارت خریدنے کے فوراً بعد میں تمہیں ٹیچنگ کی نوکری سے برطرف کر دوں گا۔''

اُسے شفا علی کا ہیجانی قہقہہ سنائی دیا۔''خوش فہمیوں میں رہنا چھوڑ دو اور جس کے ساتھ تعلق بنانے والے ہو، اس سے نبھانے کی کوشش کرو۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

اس فون کال کے بعد سفیر کے ارادوں میں مزید پختگی پیدا ہو گئی اور اس نے دل میں پکا تہیہ کر لیا کہ وہ جلد از جلد اسکول کی عمارت کو خرید کر شفا علی کو نوکری سے نکالنے کے بعد اپنی تضحیک کا بدلہ ضرور لے گا۔ آٹھ بجے کے قریب کاشی کی آمد ہوئی۔ اس نے تیار ہونے میں خاصا اہتمام کیا تھا۔ اس کے باوجود بھی چہرے پر کچھ خاص نکھار پیدا نہیں ہو سکا تھا۔ دونوں نے خاموشی کے ساتھ کھانا تناول کیا اور کافی کے کپ ہاتھوں میں لیے لان میں آ گئے۔ چودھویں کا چاند سامنے دکھائی دینے والے بنگلے کے پیچھے سے سر ابھار رہا تھا اور لان میں خوشگوار ٹھنڈک کا احساس پایا جاتا تھا۔ سفیر نے سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھا۔''شادی کے متعلق تمہارا اظہارِ خیال کیا ہے؟''

''شادی تو مجھے بہرحال کرنی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''لیکن عمر کے جس حصے میں قدم رکھ چکی ہوں۔ وہاں پسند ناپسند کو اہمیت حاصل نہیں۔ سنجیدگی اور تحفظ کا احساس چاہیے۔ تم نے گزشتہ ملاقات کے دوران میں مجھے شفا علی کے متعلق بتایا۔ غالباً وہ اس اسکول میں ٹیچر ہے جسے تم خریدنے کی بات کر رہے ہو۔ میں اس کے کردار سے خائف ہو گئی ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ تم اب بھی اس کی محبت میں گرفتار ہو اور اگر وہ اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنے کی کوشش کرے تب تم پس و پیش سے کام نہیں لو گے اس لیے تمہاری طرح میں بھی صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے اپنے تحفظ کی خاطر کچھ حفاظتی اقدام کرنا چاہوں گی۔ مجھے حق مہر میں رقم نہیں بلکہ تمہارے گھر کے کاغذات چاہئیں اور تمہیں یہ بھی لکھ کر دینا ہوگا کہ تم شفا علی سے کسی بھی قسم کا تعلق نہیں رکھو گے۔''

سفیر ہڑبڑا کر رہ گیا۔ اُس کے پاس گھر کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا۔ اگر وہ ہاتھ سے چلا جاتا تو وہ فٹ پاتھ پر آ جاتا۔ اس لیے چند لمحوں کی سوچ بچار کے بعد سگریٹ کا دھواں باہر اُگلتے ہوئے بولا۔''شفا علی اور میرا تعلق طلاق کے بعد ختم ہو چکا ہے۔ مجھے اس کے ساتھ کوئی سروکار نہیں اور بات رقم کی ہو یا پھر جائداد کی۔ اگر میں شادی کے بعد تمہیں طلاق دینا چاہوں تو رقم کا بندوبست کرنا میرے لیے ناممکن نہیں۔ اس کے علاوہ نکاح نامے میں بھی رقم کے علاوہ جائداد کے متعلق نہیں لکھا گیا۔ اس لیے اگر تم جائداد کے بجائے رقم لکھواؤ تو مجھے اعتراض نہیں ہوگا لیکن گھر

تمہارے نام کرنے والی بات سے میں قبل از وقت انکار کرتا ہوں۔''

کاشی بولی۔''ٹھیک ہے۔ تو پھر حق مہر کی رقم گھر کی قیمت کے برابر ہونی چاہیے۔ مجھے شادی سے قبل طلاق کے متعلق بات کرنا اچھا نہیں لگ رہا لیکن تحفظ کی نیت سے کر رہی ہوں۔''

سفیر پینترا بدلتے ہوئے بولا۔''اگر بات تحفظ کی حد تک محدود ہے تو پھر نکاح نامے میں چند الفاظ کا رد و بدل کر دیتے ہیں جن کے مطابق شادی کے بعد میں تمہیں طلاق نہیں دے سکوں گا اور خلاف ورزی کی صورت میں جو بھی جرمانہ مجھ پر عائد ہوگا، میں اُسے ادا کرنے کا پابند ہوں گا۔''

سفیر کی بات میں وزن تھا۔ حق مہر کی رقم یا پھر گھر اس کے نام کرنا کچھ خاص معنی نہیں رکھتا تھا۔ اگر اس سے طلاق دینے کا اختیار چھین لیا جاتا۔ تب وہ بے بس پرندے کی طرح بندھ کر رہ جاتا۔ اس صورت میں یقینی تحفظ بھی ہو جاتا اور بھرم بھی قائم رہتا۔ اس لیے اس نے فوراً اثبات میں سر ہلایا چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد وہ بولی۔''میں اسکول کی عمارت خریدنے سے قبل منافع کے متعلق اطمینان کرنے کے لیے پرنسپل کے ساتھ بیٹھ کر معاملات کا جائزہ لوں گی۔ اس کے علاوہ بننے والے کاغذات کی رُو سے عمارت کی مالک میں ہوں گی۔ تم حصے دار نہیں ہو گے۔''

سفیر سگریٹ کو پاؤں کے نیچے مسلتے ہوئے بولا۔ ''غالباً میں تمہیں پچھلی ملاقات کے دوران میں بتا چکا ہوں کہ مجھے اسکول کے کاغذات یا عمارت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں پرنسپل کی کرسی پر بیٹھ کر کام کرنا چاہتا ہوں اور عمارت خریدنے سے قبل تم ہر طریقے سے اپنا اطمینان کرنے کا حق رکھتی ہو۔ ہم چند دن اسکول کی عمارت اور کاغذات کا جائزہ لیں گے پھر مطمئن ہونے کے بعد بات چیت کا باقاعدہ آغاز کریں گے۔''

کاشی مطمئن ہوگئی۔

☆☆☆

ان دونوں کی تیسری ملاقات اسکول کی عمارت میں ہوئی۔ وہ جس علاقے میں واقع تھی وہ علاقہ کاروباری نقطۂ نگاہ سے موزوں نہیں تھا۔ کاشی نے اعتراض کیا تو سفیر نے اسے مطمئن کرنے کی نیت سے بتایا۔

''ہم چند ہی سالوں کے دوران میں اپنی رقم منافع کی صورت میں واپس حاصل کرنے کے بعد عمارت کو فروخت کر دیں گے۔ تب تک زمین کی قیمت بڑھ گئی ہو گی۔ اس لیے عمارت انہیں اچھا خاصا منافع دے گی۔''

کاشی ایک دفعہ پھر مطمئن ہوگئی۔ اسکول کی عمارت دس کمروں اور مختصر صحن پر مشتمل تھی۔ بچوں کی تعداد پانچ سو سے کچھ اوپر اور اسٹاف بارہ ٹیچروں پر مشتمل تھا۔ پرنسپل جہاندیدہ اور قابلِ ستائش شخصیت کی مالکہ تھی۔ سفیر نے آنے کا مدعا بیان کیا تو مسکراتے ہوئے بولی۔''اسکول کی عمارت فروخت ہونے کی بات چیت تکمیل کے مراحل میں ہے۔ تاہم پھر بھی اگر تمہیں عمارت خریدنے میں دلچسپی ہے تب میں پہلے معاہدے کو منسوخ کرتے ہوئے بات چیت کرنے کے لیے آمادہ ہوں لیکن معاہدہ پچاس لاکھ سے اوپر ہوگا۔''

سفیر کو شفا علی اس معاہدے کے متعلق بتا چکی تھی۔ اس لیے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔''تمہارا معاہدہ اگر شفا علی سے ہو چکا ہے تو میں تمہیں قبل از وقت بتا دوں کہ وہ سال کے بعد بھی عمارت خریدنے کی طاقت نہیں رکھتی اور سال کے بعد اسکول کو پچاس لاکھ میں بیچنا نہایت گھاٹے کا سودا ہوگا۔ بارہ مہینوں کے دوران زمین کی قیمت نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہوگی۔ بچوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوگا لیکن تمہیں لگی بندھی رقم ملے گی۔''

پرنسپل نے پوچھا۔''تم شفا علی کے متعلق کیسے جانتے ہو؟ کہیں تمہارا تعلق پراپرٹی کی خرید و فروخت سے تو نہیں؟''

''وہ میری سابقہ بیوی ہے اور چند ماہ قبل میں اُسے طلاق دے چکا ہوں۔ وہ تمہیں بے وقوف بنا رہی ہے۔ اس کے پاس پچاس لاکھ کی رقم نہیں ہے۔''

پرنسپل کے چہرے پر سوچ کے تاثرات پیدا ہوئے۔ وہ شفا کی طلاق سے آگاہ تھی اور اس کے دوسرے شوہر متین علی کو بھی جانتی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ سال کے دوران رقم کا انتظام کرنا ان دونوں کے بس کی بات نہیں تھی لیکن اسے بتایا گیا تھا کہ متین کا مکان چالیس لاکھ میں فروخت ہونے والا ہے اور دس لاکھ کا بندوبست کرنا ایک سال کے دوران ان کے لیے مشکل نہیں تھا اور سفیر کی اس بات میں بھی وزن تھا کہ ایک سال کے دوران نہ صرف زمین کی قیمت میں اضافہ ہونے کی توقع تھی بلکہ بچوں کی تعداد بھی بڑھ سکتی تھی۔ تاہم اسے رقم ایک سال پہلے کے معاہدے کے مطابق ہی ملتی۔ وہ اس کاروباری نقطہ نگاہ سے آگاہ تھی اور اس نے شفا علی کو بھی مطلع کر دیا تھا

کہ اگر کوئی بھی ایسا خریدار جو پچاس سے اوپر رقم دینے کے لیے آمادہ ہوا تب وہ معاہدے کو منسوخ کرتے ہوئے اسکول کی عمارت اس خریدار کے ہاتھوں فروخت کر دے گی۔ اس لیے چند لمحوں کی سوچ بچار کے بعد بولی۔ ”تو ٹھیک ہے۔ میں گزشتہ معاہدے کو منسوخ کرتی ہوں۔ اب تم سے معاملہ پچاس سے اوپر طے ہوگا۔“

سفیر نے تفہیمی نگاہوں سے کاشی کی طرف دیکھا، وہ سرگوشی بھرے لہجے میں بولی۔ ”مجھے پچاس میں بھی سودا گھاٹے کا دکھائی دیتا ہے۔ زمین کی قیمت علاقے کے لحاظ سے بہت زیادہ ہے اور مجھے اس بات میں بھی سچائی دکھائی نہیں دیتی کہ اسکول ماہانہ تین لاکھ کا فائدہ دے رہا ہے اور اگر دے رہا ہے تو پھر اسے فروخت کیوں کیا جا رہا ہے؟“

سفیر بولا۔ ”میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں کہ ہم اسکول کو پانچ چھ سال تک فروخت نہیں کریں گے اور اس کی ماہانہ انکم کی تفصیل تمہارے سامنے ہے۔ تم اس کا جائزہ لے سکتی ہو۔“

کاشی انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”پھر بھی میں پچاس سے اوپر رقم دینے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ تم اتنے میں ہی سودا طے کرنے کی کوشش کرو۔“

سفیر کو غصہ آگیا اور وہ کرسی چھوڑ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ”تو ٹھیک ہے پھر شادی کو بھی ختم ہی سمجھو۔ پرنسپل سے دماغ سوزی کی کیا ضرورت ہے۔ تم اپنی راہ لو اور میں اپنے راستے جاتا ہوں۔“

کاشی پریشان لہجے میں بولی۔ ”میں پچاس ہزار مزید دینے کے لیے تیار ہوں لیکن اس سے زیادہ نہیں۔ تم اپنی زبان میں پرنسپل سے بات کر لو۔“

سفیر نے پرنسپل کی طرف دیکھا۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے بتایا۔ ”مجھے باون لاکھ چاہئیں۔ اگر دے سکتے ہو تو کاغذی کارروائی کا آغاز کر دیتی ہوں ورنہ اسکول شفا علی کو دے دوں گی۔“

”باون بہت زیادہ ہیں۔ ہماری طرف سے آخری پیشکش اکیاون کی ہے۔ اس سے زیادہ دینا ہماری گنجائش سے باہر ہے۔“

پرنسپل سوچ میں پڑ گئی۔ وہ گزشتہ چند ماہ سے اسکول فروخت کرنے کی کوششوں میں مصروف تھی لیکن شفا کے سوا کوئی بھی پچاس لاکھ دینے کے لیے آمادہ نہیں ہوا تھا۔ اکیاون میں سودا تسلی بخش تھا۔ اس لیے تھوڑی سی پس و پیش کے بعد اس نے ہامی بھر لی۔ سفیر اور کاشی نے اسکول کی عمارت اور بچوں کی تعداد کا سرسری معائنہ کیا پھر واپس گھر آ گئے۔ دوسرے دن سے کاغذات کی جانچ پڑتال، اسٹاف سے بات چیت اور اخراجات کا جائزہ لینے کے بعد منافع کے متعلق حتمی رائے قائم کرنے کا کام شروع ہوا۔ منافع واقعی تسلی بخش تھا۔ کاشی مطمئن ہوگئی۔ اگلا ہفتہ کاغذات کی تکمیل کے دوران گزر گیا۔ پرنسپل کی کچہری میں واقفیت نے مہینوں کا کام ہفتوں میں کر دیا۔ اس دوران سفیر کو اسکول کے اسٹاف کی زبانی معلوم ہوا کہ شفا اپنے شوہر کے ہمراہ ہنی مون پر جا چکی ہے۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ اسکول کا سودا اس کی موجودگی میں ہوتا۔ تاکہ وہ کاغذات کی منتقلی کے فوراً بعد اسے نوکری سے برطرف کر سکتا۔ تاہم وہ اب بھی مایوس نہیں تھا۔ اس کے ہنی مون کو تباہ کرنے کا سنہری موقع اسے ملنے والا تھا۔ وہ فون کر کے اسے برطرفی کی خبر سنا کر حواس باختہ کر سکتا تھا۔

کاغذات کی تکمیل کے بعد رقم پرنسپل کے کھاتے میں منتقلی کے وقت سفیر کو کاشی کی ہمراہی میں بینک جانا پڑا۔ اسے یہ دیکھ کر خوشی اور اپنے انتخاب پر فخر محسوس ہوا۔ بینک کے عملے کی نگاہوں میں کاشی کے لیے محبت و احترام کا انتہائی جذبہ پایا جاتا تھا۔ وہ کاشی کے اکاؤنٹ کی تفصیل سے واقفیت نہیں رکھتا تھا لیکن بینک والوں کے رویے کو دیکھ کر اسے اندازہ لگانے میں مشکل پیش نہیں آئی کہ وہ بینک کی نہایت اہم اور مستحکم اکاؤنٹ ہولڈر تھی۔ ایک ہفتے کے دوران کاغذات کاشی کے نام منتقل ہو گئے اور پرنسپل کو رقم دینے کے بعد وہ قانونی طور پر اسکول کی عمارت کی مالک بن گئی۔ اس کے بعد اس نے سفیر احمد پر زور دینا شروع کر دیا کہ انہیں شادی کر لینی چاہیے۔ سفیر کو اعتراض نہیں تھا لیکن حق مہر میں ردوبدل والی بات اس کے گلے کا پھندا بننے لگی۔ کاشی کا اصرار حد سے بڑھا تب مجبوراً وہ اسے ہمراہ لے کر وکیل کے پاس چلا آیا اور اسے معاملے کے متعلق بتانے کے بعد مشورہ طلب کیا۔

وکیل بولا۔ ”اگر آپ کی بیوی حق مہر کی رقم سے مطمئن نہیں تو اپنے اطمینان کے لیے نکاح نامے میں ردوبدل کر سکتی ہے۔ تاہم آپ کو سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا ہوگا۔ کاغذات کی تکمیل کے بعد آپ حکم عدولی کے مرتکب نہیں ہو سکیں گے اور اگر ہوئے تو سزا کے علاوہ جرمانہ بھی ادا کرنا ہوگا۔“

سفیر بولا۔ ”ہم باہمی مشورے کے بعد آپ کے پاس آئے ہیں۔ آپ کاغذات مکمل کر لیجیے۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔“

وکیل نے اثبات میں سر ہلایا اور دونوں کمرے سے

باہر آگئے۔ اگلے چند دنوں کے دوران ان دونوں نے شادی کرلی۔ جلد ہی اسے معلوم ہوگیا کہ کاشی نہایت سلجھی ہوئی فرمانبردار عورت ہے۔ اب وہ شفا کو اپنے انتخاب سے مطلع کرنے کے بعد یہ احساس دلانا چاہتا تھا کہ اگر اس نے سفیر احمد کے ساتھ بے وفائی کی تھی تو کاشی نے اس کی بے وفائی کا ازالہ کردیا تھا۔ اسے صرف تنہائی کی ضرورت تھی تا کہ وہ اطمینان کے ساتھ اس سے بات چیت کر سکے۔ چند دنوں کے بعد کاشی نے اپنے کام پر جانا شروع کردیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سفیر نے شفا علی کا نمبر ڈائل کیا تو فوراً ہی اس کی غصیلی آواز سنائی دی۔

''میری شادی ہو چکی ہے اس لیے فون کرنا بند کر دو۔ ورنہ تمہارے خلاف کارروائی کروں گی۔''

سفیر نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بتایا۔ ''میں اسکول مع عمارت اکیاون لاکھ کی رقم کی ادائیگی کے بعد خرید چکا ہوں اور تمہیں کچھ ہی دنوں میں نوکری سے برطرف کرنے والا ہوں۔ اس لیے ہنی مون کو ملتوی کر کے جلد از جلد واپس آنے کی کوشش کرو۔ ورنہ حالات کی ذمے دار تم خود ہوگی۔'' وہ تصور میں اس کے حیرت بھرے چہرے کو دیکھ کر مسرت محسوس کررہا تھا۔ اسے شفا کی آواز سنائی دی۔

''مجھے معلوم ہے کہ یہ سب کاشفہ صدیقی کی مرہون منت ہے۔ تمہاری تو بیٹھے بٹھائے لاٹری نکل آئی۔ ورنہ تم اس کے اہل نہیں تھے۔''

سفیر قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''اپنے دل کی بھڑاس اچھی طرح نکال لو لیکن تمہاری اس بات میں کوئی شک نہیں کہ سب کچھ کاشی کا ہے۔ تاہم میں جلد ہی اس سب کا مالک بننے والا ہوں۔''

شفا بولی۔ ''مجھے تمہاری بیوی کی چالاکی پر حیرت محسوس ہورہی ہے جس نے ملازم ڈھونڈنے کے بجائے ایسے شوہر کا انتخاب کیا جو بغیر تنخواہ کے ملازم اور شوہر دونوں کا کام انجام دے سکے۔ یعنی ایک پنتھ دو کاج۔ اس نے شوہر اور شوفر دونوں کا اکٹھے انتظام کرلیا۔ میں اس عورت سے ملاقات کی متمنی ہوں۔''

سفیر غصیلے لہجے میں بولا۔ ''میرے موبائل میں اس کی تصویر موجود ہے اگر دیکھنا چاہو تو میں سینڈ کردیتا ہوں۔ وہ ہر لحاظ میں تم سے بہتر ہے۔''

''یقیناً وہ مجھ سے بہتر ہوگی۔ چند دن قبل مجھے پرنسپل کا فون موصول ہوا تھا۔ اس نے تمہاری بیوی کی تعریف کرنے کے بعد مجھے بتایا کہ وہ فروخت سے حاصل ہونے والی رقم سے شہر کے متمول علاقے میں ڈیڑھ کروڑ کی عمارت مع اسکول خرید چکی ہیں اور مجھے پرنسپل بنانے کی متمنی ہیں۔ تاہم میں تمہاری بیوی کی تصویر ضرور دیکھنا چاہوں گی جس نے نہایت غیر معمولی فیصلے کر کے مجھے حیران کر کے رکھ دیا۔''

سفیر نے کاشی کی چند تصاویر شفا کو سینڈ کرتے ہوئے بتایا۔ ''اسکول کی بات چیت کے دوران پرنسپل ایک لاکھ مزید مانگنے کی ضد پر اڑ گئی۔ کاشی کے لیے ایک دو لاکھ کی رقم دینا کچھ خاص معنی نہیں رکھتا۔ اس لیے چند لمحوں کی پس و پیش کے بعد اس نے ایک لاکھ کی رقم اوپر دے کر عمارت خرید لی۔ آگے تم خود سوچ سکتی ہو جو عورت ایک لاکھ کی رقم کے لیے سودے سے منکر ہوجائے وہ ڈیڑھ کروڑ... مالیت کا اسکول کیونکر خرید سکتی ہے۔ اس لیے خوش فہمیوں میں رہنا چھوڑ دو۔'' دوسری طرف گمبھیر خاموشی طاری ہوگئی۔ وہ سفیر کی بھیجی ہوئی تصاویر دیکھ رہی تھی۔ پھر اسے سرگوشیوں بھری آوازیں سنائی دیں۔ اس میں کسی مرد کی آواز نمایاں تھی پھر شفا کے ہیجانی قہقہے کے ساتھ رابطہ منقطع ہوگیا۔ سفیر کے دل کی بھڑاس ابھی تک نکل نہیں سکی تھی۔ تاہم دوبارہ فون کرنا مناسب نہیں تھا اس لیے خاموش ہوگیا۔ پانچ منٹ کے بعد اسے شفا کی جانب سے میسج موصول ہوا، لکھا تھا۔

''تمہاری بیوی کی تصویر دیکھنے کے بعد میرا اس بات پر ایمان پختہ ہوگیا کہ جوڑے آسمان پر بنتے ہیں۔ میرے شوہر کا کہنا ہے کہ وہ بھکاریوں کی ٹھیکیدار ہے۔ یہ سن کر مجھے شدید دھچکا لگا۔ تمہیں بھی لگا ہوگا لیکن میرے شوہر کا انکشاف اس لیے حتمی ہے کہ وہ چند دنوں قبل بھکاریوں پر فیچر ترتیب دے چکا ہے جو جلد ہی شائع ہونے والا ہے تو فوراً موبائل اٹھاؤ اور بیوی کو فون کر کے اُس کے متعلق پوچھو۔''

میسج پڑھنے کے بعد سفیر نے عجلت کے عالم میں کاشی کا نمبر ڈائل کیا۔ رابطہ ہوتے ہی اُسے بھکاریوں کی ملی جلی آوازیں سنائی دیں اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام لیا۔ اس کے دماغ میں وکیل کے الفاظ گونجنے لگے۔

''آپ کو سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا ہوگا۔ کاغذات کی تکمیل کے بعد آپ حکم عدولی کے مرتکب نہیں ہوسکیں گے اور اگر ہوئے تو سزا کے علاوہ جرمانہ بھی ادا کرنا ہوگا۔''

دھچکا غیر معمولی تھا۔ تاہم اُسے تمام زندگی برداشت کرنا تھا۔



ملی اسکوائر کے فلیٹ نمبر دس سے نکل کر میں گاڑی میں آبیٹھا۔ رات کے دس بجنے والے تھے۔ گرمی بہت زیادہ تھی۔ میں نے اے سی آن کر دیا۔ میری بہن نجمہ کے گھریلو حالات بہتر نہیں تھے۔ چند دن قبل اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا اور اسے نوکری کی تلاش میں دربدر پھرنا پڑ رہا تھا۔ اس کے فلیٹ کا کرایہ میں جمع کروا دیا کرتا تھا۔ میرے اپنے حالات ابتر تھے۔ کچھ عرصہ قبل ایک قصاب کی دکان پر گوشت بنانے کا کام کیا تو وہاں شمیم صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ لندن میں رہائش پذیر تھے۔ چند دنوں کے لیے ملک آئے تھے۔ انہوں نے مجھے ڈیفنس میں واقع اپنی کوٹھی کا چوکیدار بننے کی پیشکش کی۔ تنخواہ پندرہ ہزار روپے تھی۔ میں نے فوراً ہاں کر دی۔ نجمہ کے فلیٹ کا کرایہ دس ہزار تھا۔ کرایہ ادا کرنے کے بعد اپنے اخراجات کے لیے میرے پاس پانچ ہزار باقی بچتے تھے جو میری ضروریات کے لیے بالکل ناکافی تھے۔

شمیم صاحب کی چمچماتی گاڑی پورچ میں بیکار کھڑی

معاوضہ

عمران قریشی

معاشی حالات کو بہتر کرنے کے لیے جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ خود کو ہلکان کرنا پڑتا ہے... پشیمان یا قربان نہیں... ایک ٹیکسی ڈرائیور کے شب و روز... وہ بہتر سے بہترین کے لیے مسلسل کوشاں تھا۔

دگرگوں صورت حال سے دوچار...... تجسس اور دلچسپی سے بھرپور



تھی۔ میں نے اسے آن لائن ٹیکسی کی صورت میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔ پہلے مہینے کام کچھ خاص نہیں رہا۔ دوسرے مہینے بہتر ہونے لگا اور تیسرے مہینے میں نے فلیٹ کا کرایہ دینے کے بعد پانچ ہزار مزید نجمہ کو دیے۔ میرے آن لائن کسٹمرز کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ چند کا اصرار تھا کہ میں رات کے وقت بھی ٹیکسی کی سروس شروع کر دوں۔ مجھے تگڑی رقم کی اشد ضرورت تھی۔ میں شمیم صاحب کی آمد سے قبل اپنی ٹیکسی خرید لینا چاہتا تھا اس لیے میں نے رات کو بھی گاڑی باہر نکالنا شروع کر دی۔ تاہم مجھے کوٹھی کی جانب سے خدشہ لاحق تھا اگر دورانِ غیر حاضری چوری ہو جاتی تب ذمے داری مجھ پر عائد ہوتی۔ اس لیے میں نے جرمن شیفرڈ کتا خرید کر کوٹھی کے لان میں کھلا چھوڑ دیا تھا۔ شمیم صاحب کی مہنگی ترین گاڑی دن رات چلنے لگی۔ دن رات کام کی صورت میں میرے پاس رقم جمع ہونے لگی۔ تاہم گاڑی کا انجن متاثر ہونے لگا۔ میرے پاس رقم تھی لیکن میں گاڑی پر خرچ کرنے سے کترا رہا تھا۔ یہ میرے خون پسینے سے حاصل کردہ تھی۔ اس بات میں شبہ نہیں تھا کہ یہ رقم شمیم صاحب کی گاڑی کی مرہونِ منت تھی لیکن میں اپنی گاڑی خریدنے سے قبل جمع شدہ رقم میں سے ایک پائی بھی خرچ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ایک دو کسٹمرز نے مجھے منشیات کی اسمگلنگ کا مشورہ دیا۔ جسے میں نے فوری رد کر دیا۔ میں ایسا کوئی بھی کام نہیں کرنا چاہتا تھا جس کی وجہ سے میرے مستقبل پر آنچ آنے پائے لیکن چند روز قبل جب میں نے گاڑی کا انجن مستری کو دکھایا تب اس نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے فوراً اسے کھلوا کر ریپئرنگ کا مشورہ دیا۔ اس کے بعد میں سنجیدگی کے ساتھ اسمگلنگ کے متعلق سوچنے لگا۔ گوشت کی دکان پر کام کے دوران میں دکان کا مالک مجھے چرس لانے کے لیے بھیجا کرتا تھا۔ یہ چرس قریبی اڈے سے دستیاب ہوتی تھی۔ کچھ عرصے کے دوران اڈے کا ہر شخص مجھے جاننے لگا تھا۔ وہ مجھے بغیر چھان بین کے اندر جانے دیتے تھے۔ میں قیمت ادا کرتا اور چرس لے کر واپس دکان آجاتا تھا۔ وہاں کام کرنے والے تمام افراد نے مجھے نوکری دلوانے کی آفر کی تھی لیکن میں نے ہمیشہ انکار کر دیا۔ میں ان کے لیے چرس بہ آسانی بیرونِ شہر لے جا سکتا تھا۔ سال ختم ہونے میں تین مہینے باقی تھے اور میں شمیم صاحب کی واپسی سے قبل انجن کی مرمت کروا لینا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے چند ماہ کے لیے منشیات کی اسمگلنگ کا پکا تہیہ کر لیا۔ تاہم دل سے اب بھی مطمئن نہیں تھا۔

ملی اسکوائر سے نکلنے کے بعد میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ مجھے موبائل کی اسکرین پر کاشن موصول ہوا۔ اسکرین پر موجود نقطہ شہر کے نقشے پر کرسٹل چوک کی نشاندہی کر رہا تھا۔ میں چوک کے قریب تھا اور مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ رات کا یہ پہر ضمیر صاحب کے لیے مخصوص تھا۔ انہوں نے مہینے بھر پہلے بھی سے...... رابطہ کرنا شروع کیا تھا۔ وہ قریبی قصبے میں کسی عورت سے ملنے کے لیے جایا کرتے تھے۔ نہایت کم گو شخصیت کے مالک تھے۔ دورانِ سفر بات چیت سے پرہیز کرتے تھے۔ ان کا چہرہ سرجیکل ماسک کے پیچھے پوشیدہ ہوتا تھا اور آنکھوں پر سیاہ شیشوں والی عینک لگی ہوتی تھی۔ اس لیے میں ان کے چہرے سے ناآشنا تھا۔ میں نے رات کی سروس کا آغاز ان کے اصرار کو مدِنظر رکھتے ہوئے کیا تھا۔ اس سے قبل وہ جس عورت سے ملاقات کے لیے جایا کرتے تھے، وہاں بھی انہیں میری ٹیکسی ہی لے جایا کرتی تھی۔ یہ دوسری عورت تھی جو شہر سے کافی دور شبستان گیسٹ ہاؤس کی سال خوردہ عمارت میں مقیم تھی۔ مجھے وہاں تک جانے اور ضمیر صاحب کو واپس لانے کے دوران تمام رات لگ جایا کرتی تھی لیکن ان کے گیسٹ ہاؤس جانے کے بعد مجھے ڈیڑھ دو گھنٹے کی نیند پوری کرنے کا موقع مل جاتا تھا اور تگڑی رقم میں علیحدہ وصول کر لیا کرتا تھا۔

میں نے گاڑی کا رخ کرسٹل چوک کی طرف کر دیا۔ وہ حسبِ معمول فٹ پاتھ پر کھڑے میرے منتظر تھے۔ حلیہ ویسا ہی تھا۔ جیسا میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔ انہوں نے دروازہ کھولا اور اگلی سیٹ پر میرے ساتھ بیٹھ گئے۔ ان کے لباس سے مہنگے ترین پرفیوم کی خوشبو آرہی تھی۔ میں نے گاڑی آگے بڑھا دی اور شہر سے باہر جانے والی سڑک پر سفر کا آغاز کر دیا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ بولے۔

"تم چند ملاقاتوں کے دوران اچھی طرح جان گئے ہو گے کہ مجھے وقتاً فوقتاً اچھے ساتھی کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ ثانیہ سے قبل عاشی تھی اور عاشی سے پہلے طاہرہ میرا دل بہلایا کرتی تھی۔ میں حدِ آخر اپنے اس وقتی رفیق کے زیرِ التفات رہتا ہوں لیکن جہاں اس نے پٹڑی سے اترنے کی حماقت کی، وہاں میں کنارہ کشی اختیار کر لیتا ہوں۔ جب عاشی نے اپنے وقت کا تگڑا معاوضہ مانگا۔ تب میں نے ثانیہ سے رابطہ قائم کیا۔ یہ رابطہ نہایت کم عرصے تک محدود رہا۔ آج میری اس سے آخری ملاقات ہے۔ دیکھو معاملہ کس صورت میں طے ہوتا ہے۔" وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئے اور میں نے گاڑی ہائی وے کی طرف موڑ دی۔ خاموش طبع ضمیر صاحب آج خلافِ معمول سب کچھ بتا دینے پر تلے ہوئے تھے۔

"مجھے چند دنوں کے دوران وقت گزاری کے لیے کوئی

اور ذریعہ تلاش کرنا ہوگا۔ اگر تمہاری نظروں میں کوئی ہے تو بلا جھجک بتادو۔ میں تمہاری خدمت کا حسبِ منشا معاوضہ دوں گا۔‘‘ میں نے انکار میں سر ہلایا۔ منشیات کی اسمگلنگ کے بعد مجھے دلالی سے سخت نفرت تھی۔ وہ دوبارہ بولے۔

’’تم نے میری حیثیت کے بارے میں دریافت نہیں کیا۔ میں تمہیں اس کے متعلق بتاؤں گا بھی نہیں۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ ایک امیر و کبیر کسٹمر روزانہ تمہاری ٹیکسی کو بھرپور معاوضے کے عوض استعمال کرتا ہے۔ باقی تمام باتوں کو نظرانداز کردو۔‘‘ ہائی وے پر بڑے بڑے ٹرکوں اور ٹریلروں کی بھرمار تھی اس لیے گاڑی کی رفتار کو تیز کرنا ممکن نہیں تھا۔ مجھے اُن کی حیثیت سے اس کے سوا اور کوئی سروکار نہیں تھا کہ مجھے لمبے سفر کے بعد اچھا معاوضہ مل جاتا تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے ضمیر صاحب کے سراپا کا جائزہ لیا۔ جسم پتلا دبلا، بال گھنے اور سفید تھے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اصل نہیں تھے۔ بلکہ وگ کا استعمال کیا گیا تھا۔ ماسک اور عینک کی وجہ سے نقوش کے متعلق اندازہ لگانا مشکل تھا۔ تاہم چہرے کی ہیئت گول تھی۔ میں نے پہلی دفعہ ہم کلام ہوتے ہوئے کہا۔

’’رات کا اندھیرا سب کچھ اپنے اندر دفن کرلینے کی صلاحیت رکھتا ہے اور میرا دماغ بھی کسی اندھیری رات سے کم نہیں ہے۔ اگر آپ مجھ پر اعتبار کریں تو میں آپ کے اعتبار کو ٹھیس پہنچنے نہیں دوں گا۔‘‘ وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولے۔

’’معاملے کے متعلق میں تمہیں بتاچکا ہوں۔ مجھے وقت گزاری کے لیے ساتھی کی ضرورت ہے جس کا میں تگڑا معاوضہ دوں گا۔ تاہم مجھے خدشہ صرف اپنی حیثیت اور وقار کے متاثر ہونے کا ہے کیونکہ دوسری پارٹی ہمیشہ غیر ذمے داری کا مظاہرہ کرتی ہے۔ ثانیہ نے چند ماہ اس کا خیال کیا پھر بدلحاظی کا مظاہرہ شروع کردیا۔ وہ اچھے رفیق کے بجائے جیون ساتھی بننے کے خواب دیکھنے لگی۔ مجھے اس کی پروا نہیں تھی لیکن مدہوشی کے دوران مجھ سے غلطی سرزد ہوئی اور میں نے اسے اپنی حیثیت سے آگاہ کردیا۔ اس نے اس آگاہی کا ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کردیا۔ تم مجھے مشورہ دو۔ میں اس صورت حال کا مقابلہ کیسے کروں؟‘‘

میں نے جواب دیا۔ ’’ہر انسان کی کچھ نہ کچھ قیمت ہوتی ہے اس کی بھی ہوگی۔ دے دلا کر فارغ کردیجیے۔‘‘

وہ بولے۔ ’’آج فائنل راؤنڈ ہے۔ اگر بات بن گئی تو رقم اس کے حوالے کردوں گا۔ بصورت دیگر انگلی کو ٹیڑھا کرنے کی کوشش کروں گا۔‘‘

مجھے اپنے جسم میں سرد لہر دوڑتی محسوس ہوئی۔ انگلی کو ٹیڑھا کرنے سے ان کی جو بھی مراد تھی، میں اچھی طرح جان سکتا تھا۔ میرے دماغ نے اسمگلنگ والے فیصلے کو یکدم مسترد کردیا اور میں سنجیدگی کے ساتھ بلیک میلنگ کے متعلق سوچنے لگا۔ اگر سوچ سمجھ کر معاملے کو آگے بڑھایا جاتا تو نقصان کا خدشہ نہیں تھا۔ صرف ان کی حیثیت آڑے آسکتی تھی۔ وہ یقیناً گورنمنٹ کے بااثر اور بااختیار ملازم تھے اور جس بے خوفی سے انہوں نے مجھے اپنے ارادے سے باخبر کیا تھا، اس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ اپنے متعلق خوش فہمیوں میں مبتلا نہیں تھے بلکہ واقعی وہ سب کچھ کرسکتے تھے جس کا اظہار کررہے تھے۔ تاہم میں ان کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر انہیں اپنی حیثیت استعمال کرنے سے باز رکھ سکتا تھا۔ ٹیکسی میں گمبھیر خاموشی طاری ہوگئی۔ میری سوچوں کا محور ان کی ذات تھی اور وہ اپنے منصوبے پر سوچ بچار کررہے تھے۔

گاڑی قصبے میں داخل ہوگئی۔ میں نے ڈیش بورڈ پر لگی ہوئی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ پونے گیارہ بجنے والے تھے۔ قصبے پر ہُو کا عالم طاری تھا۔ گیسٹ ہاؤس کی عمارت قصبے کے مضافات میں واقع تھی۔ عمارت کے اردگرد پلاٹ خالی پڑے تھے۔ میں نے گیٹ سے کچھ پیچھے گاڑی کو کھڑا کردیا۔

ضمیر صاحب نیچے اترتے ہوئے بولے۔ ’’ہوسکتا ہے دوست کہ مجھے تمہاری ضرورت پڑے، تیار رہنا۔ میں معاوضہ میٹر پر بننے والی رقم کے علاوہ دوں گا۔‘‘

وہ گیٹ کی طرف چلے گئے۔ میرے پاس سوچنے کے لیے کافی وقت تھا۔ اس لیے میں نے سیٹ کے ساتھ سر لگادیا۔ انہیں بلیک میل کرنے کے بجائے اگر میں ان کا ساتھ دیتا۔ تب بھی ان کی جانب سے مجھے تگڑی رقم مل سکتی تھی۔ مجھے لاکھوں میں معاوضہ نہیں چاہیے تھا۔ گاڑی کی مرمت کے لیے کچھ رقم درکار تھی۔ دماغ نے ایک دفعہ پھر پلٹا کھایا۔ آج نہیں تو کل شمیم صاحب کو لندن سے واپس آجانا تھا۔ تب انکم کا یہ ذریعہ ختم ہوجاتا۔ میں چوکیدار کی نوکری نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تگڑی رقم کا مطالبہ کرنا چاہیے تھا۔ میں تمام زندگی دھکے نہیں کھاسکتا تھا۔

شیطان نے ورغلایا۔ رقم کتنی ہونی چاہیے۔ بیس لاکھ، پچیس لاکھ یا پھر تیس لاکھ۔ وہ اتنی رقم بہ آسانی دے سکتے تھے۔ مجھے نئی گاڑی خریدنے کے لیے اتنی رقم درکار تھی۔ گاڑی پاس ہو، تو ذریعہ آمدنی کو مناسب بنانا مشکل نہیں تھا لیکن ان کی حیثیت والی پھانس دوبارہ گلے میں پھنسنے لگی۔ اگر انہوں نے رُتبے کو استعمال کرتے ہوئے پولیس کو میرے پیچھے لگادیا۔

تب میرے لیے فرار مشکل ہوگا۔ تاہم میں نے یہ سوچ کر اپنے آپ کو مطمئن کرلیا کہ انہوں نے ثانیہ والے معاملے میں بھی رُتبے کو استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بدنامی کے خوف نے انہیں باز رکھا تھا۔ میں اس خوف سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ رقم دینے کے لیے بہ آسانی آمادہ ہو جائیں گے۔ رقم حاصل کرنے کے بعد میں شہر کو چھوڑ کر کہیں اور روپوش ہوسکتا تھا۔ میری سوچ درمیان میں رہ گئی۔ گیسٹ ہاؤس کا دروازہ کھلا اور خلافِ معمول ضمیر صاحب باہر نمودار ہوئے۔ چہرے پر لگے ہوئے ماسک اور عینک کی وجہ سے تاثرات کے متعلق اندازہ لگانا مشکل تھا لیکن ہاتھوں کی غیر معمولی حرکت اور قدموں کی عجلت کی وجہ سے مجھے یہ جاننے میں قطعی مشکل پیش نہیں آئی کہ وہ بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ گاڑی کے پاس پہنچنے کے بعد انہوں نے جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھولا اور اگلی سیٹ پر میرے ساتھ بیٹھتے ہوئے بولے۔ ”گاڑی اسٹارٹ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگلے چند منٹوں کے دوران ہم ایک معاہدہ کریں گے۔ میرے پاس وقت محدود ہے۔ تم نے کچھ دیر پہلے کہا تھا کہ ہر انسان کی کچھ نہ کچھ قیمت ہوتی ہے۔ میں تمہاری قیمت کے متعلق پوچھنا چاہتا ہوں، بلا جھجک بتا دو۔“

میں نے جواب دیا۔ ”قیمت معاملے کو مدِنظر رکھتے ہوئے طے کی جاتی ہے۔ اگر آپ مجھ پر اعتبار کرتے ہیں تو کھل کر بات کریں۔ میں آپ کے اعتماد پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔“

انہوں نے جیب سے رومال نکالا اور ماتھے پر آئے پسینے کو پونچھتے ہوئے بتایا۔ ”میں نے اسے قتل کر دیا ہے۔“

میرے ہاتھ اسٹیئرنگ پر لرز کر رہ گئے۔

وہ بولے جا رہے تھے۔ ”اس نے حد سے تجاوز کرتے ہوئے میری بیوی بننے کی شرط عائد کر کے مجھے مجبور کر دیا۔ میں اس سے ہاتھا پائی نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن جب تلخ کلامی زیادہ بڑھی تب میں نے قریب پڑا ہوا پیتل کا گلدان اس کے سر پر دے مارا۔ اس کا سر پھٹ گیا اور وہ جاں بحق ہوگئی۔“

میں نے پوچھا۔ ”اب آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“

”تمہارے پاس ٹیکسی ہے، اس کی لاش کو ٹھکانے لگا دو۔ میں معاوضہ دینے کے لیے تیار ہوں۔“

مجھے وقتی طور پر مسرت کا احساس ہوا لیکن فوراً ہی اس کی جگہ لاش کو ٹھکانے لگانے والی بات نے لے لی۔ یہ ایک مشکل کام تھا۔ میں معاملے میں ملوث ہونے کے بعد پولیس کی نگاہوں کا مرکز بن سکتا تھا۔ انہوں نے میری سوچ کا اندازہ چہرے کے تاثرات سے لگالیا۔

”پولیس کی فکر نہ کرو، میں انہیں سنبھال لوں گا۔ صرف لاش کو مناسب جگہ پہنچا دو۔ کیس کی فائل کو میں بند کروا دوں گا۔“

میں نے بتایا۔ ”مجھے کام کے لیے تیس لاکھ روپے چاہئیں اگر آپ دے سکتے ہیں تب میں لاش کو ایسے غائب کردوں گا جیسے اس کا وجود کبھی رہا ہی نہ ہو۔“

انہوں نے جواب دیا۔ ”میں تیار ہوں۔ اب غور سے سنو، اس کی لاش اندرونی کمرے میں پڑی ہے۔ گیسٹ ہاؤس میں کوئی نہیں ہے۔ گیٹ کھلا ہے۔ خاموشی کے ساتھ اندر جاؤ، پہلی کھڑکی کے ذریعے اندر داخل ہو کر لاش کو مع سامان گاڑی میں منتقل کر دو۔ میں گیسٹ ہاؤس کے مالکان پر یہ تاثر چھوڑنا چاہتا ہوں کہ وہ رات کے کسی پہر گیسٹ ہاؤس کو چھوڑ کر نامعلوم مقام پر منتقل ہوگئی ہے۔ تم کوشش کرنا کہ تمہارے ہاتھوں کے نشانات کمرے میں رہنے نہ پائیں۔ خون کے چند قطرے زمین پر گر گئے تھے۔ انہیں بھی صاف کر دینا اور جتنا جلدی ممکن ہو، واپس گاڑی میں آنے کی کوشش کرنا۔“

میں نے پوچھا۔ ”مجھے رقم کب اور کیسے ملے گی؟ اور اگر آپ مجھے دینے سے منکر ہوگئے تب میں کیا کروں گا؟“

ان کے چہرے پر بچاؤ کے تاثرات ابھرے، یقیناً مسکرا رہے تھے پھر آواز سنائی دی۔ ”ہم لاش کو اکٹھے کرسٹل چوک لے کر جائیں گے۔ تمہیں وہاں میرا انتظار کرنا ہوگا۔ میں رقم لے کر واپس آؤں گا اور تم رقم لینے کے بعد لاش کو ٹھکانے لگا دینا۔“

میں مطمئن ہو کر گاڑی سے نیچے اتر آیا۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔ میں محتاط نگاہوں سے اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے گیٹ کو کھول کر لان میں آ گیا۔ لان کے سامنے پہلی کھڑکی چوپٹ کھلی ہوئی تھی۔ باقی کمروں کی لائٹس آف تھیں۔ میں کھڑکی کے ذریعے کمرے میں داخل ہوگیا۔ ثانیہ زمین پر چت پڑی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے سراپا کا جائزہ لیا۔ وہ پچیس سے تیس کے درمیان قدم رکھتی نہایت خوب صورت اور متناسب جسم کی مالک تھی۔ اس کے سر کے پاس پیتل کا گلدان رکھا ہوا تھا اور زمین پر خون کا تالاب موجود تھا۔ وہ آنکھیں کھولے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی زندگی میرے منصوبے پر پانی پھیر سکتی تھی۔ میں تیس لاکھ کے لیے کچھ بھی کرنے کے لیے تیار تھا۔ چاہے وہ قتل ہی کیوں نہ ہوتا۔ میں نے زمین پر پڑے ہوئے گلدان کو اٹھایا اور اس کے سر پر

بھرپور وار کیا۔ وہ درد کی شدت سے چلائی۔ گیسٹ ہاؤس میں اس کے چیخنے چلانے کی آواز سننے والا کوئی نہیں تھا۔ میں نے مزید دو دفعہ وار کیا اور اس نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے۔

میں نے اس کے چہرے پر بیڈ کی چادر باندھی۔ تاکہ سر سے بہتا ہوا خون نیچے نہ گرنے پائے اور لاش کو کھینچ تان کر کھڑکی کے ذریعے باہر نکال کر گاڑی تک لے آیا۔ ضمیر صاحب اگلی سیٹ پر میرے منتظر تھے۔ میں نے لاش کو پچھلی سیٹ پر منتقل کیا اور دوبارہ کمرے میں آ گیا۔ کمرے کے فرش پر قالین نہیں بچھا تھا۔ فرش پر خون کی اچھی خاصی مقدار جمع تھی۔ میں باتھ روم میں چلا آیا۔ وہاں بالٹی اور تولیا رکھا ہوا تھا۔ میں نے بالٹی کو پانی سے بھرا اور تولیا ہاتھ میں لیے واپس کمرے میں آ گیا۔ میں نے خون کو اچھی طرح صاف کیا اور بالٹی کا پانی فلیش میں بہا دیا۔ پھر گلدان سے انگلیوں کے نشانات کو صاف کرنے کے بعد اسے سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ الماری کے پاس سیاہ رنگ کا اٹیچی کیس رکھا ہوا تھا۔ میں نے الماری میں لٹکے ہوئے ثانیہ کے تمام کپڑے اور ضروری کاغذات وغیرہ اٹیچی کیس کے اندر منتقل کیے۔ خون آلود تولیے کو شاپر میں ڈال کر ان کے اوپر رکھا اور کمرے کے دروازے کی کنڈی کھول کر کھڑکی کے ذریعے باہر آ گیا۔ اس دوران میں رومال کے ذریعے ہاتھوں کے نشانات بھی صاف کرتا رہا۔ گیسٹ ہاؤس کے گیٹ سے باہر نکلنے کے بعد میں نے دروازہ بند کیا اور گاڑی کی طرف چلا آیا۔ مجھے اس کام میں آدھا گھنٹا لگا تھا۔ ضمیر صاحب اگلی سیٹ پر بت بنے خاموش بیٹھے تھے۔ میں نے رومال سے پسینہ پونچھا اور گاڑی کو اسٹارٹ کر کے سڑک پر لے آیا۔ چند لمحے خاموشی طاری رہی پھر ضمیر صاحب بولے۔ ''کسی بھی کیس کی تفتیش کا آغاز لاش ملنے کے بعد ہوتا ہے۔ اگر لاش نہ ملے تب پولیس گمشدگی کی رپورٹ درج کرنے کے بعد اسے نظر انداز کر دیتی ہے۔ تمہیں لاش کو ایسے ٹھکانے لگانا ہے کہ اس کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹ کر رہ جائے۔''

میں نے انہیں بتایا۔ ''خوش قسمتی سے میں کافی عرصہ قصاب کی دکان پر کام کر چکا ہوں اور میرے پاس گھر میں گوشت بنانے کے اوزار موجود ہیں۔ میں ان کے ذریعے اتنی صفائی سے گوشت کے ٹکڑے کر کے انہیں شاپروں میں منتقل کروں گا کہ دیکھنے والوں کو معلوم نہیں ہو سکے گا کہ وہ کسی انسان کے ٹکڑے ہیں یا پھر جانور کے ٹکڑے ہیں۔ ان شاپروں کو ثانیہ کے ملبوسات سے بھرے ہوئے اٹیچی کیس کے ہمراہ میں دریا کی نذر کر دوں گا۔''

ضمیر صاحب نے مطمئن انداز میں سر کو سیٹ کے ساتھ لگا کر یقیناً آنکھیں بھی موند لیں۔ میں نے اپنے دماغ میں سر سراتا ہوا سوال پوچھا۔ ''کم وبیش ہم دونوں اس گناہ میں مکمل طور پر ملوث ہو چکے ہیں۔ اگر میں آپ کو بلیک میل کرنا چاہوں تو کیا میرے لیے ممکن نہیں۔''

وہ خاموشی کے ساتھ سیٹ پر تقریباً لیٹے رہے پھر... آہستہ لہجے میں بولے۔ ''میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں جتنا تم مجھے گردان رہے ہو۔ میرے پاس بہت کچھ اپنے تحفظ کے لیے موجود ہے۔ اس کے علاوہ تم میری شخصیت سے بھی ناواقف ہو۔ رابطہ کیسے کرو گے پھر مجھے گیسٹ ہاؤس میں داخل ہوتے ہوئے یا باہر نکلتے ہوئے کسی نے بھی نہیں دیکھا ہے۔ ہمارے تعلقات کی گواہی کون دے گا۔ سال خوردہ ریسٹ ہاؤس میں چوکیدار موجود نہیں۔ میں کمرے تک آنے اور واپس جانے کے لیے کھڑکی استعمال کرتا تھا۔ جسے ثانیہ میرے لیے رات کو کھول دیا کرتی تھی۔ اس لیے جو کچھ بھی ہوا سات پردوں کے پیچھے نہایت رازدارانہ طریقے سے ہوا۔''

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اس کے باوجود بھی میں وہ سب کچھ کر سکتا ہوں جو آپ کے وہم و گمان میں بھی نہیں۔ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ کیا ہے؟''

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور چہرے کے تاثرات پوشیدہ ہونے کی وجہ سے میں ان کے احساسات سے بھی ناواقف رہا۔ اس لیے کچھ دیر جواب کا انتظار کرتے رہنے کے بعد میں خود ہی بتانے لگا۔

''میں گاڑی کو پولیس اسٹیشن کی جانب موڑنے لگا ہوں۔ یہاں ہم دونوں کے علاوہ تیسرا شخص موجود نہیں ہے اور ثانیہ کا قاتل ہم دونوں میں سے ایک ہے۔ اس لیے لاش کا ڈی این اے ٹیسٹ کرنے کے بعد انہیں بہ خوبی معلوم ہو جائے گا کہ قاتل کون ہے۔''

اُن کے قہقہے سے گاڑی کا ماحول گونج اٹھا۔ میں نے گھبرا کر ان کی طرف دیکھا لیکن سیاہ عینک اور ماسک کے سوا مزید کچھ دیکھ نہیں سکا۔ انہوں نے ہنسی پر بمشکل تمام قابو پاتے ہوئے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور موبائل باہر نکالتے ہوئے بولے۔

''میں نے کچھ دیر قبل تمہیں بتایا تھا کہ میرے پاس اپنے تحفظ کے لیے بہت کچھ موجود ہے۔ موبائل کو آن کرو اور اوپر موجود مووی کا معائنہ کرو۔''

میں نے گاڑی کو سڑک کے کنارے روک دیا اور موبائل آن کرنے کے بعد مووی دیکھنے لگا۔ میرے ہاتھوں

کے طوطے اُڑ گئے۔ ماتھے پر پسینے کے قطرے جھلملانے لگے اور حلق خشک ہو گیا۔ مووی کے اندر میں پیتل کے گلدان کے ساتھ ثانیہ کو ہلاک کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ انہوں نے مووی میری لاعلمی کے دوران کھڑکی میں کھڑے ہو کر بنائی تھی۔ مجھے ضمیر صاحب کی آواز سنائی دی۔

''میں نے جان بوجھ کر اسے ہلاک نہیں کیا تھا تاکہ تیس لاکھ کے لالچ میں تم اسے ختم کرنے کی کوشش کرو لیکن فکر نہ کرو، میں تمہیں بلیک میل نہیں کروں گا۔ مووی میرے پاس حفاظتی اقدام کے طور پر رہے گی۔ تاکہ تم مجبور ہو کر میرے کام کر سکو۔ ثانیہ کے بعد مجھے آئندہ بھی تمہاری ضرورت پڑے گی۔ تمہارے ہر اقدام کے بدلے میں تمہیں معاوضے کے علاوہ تحفظ بھی دوں گا۔''

میں چپ رہا۔ میرے پاس بولنے کے لیے کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔

دوسرے دن میں نے ثانیہ کی لاش کے ساتھ جو کیا، وہ میں آپ کو نہیں بتاؤں گا۔ بس اتنا جان لیجیے کہ میں نے ماہر قصاب کے مانند گوشت اور ہڈیاں علیحدہ کر کے تھیلوں میں بھرنے کے بعد دریا میں بہا دیں۔ اس کام میں مجھے جان جوکھوں میں لگانی پڑی۔ آخری پھیرے کے دوران میں نے ثانیہ کے کاغذات اور کپڑوں والا اٹیچی کیس بھی دریا میں پھینک دیا۔ ضمیر صاحب نے مجھے اس کام کے دس لاکھ روپے دیے۔ دوسرے دن میں نے گاڑی کے انجن کی مرمت کروائی اور کچھ رقم نجمہ کے حوالے کر دی۔

اس نے مجھے بتایا۔ ''شاید اگلے مہینے سے مجھے آپ کی مدد کی ضرورت نہ پڑے مجھے کام مل گیا ہے۔ تنخواہ بھی مناسب ہے۔ اس لیے گزر بسر آسانی سے ہو جائے گی۔''

میں نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔ ''میرے ہوتے ہوئے تمہیں کام کرنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ فلیٹ میں آرام سے بچوں کے ساتھ رہو۔ میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔''

وہ ممنون نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں آپ پر مزید بوجھ نہیں بننا چاہتی ہوں۔ آپ نے ہمارے لیے جو کچھ کیا ہے، میں اس کا بدلہ نہیں چکا سکتی۔ لیکن آپ کا ہاتھ بٹانے کی کوشش ضرور کر سکتی ہوں۔''

میں نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ ''پگلی تم مجھ پر بوجھ نہیں ہو۔ میں بہ آسانی تمہارے اور تمہارے بچوں کے اخراجات برداشت کر سکتا ہوں۔ میرا کام کسی حد تک بہتر ہو گیا ہے۔ تم کام سے انکار کر دو۔''

لیکن وہ نہیں مانی اور میں کچھ دیر وہاں بیٹھ کر واپس کوٹھی آ گیا۔ دس لاکھ میں سے باقی بچ جانے والی رقم میں نے اکاؤنٹ میں منتقل کر دی۔ اب مجھے اپنی گاڑی خریدنے کے لیے آٹھ لاکھ کی مزید رقم چاہیے تھی۔ شمیم صاحب کے واپس آنے میں دو ماہ باقی رہ گئے تھے۔ گاڑی کے ذریعے آٹھ لاکھ کا بندوبست کرنا ممکن نہیں تھا۔ ضمیر صاحب نے بھی دوبارہ رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں نے کئی دفعہ کرسٹل چوک کے چکر لگائے۔ وہ وہاں نہیں تھے۔ پھر ایک دن مجھے کال موصول ہوا۔ لوکیشن کرسٹل چوک کی تھی۔ میں لوکیشن کی طرف آ گیا۔ وہ چوک پر میرے منتظر تھے۔ اُن کے چہرے پر حسبِ معمول ماسک اور عینک لگی ہوئی تھی۔ وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئے۔ میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولے۔ ''ثانیہ والا معاملہ بخیر و خوبی اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ اب مزید کام کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

میں نے پریشان لہجے میں بتایا۔ ''لاش ٹھکانے لگانے کے لیے رقم کم ہے۔ مجھے کم از کم پندرہ لاکھ چاہئیں۔ گوشت اور ہڈیاں برابر کرنے کے بعد انہیں دریا برد کرنے کے دوران میری جان سولی پر لٹکی رہتی ہے۔ پولیس کا ہدف بننے پر آپ کا کچھ نہیں جائے گا، میں پھنس جاؤں گا۔''

وہ بولے۔ ''میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ کسی بھی غیر معمولی صورتِ حال کے دوران میں تمہاری پشت پناہی کروں گا۔ میں سب کچھ کرنے کی اہلیت رکھتا ہوں۔ مجھے تمہاری ضرورت بھی نہ پڑتی اگر چند مجبوریاں آڑے نہ آتیں۔ تاہم میں اس سے زیادہ رقم نہیں دے سکتا۔'' میں نے گاڑی کو ہائی وے کی طرف موڑ دیا۔ آج خلافِ معمول ہائی وے پر ٹریفک عام دنوں سے زیادہ تھا۔ ٹرکوں اور ٹریلروں کے علاوہ چھوٹی گاڑیوں کی بھی بہتات تھی۔ وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولے۔ ''مجھے ایک نئی عورت مل گئی۔ کل سے تمہیں روزانہ رات کو مجھے کرسٹل چوک سے پک کرنے کے بعد اس ایڈریس تک پہنچانا ہوگا۔'' انہوں نے جیب میں سے کاغذ نکال کر میرے ہاتھوں میں تھما دیا پھر مسکراتے ہوئے بولے۔ ''عورت بہت جاندار اور خوب صورت ہے۔ دیکھو کب تک ساتھ نبھاتی ہے۔ اگر اس نے پٹری سے اترنے کی کوشش کی تب شاید مجھے تمہاری خدمات حاصل کرنا پڑیں۔''

میں نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذ کو چہرے کے سامنے کیا۔ اندھیرا زیادہ تھا۔ اس لیے میں نے چھت کی لائٹ آن کر دی اور

دوبارہ کاغذ پر نگاہ ڈالی۔ لکھائی صاف ستھری اور واضح تھی۔ کاغذ پر ایڈریس کے علاوہ موبائل نمبر بھی تحریر تھا۔ موبائل نمبر پڑھنے کا تو مجھے موقع ہی نصیب نہیں ہوا۔ ایڈریس نے ہی حواس معطل کر دیے۔ اسٹیئرنگ پر گرفت ڈھیلی ہوئی اور ہائی وے پر بھاگتی ہوئی گاڑی بُری طرح لہرائی پھر زوردار دھماکا ہوا۔ ایک ٹرک اچانک ہی گاڑی کے سامنے آ گیا تھا۔ مجھے زوردار جھٹکا لگا۔ ضمیر صاحب کے چِلّانے کی آواز سنائی دی پھر خاموشی طاری ہوگئی۔

☆☆☆

آنکھ کھلنے پر میں نے اپنے آپ کو پٹیوں میں جکڑے ہوئے اسپتال کے بیڈ پر پایا۔ چوٹ کہاں کہاں لگی تھی، مجھے کچھ معلوم نہیں ہونے پا رہا تھا۔ تاہم تکلیف زیادہ نہیں تھی۔ قریب کھڑی نرس نے مجھے بتایا کہ پین کلر ٹیکوں کی وجہ سے درد میں کمی ہے۔ ورنہ جو حال دکھائی دے رہا ہے، اس کے مطابق میرا بات چیت کرنا بھی ممکن نہیں تھا اور ٹیکے صرف اس لیے لگائے گئے ہیں تاکہ میں اپنا بیان قلمبند کروا سکوں۔ اس کی بات درمیان میں رہ گئی اور کمرے کا دروازہ کھول کر انسپکٹر اندر داخل ہوا۔ اس نے نرس سے میرے متعلق چند باتیں کیں اور بیڈ کی طرف آ گیا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔

وہ نرم لہجے میں بولا۔ ”لیٹے رہو۔ تمہارے جسم میں جو چند ہڈیاں ٹوٹنے سے بچ گئی ہیں، ان پر بوجھ مت ڈالو۔ بس میں جو پوچھوں، اس کا مختصر جواب دینے کی کوشش کرو۔“

وہ قریبی کرسی پر بیٹھ گیا پھر بولا۔ ”ہمدانی صاحب کو کب سے جانتے ہو؟“ میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”کون ہمدانی صاحب......؟“

اُس نے جیب میں سے چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر ... نکالا اور آن کرنے کے بعد میرے سرہانے رکھتے ہوئے بتایا۔ ”وہی جو حادثے سے قبل تمہارے ساتھ اگلی سیٹ پر براجمان تھے۔“

میں نے طویل سانس لیتے ہوئے بتایا۔ ”وہ تو ضمیر صاحب تھے۔ میں ان کو جانتا نہیں ہوں۔ وہ میری آن لائن ٹیکسی کے مستقل ممبر ہیں۔“

انسپکٹر بولا۔ ”مجھے اُن کے متعلق تفصیل کے ساتھ بتاؤ کہ تم انہیں کہاں سے اٹھاتے تھے اور کہاں ڈراپ کرتے تھے؟“

میرے دماغ میں شبستان گیسٹ ہاؤس اور ثانیہ کے قتل کی واردات گھومنے لگی۔ اس لیے معاملے کو گول کرتے ہوئے میں نے بتایا۔ ”وہ کرسٹل چوک پر میرا انتظار کرتے تھے۔ ان کی منزلِ مقصود کبھی بھی ایک نہیں ہوتی تھی۔ وہ کبھی سرکلر روڈ اور کبھی صدر کے قریبی مقامات پر اتر جایا کرتے تھے۔ زیادہ تر وہ کمرشل ایریاز کا انتخاب کرتے تھے۔“

”ان علاقوں کے نام تفصیل کے ساتھ بیان کرو۔“

میرے دماغ میں جو بھی نام یکمشت آئے، وہ میں نے بتا دیے۔

اس نے پوچھا۔ ”دورانِ سفر بات چیت کا موضوع کیا ہوتا تھا؟ کبھی انہوں نے سیاست پر بات چیت کی یا پھر اپنے کسی دشمن کے متعلق بتایا؟“

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ ”وہ بہت کم گو تھے۔ بات چیت سے ہمیشہ احتراز کرتے تھے۔ تاہم شخصیت مشکوک تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اپنی حیثیت کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہوں۔“

”کیا تم اُن کی حیثیت سے واقف تھے؟“

میں نے دوبارہ انکار میں سر ہلایا۔ ”ہمدانی صاحب جنہیں تم ضمیر صاحب کہہ کر مخاطب کر رہے ہو، ملک کے اہم بیرسٹر تھے۔ گزشتہ سال عہدے سے ریٹائر ہوئے اور کل رات تمہاری گاڑی کے ایکسیڈنٹ میں جاں بحق ہو گئے۔“

میرا دل چند لمحوں کے لیے رک گیا لیکن فوراً ہی اس کی اگلی بات نے دماغ کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

”ان کی جیب میں سے ہمیں ٹوٹا ہوا موبائل دستیاب ہوا جس کے اندر ایک فلم محفوظ تھی۔ اس فلم میں تم ثانیہ نامی ایک کال گرل کو ہلاک کر رہے ہو۔ اوپر کا بیان صرف اس خدشے کو مدِنظر رکھتے ہوئے ریکارڈ کیا گیا کہ عدالتی کارروائی کے دوران نقطے کے متعلق پوچھ گچھ نہ ہونے پائے۔ ہمیں تباہ شدہ گاڑی کے اندر سے کاغذ کے ٹکڑے پر مختصر ایڈریس بھی ملا۔“ اس نے کاغذ کا ٹکڑا جیب میں سے نکال کر ایڈریس پڑھنا شروع کیا۔ ”ملی اسکوائر فلیٹ نمبر دس نجمہ شیرازی۔“

میری قوتِ سماعت یکلخت ختم ہوئی۔ میں نے سر کو زور سے جھٹکا تب اس کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ ”ہم نے ایڈریس کے متعلق چھان بین کی تو پتا چلا کہ وہ تمہاری بہن کے فلیٹ کا ایڈریس تھا۔ اس انکشاف کے بعد ہمیں بلیک میلنگ کا شبہ ہوا۔ لیکن مووی دیکھنے کے بعد ہم نے شبے کو مسترد کر دیا۔ تاہم تمہیں ثانیہ کا قاتل مووی دیکھنے کے بعد گردان لیا گیا اور سزا کا فیصلہ عدالت سنائے گی۔“

میں نے بے چارگی کے عالم میں سر کو جھکا لیا......

❖❖❖

زیرِنقاب

اسما قادری

چھوٹے چھوٹے بچے بھی بڑے بڑے خواب بُنتے ہیں... آسمان کی وسعتوں میں اڑنے کے خواب... بے لوث کوششوں اور اُمنگوں سے بھرپور روشن مستقبل کا خواب اس کی آنکھوں میں کم عمری سے ہی بسیرا کر چکا تھا... راستے ہموار تھے کہ اچانک ہی ایک پتھر راہ میں آگیا... سکون و اطمینان اس کی زندگی سے رخصت ہو گیا... وہ جس زمین پر اُترنا چاہتا تھا... وہ پیچھے چھوٹتی جارہی تھی... ایک پُرجوش زندگی سے بھرپور نوجوان کی داستانِ حیرت...

محبت اور قربانی کے جذبوں سے گندھی ایک دل گداز داستان......

وہ ایک نوعمر لڑکا تھا جس کا سر دو، دو پولیس والوں نے پوری طاقت سے جکڑ کر یخ پانی سے بھری بالٹی میں ڈبو رکھا تھا۔ خود کو اس اذیت سے نجات دلانے کے لیے لڑکا بُری طرح پھڑپھڑا رہا تھا لیکن تربیت یافتہ اور سانڈ کی طرح پلے جسموں والے پولیس والوں کی گرفت سے نکلنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

''م...... ما......'' تکلیف کی شدت سے گھبرا کر اس نے بے ساختہ ہی ماں کو پکارنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں بہت سا پانی اس کے پیٹ میں چلا گیا۔

''بول......اب بھی سچ بولے گا یا نہیں؟'' جس لمحے اسے لگا کہ آکسیجن کے لیے تڑپتے پھیپھڑوں کی جلن اسے مار ہی ڈالے گی عین اسی لمحے اس کے گھنے بالوں کو مٹھی میں بھینچ کر اس کا سر بالٹی سے نکال لیا گیا اور اس کے دائیں رخسار پر زناٹے دار تھپڑ مار کر اس سے پوچھا گیا۔ ٹھنڈے پانی نے اس کے چہرے کو اس بُری طرح سُن کر دیا تھا کہ وہ تھپڑ کی تکلیف محسوس نہ کر سکا۔ کر بھی لیتا تو اس وقت اسے ہر تکلیف سے بڑھ کر سانس لینے کی فکر تھی وہ کسی ہانپتے ہوئے کتے کی طرح منہ کھولے دیوانہ وار اپنے پھیپھڑوں میں آکسیجن اُتار رہا تھا۔

''ڈراما بند کرا وئے اور سچ بک ورنہ ہم تیرے حلق میں ہاتھ ڈال کر بھی سب کچھ برآمد کروا لیں گے۔'' اس کے بالوں کو ایک زوردار جھٹکا دیتے ہوئے ایک بار پھر اس سے کرخت لہجے میں پوچھا گیا۔

''میں بے قصور ہوں۔ میرا یقین کریں میں بے قصور ہوں۔'' وہ روہانسا ہو گیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر ایک بار پھر وہ بات دہرائی جو پچھلے کئی گھنٹوں سے کہہ رہا تھا۔

''بہت ہی ڈھیٹ ہڈی ہے تو بچو...... لیکن یاد رکھ یہاں تجھ سے بڑے بڑے پھنّے خان بھی آکر تیر کی طرح سیدھے ہو جاتے ہیں۔ تیری تو کوئی اوقات ہی نہیں ہے۔'' دائیں طرف کھڑے موٹی توند والے پولیس والے نے

مونچھوں کو بل دیتے ہوئے اسے باور کروایا اور بالکل ہی اچانک اس کا سر ایک بار پھر سامنے دھری ٹھنڈے پانی کی بالٹی میں ڈبو دیا۔ منہ بالٹی کے اندر پہنچتے پر وہ بری طرح تڑپا لیکن ان کی مضبوط گرفت سے خود کو چھڑانا اس کے بس سے باہر تھا۔

☆☆☆

”جلدی ناشتا دیں مما! مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ چھوٹی سی کچن ٹیبل پر اپنا موبائل اور بائیک کی چابیاں رکھتے ہوئے اس نے کوکنگ رینج کے سامنے کھڑی تیزی سے ہاتھ چلاتی ماں سے کہا اور خود کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

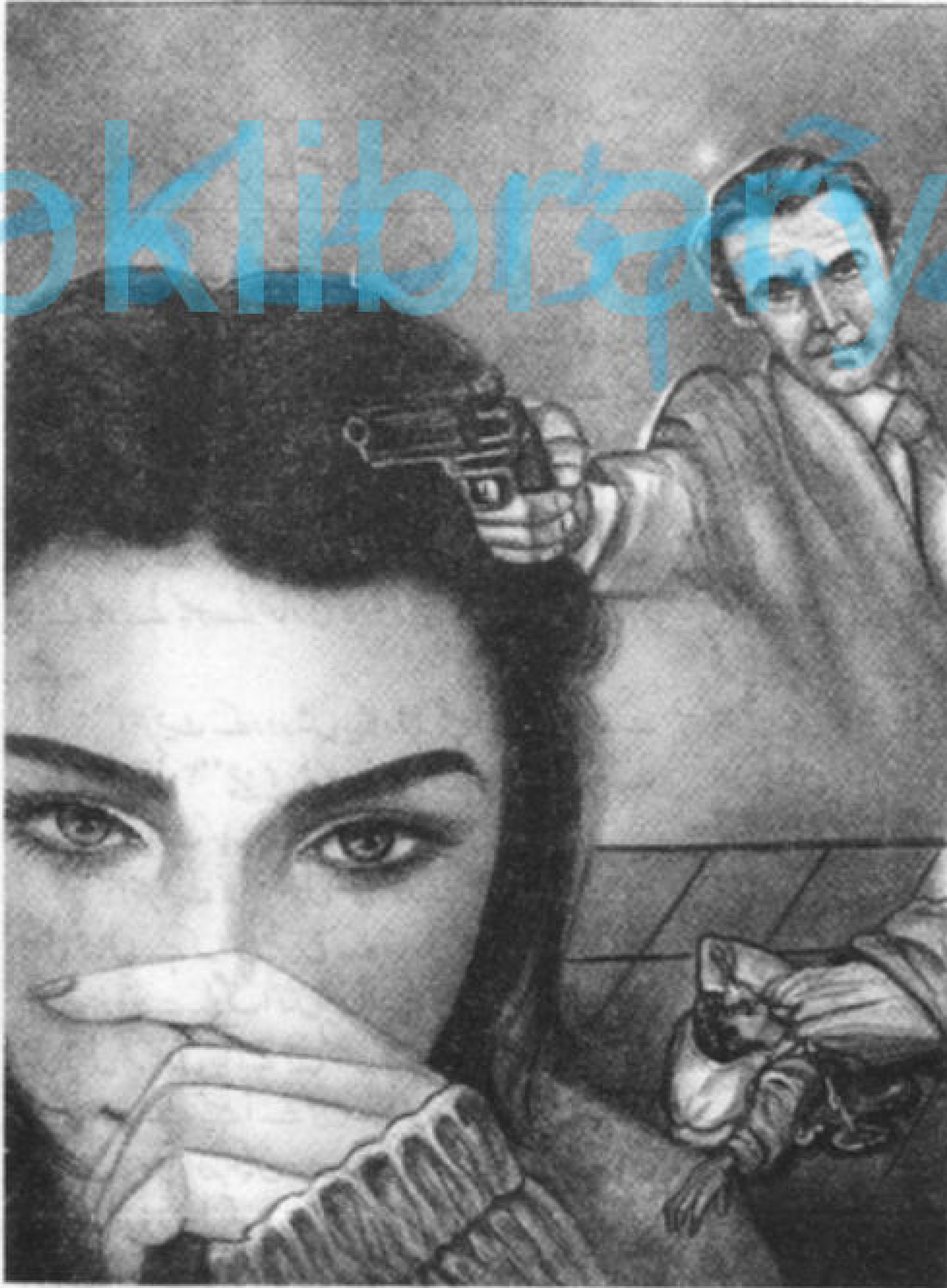
”اتنے ہوا کے گھوڑے پر کیوں سوار ہو؟ کیا کسی خاص جگہ جانا ہے“ عمیرہ نے ہاف فرائی انڈے کی پلیٹ اس کے سامنے رکھتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

”جنید کا فون آیا تھا۔ اسے ایک کسٹمر ملا ہے کہہ رہا تھا کہ کسٹمر کو جلدی ہے۔ اس کے بیٹے کی آن لائن کلاسز ڈسٹرب ہو رہی ہیں اس لیے آج دس گیارہ بجے تک ہر حال میں کام نمٹانا ہے۔“ اس نے نوالہ منہ میں ڈال کر تیزی سے چباتے ہوئے جواب دینے کی فرصت نکالی۔

”کیوں خواہ مخواہ کی دردسری پالی ہوئی ہے۔ ابھی میں ہوں نا اور سب دیکھ رہی ہوں پھر تمہیں کیا ضرورت پڑی ہے کمانے کے چکر میں خود کو خوار کرنے کی۔ ابھی تم اپنے ٹیسٹ کی تیاری کرو اور ایڈمیشن مل جانے پر دل لگا کر پڑھائی کرو۔ جب کچھ بن جاؤ گے تو پھر کمانا شمانا اور مجھے عیش کروانا۔ ابھی میں اتنی بوڑھی نہیں ہوئی ہوں کہ معاملات چلانے کے لیے تمہارے سہارے کی ضرورت محسوس ہو۔“ بیٹے کی عجلت کی وجہ جان کر اسے اچھا نہیں لگا اور قدرے خفگی سے اسے ٹوکنے لگی۔

”مائی سویٹ مدر...... آپ اتنی تو کیا تھوڑی سی بھی بوڑھی نہیں ہوئی ہیں اور میں چاہوں تو آپ کو اپنی مما کے بجائے بہن کہہ کر بھی دوستوں سے متعارف کروا سکتا ہوں اس لیے یہ تو بالکل سوچیں ہی نہیں کہ میں آپ کا سہارا بننے کے لیے یہ سب کر رہا ہوں۔ یہ بس میرا شوق ہے اور وعدہ کہ میں اپنے رزلٹس کو اس شوق کے ہاتھوں بالکل بھی متاثر نہیں ہونے دوں گا۔“ ماں کی خفگی کو محسوس کر کے اس نے ناشتا جوں کا توں چھوڑا اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر اسے منانے لگا۔

”میں تم سے ناراض نہیں ہوں سمیر لیکن بس مجھے اچھا نہیں لگتا کہ تم اتنی سی عمر میں کمانے کی فکر میں پڑ جاؤ۔ مجھے خود سے شرمندگی ہونے لگتی ہے کہ شاید میں تمہیں وہ سب فراہم نہیں کر پا رہی جس کی تمہیں خواہش ہے اس لیے تمہیں خود ہاتھ پیر چلانے پڑتے ہیں۔“ اس نے اپنے اندرونی جذبات کا اظہار کیا۔



''ایسا بالکل بھی نہیں ہے مما! آپ نے تو ہمیشہ مجھے میری خواہش سے بڑھ کر سہولیات دی ہیں لیکن اگر میں اپنے شوق کی تکمیل کے ساتھ ساتھ خود انحصاری کی راہ اختیار کرنا چاہتا ہوں تو اس میں کوئی برائی بھی نہیں ہے۔ باہر کے ممالک میں تو اٹھارہ سال کی عمر میں والدین خود بچوں کو کمانے کی ترغیب دیتے ہیں۔''

''ابھی تم اٹھارہ سال کے نہیں ہوئے ہو۔'' اس نے سمیر کو ٹوکا۔

''کم آن مما...... صرف دو ماہ ہی تو رہ گئے ہیں میرے اٹھارہ سال کا ہونے میں۔ اب میں کوئی لڑکی تو ہوں نہیں کہ اپنی عمر کم کرنے کی کوشش کروں۔'' وہ بے ساختہ ہی ہنسا۔

''ٹھیک ہے، بہت بڑے ہو گئے ہو۔ جو مرضی چاہے کرو لیکن تعلیم کے معاملے میں، میں ذرا سی کوتاہی برداشت نہیں کروں گی۔'' عبیرہ نے ہتھیار ڈال دیے لیکن ساتھ ہی تنبیہ کرنا نہیں بھولی۔

''اس کا تو میں آپ سے پہلے ہی وعدہ کر چکا ہوں۔'' اسے مانتے دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا اور ایک بار پھر ناشتے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''ارے ہاں، میں تو بھول ہی گئی تھی۔ کل ایک لڑکا آیا تھا یہ تمہارے لیے کارڈز دے گیا ہے۔'' چائے کی پیالی اس کے سامنے رکھتے ہوئے عبیرہ کو یاد آیا تو وہ کچن سے باہر نکلی اور فوراً ہی ایک چھوٹا سا گتے کا ڈبا لا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے بے حد اشتیاق سے ڈبے کا ڈھکن کھول کر دیکھا۔ اس کے سامنے سبز رنگ پر خوب صورت پرنٹنگ والے چھوٹے چھوٹے تعارفی کارڈز ایک ترتیب میں موجود تھے۔

''انٹرنیٹ کے دور میں یہ کارڈز چھپوانے کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟'' چیزیں ٹھکانے پر رکھتے ہوئے عبیرہ نے اس سے دریافت کیا۔

''انٹرنیٹ کا استعمال بھی کر رہے ہیں ہم لیکن میرا ذاتی خیال ہے کہ اس طرح کے تعارفی کارڈز کی بھی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ لوگ انہیں عموماً اپنے والٹ اور پرس وغیرہ میں ڈال کر بھول جاتے ہیں لیکن جب ضرورت پڑتی ہے تو یاد بھی سب سے پہلے آتے ہیں۔'' اس نے اپنے عمل کے حق میں رائے دی اور ٹیشو پیپر سے ہاتھ صاف کر کے ڈبے میں سے کچھ کارڈز نکال کر اپنے والٹ میں منتقل کیے۔ اسے اور اس کے دوست جنید کو کمپیوٹر سے عشق تھا اور اس عشق نے انہیں بغیر کسی ڈگری کے ہی سوفٹ ویئر اور ہارڈ ویئر کی اتنی شدبد دے دی تھی کہ چھوٹا موٹا مسئلہ تو وہ چٹکی بجاتے حل کر دیتے تھے۔ جنید کے ایک چچا جو اسی کاروبار سے وابستہ تھے ان کے شوق کو مہمیز دینے کا ذریعہ بنے۔ انہوں نے کام سیکھنے میں ان دونوں کی مدد کرنے کے ساتھ ساتھ کسٹمر بھی فراہم کیے یوں ان کا کام اچھا خاصا چل نکلا اور اب وہ اتنا کما رہے تھے کہ گھر سے پاکٹ منی لینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔

''آج میں بوتیک پر جاؤں گی۔ اس لیے ہوسکتا ہے واپسی میں کچھ دیر ہو جائے۔ تم میرا انتظار مت کرنا اور کھانا کھا لینا۔'' اسے گھر سے نکلنے کے لیے پر تولتا دیکھ کر وہ اپنا کام روک کر پلٹی اور اسے مطلع کیا۔

''اوکے، یو ڈونٹ وری۔ میں کھا لوں گا۔'' اس نے موبائل اور چابیاں اٹھا کر باہر کا رخ کیا۔ عبیرہ حسب معمول اس کے پیچھے تھی۔

''اللہ حافظ۔ بائیک دھیان سے چلانا۔'' وہ اس کا اکلوتا بیٹا ہی نہیں دنیا میں اکلوتا رشتہ بھی تھا اس لیے وہ بے حد متفکر رہتی تھی۔ اس کی خواہش پر اسے بائیک دلا ضرور دی تھی لیکن ہر بار اسے احتیاط کی تلقین کرنا نہیں بھولتی تھی۔ تلقین کے ساتھ ساتھ اس کی ڈھیروں دعائیں بھی تھیں جو بیٹے کے پیچھے پیچھے جاتی تھیں۔

☆☆☆

جاگنگ ٹریک پر دھیمی رفتار سے دوڑتا وہ تقریباً پچپن ساٹھ سالہ شخص اپنے حلیے اور شکل دونوں سے ہی پڑھا لکھا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے لباس اور انداز سے خوش حالی بھی جھلک رہی تھی اور وہ ایسے ہی لوگوں کا متلاشی رہتا تھا۔ ٹریک پر اس سے چند قدم کے فاصلے پر دوڑتا ہوا وہ موقع کی تلاش میں تھا لیکن فی الحال وہ شخص رکنے کے موڈ میں نہیں تھا اور یکساں رفتار سے دوڑتا چلا جا رہا تھا چنانچہ وہ بھی ثابت قدمی سے اس کے پیچھے تھا۔ دوڑتے ہوئے اسے اپنے ٹراؤزر کی جیب میں پڑے موبائل کی وائبریشن محسوس ہوئی تو جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل نکالا اور کال ریسیو کی۔

''کدھر ہے اور کیا کر رہا ہے؟'' دوسری طرف سے فون کرنے والے نے پوچھا۔

''وہیں جہاں کا تجھے بتایا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔

''یعنی مشن پر نکلا ہوا ہے۔ بتا کوئی شکار ملا کیا؟'' دوسری طرف سے ہنس کر پوچھا گیا۔

''شکار تاڑ لیا ہے بس چھپا ناره گیا ہے۔'' اس کے

انداز میں بھی شوخی تھی۔ لیکن اس بات کا خیال رکھتے ہوئے کہ کسی کے کان میں بات نہ پڑے آواز دھیمی رکھی تھی۔

''چل پھر تو اپنے شکار پر فوکس کر، میں فون رکھتا ہوں۔''

''ہاں، ہاں رکھ۔ وہ بیٹھ رہا ہے۔ میں جاتا ہوں۔'' اس نے عجلت میں فون بند کر کے دوبارہ ٹراؤزر کی جیب میں رکھا اور خود بھی ٹریک سے ہٹ کر اس بینچ پر جا بیٹھا جس پر وہ شخص بیٹھا تھا۔

''آج موسم اچھا ہے۔'' انگریزوں کے رواج کے مطابق اس نے گفتگو کا آغاز موسم پر تبصرے سے کیا۔

''واقعی موسم اچھا ہے۔ مجھے اس لیے بھی زیادہ اچھا لگ رہا ہے کہ آج بیگم ساتھ نہیں آئیں۔'' انہوں نے بزلہ سنجی کا مظاہرہ کیا۔

''ایسا کیوں؟'' اس نے حیرانی کا مظاہرہ کیا۔

''بھئی وہ ساتھ ہوں تو اپنے سوا کسی اور بڑی بی کی طرف دیکھنے کا موقع نہیں دیتیں۔''

''تو آپ بڑی بیوں کی طرف دیکھتے ہی کیوں ہیں۔ ڈراینگ اور فریش چہروں پر نظر ڈالا کریں۔'' اس نے مفت مشورہ دیا۔

''سچ بتاؤں، ڈالنا تو ادھر ہی چاہتا ہوں لیکن اول تو یہ کہ یہاں ینگ اور فریش چہرے کم کم ہی اپنی جھلک دکھاتے ہیں اور جو کبھی نظر آ بھی جائیں تو اپنی عمر کا لحاظ کر کے سوچنا پڑتا ہے کہ مرزا صاحب یہ بچیاں آپ کی بیٹی کی عمر کی ہیں اس لیے نظریں نیچی کریں اور شرافت کے جامے میں واپس آ جائیں۔'' وہ چہرے سے ہی اسے خوش مزاج لگے تھے اور گفتگو نے ثابت کر دیا تھا کہ اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔

''تم سناؤ، تم کیا کرتے ہو؟ عمر کے حساب سے تو تمہیں ابھی طالب علم ہی ہونا چاہیے۔'' اپنی کہتے کہتے انہوں نے اس کے متعلق جاننے کی خواہش کی۔

''جی آپ کا اندازہ درست ہے۔ ابھی میں اسٹوڈنٹ ہی ہوں لیکن ساتھ میں کچھ کام کاج بھی کرتا ہوں۔'' گفتگو نے اس کا من چاہا رخ اختیار کر لیا تھا اس لیے وہ پُرجوش ہو گیا اور انہیں اپنے متعلق کافی کچھ بتاتا چلا گیا۔

''گڈ، مجھے تم جیسے ذمے دار فطرت کے لڑکے پسند ہیں۔ مجھے کبھی ضرورت پڑی تو تم سے ضرور رابطہ کروں گا بلکہ میں اپنے دوست احباب اور کولیگز سے بھی تمہارا ذکر کر سکتا ہوں۔ اگر تمہارا کوئی کونٹیکٹ نمبر وغیرہ ہے تو مجھے دے دو۔'' وہ اس کے متعلق سُن کر متاثر ہوئے اور بڑی فراخ دلی سے اپنی خدمات پیش کیں۔

''یہ میرا کارڈ ہے۔ اس پر میرا کونٹیکٹ نمبر اور ای میل ایڈریس وغیرہ سب کچھ موجود ہے۔'' اس نے خوشی خوشی والٹ سے ایک کارڈ نکال کر انہیں پیش کیا۔ وہ دلچسپی سے کارڈ اور اس پر درج مندرجات کا جائزہ لینے لگے۔

''میرے خیال میں آپ یہ چند اضافی کارڈز بھی رکھ لیں۔ اس طرح آپ کو مجھے متعارف کروانے میں سہولت رہے گی۔'' ان کے جائزہ لینے کے دوران ہی اس نے مزید چند کارڈز ان کی طرف بڑھائے جنہیں انہوں نے پہلے والے کارڈ کے ساتھ ہی اپنے والٹ میں رکھ لیا۔

''اب مجھے اجازت دیجیے۔ ناشتے پر میرا انتظار ہو رہا ہوگا۔'' اس کا کام ہو چکا تھا چنانچہ نہایت قرینے سے اجازت چاہی اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس کے روانہ ہونے کے چند منٹ بعد وہ بھی بینچ سے اٹھ کر پارک کے بیرونی گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔ پارکنگ میں اپنی گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے انہیں اپنی گردن کی پشت پر چبھن کا سا احساس ہوا۔ یہ بالکل چیونٹی کے کاٹنے جیسا احساس تھا۔ پارک کی تازہ ہوا میں سانس لینے کی یہ قیمت بھی کبھار انہیں چکانی پڑ جاتی تھی۔ گھاس پھوس اور درختوں پر بسیرا کرنے والی ننھی مخلوقات میں سے کوئی، کوئی کبھی ان کے کپڑوں پر بھی چڑھ جاتی تھی اور جسم کے کسی حصے پر کاٹ کر اپنی موجودگی کا احساس بھی دلا دیتی تھی۔ گردن پر کسی چیونٹی کی موجودگی کے یقین کے ساتھ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر آہستہ سے گردن کی پشت سہلائی اور جیب سے گاڑی کی چابی نکال کر چند قدم کے فاصلے پر موجود گاڑی کی طرف بڑھے لیکن یکدم ہی انہیں لگا کہ زمین آسمان گھوم کر رہ گئے ہوں۔ انہوں نے خود کو سنبھالنے کے لیے دونوں ہاتھوں کی مدد سے سر تھام لیا لیکن چکر تھے کہ مسلسل آتے ہی چلے جا رہے تھے۔ انہوں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش میں گاڑی پر ہاتھ رکھ کر سہارا لینے کی کوشش کی لیکن اس سے پہلے ہی پیچھے سے آتے دو لڑکوں نے انہیں تھام لیا۔

''بس انکل جی! زیادہ پریشان نہ ہوں۔ ہم سنبھال لیں گے آپ کو۔'' چہرے پر ماسک لگائے ان دونوں لڑکوں کا انداز کچھ عجیب سا تھا۔ انہوں نے چاہا کہ کسی کو اپنی مدد کے لیے پکاریں لیکن لڑکوں نے انہیں اس کا موقع نہیں دیا۔ ان میں سے ایک نے ان کا منہ دبوچا اور دونوں انہیں کھینچتے

ہوئے ایک گاڑی کے پیچھے لے گئے۔

''جلدی جلدی تلاشی لو۔'' ان کا منہ دبوچنے والے لڑکے نے اپنے ساتھی سے کہا تو وہ جلدی جلدی ان کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ انہوں نے ان کی جیبوں سے کیا کیا نکالا وہ دیکھ نہیں سکے۔ ان کے چکر بہت بڑھ چکے تھے اور دماغ عجیب سُن سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ دھندلاتی آنکھوں سے انہوں نے آخر میں صرف اتنا دیکھا کہ وہ دونوں انہیں چھوڑ کر اطمینان سے چلتے ہوئے ان کی کار تک گئے اور دروازے کھول کر اندر بیٹھ گئے۔ کار کے پارکنگ سے باہر نکل کر جانے تک ان کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔

☆☆☆

''تنگ آگئی ہوں یار! لیپ ٹاپ مسلسل گڑبڑ کر رہا ہے اور اس کا سارا اثر میرے کام پر پڑ رہا ہے۔''

وہ اپنی بائیک میں پیٹرول ڈلوا رہا تھا کہ قریب سے سنائی دیتی نسوانی آواز نے پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ گاڑیوں کے لیے مخصوص برابر والی قطار میں ایک پینتیس چھتیس سالہ عورت نیلے رنگ کی مہران کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی کسی سے موبائل فون پر محوِ گفتگو تھی۔ پیٹرول کی ادائیگی کے لیے والٹ سے نوٹ نکالتے نکالتے بے اختیار اس نے اپنا تعارفی کارڈ بھی باہر نکال لیا۔

''آج معلوم کرتی ہوں کسی سے۔ اگر ایسے ہی گڑبڑی والا لیپ ٹاپ لے کر بیٹھی رہی تو باس نے میری ایک نہیں سننی ہے اور عنقریب دفتر سے باہر کر دینا ہے۔'' وہ اردگرد سے بے نیاز موبائل پر گفتگو کرنے میں مصروف تھی۔ چنانچہ جیسے ہی اپنے قریب سے ایکسکیوزمی کی آواز سنی چونک گئی۔ سر پر ہیلمٹ لگائے ایک بائیک سوار اس کے قریب کھڑا تھا۔

''یہ میرا کارڈ رکھ لیجیے۔ مجھے امید ہے کہ میں آپ کے کام آسکوں گا۔'' لڑکے نے ادب سے ایک ہلکے سبز رنگ کا کارڈ اس کے ہاتھ میں تھمایا اور خود اپنی بائیک آگے نکال لے گیا۔ عورت نے کارڈ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے موبائل پر گفتگو کا سلسلہ ختم کیا اور پیٹرول پمپ والے لڑکے کو گاڑی کی چابی تھمائی۔ جتنی دیر اس کی گاڑی کا فیول ٹینک بھرتا رہا، وہ کارڈ کا جائزہ لیتی رہی۔ کارڈ کے مندرجات کو پڑھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ کچھ دیر قبل اس کی فون پر جاری گفتگو بائیک والے لڑکے نے سُن لی تھی اور اس کی صورت میں اپنا ایک متوقع کسٹمر ڈھونڈ لیا تھا۔ لڑکے کے اس انداز پر دھیرے سے مسکراتے ہوئے اس نے کارڈ ڈیش بورڈ پر ڈالا اور پیٹرول کی رقم ادا کر کے گاڑی آگے بڑھا دی۔

پیٹرول پمپ سے آگے نکل کر اس نے بیک ویو مرر (عقبی آئینہ) پر نظر ڈالی۔ اسے اپنے پیچھے ایک بائیک نظر آئی۔ بائیک چلانے والے لڑکے کا ہیلمٹ اور پیراشوٹ کا نیلا اپر فوراً ہی اس کے نوٹس میں آگیا۔ کچھ دیر قبل پیٹرول پمپ پر اسے کارڈ دینے والے لڑکے نے بھی یہی دونوں چیزیں پہن رکھی تھیں۔ وہ لب بھینچے مسلسل اس بائیک سوار کو اپنے پیچھے آتے ہوئے دیکھتی رہی۔ دیکھتے دیکھتے اس نے اپنی حالت میں آنے والی تبدیلی محسوس کی۔ چکر، آنکھوں کے آگے آئی دھندلاہٹ اور عجیب سی بے چینی نے اسے بتایا کہ وہ زیادہ دیر تک گاڑی پر اپنا کنٹرول قائم نہیں رکھ سکے گی۔ اس نے ایک بار پھر مسلسل اپنے پیچھے آئی بائیک کو دیکھا اور فیصلہ کر لیا کہ عملی قدم اٹھانے کا وقت آگیا ہے۔

اس نے گاڑی کی رفتار مزید بڑھائی اور تقریباً ڈیڑھ منٹ میں راستے میں آنے والے ایک دوسرے پیٹرول پمپ میں گھس گئی۔ اس کا پیٹرول پمپ میں داخل ہونے کا انداز اتنا غیر معمولی تھا کہ عملے سمیت وہاں موجود گاہک بھی متوجہ ہو گئے۔ عملے کا ایک فرد تیزی سے بھاگتا ہوا قریب آیا۔ اس سے قبل کہ وہ خاتون کو سخت الفاظ میں اس کی حرکت پر تنبیہ کرتا اس کی نظر اس کی حالت پر پڑ گئی۔ وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے اسٹیئرنگ پر جھکی ہوئی تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ اس کا جسم اس کے قابو میں نہیں ہے۔ اس نے چلا کر اپنے کسی سینئر کو پکارا اور پھر خود جھک کر خاتون سے اس کی طبیعت کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔

''مم...... مجھے پانی پلاؤ۔ مجھے چک...... کر آرہے ہیں، میرا دل......'' خاتون نے ایک سسکی سی لی۔

''دل...... ڈوب رہا ہے۔'' پیٹرول پمپ پر فوراً ہی ایک ہنگامی سی صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ خاتون کی گاڑی کے گرد رش لگ گیا اور اسے طبی امداد فراہم کرنے کے سلسلے میں مشورے دیے جانے لگے۔ منیجر نے کسی مشورے پر کان دھرنے کے بجائے ایمبولینس اور ساتھ ساتھ پولیس کو کال کی۔ ایمبولینس کے خاتون کو لے کر روانہ ہونے تک پولیس موبائل بھی وہاں پہنچ چکی تھی۔ خاتون کی گاڑی کو ایک سائڈ پر لگا کر اسے لاک کیا گیا منیجر اور عملے کے افراد سے معلومات حاصل کی گئیں اور پھر چائے اور اس کے ساتھ آنے والے ان لوازمات سے انصاف کیا جانے لگا جو منیجر

نے جذبۂ خیر سگالی کے طور پر منگوائے تھے۔ ان کے حساب سے یہ ایک عام سا معاملہ تھا۔ خاتون کی حالت طبی امداد ملنے پر سنبھلتی تو وہ خود ہی اپنے گھر کال کر کے کسی کو بلوا لیتی اور پھر معمولی سی کارروائی کے بعد پیٹرول پمپ پر کھڑی کار مالکوں کے حوالے کر دی جاتی۔ صورتِ حال میں تبدیلی منیجر کے پاس آنے والی کال کے بعد آئی۔

''اسپتال سے کال ہے جناب! خاتون کی حالت سنبھل گئی ہے لیکن ڈاکٹر کی رائے کے مطابق یہ ایک مشکوک کیس ہے اور پولیس کی اسپتال میں موجودگی ضروری ہے۔'' کال سننے کے بعد اس نے پولیس والوں کو اطلاع دی تو وہ لوگ چونک گئے

''کیا مطلب ہے مشکوک کیس......؟'' ایس آئی جو اس وقت ان کے بیچ سب سے ''اعلیٰ افسر'' تھا خراب موڈ کے ساتھ بولا۔

''یہ تو آپ کو اسپتال جا کر ہی معلوم کرنا پڑے گا۔ مجھے بس اتنی ہی اطلاع ملی ہے۔'' منیجر نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

''چلو اوئے، چل کر دیکھتے ہیں۔'' ایس آئی نے دو گھونٹ میں ساری چائے اپنے حلق میں انڈیلی اور ساتھیوں کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ اسپتال میں خاتون کو طبی امداد دینے والی لیڈی ڈاکٹر گویا منتظر ہی تھی۔

''مجھے یقین ہے کہ خاتون کو کسی زود اثر نشہ آور کیمیکل سے نشانہ بنایا گیا ہے۔ فوری طبی امداد سے ان کی حالت تو سنبھل گئی ہے لیکن انویسٹی گیشن کے لیے میں نے ان کے خون کا سیمپل لے کر لیبارٹری بھجوا دیا ہے۔''

''ہو سکتا ہے اس نے خود کوئی نشہ آور شے پی رکھی ہو؟'' ایس آئی نے اندازہ لگانے میں عجلت دکھائی۔

''اگر ایسا ہوتا تو اس کے منہ کی بو آپ مجھ سے پہلے سونگھ چکے ہوتے۔ میرے اندازے کے مطابق وہ ایک شریف اور مہذب خاتون ہیں۔ بہر حال میری رائے لینے کے بجائے آپ اس خاتون کا بیان لیں تو شاید اس کیس کو کسی اور اینگل سے دیکھ سکیں گے۔'' لیڈی ڈاکٹر کے تیور بتا رہے تھے کہ اس نے مشکل سے اپنے غصے کو قابو کر کے یہ الفاظ ادا کیے ہیں۔ ایس آئی اپنے ایک ساتھی کے ساتھ کچھ خجل سا مریضہ کا بیان لینے چلا گیا۔ لیڈی ڈاکٹر کو کچھ کہنے کی اس میں اس لیے جرأت نہیں تھی کہ اسے علم تھا کہ وہ ایک حکومتی وزیر کی سگی بھتیجی ہے اور اس سے بدتمیزی اسے بہت مہنگی پڑ سکتی ہے۔

''جی تو بی بی کیا نام ہے آپ کا؟'' مریضہ کے کمرے میں پہنچ کر ایس آئی نے اس سے تفتیش کا آغاز کیا۔

''عفت...... عفت سلطانہ۔''

''ملازمت کرتی ہیں آپ؟'' خاتون کی وضع قطع سے اندازہ لگاتے ہوئے اگلا سوال داغا۔

''جی ہاں، ایک پرائیویٹ فرم میں ملازم ہوں۔'' اس نے فرم کا نام اور اپنا عہدہ بتایا۔

''کیا آپ اندازہ لگا سکتی ہیں کہ آپ کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ میرا مطلب ہے کہ ڈاکٹر صاحبہ کا خیال ہے کہ آپ کو کسی نشہ آور شے سے نشانہ بنایا گیا ہے تو آپ بتائیں کہ آپ کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ کیا کسی نے آپ پر کوئی اسپرے شسپرے یا تھا یا کچھ اور......؟''

''نہیں...... ایسا تو کچھ نہیں ہوا تھا بس پچھلے پیٹرول پمپ پر جب میں اپنی گاڑی میں فیول ڈلوانے کے لیے رکی تھی تو ایک لڑکے نے مجھے اپنا وزیٹنگ کارڈ دیا تھا۔ میں نے وہ کارڈ اپنی گاڑی کے ڈیش بورڈ پر ڈال دیا تھا......'' وہ کچھ الجھی ہوئی سوچ سوچ کر ایس آئی کو بتانے لگی۔

''وہ لڑکا مجھ سے پہلے پیٹرول پمپ سے نکل گیا تھا لیکن جب میں فیول ڈلوانے کے بعد سڑک پر آئی تو میں نے اسے اپنی گاڑی کے پیچھے آتے ہوئے دیکھا۔ مجھے یہ بات کچھ عجیب لگی لیکن اس سے قبل کہ میں کچھ اور سوچ پاتی مجھے اپنی طبیعت بگڑتی ہوئی محسوس ہوئی اور ایسا لگا کہ اگر میں ڈرائیونگ کرتی رہی تو یقینی طور پر کسی حادثے کا شکار ہو جاؤں گی۔ خود کو کسی حادثے سے بچانے کے لیے میں ایک پیٹرول پمپ پر رک گئی اور وہاں سے لوگوں نے مجھے یہاں پہنچا دیا''

''کوئی دشمنی وغیرہ کا معاملہ......؟'' ایس آئی نے اسے کریدا۔

''بالکل نہیں۔ میں اپنے کام سے کام رکھنے والے لوگوں میں سے ہوں اور لوگوں کی عمومی رائے میرے بارے میں بہت اچھی ہے۔'' اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''اس لڑکے کا دیا ہوا کارڈ اب کہاں ہے؟''

''وہ وہیں میری گاڑی کے ڈیش بورڈ پر ہی ہو گا۔ میری گاڑی تو بحفاظت ہے نا؟'' سوال کا جواب دیتے ہوئے اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

''جی ہاں۔ آپ کی گاڑی اسی پیٹرول پمپ پر بالکل محفوظ ہے۔'' ایس آئی نے اسے تسلی دی اور چند مزید ضمنی

سوالات کرنے کے بعد وہاں سے رخصت ہو گیا۔
عفت سلطانہ چہرے پر تفکر بھرے تاثرات لیے چند منٹ تک یونہی بستر پر پاؤں لٹکائے بیٹھی رہی۔ پھر سائڈ ٹیبل پر پڑا اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر اس میں سے موبائل نکالا۔ طبیعت خراب ہونے کے باوجود اس نے اسپتال منتقلی کے دوران اپنے بیگ کا خیال رکھا تھا اور کسی بھی لمحے اس سے غافل نہیں ہوئی تھی کہ مبادا کوئی موقع پرست شخص اسے لے اڑے اور وہ اپنی رقم اور موبائل سمیت دیگر قیمتی اشیا سے محروم ہو جائے۔
''میں عفت بات کر رہی ہوں سہیل۔ آفس آتے ہوئے میں ایک حادثے کا شکار ہو گئی ہوں......'' وہ معمول کے مطابق وقت پر اپنے دفتر نہیں پہنچ سکی تھی اور اسے معلوم تھا کہ اس کی میز پر بہت سارا کام اس کا منتظر ہے اس لیے کسی بھی بدمزگی سے بچنے کے لیے اپنے کولیگ کو حالات سے باخبر کر رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ سہیل خود ہی اس واقعے کے بارے میں باس کو مطلع کر دے گا اور وہ کسی بھی جھنجٹ سے بچ جائے گی۔

☆☆☆

''تمہاری اسٹڈی کیسی چل رہی ہے؟'' استری شدہ کپڑوں کو ہینگر میں لگاتے ہوئے عبیرہ نے اس سے دریافت کیا۔ وہ ایک ورکنگ ویمن تھی جسے اپنے گھر اور کام کے درمیان توازن قائم رکھنے کے لیے ہمہ وقت متحرک رہنا پڑتا تھا۔
''ایک دم اے ون۔ یو ڈونٹ وری۔ میرٹ لسٹ میں میرا نام ڈھونڈنے کے لیے آپ کو کوئی پریشانی نہیں اٹھانی پڑے گی۔'' موبائل کی اسکرین پر مسلسل انگلیاں چلاتے ہوئے اس نے ماں کی بات کا جواب دینے کی مہلت نکالی۔
''یہ کانفیڈنس ہے یا اوور کانفیڈنس؟'' عبیرہ نے ہینگر الماری میں ٹانگتے ہوئے اسے پلٹ کر گھورا۔
''کانفیڈنس ہے مام لیکن اپنی محنت سے زیادہ آپ کی دعاؤں پر۔'' عبیرہ کا گھورنا محسوس کرنے کے باوجود اس نے موبائل کی اسکرین پر سے نظریں نہیں ہٹائیں۔
''بی سیریس سمیر...... میں اسٹڈیز کے معاملے میں کسی قسم کی بے پروائی برداشت نہیں کر سکتی۔ تم چاہو تو تیاری کے لیے کوئی اکیڈمی جوائن کر لو۔ میں آنے والے کل میں تمہاری یہ نان سیریس بات نہیں سننا چاہتی کہ آپ نے ٹھیک سے دعا نہیں کی ہو گی اس لیے میرا میرٹ لسٹ میں نام نہیں آیا۔''
وہ اکلوتے بیٹے سے بہت محبت کرتی تھی لیکن اس کی تعلیم کے معاملے میں کسی رعایت کی قائل نہیں تھی اس لیے اس کے بے پروا انداز پر غصے میں آ گئی اور ایک دم آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے موبائل چھین لیا۔ موبائل کی اسکرین پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ وہاں کیمسٹری کی چند مساوات لکھی صاف نظر آ رہی تھیں یعنی وہ اس کے اندازے کے برخلاف کسی فضول سرگرمی میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنی پڑھائی پر ہی توجہ دے رہا تھا۔
''سوری۔'' اس نے آہستہ سے کہتے ہوئے فون واپس کر دیا۔
''اٹس او کے مما! مجھے معلوم ہے کہ آپ میرے فیوچر کی فکر میں ہی ٹینس ہو رہی ہیں لیکن میں آپ سے یہی کہوں گا کہ پلیز ٹینشن مت لیا کریں۔ میں آپ کا بیٹا ہوں اور مجھے آپ کی محنت اور قربانیوں کا احساس ہے اس لیے اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں آپ کو مایوس کر دوں۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آیا اور اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر بولا تو اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔
''اب ایموشنل ہونے کی نہیں ہو رہی ہے۔'' اس نے فوراً ٹوکا۔
''اچھا بابا نہیں ہوتی ایموشنل تم بیٹھ کر اپنی پڑھائی کرو۔ میں یہ کام سمیٹ کر کچن میں جاتی ہوں بس مجھے اتنا بتا دو کہ تمہارے لیے ڈنر میں کیا بناؤں۔ مجھے تو فریحہ کی چھوٹی بیٹی کی برتھ ڈے پارٹی اٹینڈ کرنی ہے اس لیے میرا ڈنر وہیں ہو گا۔'' وہ اس کا شانہ تھپتھپا کر اپنے کام میں مصروف ہوتے ہوئے اس سے پوچھنے لگی۔
''کچھ بھی نہ بنائیں۔ میرا آج رات جنید کی طرف کمبائنڈ اسٹڈی کے لیے رکنے کا پروگرام ہے اور جنید کا خیال ہے کہ ہم آج رات کہیں باربی کیو کھانے جائیں۔'' اس نے عبیرہ کو اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔
''کچھ الٹا سیدھا کھا کر بیمار نہ پڑ جانا۔ آج کل کے حالات میں ویسے ہی بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔'' وہ فوراً فکرمند ہوئی۔
''آپ بھی تو پارٹی میں جا رہی ہیں مما! وہاں آپ کی سوشل ڈسٹینسنگ کا کیا ہو گا؟'' عبیرہ صحت کے حوالے سے حساس تھی اور کورونا کی وبا کے بعد سے تو بہت ہی محتاط ہو گئی تھی اس لیے اسے ماں کو چھیڑنے کا موقع مل گیا۔
''فریحہ نے صرف چند مخصوص لوگوں کو انوائٹ کیا

ہے اور وہ سب مجھ سمیت سینس ایبل لوگ ہیں اس لیے میں اس پارٹی میں شرکت کے لیے جا رہی ہوں لیکن تم اور تمہارے دوست سب بے پروا لوگ ہو اس لیے مجھے فکر کرنی پڑتی ہے۔'' عبیرہ نے اسے لیکچر دیا۔

''اچھا پر اس نہیں کروں گا بے پروائی۔ ماسک لگا کر جاؤں گا اور سینی ٹائزر بھی ساتھ رکھوں گا۔ ویسے بھی اب کورونا کی ویکسین آ گئی ہے اس لیے زیادہ ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''ویکسین آ گئی ہے لیکن ہم نے ابھی تک لگوائی نہیں ہے اس لیے احتیاط لازم ہے۔'' اسے بیٹے کی بے نیازی کھلی۔

''او کے بابا میں پوری احتیاط کروں گا اب تو اجازت دے دیں۔ میری نہیں تو وزیر اعظم صاحب کی ہی سن لیں جو کہتے ہیں کہ اب ہمیں کورونا کے ساتھ رہنے کی عادت ڈالنی ہوگی۔ دیکھیں اب تو کوئی بھی ڈر کر گھر میں بند ہو کر بیٹھنے کو تیار نہیں ہے اور سب روٹین لائف کی طرف جا رہے ہیں۔'' اس کے پاس اپنے دلائل تھے۔

''وہ تو خیر مجبوری ہے اور میں کون سا تمہیں گھر میں بند کر کے بٹھا بھی نہیں رہی ہوں بس یاددہانی کروا رہی ہوں کہ احتیاط کرنا۔'' عبیرہ نے بحث سمیٹی اور الماری بند کر کے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

''امیزنگ۔ یہ آج کا دوسرا عجیب و غریب کیس ہے اور دونوں کیسز میں ایک بات مشترک ہے۔'' ایس ایچ او حامد علی نے ایس آئی کی پیش کردہ رپورٹ کا جائزہ لینے کے بعد تبصرہ کیا تو وہ حیران رہ گیا۔

''میں سمجھا نہیں سر! کیا کہیں اور بھی کسی خاتون کو اس طرح نشانہ بنایا گیا ہے؟''

''خاتون کو نہیں ایک مرد کو۔ داؤد مرزا نامی ایک آدمی ہے۔ ایک پرائیویٹ فرم میں اچھے عہدے پر کام کرتا ہے۔ آج صبح وہ اپنے معمول کے مطابق پارک میں واک اور جاگنگ وغیرہ کے لیے گیا تو وہاں ایک لڑکے نے اسے اپنا وزیٹنگ کارڈ دیا۔ لڑکے سے ملاقات کے بعد وہ پارکنگ میں اپنی کار میں بیٹھنے جا رہا تھا تو اسے چکر آ گیا اور پھر اچانک ہی دو لڑکوں نے اسے گھیر کر اس کی جیبوں سے نقدی، موبائل اور گاڑی کی چابیاں نکال لیں۔ جسم مفلوج ہونے کی وجہ سے وہ بے چارہ کسی کو مدد کے لیے پکار بھی نہیں سکا اور وہ لڑکے اسی کی گاڑی میں بیٹھ کر فرار ہو گئے۔ بعد میں کچھ لوگوں نے داؤد مرزا کو پارکنگ میں پڑا دیکھ کر اسپتال پہنچایا جہاں اس نے حالت سنبھلنے کے بعد پولیس میں رپورٹ لکھوائی۔ پولیس نے جو ابتدائی تفتیش کی ہے اس کے مطابق داؤد مرزا کو پارک میں ملنے والے لڑکے کا حلیہ ان پر حملہ کرنے والے لڑکوں میں سے ایک سے ملتا جلتا تھا لیکن چہرے پر موجود ماسک اور خراب فوٹیج کی وجہ سے حتمی طور پر یہ بات نہیں کہی جا سکتی۔''

''کیا داؤد مرزا اور عفت سلطانہ کو دیے گئے وزیٹنگ کارڈز ایک ہی ہیں سر؟'' ایس آئی تفصیل جان کر پُرجوش ہوا۔ عفت سلطانہ نے خود کو کارڈ دینے والے بائیکر پر شبہ ظاہر کیا تھا کہ وہ اس کا تعاقب کر رہا تھا اس لیے ایس آئی نے وزیٹنگ کارڈ کو اپنے ریکارڈ کا حصہ بنا لیا تھا اور اب اپنے افسر کی بات نے اسے چونکا دیا تھا۔

''بالکل...... یہ دیکھو، میرے پاس ریکارڈ میں وہ کارڈ موجود بھی ہے۔'' ایس ایچ او نے پلاسٹک کے لفافے سے پیک کارڈ نکال کر اس کے سامنے کیا۔

''یہ تو کھیلا ہے سر جی۔ خاتون نے بھی کارڈ ملنے کے تھوڑی دیر بعد چکر اور دل گھبرانے کی شکایت کرتے ہوئے پیٹرول پمپ پر گاڑی روکی تھی اور اس داؤد مرزا کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ خاتون البتہ خوش قسمت رہی کہ اسے کوئی مالی نقصان نہیں اٹھانا پڑا۔'' ایس آئی نے خوب صورت لکھائی والے سبزی مائل کارڈ کا جائزہ لیتے ہوئے تبصرہ کیا۔ کارڈ پر موجود مندرجات بالکل یکساں تھے۔

''تم نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ ڈاکٹر نے خاتون کو کسی نشہ آور شے کا نشانہ بنائے جانے کا شبہ ظاہر کیا تھا۔ مرزا کے کیس میں بھی ایسا ہی ہے یعنی یہ کوئی نیا گروہ سرگرم ہوا ہے جو لوگوں کو اس طریقے سے لوٹ رہا ہے۔'' ایس ایچ او نے بال پوائنٹ سے میز کی سطح کو بجاتے ہوئے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''لگتا تو یہی ہے سر! کل تک بلڈ ٹیسٹ کی رپورٹ آ جائے تو کنفرم بھی ہو جائے گا اور یہ بھی پتا چل جائے گا کہ اس کام کے لیے کون سا کیمیکل استعمال کیا جا رہا ہے۔''

''ان کارڈز کو بھی لیبارٹری بھیج کر چیک کرواؤ۔ مجھے لگتا ہے کہ ان کارڈز پر ہی کوئی ایسا کیمیکل لگایا گیا ہے جو چھونے والے کے مساموں سے خون میں سرایت کر کے اثر دکھاتا ہے اور لٹیرے شکار کی خراب حالت کا فائدہ اٹھا کر آسانی سے اسے لوٹنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔'' ایس ایچ او تجربہ کار آدمی تھا اس لیے واردات کے نئے طریقے

کے باوجود اسے نتیجہ اخذ کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔

''میں بھجوا دیتا ہوں سر اور یہ بھی چیک کرواتا ہوں کہ شہر میں کہیں اور بھی تو اس قسم کی وارداتیں نہیں ہو رہیں۔ ہمارے علاقے میں جس طرح دو گھنٹے کے مختصر وقفے میں یہ دو وارداتیں ہوئی ہیں اس سے یہی لگ رہا ہے کہ یہ لڑکے اس قسم کی کارروائیوں میں خاصے منجھ چکے ہیں جب ہی اتنے اعتماد سے کام کر رہے ہیں۔'' ایس آئی نے اپنی ذہانت دکھانے کی کوشش کی۔

''یہ نئی نسل کے کارنامے ہیں شاید، اس لیے ان کے بارے میں کچھ بھی کہنا مشکل ہے۔ انہیں ہر بات میں بہت جلدی ہوتی ہے اس لیے ہونے کو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آج پہلی بار میں ہی وہ اکٹھے یہ دو وارداتیں کر گزرے ہوں۔'' ایس ایچ او نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''کارڈ پر کانٹیکٹ نمبر اور ای میل ایڈریس تو ہے سر! آپ کہیں تو فون کے ذریعے گھیرنے کی کوشش کرتے ہیں۔'' ایس آئی کی آنکھیں چمکیں۔

''دیکھ لو یار...... یہ نہ ہو کہ کچا ہاتھ ڈالو اور بندہ ہوشیار ہو کر بھاگ نکلے۔ ایسے وارداتیے بڑے چوکنے رہتے ہیں اور ذرا سی بھی آہٹ پر بھاگ نکلتے ہیں۔''

''تو پھر ایسا کریں کہ اس نمبر کو آبزرویشن پر لگوا دیں اور ای میل اکاؤنٹ وغیرہ کو بھی چیک کروائیں۔ کل دونوں وکٹمز کی بلڈ رپورٹ آنے کے بعد ہی پکا ہاتھ ڈالیں گے۔'' ایس آئی جوان تھا اور اس کیس میں اسے کارکردگی دکھانے کا موقع نظر آ رہا تھا اس لیے جوش کا مظاہرہ کیا۔

''سب ہو جائے گا یار، اب تو ذرا روٹی شوٹی کا بھی انتظام کر دو پہر میں بھی ٹھیک سے کھانے کا ٹیم نہیں ملا تھا اس لیے اب بھوک سے بُرا حال ہے۔'' ایس ایچ او نے توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنے اہم ترین مسئلے کی طرف توجہ مبذول کروائی جسے نظر انداز کرنا ایس آئی کے بس کی بات نہیں تھی۔ ملازمت کے چند سالوں میں وہ یہ گر تو سیکھ ہی چکا تھا کہ کامیابی کا اصل راز محنت میں نہیں بلکہ اپنے افسران کو خوش رکھنے میں پوشیدہ ہے۔

☆☆☆

''یہ کچھ زیادہ چیزیں نہیں منگوا لیں تم نے؟ ہم یہ اتنا سارا کھانا کیسے کھا پائیں گے؟'' اس نے میز پر بیک وقت سجی کئی ڈشز کو دیکھ کر اعتراض کیا۔

''کوئی مسئلہ نہیں ہے یار جو بچے گا پیک کروا لیں گے۔ مجھے تو ویسے بھی رات کو زیادہ دیر تک جاگنے پر دوبارہ بھوک لگنے لگتی ہے۔'' جنید نے کان پر سے مکھی اڑانے والے انداز میں اس کے اعتراض کو نظر انداز کیا۔

''کچھ خیال کر یار دنیا میں لوگ بھوکے مر رہے ہیں اور تو ڈبل ڈبل کھا کر اوور ویٹ ہو رہا ہے۔ یہی حال رہا تو اپنے چاچو سے بھی ڈبل ہو جائے گا۔'' اس نے جنید کو ڈرایا۔

''میرے چاچو کون سا مانتے ہیں کہ وہ زیادہ کھانے سے موٹے ہوئے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ایک تو موروثی موٹاپا ہے دوسرے کام بھی ایسا ہے کہ زیادہ تر وقت بیٹھ کر ہی گزرتا ہے اس لیے جسم پھیلتا جا رہا ہے۔'' جنید کی زبان اور ہاتھ یکساں رفتار سے کام کر رہے تھے اور پلیٹوں میں موجود کھانا تیزی سے اس کے پیٹ میں منتقل ہو رہا تھا۔

''سیدھے سیدھے بول کہ اصل موروثی بیماری ڈھٹائی ہے۔'' اس نے ایک چکن اسٹک اور کچھ سلاد اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے تبصرہ کیا جسے جنید نے ایک زوردار قہقہہ لگا کر نظر انداز کر دیا اور مزے سے بولا۔

''جو بولنا ہے بولتا رہ۔ ہماری خاندانی صحت کا ایک راز یہ بھی ہے کہ ہم کوئی بات دل پر نہیں لیتے اور ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتے ہیں۔''

''تو یہ بول نا کہ چکنا گھڑا ہے۔'' وہ بے ساختہ ہی بولا۔

''تمہاری طرح ہڈیوں کا ہار ہونے سے چکنا گھڑا ہونا بہتر ہے۔ چکنا ہی سہی گھڑا کسی کام تو آتا ہے۔'' جنید بھی اسے بخشنے والا نہیں تھا۔

''گھڑا ایک آؤٹ آف ڈیٹڈ شے ہے۔ اسے آج کل کوئی اپنے گھر میں رکھنا پسند نہیں کرتا تو بھلا کام کیا لے گا۔'' اس نے دوبدو جواب دیا۔ ہلکی پھلکی نوک جھوک اور گفتگو میں انہوں نے کھانا ختم کیا۔

''بل میں دوں گا۔'' بل دینے کی باری آئی تو اس نے جنید کو روک کر والٹ نکالنے کے لیے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس کا ہاتھ خالی باہر آیا۔ اس نے جلدی سے اپنی دوسری جیب چیک کی لیکن والٹ موجود نہیں تھا۔

''کیا ہوا؟'' جنید نے اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر پوچھا۔

''میرا والٹ نہیں ہے یار......'' اس نے جھینپی ہوئی کیفیت میں بتایا۔

''اٹس او کے۔ میں بل دے دیتا ہوں۔'' جنید نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی اور خود بل ادا کرنے چلا گیا۔

''اتنی عجیب سی شکل کیوں بنایا ہوا ہے؟ مل جائے گا والٹ گھر پر ہی رہ گیا ہوگا۔'' جنید بل کی ادائیگی کے بعد واپس آیا تو اسے سوچوں میں گم دیکھ کر اسے تسلی دی۔

''نہیں یار گھر پر نہیں بھولا ہوں۔ تجھے یاد نہیں کہ میں نے یہاں بازار میں پہنچ کر ایزی لوڈ کروایا تھا اور اپنے والٹ سے ہی پیسے نکال کر دیے تھے۔''

''اوہو...... پھر تو اس کا مطلب ہے کہ تیرے ساتھ ہاتھ ہو گیا ہے۔ رش والی جگہوں پر تو جیب کترے بڑی صفائی سے اپنا کام دکھا جاتے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہمیں جولڑکی ملی تھی نہ بھی تو اسی بات کا رونا رو رہی تھی نا کہ کسی نے اس کا موبائل چوری کر لیا ہے۔'' جنید نے خیال آرائی کرنے کے ساتھ ساتھ یاددہانی بھی کروائی۔

''وہ لڑکی تو لگ بھی کوئی ہونقِ اعظم رہی تھی۔ عجیب بوکھلائی ہوئی چیز تھی۔'' اس نے مذکورہ لڑکی پر تبصرہ کیا۔

''کہہ تو، تو ٹھیک رہا ہے۔ اس کی حماقت کا تو اسی بات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ موصوفہ جیولری کی سلیکشن کے دوران اپنا موبائل کاؤنٹر پر رکھ کر بھول گئیں اور جب یاد آیا تو موبائل وہاں نہیں تھا۔'' جنید نے بھی اس کی تائید کی۔

''پر یار میں ایسا بے پروا تو نہیں ہوں۔ مجھے تو حیرت ہو رہی ہے کہ میرے پاکٹ میں سے والٹ نکل گیا اور مجھے خبر تک نہیں ہوئی۔'' وہ حیران تھا۔

''جانے دے میرے بھائی! یہاں ایسے ایسے فنکار پڑے ہیں کہ آنکھوں سے سرمہ چرا کر لے جائیں اور کسی کو کان و کان خبر نہ ہو۔'' جنید نے حقیقت بیان کی۔ پھر خیال آنے پر پوچھنے لگا۔

''والٹ میں بہت زیادہ رقم یا کوئی ضروری ڈاکومنٹ تو نہیں تھا؟ اگر ایسا ہے تو چل کر ایف آئی آر کٹوا دیتے ہیں۔''

''ارے نہیں یار ایسا کچھ خاص نہیں تھا۔ بائیک کے کاغذات میں ہمیشہ شرٹ کی سامنے والی جیب میں رکھتا ہوں کہ کوئی ٹریفک کانسٹیبل وغیرہ روک لے تو فوراً پیش کر کے اپنی جان چھڑواؤں۔ پیسے جتنے جانے تھے، چلے گئے۔ ایف آئی آر کٹوانے سے ملنے سے تو رہے الٹا تھانے جانے پر پولیس والوں کی جیب گرم کرنی پڑے گی۔'' اس نے جنید کی تجویز کو رد کیا۔

''کہہ تو ٹھیک رہا ہے تو۔ چل پھر نکلتے ہیں یہاں سے۔ آگے اپنے دھندے بھی نمٹانے ہیں۔'' جنید نے فوراً اس سے اتفاق کیا۔

''ہاں چل، ٹائم بھی کافی ہو گیا ہے لیکن یار یاد رکھنا آئندہ یہ رات والے دھندے میں مجھے نہ پھنسانا۔ ابھی تو کمبائنڈ اسٹڈی کا بہانہ چل گیا ہے لیکن بار بار مما اس طرح چھوٹ دینے والی نہیں ہیں۔ مجھے خود بھی انہیں رات کو گھر پر اکیلا چھوڑنا پسند نہیں۔'' اس نے بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے جنید کو تنبیہ کی۔

''ایک تو میں تیرے یہ ماماز بوائے ہونے سے پریشان ہوں۔'' جنید نے منہ بنایا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر بات بدلتے ہوئے بولا۔

''اچھا چل آئندہ خیال کروں گا۔ ابھی تو یہ پارٹی ہی زبردست ٹکر گئی تو میں نے چانس ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ رات ہی رات میں کام نمٹا کر آرام سے مال بنا لیں گے پھر تو گھر میں بیٹھ کر آرام سے پڑھتے رہنا۔''

''یہی مناسب ہوگا۔ پارٹی چاہے ہلکی ملے، کام میں بس دن میں ہی کروں گا۔ اپنی مما کی خواہش سے زیادہ اہم نہیں ہے میرے لیے پیسا۔'' اسے واقعی اپنی ماں دنیا کی ہر شے سے بڑھ کر عزیز تھی۔

☆☆☆

رات تقریباً پونے ایک بجے کا وقت تھا۔ ویران بس اسٹاپ پر ایک ہائی ایس رکی اور اس میں سے ایک شخص کے اترنے کے بعد آگے بڑھ گئی۔ اترنے والا شخص جیبوں میں ہاتھ ڈال کر بے نیازی سے ایک طرف چل پڑا۔ اس شخص کا نام غضنفر آغا تھا۔ وہ ایک بڑی ٹیکسٹائل مل میں سینئر الیکٹریشن کے عہدے پر کام کرتا تھا۔ تیس سالہ آغا ڈپلومہ ہولڈر تھا اور اپنے کام میں مہارت رکھتا تھا اس لیے کمپنی اسے معقول مشاہرہ دیتی تھی۔ کمپنی کی ملازمت کے علاوہ، وہ اکثر اِدھر اُدھر سے بھی کام پکڑ لیتا تھا اس لیے ہر مہینے تنخواہ کے علاوہ پندرہ بیس ہزار روپے اضافی بھی کما لیتا تھا۔

سادہ طرزِ زندگی والے آغا نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی اس لیے اس کی آمدنی کا بیشتر حصہ محفوظ رہتا تھا۔ وہ اپنے والدین کی وفات کے بعد سے ورثے میں ملنے والے گھر میں اکیلا رہ رہا تھا۔ اس کے بہن بھائی بھی نہیں تھے کہ گھر میں کوئی آتا جاتا اور خاطر تواضع میں کچھ خرچ کرنا پڑتا۔ جس کالونی میں وہ رہتا تھا، اس کالونی کے ایسے گھرانوں نے جہاں جوان لڑکیاں موجود تھیں، شروع شروع میں آغا میں خاصی دلچسپی لی لیکن اس نے پروں پر پانی نہیں پڑنے دیا۔ درحقیقت اس کا رویہ لوگوں سے اتنا خراب تھا کہ لوگوں نے کان پکڑ لیے اور فیصلہ کر لیا کہ اس

جیسے اکھڑ اور بدمزاج شخص سے اپنی بہن یا بیٹی کا رشتہ جوڑنے کا مطلب ہوگا اس بے چاری کی زندگی خراب کرنا۔ اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد لوگوں نے اس کا پیچھا چھوڑ دیا اور وہ اپنی تنہائی کے ساتھ سکون کی زندگی گزارنے لگا۔

غضنفر آغا شروع سے اس مزاج کا بندہ نہیں تھا۔ اس کے مزاج میں یہ تبدیلی اس کی شادی شدہ چھوٹی بہن کی موت کے بعد آئی تھی۔ دوسرے شہر میں بیاہی جانے والی اس کی لاڈلی بہن شادی کے محض ایک سال بعد گیس سلنڈر پھٹنے سے مرگئی تھی۔ شادی کے ایک سالہ عرصے میں بہن بظاہر اپنے گھر میں خوش تھی اور اس نے اپنے شوہر سمیت کسی سسرالی عزیز کی بھی شکایت نہیں کی تھی پھر بھی غضنفر کے دل میں شک آگیا کہ اس کی بہن کو قتل کیا گیا ہے۔ اس شک نے اسے بہن کے شوہر، رشتے داروں اور یہاں تک کہ اپنے ماں باپ کی یقین دہانیوں کے باوجود بھی اسے اس بات کا یقین نہیں کرنے دیا کہ اس کی بہن کی موت ایک حادثہ تھا۔ حقیقتاً اس کے لیے اکلوتی بہن کی اچانک موت ہی ناقابلِ قبول واقعہ تھا اور ایک دردناک حقیقت کو قبول نہ کرنے کے باعث اس کا ذہن الجھ کر رہ گیا تھا۔ بہن کی موت کے چھ ماہ بعد ہی ماں کے گزرنے نے اس پیچیدگی کو اور بڑھا دیا۔ وہ اپنے رویوں میں اس قدر شدت پسند نظر آنے لگا کہ اس کو ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑے۔ اس واقعے کے بعد اس کے والد کو پہلی بار احساس ہوا کہ اسے علاج کی ضرورت ہے۔ چھ ماہ نفسیاتی معالج کے زیرِ نگرانی علاج کے نتیجے میں وہ کافی بہتر ہوگیا اور ایک بار پھر ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ اب بھی اس کی وہ ملازمت جاری تھی اور انتہائی کم گوئی کے سوا کسی کو اس سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ اس کے والد حیات رہتے تو شاید اس پر علاج جاری رکھنے کے سلسلے میں دباؤ ڈالتے یا اس کا گھر ہی بسا دیتے لیکن ان کے چلے جانے سے یہ دونوں اہم کام رک گئے اور غضنفر کی زندگی بھی رک سی گئی۔ اب وہ ایک پُراسرار کردار کی طرح لوگوں کی گفتگو کا موضوع تو بنا رہتا تھا لیکن لوگوں کو اس سے براہِ راست گفتگو کرنے کی ہمت بہت کم ہی ہو پاتی تھی۔

اپنی ذات میں گم رہنے والے غضنفر آغا نے بے شک دنیا کو چھوڑ دیا تھا لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ دنیا اس جیسے بے ضرر کردار کو بھی بخشنے والی نہیں تھی۔ وہ اسٹاپ سے پیدل اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا تو اسے اندازہ نہیں تھا کہ روزانہ کی طرح گھر کے دروازے پر صرف تنہائی اس کی منتظر نہیں ہوگی۔ ابھی اس نے تالا کھول کر دروازے کو دھکیلا ہی تھا کہ پیچھے سے دو افراد اسے دھکیلتے ہوئے اندر لے گئے اور دروازہ بند کرلیا۔

''کک...... کون ہو تم؟'' فطری طور پر وہ اچانک ٹوٹنے والی اس افتاد پر گھبرا گیا۔

''تعاون کرو گے تو ہمیں دوست پاؤ گے ورنہ ہم موت کے فرشتے کا روپ بھی دھار سکتے ہیں۔'' تاریک گھر میں کھڑے ہوکر خوفناک لہجے میں ایسی بات سُن کر غضنفر لرز گیا۔ وہ ویسے بھی نفسیاتی پیچیدگیوں کا شکار تھا جو اپنی کمزوری کو چھپانے کے لیے عام لوگوں سے تو لڑ جھگڑ کر گزارا کرلیتا تھا لیکن تاریکی میں حملہ آور ہونے والے اجنبیوں سے خوف زدہ ہوگیا تھا۔

''کک...... کیسا تعاون؟'' اس نے کپکپاتے لہجے میں دریافت کیا۔ جواب میں ایک ہلکی سی آواز کے ساتھ روشنی پھیل گئی۔ روشنی نے لمحہ بھر کے لیے اس کی آنکھوں کو چندھیا دیا لیکن پھر وہ ان دو افراد کو دیکھنے کے لائق ہوگیا۔ ان میں سے ایک دبلا پتلا اور قدرے دراز قد کا تھا جبکہ دوسرا فربہی مائل جسم کے ساتھ درمیانے قد کا مالک تھا۔ دونوں نے اپنے چہروں پر ماسک لگا رکھا تھا اس لیے غضنفر ان کی شکلیں دیکھنے سے قاصر تھا۔

''کیا چاہتے ہو تم لوگ؟'' اس بار اس نے کوشش کر کے خود کو سنبھالا اور قدرے مضبوط لہجے میں دریافت کیا۔

''رقم......'' نہایت اطمینان سے ایک یک لفظی مطالبہ کیا گیا۔

''کک...... کیسی رقم؟'' وہ ہڑبڑایا۔

''وہی رقم جس پر تم سانپ بن کر بیٹھے ہوئے ہو۔ نہ خود خرچ کرتے ہو اور نہ ہی دوسروں کو دیتے ہو۔''

''نہیں......'' غضنفر نے زور سے نفی میں سر ہلایا۔ ''میرے پاس کوئی رقم نہیں ہے۔ تمہیں کسی نے غلط اطلاع دی ہے۔''

''ہمیں کسی نے کوئی اطلاع نہیں دی۔ ہم اپنے لیے اطلاعات خود حاصل کرتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ ٹھیک ٹھاک آمدنی کے باوجود تمہارے اخراجات برائے نام ہیں۔ تم سادہ کھانا کھاتے ہو، معمولی لباس پہنتے ہو، کمپنی کی گاڑی تمہیں پک اینڈ ڈراپ دیتی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ تم اپنی آمدنی کا بڑا حصہ بچا لیتے ہو۔ اس بچت کو محفوظ رکھنے کے لیے تمہارے پاس کوئی بینک اکاؤنٹ نہیں ہے نہ ہی تم کسی عزیز و اقارب سے تعلق رکھتے ہو کہ رقم ان میں سے کسی کے پاس رکھوا دی ہو تو اس کا صاف اور سیدھا مطلب

ہے کہ رقم تمہارے پاس، اسی گھر میں محفوظ ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ ہم تمہارے گھر کی تلاشی لینے میں وقت ضائع کریں۔ اس سے بہتر ہے کہ تم خود اپنے ہاتھ سے رقم ہمارے حوالے کردو۔'' فربہی مائل شخص نے اپنا مدعا بیان کیا تو غضنفر کے ماتھے پر پسینا چمکنے لگا جو کچھ وہ لوگ کہہ رہے تھے، وہ غلط نہیں تھا۔ اس کی ساری بچت اس کے پاس گھر میں ہی محفوظ تھی۔

''تم...... تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' اس نے تھوک نگل کر اپنا حلق تر کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

''میرے پاس روزمرہ خرچ کے لیے رکھے ہوئے دس بارہ ہزار روپے کے سوا کوئی رقم موجود نہیں ہے۔ تم چاہو تو اپنے اطمینان کے لیے میرے گھر کی تلاشی لے لو۔''

''ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش نہ کر سالے، ہمیں بھی معلوم ہے کہ تیرے جیسے سنکی بندے نے رقم کسی ایسی جگہ نہیں رکھی ہوگی جو ہمیں آسانی سے مل جائے۔ رقم تو ہمیں نکال کر دے گا ورنہ اپنی جان سے جائے گا۔'' دبلا پتلا شخص اس کا جواب سن کر یکدم ہی مشتعل ہوگیا اور اپنے ہاتھ میں موجود پسٹل کی نال اس کے منہ میں گھسا دی۔ اس کی اس حرکت نے غضنفر کے اعتماد کو ایک بار پھر بالکل صفر پر پہنچا دیا اور وہ بُری طرح کانپنے لگا۔

''پیار سے یار...... تو تو فوراً ہی بندہ پھڑ کانے بیٹھ جاتا ہے۔ دیکھ تو سہی اس بے چارے کی کیا حالت ہوگئی ہے۔ چل باہر نکال گن اور ذرا دھیرج سے بات کر۔'' فربہی مائل بندے نے اپنے ساتھی کو سمجھایا تو اس نے گن واپس کھینچ لی لیکن اس کا رخ بہرحال اب بھی غضنفر کی طرف ہی تھا۔ خوف زدہ غضنفر خود کو سنبھالنے کے لیے گہری گہری سانسیں لینے لگا۔

''چل یار اب جلدی سے بتا دے ورنہ یہ جو میرا ساتھی ہے نا...... یہ بہت غصے والا ہے اور کبھی کبھی شوق میں بھی بندے کو گولی مار دیتا ہے۔'' فربہی مائل شخص نے اس کا شانہ سہلاتے ہوئے پیار سے اسے سمجھایا۔ غضنفر اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ گڈ اینڈ بیڈ کاپ کے اس کھیل کو نہیں سمجھ سکتا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ وہ دونوں ہر حال میں اس سے رقم لے کر ہی یہاں سے جائیں گے اس لیے ان کے آگے ہتھیار ڈال دینا ہی مناسب سمجھا اور ڈھیلا پڑتے ہوئے آہستہ سے بولا۔

''ٹھیک ہے، میں تمہیں رقم دے دیتا ہوں لیکن اس کے لیے مجھے دوسرے کمرے میں جانا پڑے گا اور ایک اسکرو ڈرائیور بھی درکار ہوگا۔''

''جو چاہے سو کرو۔ ہمیں صرف رقم سے مطلب ہے۔'' اسے جواب ملا۔ تھوڑی دیر میں ہی وہ دوسرے کمرے کی ایک دیوار کے پاس کھڑا اسکرو ڈرائیور کی مدد سے دیوار میں نصب سوئچ بورڈ کو کھول کر سامنے کا پینل ہٹا چکا تھا۔ پینل ہٹنے پر دیوار کا وہ خلا نظر آنے لگا جس کے اندر عموماً تاروں کے گچھے سموئے ہوئے ہوتے ہیں لیکن اس بورڈ کے پیچھے بس ایک آدھ تار ہی نظر آرہا تھا جبکہ خلا خاصا وسیع تھا۔ اس خلا میں چپ بورڈ سے بنا ایک مستطیل ڈبا موجود تھا۔

''بہت خوب، رقم محفوظ رکھنے کے لیے بڑا اچھا ٹھکانا بنایا ہے تم نے لیکن یاد رکھنا کہ چور ہمیشہ رقم کے مالک سے زیادہ چالاک ہوتے ہیں۔'' دبلے پتلے شخص نے ڈبا اپنے قبضے میں لے کر اس میں موجود رقم کا جائزہ لیتے ہوئے کھلکھلا کر تبصرہ کیا اور پھر اپنے اپر کی جیب سے کپڑے کا تہ کیا ہوا تھیلا نکال کر رقم اس میں منتقل کرنے لگا۔ غضنفر سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہی تھی کہ تھیلا نکالتے ہوئے اس شخص کی جیب سے کوئی شے نکل کر فرش پر گرگئی تھی لیکن وہ خاموش رہا۔

''اب ہم تمہیں ایک چھوٹی سی تکلیف دیں گے۔ امید ہے تم برا نہیں مانو گے۔'' رقم تھیلے میں منتقل کر کے اس کا منہ بند کرنے کے بعد وہ خوشگوار لہجے میں بولا اور اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ اس کا ساتھی نائیلون کی ایک پتلی سی رسی لے کر غضنفر کی طرف بڑھا تو وہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ اپنی طرف اٹھی ہوئی گن کی نال کی وجہ سے وہ بے بس تھا کہ خود کو خاموشی سے بندھوا لے۔

جب وہ دونوں رقم سمیت اس کے گھر سے روانہ ہو رہے تھے تو وہ بندھی ہوئی حالت میں فرش پر پڑا اس شے کو گھور رہا تھا جو دبلے شخص کے اپر کی جیب سے گری تھی۔ برسوں پہلے وہ اپنی مرنے والی بہن کی موت کا اصل سبب تو نہیں جان سکا تھا کہ کسی کو اس جرم کی سزا دلوا پاتا لیکن یہ چور اپنا سراغ چھوڑ گئے تھے اور وہ انہیں معاف کرنے والا نہیں تھا۔

☆☆☆

''دائیں طرف موڑ لو۔'' پچھلی سیٹ پر براجمان سواری نے حکم دیا تو ڈرائیور کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

''آخر آپ کو جانا کہاں ہے؟'' ڈرائیور قدرے جھنجلایا ہوا پلٹ کر پوچھنے لگا۔

''پہنچ کر دیکھ لینا۔'' مسکرا کر جواب دیا گیا۔

''پچھلے ایک گھنٹے میں آپ کے حکم پر کبھی دائیں تو کبھی بائیں گاڑی موڑتا جا رہا ہوں لیکن ابھی تک اس بات کا تعین نہیں ہو سکا کہ آپ کو جانا کہاں ہے؟'' ڈرائیور کو اس کی مسکراہٹ بالکل اچھی نہیں لگی۔ حقیقتاً وہ اب کچھ بے چینی سی محسوس کر رہا تھا اور اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

''تم میٹر کے حساب سے چارج کرتے ہو۔ تمہیں اس بات کی فکر نہیں ہونی چاہیے کہ میری منزل ایک گھنٹے بعد آئے گی یا دو گھنٹے بعد۔ میٹر کے حساب سے جو بھی کرایہ بنا تمہیں ٹپ سمیت ادا کر دیا جائے گا۔ اس لیے اب فضول بحث نہ کرو اور گاڑی چلاؤ ورنہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں تمہاری کمپنی کو تمہارے خراب رویے کی کمپلین کر دوں۔'' سواری کی دھمکی نے پہلے تو ڈرائیور کو تلملانے پر مجبور کر دیا لیکن پھر اس نے دماغ ٹھنڈا کرتے ہوئے غور کیا تو بات اتنی بھی غلط نہیں تھی۔ اسے میٹر کے حساب سے کرایہ وصول کرنا تھا اور اس سے اسے کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے تھا کہ اسے بلاوجہ سڑکوں پر گھمایا جا رہا ہے یا باوجہ...... وہ جس طبقے سے تعلق رکھتا تھا، اس سے جڑی مجبوریاں بھی اسے نخرہ کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔ وہ اپنی بیوی، تین بچوں ماں اور کنواری بہن کا واحد کفیل تھا جسے وہ روزمرہ اخراجات کے ساتھ ساتھ بہن کی متوقع شادی کے اخراجات کے لیے بھی رقم پس انداز کرنی تھی اور اس کے لیے ایسی سواریاں کسی نعمت کی طرح تھیں جو کرائے کے ساتھ ساتھ معقول ٹپ بھی عنایت کر دیں۔ اس سواری کی طرف سے اچھی ٹپ کے اشارے نے اسے اپنی ناگواری کو اپنے اندر ہی دبا لینے پر مجبور کر دیا۔

''اب بائیں جانب لے لو۔'' گاڑی کچھ دیر چلتے رہنے کے بعد اسے ایک بار پھر ہدایت دی گئی۔ اب وہ جس سڑک پر جا رہے تھے، وہ عموماً سنسان پڑی رہتی تھی لیکن تشویش کی بات اس لیے نہیں تھی کہ اس سڑک کے اختتام پر ایک ہاؤسنگ سوسائٹی کی طرف جانے والا راستہ شروع ہو جاتا تھا۔ باقی شہر سے ہٹ کر بنائی گئی یہ سوسائٹی اپر مڈل کلاس یا نودولتیوں کے لیے آئیڈیل جگہ تھی کہ گنجان شہر کے مقابلے میں یہاں نسبتاً کم قیمت پر زیادہ اچھے مکانات مل گئے تھے اور پبلک ٹرانسپورٹ کی عدم دستیابی کی وجہ سے وہ غریب رشتے دار وقت بے وقت ان سے ملنے کے لیے نہیں آ سکتے تھے جن سے ملنا اب وقت کا زیاں محسوس ہوتا تھا۔

''آپ کو اگر گلشن...... جانا تھا تو پہلے ہی مجھے بتا دیا ہوتا۔ میں اس سے مختصر راستے سے اور کم وقت میں آپ کو وہاں پہنچا دیتا۔'' اس نے سوسائٹی کا نام لیتے ہوئے سواری سے کہا۔ اپنے تئیں منزل کا تعین کر لینے کے بعد وہ خاصا پُرسکون ہو گیا تھا۔

''نہیں مجھے وہاں نہیں جانا ہے۔ میری منزل آ چکی ہے۔ تم یہیں گاڑی روک لو۔'' سواری کی طرف سے اس کے اندازے کی تردید کرتے ہوئے حکم صادر کیا گیا تو وہ حیران رہ گیا۔

''یہاں...... اس جگہ؟'' اس نے سنسان اور قدرے ٹوٹی پھوٹی سڑک اور اطراف میں موجود جھاڑیوں کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

''بالکل، کیا تم اس بات پر اعتراض کا کوئی حق رکھتے ہو کہ تمہاری گاڑی میں بیٹھنے والا پسنجر کہاں اترتا ہے؟'' سخت لہجے میں دیے گئے جواب نے اسے مزید کسی نصیحت کی ہمت نہیں ہونے دی اور گاڑی کو بریک لگا دیے۔ اس کے حق میں یہی بہتر تھا کہ اسے اس کھسکی ہوئی شخصیت سے نجات مل جاتی۔

''اپنا موبائل اور جو بھی کیش ہے، میرے حوالے کر دو۔'' گاڑی رکتے ہی اپنی گردن سے آ لگنے والی گن کی نال نے ڈرائیور کو بوکھلاہٹ میں مبتلا کر دیا۔

''یہ...... یہ......'' بوکھلا کر کچھ کہنے کی کوشش میں وہ ہکلا کر رہ گیا اور بے ساختہ دروازہ کھولنے کے لیے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔ گردن میں پیوست ہونے والی بے آواز گولی نے اسے ہینڈل کھینچنے کی مہلت نہیں دی اور وہ سیٹ پر لڑھک گیا۔ قاتل نے جھک کر اس کی جیب سے اس کا والٹ نکالا اور ڈیش بورڈ پر پڑا موبائل اٹھا کر اسے آف کرتے ہوئے اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس کے دروازہ کھول کر گاڑی سے اترنے سے قبل ہی ایک موٹر سائیکل وہاں آ کر رکی۔ اس نے موٹر سائیکل سوار کو مسکرا کر دیکھا اور وکٹری کا نشان بنا کر دکھایا۔ اگلے ہی لمحے وہ موٹر سائیکل اسے جائے واردات سے دور لے جا رہی تھی۔

☆☆☆

''سمیر...... سمیر...... اٹھ یار......'' جنید کے پکارنے اور ہلانے پر وہ گہری نیند سے جاگا۔ سوئے ہوئے مشکل سے ایک گھنٹا گزرا تھا اس لیے آنکھ کھل جانے کے باوجود وہ پوری طرح حواس میں نہیں آیا تھا۔

''سوری یار! تیری نیند خراب کر دی لیکن بات ہی ایسی ہے کہ میں مجبور ہو گیا۔''

''کیا بات ہے جنید؟ سب خیریت تو ہے؟'' جنید کے

لہجے نے اسے نیند کے خمار سے نکال کر حواس میں آنے پر مجبور کیا اور فکر مندی سے اس کے مُتے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"نہیں یار...... خیریت نہیں ہے۔" جنید نے سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا ہوا ہے؟" سوال کرتے ہوئے اسے خود اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ جواب میں جنید نے جو کچھ بتایا، وہ واقعی بہت بُرا تھا۔

"اب؟" اس نے یک لفظی سوال کیا۔

"ساڑھے چھ بجے ایک گاڑی نکلنے والی ہے اسی سے جانا ہے۔ ٹائم زیادہ نہیں ہے ورنہ میں تیری نیند خراب نہیں کرتا۔" جنید نے بکھرے بکھرے لہجے میں اسے جواب دیا۔

"فضول باتیں نہ کر۔ یہ وقت ایسا نہیں ہے کہ میں اپنے آرام کی پروا کروں۔ تو ایسا کر کہ جانے کی تیاری کر۔ میں بھی گھر جا کر مما کو بتا کر اور اپنے کپڑے وغیرہ لے کر نکلتا ہوں۔ وقت پر پہنچ گیا تو تیرے ساتھ ہی نکل جاؤں گا ورنہ ڈائیو سے آجاؤں گا۔" اس نے جنید کے شانے پر تھپکی دی اور ملحقہ غسل خانے سے منہ پر پانی کے چند چھپکے مار کر باہر نکل گیا۔ باہر نکلتے ہوئے اسے جنید کے گھر کے اندرونی حصے سے چند آوازیں سنائی دیں۔ اس کا دل چاہا کہ جنید کی امی سے مل کر جائے لیکن پھر ان کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہو سکی اور ایسے ہی اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ وقت ایسا تھا کہ سڑکیں خالی پڑی ہوئی تھیں اس لیے اپنے گھر تک کا فاصلہ طے کرنے میں اسے زیادہ وقت نہیں لگا۔

اپنی چابی سے دروازہ کھول کر گھر میں داخل ہو کر اس نے سیدھا اپنے کمرے کا رخ کیا۔ اسے معلوم تھا کہ عبیرہ کے جاگنے میں ابھی پندرہ بیس منٹ باقی ہیں اور اتنی دیر میں وہ اپنی تیاری سے فارغ ہو سکتا تھا۔ عبیرہ کی ہفتے بھر کے کپڑے ایک ساتھ استری کر کے رکھنے کی عادت نے اس کے کام کو خاصا آسان کر دیا۔ کوئیک شاور کے بعد کپڑے تبدیل کرنے اور بیگ میں اپنے دو جوڑوں کے علاوہ ٹوتھ برش اور ضرورت کی ایسی ہی ایک دو چھوٹی موٹی چیزیں رکھنے میں اسے زیادہ وقت نہیں لگا۔ استعمال کی ان چیزوں کے علاوہ اس نے اپنے پاس جمع شدہ رقم بھی بیگ کے ایک خفیہ خانے میں رکھ لی کہ کسی ضرورت کے تحت کام آسکے۔ اس پوری تیاری میں اس نے مشکل سے پندرہ منٹ خرچ کیے تھے اور یہ ارادہ لے کر کمرے سے باہر نکلا تھا کہ اگر عبیرہ نہیں جاگی ہو گی تو پہلے چائے کا پانی رکھ کر انہیں اٹھانے آئے گا لیکن باہر نکلتے ہی اسے کچن میں اس کی موجودگی کا احساس ہو گیا۔

"السلام علیکم مما! آج آپ وقت سے پہلے ہی اٹھ گئیں؟" کچن میں پھیلی چائے کی مہک، سِکتے ہوئے توس اور تلے جانے والے انڈوں کو دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا کہ عبیرہ کم از کم دس بارہ منٹ سے وہاں موجود ہے اس لیے کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"تم گھر میں نہ ہو تو سکون کی نیند کب آتی ہے۔ تم آئے تو میں جاگ ہی رہی تھی۔ اس لیے بستر چھوڑ کر ناشتا بنانے کھڑی ہو گئی۔" عبیرہ کے لہجے میں وہی محبت رچی ہوئی تھی جو اسے اپنی ماں کی قدر کرنے پر اکساتی تھی اور وہ دل میں عہد کرتا تھا کہ اپنی اس پیاری ماں کو بہت خوشیاں اور آرام دے گا۔

"میں خود بھی آپ کو اکیلے چھوڑ کر جانا پسند نہیں کرتا لیکن بعض اوقات انسان کو کچھ کام نہ چاہتے ہوئے بھی کرنے پڑتے ہیں۔" وہ واقعی ماں کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا لیکن حالات کا تقاضا کچھ اور تھا۔

"کیا تم کہیں جا رہے ہو ہمیر......؟" عبیرہ اس کے لیے کپ میں چائے ڈالتے ہوئے چونکی اور پہلی بار اسے ادراک ہوا کہ وہ معمول سے قدرے مختلف حلیے میں تیار ہے۔ اس نے شلوار قمیص پہنا ہوا تھا اور شلوار قمیص وہ عیدین کے علاوہ صرف جمعے کے جمعے پہنا کرتا تھا اور آج جمعہ نہیں تھا۔

"مجھے جنید کے ساتھ اس کی بہن کے گھر جانا ہے۔ ہو سکتا ہے وہاں مجھے اس کے ساتھ ایک دو دن قیام کرنا پڑے۔ آپ پریشان نہ ہونا۔" اس نے ماں کو وہ اطلاع دی جسے دینے کے لیے ناشتا کرنے کے بہانے اتنی دیر سے ہمت مجتمع کر رہا تھا۔ اس سے قبل وہ کبھی شہر سے باہر تنہا نہیں گیا تھا لیکن اس وقت اسے لگ رہا تھا کہ ایسا کرنا ناگزیر ہے۔

"کیا مطلب؟ کہاں اور کیوں جا رہے ہو تم؟" حسب توقع عبیرہ کو اس اطلاع نے شاک پہنچایا۔

"مجبوری ہے مما!" اس نے عبیرہ کے جانے کی وجہ بتانے کے ساتھ ساتھ اندرونِ سندھ کے اس چھوٹے شہر کا نام بھی بتایا جہاں جنید کی بہن کا سسرال تھا۔

"اس سچویشن میں، میں تمہیں روک بھی نہیں سکتی لیکن سچ پوچھو تو مجھے تمہارا اپنے بغیر شہر سے باہر جانا اچھا نہیں لگ

رہا۔ ابھی تم اتنے بڑے نہیں ہوئے ہو بیٹا۔ ابھی تو تم پورے اٹھارہ سال کے بھی نہیں ہوئے ہو۔" عبیرہ نے واضح کر دیا کہ اسے اس کا جانا پسند نہیں آرہا ہے۔

"پلیز مما۔" اس نے لجاجت سے اس کے ہاتھ تھامے اور ساتھ ہی ایک چور نظر گھڑی پر ڈالی۔ گھڑی کی سوئیوں نے اسے بتایا کہ اس کے لیے جنید کے ساتھ سفر کرنا ممکن نہیں ہو سکے گا۔

"منع نہیں کر رہی ہوں تمہیں لیکن یہ بتا رہی ہوں کہ اپنی اجازت کے بغیر مجھے تمہارا جنید سے کمٹمنٹ کرنا پسند نہیں آیا ہے۔" وہ اس سے اسے سخت انداز میں بہت کم پیش آیا کرتی تھی اور اس کا یہ انداز سمیر کو نادم کر رہا تھا۔

"سوری مما آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔" اس نے باقاعدہ کان پکڑ کر ماں سے معذرت کی۔

"ناشتا ختم کرو اور جلدی سے روانہ ہو جاؤ۔ جب جا ہی رہے ہو تو بہتر ہوگا کہ وقت پر وہاں پہنچ جاؤ۔ اور ہاں...... جب ذرا سکون ہو تو مجھے کال کر لینا۔" روٹھی روٹھی سی اجازت دینے کے باوجود اسے اخلاقی فرائض کا خیال تھا اس لیے کال کرنے کی نصیحت کرنے کے ساتھ چند ہدایات دیں۔

"آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کی ہر ہدایت کو اچھی طرح یاد رکھوں گا۔" اس نے یقین دہانی کروائی اور باقی ماندہ چائے ایک ہی گھونٹ میں حلق سے نیچے اتار کر اپنے کمرے کی طرف بھاگا۔ تیار شدہ بیگ لے کر باہر آیا تو وہ اس کے انتظار میں کھڑی تھی۔

"یہ روپے رکھ لو اپنے پاس ہو سکتا ہے ضرورت پڑ جائے۔"

"ارے نہیں مما! اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ٹھیک ٹھاک رقم ہے میرے پاس۔ گزارا ہو جائے گا۔" اس نے عبیرہ کی بڑھائی ہوئی رقم نہیں تھامی اور اسے پیار کر کے باہر نکل گیا۔

"ہاں جنید! تم نکل جاؤ۔ میں لیٹ ہو گیا ہوں۔ اب ڈائیو سے آؤں گا اور وہاں پہنچ کر تمہیں کال کر لوں گا۔" سیڑھیاں اترتے اترتے اس نے جنید کو کال کر کے اپنے بارے میں اطلاع دی اور اس کے "او کے" کہنے پر فون بند کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ ڈائیو کے اڈے تک پہنچنے کے لیے وہ اپنی بائیک استعمال نہیں کر سکتا تھا اس لیے سڑک پر آکر ٹیکسی کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگا۔ ٹیکسی فوراً ہی مل گئی۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر روانہ ہوتے ہوئے اسے علم نہیں ہو سکا تھا کہ ایک گاڑی اس کے تعاقب میں آرہی ہے۔

☆☆☆

"تم فضول میں اتنی پریشان ہو رہی ہو یار! تمہاری نظر میں وہ بچہ ہے لیکن سچ یہ ہے کہ اب وہ بڑا ہو گیا ہے اور اس کی عمر کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے فیصلے اپنی مرضی سے کرے۔ تم آخر کب تک اسے انگلی پکڑ کر چلاتی رہو گی۔" وہ دفتر میں فریحہ کے روبرو بیٹھی ہوئی تھی اور فریحہ اسے رسان سے سمجھا رہی تھی۔

"شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن میں عجیب سی گھبراہٹ اور بے چینی محسوس کر رہی ہوں۔ وہ پہلی بار اکیلا شہر سے باہر گیا ہے شاید اس لیے۔" اس نے اپنی کنپٹیوں کو دباتے ہوئے اپنے رویے کی وضاحت کی۔ سمیر کا خود سے جنید کے ساتھ چلے جانے کا فیصلہ کرنا اسے بہت کھلا تھا اور وہ اتنی ڈسٹرب تھی کہ فریحہ نے اس کی شکل دیکھتے ہی گڑبڑ کو بھانپ لیا تھا۔ اس کے پوچھنے پر وہ اپنے جذبات کو چھپا نہیں سکی تھی اور اس سے سب کچھ کہہ دیا تھا۔

"ایسا کبھی نہ کبھی تو ہونا تھا عبیرہ۔ وہ یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے والا ہے وہاں اس کی دوستیوں کا دائرہ اور وسیع ہوگا اور وہ اڑنے کے لیے مزید کھلا آسمان مانگے گا۔ تم اگر اسے پلو سے باندھ کر بیٹھے رہنے پر بضد رہیں تو وہ ایک نارمل انسان کی طرح زندگی نہیں گزار سکے گا۔ اسے ایک نارمل لائف جینے دو ورنہ کبھی وہ یہ سوچنے اور کہنے پر مجبور ہو جائے گا کہ کیونکہ اس کا باپ نہیں تھا اس لیے وہ زندگی کو کھل کر جینے سے محروم رہا۔" فریحہ اس کی بچپن کی سہیلی تھی اور اس کی زندگی کے تمام نشیب و فراز سے واقف تھی اس لیے اسے بہتر طور پر سمجھا سکتی تھی۔ حقیقتاً یہ فریحہ ہی تھی جس نے اس وقت جبکہ وہ بری طرح ٹوٹ چکی تھی دوبارہ کھڑے ہونے اور زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینے کی ہمت دلائی تھی۔

"نہیں وہ ایسا نہیں سوچ سکتا، وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے اور اسے میری قربانیوں کا بہت احساس ہے۔" وہ جیسے خوف زدہ سی ہوگئی۔

"مجھے معلوم ہے کہ سمیر بہت حساس بچہ ہے اسی لیے تمہیں سمجھا رہی ہوں کہ اسے نارمل لائف جینے دو ورنہ وہ اندر ہی اندر ٹوٹ جائے گا اور تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا۔" فریحہ نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے سمجھایا تو وہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"ریلیکس ہو جاؤ۔ کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہوئی

انتباہ

ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی جانب سے تنبیہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر "آفیشل پیج" کی اصطلاح استعمال کر رہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تاکہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے ماہناموں کے مضامین، افسانے اور کہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر اَپ لوڈ کر کے ادارے کو سنگین مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کر رہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کر دیں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

PREVENTION OF ELECTRONIC CRIMES ACT 2016

اور

COPYRIGHT ORDINANCE 1962/2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/ اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35804200-35804300

ہے۔ وہ دوست کے ساتھ گیا ہے۔ ایک دو دن میں واپس آجائے گا۔ تم فون پر اس سے رابطے میں رہنا تمہیں اس کی خیریت پتا چلتی رہے گی۔ بس اتنی سی بات ہے۔ بس اب جاؤ اور کام دیکھو۔ ہاجرہ کو شاید کسی معاملے میں تمہاری گائیڈنس کی ضرورت بھی ہے۔'' فریحہ نے اسے سمجھاتے سمجھاتے کام سے بھی لگا دیا۔ وہ چاہتی تھی کہ عبیرہ مصروف ہو جائے تاکہ اس کا دماغ بیٹے کی طرف سے ہٹے۔

وہ اور عبیرہ مل کر کئی سالوں سے شہر میں ایک اچھا بوتیک چلا رہی تھیں۔ فریحہ زیادہ تر بوتیک پر ہوتی تھی اور فرنٹ پر رہ کر کام کرتی تھی جبکہ عبیرہ نے اس چھوٹے سے یونٹ کو سنبھال رکھا تھا جہاں سلائی، کڑھائی اور دیگر متعلقہ کام انجام دیے جاتے تھے۔ اس کاروبار سے انہیں اتنا منافع ہو جاتا تھا کہ وہ اپنے اپنے معاشی مسائل بخیر و خوبی حل کرنے میں کامیاب رہتی تھیں اور ایک پُرسکون زندگی گزار رہی تھیں۔

''کل جو دوپٹے ڈائی کروانے کا کہا تھا انہیں بھی دیکھ لینا۔ مسز انیس کی بیٹیوں کو شوق چڑھا ہے کہ وہ مایوں کے ایونٹ پر بڑے بڑے دوپٹے اوڑھیں گی۔'' اب فریحہ وہاں سے جانے کے لیے پَر تول رہی تھی۔

''دوپٹے تو ان کی مرضی کے مطابق تیار ہو جائیں گے لیکن میں حیران ہوں کہ وہ لڑکیاں جنہوں نے جینز اور ٹی شرٹ کے علاوہ شاید ہی کچھ پہنا ہو، ان دوپٹوں کو سنبھالیں گی کیسے؟'' اس کے کیے تبصرے پر فریحہ نے زوردار قہقہہ لگایا پھر شانے اچکا کر بولی۔

''یہ ان کا ہیڈک ہے ہمیں تو بس کسٹمر کی ڈیمانڈ پوری کرنے سے مطلب ہے۔''

''شیور......'' عبیرہ نے کہا اور باہر نکل گئی۔ فریحہ بھی نکلنے ہی لگی تھی کہ موبائل کی گھنٹی نے رکنے پر مجبور کر دیا۔ اسکرین پر اس کے بڑے بھائی شہباز کا نام چمک رہا تھا۔

''السلام علیکم بھائی۔ خیریت آپ نے اس وقت کیسے کال کی؟'' شہباز عموماً کام کے اوقات میں کال نہیں کرتا تھا اس لیے اس نے کچھ پریشانی محسوس کی تھی۔

''تم کہاں ہو؟'' شہباز نے اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''کارخانے میں ہوں۔ بوتیک کے لیے نکلنے ہی لگی تھی۔''

''اور عبیرہ......؟'' شہباز نے دوسرا سوال کیا۔

''وہ بھی یہیں ہے ذرا کسی کام سے باہر نکلی ہے۔ آپ بتائیں کہ مسئلہ کیا ہے؟'' اس کے سوالات فریحہ کی تشویش میں اضافے کا سبب بن رہے تھے۔

''بہت عجیب سا معاملہ ہو گیا ہے فریحہ، فی الحال تم عبیرہ کو کچھ مت بتانا۔ پہلے میں اپنے طور پر کچھ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' شہباز نے گہری سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا اور اس کے بعد جو تفصیلات بتائیں، انہیں سُن کر فریحہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ تو......'' اس کے لیے اپنا جملہ پورا کرنا مشکل ہو گیا۔

''یہ سب تو معلوم کرنا پڑے گا بس تمہیں پہلے اس لیے کال کر دی کہ تم ذہنی طور پر تیار رہو۔ عبیرہ کے لیے یہ بہت نازک معاملہ ہے اور ان حالات میں تم ہی ہو جسے اسے سنبھالنے اور حوصلہ دینے کی ذمے داری ادا کرنی ہے۔''

''جی بھائی۔'' فریحہ کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی اور وہ فون بند کرنے کے بعد دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔

☆☆☆

''عبیرہ کیسی ہے؟'' فریحہ کے گھر میں قدم رکھتے ہی یہ پہلا سوال تھا جو شہباز نے اس سے کیا۔

''کیسی ہو سکتی ہے؟'' فریحہ نے ایک گہرا سانس لیا۔ ''نیوز ٹی وی پر آجانے کی وجہ سے بات پھیل گئی تھی۔ اسے بھی کسی نے کال کر کے بتا دیا۔ جب سے پتا چلا ہے، بہت ڈسٹرب ہے۔ تھانے جانا چاہ رہی تھی لیکن میں نے روک لیا کہ پہلے بھائی کو معلوم کرنے دو۔ میں اسے زبردستی اپنے ساتھ گھر لے آئی تھی اور اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ آپ وکیل کا انتظام کر رہے ہیں لیکن ظاہر ہے اسے قرار نہیں تھا۔ میں نے زبردستی ٹرینکولائزر دے کر سُلا دیا ہے۔ آپ بتائیں کیا اطلاعات ہیں؟'' شہباز کے سوال کا جواب دے کر اس نے بے چینی سے پوچھا۔

''اطلاعات بالکل بھی اچھی نہیں ہیں۔ اب تک جتنی بھی باتیں سامنے آئی ہیں، وہ سمیر کو مجرم ثابت کر رہی ہیں۔ جس ایس ایچ او کے ہاتھ میں کیس ہے وہ تو بالکل اسے رعایت دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ کہہ رہا تھا سمیر کا ساتھی جنید شہر سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ سمیر کو اس نے عین موقع پر گرفتار کیا ہے ورنہ وہ بھی فرار ہو چکا ہوتا۔'' شہباز نے تھکے تھکے لہجے میں بتایا۔

''کیا الزام ہے اس پر ذرا تفصیل سے بتائیں؟'' فریحہ کا اپنا خون خشک ہوا جا رہا تھا۔ عبیرہ سے دوستی کے

حوالے سے اس کا اپنا بھی سمیر سے گہرا تعلق تھا اور وہ اس کے لیے اپنے دل میں تکلیف محسوس کر رہی تھی۔

"کوئی ایک الزام نہیں ہے۔ الزامات کی اچھی خاصی فہرست ہے اور ہر الزام ہی سنگین ہے۔" شہباز خود پریشان تھا۔ وہ اوائل جوانی سے عبیرہ کے لیے اپنے دل میں خاص جذبات رکھتا تھا لیکن اسے ان جذبات کے اظہار کا موقع ہی نہیں مل سکا اور عبیرہ اس کی دسترس سے نکل گئی۔ اس نے بھی رواج کے مطابق کسی اور کا ہاتھ تھام لیا لیکن یہ سچ تھا کہ عبیرہ کے لیے اب بھی اس کے دل میں نرم گوشہ تھا اور وہ اس کی تکلیف کا سوچ کر پریشان تھا۔

"کچھ تو پتا چلے۔" فریحہ نے بے چینی سے پوچھا۔

"اس کے خلاف تھانے میں پہلی رپورٹ تشدد اور کارچوری کی ہے۔ الزام ہے کہ اس نے پارک میں جاگنگ کے لیے آنے والے داؤد مرزا نامی ایک شخص کو اپنی چکنی چپڑی باتوں سے ٹریپ کیا اور پھر انہیں اپنا تعارفی کارڈ تھما کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔ مرزا صاحب ابھی پارکنگ تک ہی گئے تھے کہ انہیں چکر آنے لگے۔ وہ سنبھلتے اس سے پہلے ہی دو لڑکوں نے ان پر حملہ کر دیا اور ان کی نقدی اور موبائل کے علاوہ کار بھی لے کر غائب ہو گئے۔ سی سی ٹی وی فوٹیج میں سمیر کو پارک میں جاتے ہوئے صاف دیکھا جاسکتا ہے۔ پارکنگ کے کیمرے سے جو فوٹیج ملی ہے، وہ اتنی واضح نہیں ہے لیکن حملہ آور لڑکوں میں سے ایک کا قد کاٹھ بالکل سمیر جیسا ہے اور اس نے جو اپر پہن رکھا ہے، وہ بھی سمیر کے اپر جیسا ہی ہے۔"

"مائی گاڈ......" فریحہ نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

"مزید بھی تو سنو......" شہباز نے اسے ٹوکا۔

"اس کے خلاف دوسری رپورٹ ایک ملازمت پیشہ خاتون عفت سلطانہ نے درج کروائی ہے، انہیں سمیر نے ایک پیٹرول پمپ پر اپنا تعارفی کارڈ دیا تھا۔ انہوں نے بھی کارڈ لینے کے تھوڑی دیر بعد چکر وغیرہ کی شکایت محسوس کی لیکن خاتون خاصی اسمارٹ تھیں انہوں نے سمیر کو بائیک پر اپنا پیچھا کرتے ہوئے دیکھ لیا اور ایک دوسرے قریبی پیٹرول پمپ پر گاڑی روک کر مدد طلب کر لی اس لیے وہ کسی بھی قسم کے نقصان سے محفوظ رہی۔ اس کیس میں بھی سی سی ٹی وی فوٹیج میں سمیر کو پہلے پیٹرول پمپ پر دیکھا جاسکتا ہے۔"

"یہ وزیٹنگ کارڈ اور چکر آنے کا آپس میں کیا تعلق ہے؟" شہباز کے سنائے دوسرے واقعے کو سن کر فریحہ نے تعجب سے پوچھا۔

"عفت سلطانہ اور داؤد مرزا دونوں کے خون کے تجزیے سے معلوم ہوا ہے کہ انہیں کوئی ایسا کیمیکل استعمال کروایا گیا تھا جس کے اثر سے ابتدا میں چکر آتے ہیں اور پھر بندہ بے ہوش بھی ہو سکتا ہے۔ سمیر نے جو وزیٹنگ کارڈز انہیں دیے تھے انہیں چیک کروانے پر پتا چلا کہ ان کی سطح پر وہ کیمیکل موجود تھا جو مساموں کے ذریعے بھی انسان کے جسم میں داخل ہو کر خون میں شامل ہو جاتا ہے۔ عفت سلطانہ اور داؤد مرزا دونوں کے خون کے نمونوں میں وہ کیمیکل پایا گیا ہے۔"

"او مائی گاڈ...... کیا سمیر نے سچ مچ یہ سب کیا ہے؟" فریحہ کا منہ کھل گیا۔

"کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ حالات و واقعات تو اس کے خلاف ہی ہیں۔" شہباز نے اپنی کنپٹی دبائی۔ وہ خود اپنے ذہن پر بہت زیادہ دباؤ محسوس کر رہا تھا۔

"تیسرا کیس ایک گھر میں ڈاکا زنی کا ہے۔ غضنفر آغا نامی اس شخص کے مطابق اس نے دو دن پہلے سمیر اور جنید نامی دو لڑکوں سے اپنا کمپیوٹر ٹھیک کروایا تھا۔ ڈاکے کے وقت ماسک کے باوجود اس نے ایک لڑکے کی دائیں آنکھ کے قریب تل کی موجودگی کو نوٹس کر لیا جبکہ دوسرا سراغ اسے اس تعارفی کارڈ کے ذریعے ملا جو ایک ڈاکو کی جیب سے گر گیا تھا۔"

"کارڈ سمیر کا ہی ہے اور اس کی دائیں آنکھ کے قریب تل بھی موجود ہے۔" فریحہ کا انداز اب کھویا کھویا سا تھا۔ وہ صاف محسوس کر رہی تھی کہ اتنے سارے شواہد کے بعد سمیر کو کسی صورت بے قصور نہیں سمجھا جاسکتا۔

"تمہارا اندازہ درست ہے لیکن اب سب معاملات سے بھی زیادہ سنگین ترین واردات سمیر کے حصے میں آئی ہے، اس نے تو میری مت ہی مار دی ہے۔"

"کیسی واردات؟" شہباز کے انداز نے فریحہ کا چہرہ فق کر دیا۔

"قتل کی واردات......"

"کیا قتل......؟" اس کے حلق سے چیخ سی برآمد ہوئی۔

"ہاں۔" شہباز نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ایک آن لائن ٹیکسی سروس کے ڈرائیور کا قتل ہوا ہے اور ریکارڈ پر یہ بات موجود ہے کہ اس ٹیکسی ڈرائیور کو آخری کال سمیر نے ہی کی تھی۔ ڈرائیور کو ایک سنسان سڑک پر ہلاک کیا گیا ہے اور

اس کے پاس موجود ساری نقدی غائب ہے۔ پولیس کا خیال ہے کہ شاید کسی طرح ملزمان کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا اس لیے انہوں نے خود کو بچانے کے لیے فرار کی راہ اختیار کی۔ شریک جرم جنید اس کوشش میں کامیاب رہا جبکہ سمیر عین موقع پر دھر لیا گیا۔ اس کے پاس سے ملنے والی بھاری رقم اور کپڑوں کے بیگ سے بھی اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ لمبے عرصے کے لیے شہر سے باہر جا رہا ہے۔''

''لیکن عبیرہ نے تو مجھے بتایا تھا کہ سمیر کے دوست کی بہن جو اندرون سندھ بیاہی ہوئی ہے، اس کی حادثاتی موت ہو گئی ہے اور سمیر دوست کا غم بانٹنے کے لیے اس کے ساتھ وہاں جانا چاہتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اگر ضرورت پڑی تو کفن دفن کے اخراجات اور میت والے گھر میں کھانا دینے کے لیے اپنی طرف سے پیشکش کر دے گا اس لیے اپنے ساتھ رقم لے کر گیا ہے۔ عبیرہ تو اس کے پیشگی اجازت لیے بغیر شہر سے باہر جانے پر ہی اتنی ڈسٹرب تھی۔ قتل وغیرہ کا پتا چلے گا تو کیا کرے گی؟'' مکمل حالات جان کر فریحہ کا سر چکرانے لگا تھا۔ ٹی وی پر جو نیوز آئی تھی، اس میں تو بس ایک نوسرباز کے رقم سمیت شہر سے باہر جانے کا ذکر تھا۔ اتنے سنگین الزامات کا تو کسی نے سوچا بھی نہیں تھا۔

''ظاہر ہے وہ ماں کو سچ بتا کر تو فرار نہیں ہو سکتا تھا اس لیے جھوٹی کہانی سنا دی ہو گی۔''

''وہ ایسا بچہ نہیں ہے بھائی! عبیرہ نے اس کی بہت اچھی تربیت کی ہے۔ وہ بہت حساس طبیعت کا مالک ہے اور اسے اس بات کا بہت احساس ہے کہ اس کی ماں اس کی پرورش کے لیے بہت محنت کر رہی ہے۔ آپ ملے تو ہیں اس سے۔'' فریحہ اتنے سارے الزامات سُن کر بھی بے یقینی کا شکار تھی کہ سمیر نے یہ سب کیا ہو گا۔

''بظاہر تو واقعی اچھا لڑکا لگتا ہے لیکن کسی کے بارے میں بھی حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ سنگل مدرز کے لیے ویسے بھی جوان ہوتے ہوئے لڑکوں کو سنبھالنا اور ان کی ایکٹیوٹیز پر نظر رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی گیدرنگ اچھی نہ ہو۔ ماں کو محنت و مشقت سے بچانے اور خود جلد از جلد اپنے قدموں پر کھڑے ہو جانے کی خواہش بھی اسے جرم کے راستے پر ڈالنے کا سبب بن سکتی ہے۔ بہرحال میں نے وکیل سے بات کر لی ہے۔ ضمانت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، وکیل بمشکل اس سے ایک مختصر ملاقات کرنے اور وکالت نامے پر سائن کروانے میں کامیاب ہو سکا ہے۔'' شہباز مرد تھا اس لیے جذبات سے زیادہ حقائق کی بنیاد پر سوچ رہا تھا۔

''یہ سب سچ ثابت ہو گیا تو عبیرہ تو اپنی جان سے چلی جائے گی۔'' فریحہ نے ایک جھرجھری سی لے کر تبصرہ کیا۔ شہباز کے اندر تبصرے کی بھی ہمت نہیں تھی۔

☆☆☆

''تو، تو سچ نہیں بولے گا؟'' ایس ایچ او نے قہر آلود نظروں سے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''میں سچ ہی کہہ رہا ہوں سر، میرا یقین کریں میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ میری مما نے ہمیشہ مجھے محنت اور ایمانداری کا سبق دیا ہے اور میرے پاس سے آپ کو جو بھی رقم ملی ہے، وہ میری محنت کی کمائی کی ہے۔'' پولیس والوں کے زیرِ عتاب گزارے گئے چند گھنٹوں میں ہی اس کی حالت پتلی ہو گئی تھی اور وہ لٹھے جیسے سفید چہرے پر پھٹی پھٹی آنکھیں لیے اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''مما...... میری مما مجھ پر اتنے سنگین الزامات کا سن کر مر جائیں گی سر۔ میں نے کچھ نہیں کیا، آپ مجھے میری مما کے پاس جانے دیں۔'' تھانے میں تو بڑوں بڑوں کا پتا پانی ہو جاتا ہے اس پورے اٹھارہ سال کے نہ ہو سکے لڑکے نے اپنے ہاتھ پیر چھوڑ دیے تھے اور مما کو یاد کر کے سسک سسک کر رونے لگا تھا تو اس میں حیرت کی کیا بات تھی۔

''چپ کر او ماں کے لعل، ابھی تو تجھے صرف ماں یاد آئی ہے ایک بار اور ڈرائنگ روم کی سیر کر لی تو نانی بھی یاد آ جائے گی بچو......'' ایس ایچ او کے ایک چمچے نے اس کی گدی پر زوردار ہاتھ مارتے ہوئے اسے دھمکایا۔

''معاف کر دیں سر...... مجھے جانے دیں۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔'' اس اذیت سے ایک بار اور گزرنے کے خیال سے اس کی روح فنا ہو گئی اور اس نے ان لوگوں کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

''تیرے جیسے کو ہی کہتے ہیں کہ شکل سلیمانی اور گن شیطانی...... دیکھنے میں تو اتنا معصوم اور بیبا بچہ لگتا ہے اور کرتوت دیکھو تو لوٹ مار اور ڈاکا زنی سے لے کر قتل تک کوئی کام نہیں چھوڑا ہے تو نے۔'' ایس ایچ او نے اسے گھرکا۔

''اللہ کی قسم سر! میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ آپ چاہیں تو مجھ سے قرآن پر ہاتھ رکھوا لیں۔'' وہ ہر صورت اپنی بے گناہی کو ثابت کرنا چاہتا تھا۔

''ہر جگہ تو نے اپنے جرم کا نشان چھوڑا ہے بالکے! تو ذہین ہے پر کچے پن میں بڑی بڑی غلطیاں کر گیا ہے۔ میری مان تو اقبالِ جرم کر لے میں کوشش کروں گا کہ تیری کم

عمری پر رحم کھا کر تیرا کیس ہلکا بناؤں۔'' اب ایس ایچ او اسے رجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''میں نے کچھ کیا نہیں تو مانوں کیسے؟'' اس نے معصومیت سے کہا جواباً اس کی پیٹھ پر ایک زوردار دھپ لگی۔

''خنزیر کا بچہ سمجھتا نہیں ہے اور وہی مرغے کی ایک ٹانگ کی رٹ لگا کر بیٹھا ہے۔'' مارنے والے نے اسے بلا تکلف گالی بھی دی تھی۔

''چل ایسا کر اپنے دوست کا پتا ٹھکانا بتا دے۔ بھاگ کر کہاں گیا ہے وہ۔ باقی کا لوٹا ہوا مال یقیناً اسی کے پاس ہوگا۔'' اب اس پر ایک اور نیا حملہ کیا گیا۔

''میں نے آپ کو بتایا تھا کہ وہ اپنی بہن کی میت میں شریک ہونے کے لیے گیا ہے اور میں بھی وہیں جا رہا تھا۔'' اس نے روہانسے لہجے میں بتایا۔

''اس کا فون مسلسل بند جا رہا ہے بیٹا اور بہن کے گھر کا تو نے پتا ٹھکانا کچھ نہیں بتایا۔ خالی شہر کے نام سے ہم اس تک کیسے پہنچ سکتے ہیں بھلا؟'' ایس ایچ او نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔

''پتا تو خود مجھے بھی معلوم نہیں ہے بس یہی طے ہوا تھا کہ اسٹاپ پر اتر کر جنید کو فون کروں گا تو وہ مجھے لینے وہاں پہنچ جائے گا۔'' ایس ایچ او کی نظروں سے خائف ہوتے ہوئے اس نے سر جھکا کر جواب دیا۔

''بلے بھئی بلے تیری معصومیت کے۔ بڑا ہی گولی باز ہے تو۔ ٹھیک ہے نہ کر ہمارے ساتھ تعاون اب عدالت میں ہی تجھے رگڑا لگائیں گے۔ جسمانی ریمانڈ ملنے کے بعد جب تجھ سے سوال کریں گے تو یاد رکھنا کہ تیری روح بھی بلبلا کر ہمارے ہر سوال کا جواب دے گی۔'' ایس ایچ او اسے دھمکی دیتا ہوا باہر نکل گیا اور وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام کر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

''بہت خراب کیس ہے شہباز صاحب! سچ یہ ہے کہ آپ کی مروت میں یہ کیس لے کر میں نے اپنے کیریئر میں خود ہی ایک ناکامی درج کروالی ہے۔ سارے ثبوت اس لڑکے کے خلاف ہیں۔ گواہوں نے بھی اسے شناخت کر لیا ہے۔ اب آپ بتائیں کہ اس کے سوا باقی کیا رہ جاتا ہے۔'' صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وکیل کا مزاج قدرے برہم تھا۔ وہ اچھی شہرت کا حامل وکیل تھا اور شناسائی کے لحاظ میں ایک ایسا کیس لے بیٹھا تھا جس میں اسے اپنی ہار صاف دکھائی دے رہی تھی۔

''حالات تو واقعی اچھے نہیں ہیں لیکن جس طرح سمیر مسلسل انکاری ہے، اس سے مجھے شک ہو رہا ہے کہ کیا پتا وہ سچ بول رہا ہو۔ وہ کوئی عادی مجرم تو ہے نہیں پھر بھی اپنے انکار پر قائم ہے تو اس سے مجھے لگتا ہے کہ وہ کہیں نہ کہیں سچا ہے۔'' شہباز خود سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

''ہوسکتا ہے پہلے بھی وہ چھوٹے موٹے جرائم کرتا رہا ہو لیکن اب پکڑا گیا ہے تو آپ کو پتا چلا ہے۔ مائیں اکثر اپنے بچوں کی خامیاں چھپا لیتی ہیں۔'' وکیل نے رائے دی۔

''اس کی ماں ایسی نہیں ہے۔'' شہباز کا انداز دفاعی تھا۔ وہ خود بھی جانتا تھا کہ اس کے دل میں عبیرہ کے لیے جو جذبات ہیں، ان کی وجہ سے وہ اس کے بارے میں کبھی کوئی منفی بات نہیں سوچ پاتا۔

''لیبارٹری ٹیسٹس، فرانزک رپورٹس، سی سی ٹی وی کیمرا فوٹیجز اور گواہان کے بیانات...... ایک لمبی فہرست ہے اس کے خلاف ثبوتوں کی۔ ہم اگر جھٹلائیں بھی تو آخر کس کس کو جھٹلائیں گے۔ سچ تو یہ ہے میری گڈول داؤ پر لگ گئی ہے اس کیس کی وجہ سے۔'' وکیل کچھ جھنجلایا ہوا تھا۔

''پھر بھی ہمیں ایک بار سمیر کے بیان پر توجہ دینی چاہیے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ مانتا ہے کہ عفت سلطانہ، داؤد مرزا اور غضنفر آغا سے وہ ملا تھا اور اس نے انہیں اپنا کارڈ بھی دیا تھا لیکن اس کے پیچھے اس کا صرف اور صرف ایک مقصد تھا کہ وہ انہیں اپنا کلائنٹ بنانا چاہتا تھا۔ اس نے ان میں سے کسی کو ذرہ برابر نقصان نہیں پہنچایا اور مرنے والے ٹیکسی ڈرائیور کی تو اس نے شکل تک نہیں دیکھی۔ ٹیکسی کے لیے اس نے بازار میں ملنے والی لڑکی کی فرمائش پر جس کا موبائل چوری ہو گیا تھا، اس کی مدد کے لیے کال کی تھی۔ وہ لڑکی اس کے سامنے ٹیکسی میں بیٹھ کر گئی بھی تھی لیکن بعد میں کیا ہوا وہ نہیں جانتا ہے۔'' شہباز صحافت کے شعبے سے وابستہ تھا اور بال کی کھال نکالنا اس کی عادت تھی۔ ابتدائی ثبوتوں اور گواہیوں نے اسے بھی سمیر سے بدگمان کیا تھا لیکن اب وہ ذرا مختلف زاویے سے سوچ رہا تھا۔

''ٹیکسی کی پچھلی سیٹ کے نیچے سے سمیر کا والٹ ملا تھا شاید آپ یہ بات بھول رہے ہیں۔'' وکیل نے اسے یاد دہانی کروائی۔

''والٹ کے معاملے میں تو اس نے صاف بتایا تھا کہ وہ کسی جیب کترے نے اس کی جیب سے نکال لیا تھا

جس کی اسے اس وقت خبر ہوئی تھی جب اس نے ریسٹورنٹ میں کھانے کا بل دینا چاہا تھا۔''

''اگر اس بات کو درست مان لیا جائے تو اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ سمیر کا کوئی ایسا دشمن ہے جو اسے شدید ترین نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ کیا اس کی والدہ نے اس کے ایسے کسی دشمن کا ذکر کیا ہے؟'' وکیل نے نکتہ اٹھایا۔

''نہیں، ایسا تو کچھ نہیں کہا اس نے لیکن یہ بات مجھے کھٹک رہی ہے کہ آخر سمیر ہر جگہ ایسی نشانی کیوں چھوڑ کر آیا جو سیدھی اس کی نشاندہی کر دے اگر ایک آدھ جگہ یہ غلطی ہوئی تو ماننے والی بات تھی لیکن اس دور میں جبکہ دنیا جہاں کی معلومات بچوں کی فنگر ٹپس پر ہیں؟ ایسی حماقتوں کا وہ بھی تسلسل سے ہونا سمجھ سے باہر ہے۔''

''سی سی ٹی وی فوٹیج کے بارے میں کیا کہیں گے آپ؟'' وکیل نے پوچھا۔

''ان میں سے بیشتر واضح نہیں ہیں۔ ملتے جلتے قدوقامت، اُوپر کے سیم کلر اور ایک ماسک میں چھپے دھندلے چہرے کو ثبوت نہیں مانا جا سکتا۔ کم از کم میرے نزدیک تو یہ واضح ثبوت نہیں ہیں۔'' شہباز نے نفی میں سر ہلایا۔

''غضنفر آغا کے گھر ڈاکے اور ٹیکسی ڈرائیور کے قتل والی رات کو کس کھاتے میں ڈالیں گے آپ؟ سمیر نے خود تسلیم کیا ہے کہ اس رات کمبائنڈ اسٹڈی کا بہانہ بنا کر وہ جنید کے گھر رکنے گیا تھا لیکن ان دونوں نے رات کا اچھا خاصا حصہ باہر گزارا تھا۔''

''وہ اس لیے کہ انہیں ایک ایسے کلائنٹ کا کمپیوٹر ٹھیک کرنے جانا تھا جنہیں اگلی ہی صبح دوسرے شہر شفٹ ہونا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ شفٹنگ سے پہلے پہلے کمپیوٹر ٹھیک کروا لیں لیکن جب سمیر اور جنید وہاں پہنچے تو کلائنٹ نے بتایا کہ اس کی بیوی نے دیگر سامان کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر بھی پیک کروا دیا ہے اور اب وہ اسے ان پیک کر کے اپنا کام نہیں بڑھانا چاہتے اس لیے معذرت چاہتے ہیں۔''

''اور پولیس اس کلائنٹ کو ڈھونڈنے میں بالکل ویسے ہی ناکام ہے جیسے جنید اور اس کی فیملی کو۔ اگر جنید بے قصور تھا تو اسے سامنے آکر اپنی صفائی پیش کرنی چاہیے تھی۔'' وکیل اس کی دلیل سے قائل نہیں ہوا۔

''ہماری پولیس سست اور کام چور ہے۔ انہیں سمیر کی شکل میں ایک ایسا شکار مل گیا ہے جس پر وہ آسانی سے ہر الزام ثابت کر کے اسے مجرم قرار دے سکتے ہیں۔ اس لیے انہیں مزید بھاگ دوڑ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' شہباز کو غصہ آنے لگا اور وہ ذرا بلند آواز میں مزید بولا۔

''یہ بات تو ثابت ہو گئی ہے کہ جنید کی بہن کی ڈیتھ کے حوالے سے کوئی جھوٹ نہیں بولا گیا تھا۔ وہ اور اس کی فیملی اس دن وہیں گئے تھے۔ بعد میں یقیناً انہیں کسی ذریعے سے سمیر اور جنید پر لگنے والے الزامات کا پتا چل گیا اور انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ بیٹے سمیت غائب ہو جائیں ورنہ پولیس والے جنید کی بھی وہی حالت کرتے جو سمیر کی، کی جا رہی ہے۔''

''کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟'' وکیل شہباز کی بات پر کوئی ردِعمل ظاہر کرتا، اس سے قبل ہی دروازے پر دستک ہوئی اور ایک شخص نے جھانک کر پوچھا۔

''غضنفر آغا......'' وکیل آنے والے کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''زحمت دینے کے لیے معافی چاہتا ہوں لیکن ایک ایسی بات میرے ذہن میں کھٹک رہی تھی جسے پولیس والوں کے مقابلے میں، میں نے آپ سے شیئر کرنا زیادہ بہتر سمجھا۔'' غضنفر آغا مصافحہ کر کے شہباز کے ساتھ والی کرسی پر وکیل کے مدِمقابل بیٹھ گیا۔

''یقیناً وہ کوئی اہم بات ہو گی۔ پلیز آپ بتائیں میں سن رہا ہوں۔'' وکیل نے اس سے نرمی سے کہا۔

''ڈاکے والی رات جو دو افراد میرے مکان میں گھسے تھے میں نے ان میں سے ایک کو سمیر کی حیثیت سے شناخت کیا تھا۔ میری شناخت کی بنیاد قدوقامت اور آنکھ کے قریب موجود تل پر تھی لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ پہلا فرق جو میں نے نوٹ کیا، وہ اس شخص اور سمیر کی آواز کا تھا۔ سمیر کی آواز میں نوعمری کا اثر ہے جبکہ اس شخص کی آواز میں نسبتاً پختگی تھی۔'' غضنفر آغا سوچ سوچ کر بول رہا تھا۔ شہباز نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اپنا پورا چہرہ اس کی طرف گھما لیا اور غور سے اس کی بات سننے لگا۔

''دوسرا فرق باڈی لینگویج کا ہے۔ جب میں اس شخص اور سمیر کو ذہن میں لاتا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ ان دونوں کے چلنے پھرنے اور کھڑے ہونے کا انداز ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ یعنی میں کہنا چاہ رہا ہوں کہ غور کرنے پر مجھے ڈاکو اور سمیر کے دو الگ الگ شخصیات ہونے کا احساس ہوا ہے۔'' آغا اپنی بات مکمل کر کے خاموش ہو گیا۔

''آپ کے تعاون کا شکریہ۔ ہو سکتا ہے میں کورٹ

میں اس سلسلے میں آپ سے ڈسکشن کروں۔'' وکیل کے لہجے میں پیشہ ورانہ خوش اخلاقی تھی۔

''اب...... اب کیا کہتے ہیں آپ؟'' آغا کے رخصت ہونے کے بعد شہباز پُرجوش لہجے میں وکیل سے مخاطب ہوا۔

''یہ شخص نفسیاتی مریض رہ چکا ہے اور اب بھی محلے میں اسے نفسیاتی ہی سمجھا جاتا ہے اس لیے شناخت کے حوالے سے اس کے بیان کی تبدیلی کیس پر زیادہ اثرانداز نہیں ہوگی۔ اس کے مقابلے میں عفت سلطانہ اور داؤد مرزا کی گواہیوں کو زیادہ معتبر سمجھا جائے گا۔'' وکیل نے سنجیدگی سے اسے جواب دیا۔

''عفت سلطانہ اور داؤد مرزا کی گواہیاں کون سی اتنی معتبر ہیں۔ عفت سلطانہ کو تو خیر سے کوئی مالی نقصان ہوا ہی نہیں اور داؤد مرزا یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ پارکنگ میں ان پر حملہ آور ہونے والے افراد کون تھے۔ وہ قبل ازواردات سمیر سے ملاقات کے حوالے سے پُریقین ہیں اور اس کا تو سمیر بھی انکاری نہیں ہے۔ اس نے صاف بتایا ہے کہ سوشل میڈیا کے ذریعے تشہیر کے علاوہ اس نے زیادہ سے زیادہ کلائنٹ حاصل کرنے کے لیے یہ طریقۂ کار اختیار کیا تھا۔'' شہباز نے وکیل سے بحث کی۔

''میری بات سمجھنے کی کوشش کریں شہباز صاحب! یہ کیس اگر صرف گواہان پر کھڑا ہوتا تو میں کورٹ میں ان کی دھجیاں اڑا دیتا لیکن مسئلہ یہ ہے کہ سمیر کے خلاف ٹھوس ثبوت وشواہد بھی موجود ہیں۔ میں آپ کی بات مان لیتا ہوں کہ کسی نے سمیر کو پھنسوانے کی کوشش کی ہے لیکن صرف کہہ دینے سے کچھ نہیں ہوتا ہمیں ثابت کرنا پڑے گا کہ وہ کیا وجوہات ہیں جن کی بنیاد پر کوئی اسے پھنسوانے کی کوشش کر رہا ہے۔ آپ میرے سامنے اس کا دشمن یا وجۂ دشمنی لے کر آئیں تو میں کوشش کروں گا کہ کیس کو مختلف انداز میں ہینڈل کر سکوں۔'' وکیل نے اپنی بات ختم کر کے آنکھوں پر قریب کا چشمہ چڑھایا اور ایک فائل کھول کر اسے دیکھنے لگا۔ یہ شہباز کے لیے واضح اشارہ تھا کہ وہ اسے اس سے زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔

☆☆☆

''ایسے کیسے چلے گا عبیرہ؟'' شہباز نے اندر داخل ہوتے ہوئے فریحہ کی تھکی آواز سنی اور ساتھ ہی نظریں میز پر رکھے ان چھوئے کھانے پر پڑیں تو وہ ساری صورت حال کو سمجھ گیا۔

''میرے لیے ایک کپ چائے تو بنا دو فریحہ۔'' کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے اس نے بہن کو منظر سے ہٹایا اور نظریں اس پر ٹکا دیں۔ کئی دنو کا پہنا ہوا ملگجا لباس، بغیر کنگھی کے اُلجھے ہوئے بال، مسلسل رونے سے سوج جانے والی آنکھیں، آنکھوں کے گرد پڑے ہوئے حلقے اور چہرے کی زرد رنگت...... وہ ایک لٹی پٹی اور اجڑی ہوئی ماں کی مکمل تصویر تھی۔

''فریحہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ چیزیں اس طرح نہیں چل سکتیں جس طرح تم چلا رہی ہو۔ دنیا میں کسی کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ سارا وقت دوسرے کا غم بانٹتا رہے اس لیے ہمیں چاہیے کہ دوستوں کو ان کی طاقت سے زیادہ آزمائش میں نہ ڈالیں۔'' وہ بہت سنجیدگی سے اسے حقائق کا احساس دلا رہا تھا۔

''میں کیا کروں؟ سمیر کے بغیر مجھے کچھ نہیں سمجھ آرہا۔ آپ نے کورٹ میں اس کی حالت دیکھی تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ اسے ٹارچر کیا جا رہا ہے۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''میں مانتا ہوں کہ بطور ماں تمہارے لیے یہ ایک تکلیف دہ صورت حال ہے لیکن تمہیں سمجھنا ہوگا کہ رونے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا اور نہ ہی یوں کھانا اور دنیا کا ہر کام چھوڑ دینے سے تم سمیر کی کوئی مدد کر سکو گی۔ یہ ایک مشکل صورت حال ہے اور مشکلات سے لڑنے کے لیے انسان کو سب سے پہلے خود کو مضبوط کرنا ہوتا ہے۔ تم اپنے آپ کو نہیں سنبھال پا رہیں تو اپنے بیٹے کے لیے کیا کرو گی؟'' وہ اسے کوئی رعایت دینے کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے سخت لہجے میں بولا۔

''میرے بس میں کچھ ہو تو کروں نا؟ الزامات کی لمبی فہرست ہے اور اتنے ثبوت پیش کر دیے گئے ہیں کہ ہر ایک کو لگتا ہوگا کہ وہ مجرم ہے لیکن میں اپنے بیٹے کو جانتی ہوں، میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ وہ یہ سب کر ہی نہیں سکتا۔'' بے حد اداسی سے یہ سب کہتے ہوئے وہ ساتھ ساتھ اپنے آنسو بھی صاف کرتی جا رہی تھی۔

''اسے کسی نے پھنسانے کی کوشش کی ہے شہباز۔ میرا یقین کریں سمیر کسی طور اتنے بھیانک جرائم میں ملوث نہیں ہو سکتا۔'' ضبط کی کوشش کے باوجود وہ خود کو پوری طرح سنبھالنے میں ناکام تھی۔ شہباز کو بے حد تکلیف ہوئی۔ زندگی اتنے نشیب و فراز سے گزر چکی تھی لیکن اسے خود سے اعتراف کرنا پڑ رہا تھا کہ وہ اوائلِ جوانی کی محبت اب بھی

اس کے دل میں زندہ ہے۔

''یہ بات میں نے وکیل سے بھی کہی تھی۔ اس نے کہا پھنسانے کا کام کوئی دشمن ہی کر سکتا ہے۔ آپ دشمن کا نام اور وجۂ دشمنی سامنے لائیں۔ تم ماں ہو اور سمیر سے سب سے زیادہ قریب بھی ہو۔ تم بتاؤ کہ کیا تمہارے علم میں کوئی ایسی بات ہے کہ سمیر کا کسی سے کوئی جھگڑا ہوا ہو یا کسی لڑکی وغیرہ ہی کا معاملہ ہو۔'' وہ نرمی سے بولتا ہوا اسے منطقی انداز میں سوچنے پر راضی کر رہا تھا۔

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''سمیر مجھ سے اپنے چھوٹے بڑے سارے معاملات ڈسکس کیا کرتا تھا اور اس نے مجھے کبھی ایسی کوئی بات نہیں بتائی کہ جس سے میں اس کی کسی کے ساتھ دشمنی کا اندازہ لگا سکوں۔''

''سمیر بھی ایسی کسی بات سے انکاری ہے اور یہاں آ کر ہماری تفتیش کی گاڑی پھنس ہو جاتی ہے۔ اگر وہ مجرم نہیں ہے تو کوئی تو وجہ ہو گی کہ اس کے خلاف اس قدر مربوط سازش تیار کی گئی ہے۔'' شہباز الجھن میں مبتلا تھا۔

''میرا بیٹا ہرگز بھی مجرم نہیں ہے۔'' عبیرہ کو اس کا ''اگر'' کہنا کھلا سو قدرے تیز لہجے میں بولی۔

''ریلیکس عبیرہ۔ بھائی سمیر پر کوئی الزام نہیں لگا رہے ہیں۔ وہ بس اس صورتِ حال کا تجزیہ کر رہے ہیں۔'' فریحہ جو چائے بنا کر لے آئی تھی، چائے کی پیالی شہباز کے سامنے رکھ کر اس کی طرف مڑی اور دلاسا دینے والے انداز میں اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ شہباز البتہ اب اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

''تم ایک کام کرو عبیرہ......'' بالآخر اس نے کسی نتیجے پر پہنچتے ہوئے اسے مخاطب کیا تو وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ شہباز نے اسے اپنی تجویز پیش کی۔

''نہیں۔ میں ان ظالموں سے بھیک نہیں مانگ سکتی۔'' وہ پہلے سے زیادہ زرد پڑ گئی۔

''اپنے بیٹے کو بچانا چاہتی ہو تو تمہیں ایسا کرنا پڑے گا۔ میرا تجربہ ہے کہ دولت اور اثر و رسوخ سے بہت سی آسانیاں حاصل ہو جاتی ہیں۔'' وہ اپنی تجویز پر نہایت سنجیدگی سے قائم تھا۔

''وہ لوگ میری زندگی میں آسانیاں کیوں پیدا کرنا چاہیں گے؟'' عبیرہ نے مایوسی سے سر جھٹکا۔

''انہیں ایسا کرنا پڑے گا کیونکہ سمیر اس کا حق دار ہے اور تم اس کا یہ حق ثابت کر سکتی ہو۔ اگر وہ زیادہ ڈھٹائی دکھائیں تو تم الٹا ان پر الزام عائد کر دینا کہ انہوں نے ہی سمیر کو پھنسانے کے لیے یہ سب کیا ہے۔'' شہباز کے دیے مشورے پر وہ اسے آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ وہ اسے اس کی زندگی کا وہ باب کھولنے کا کہہ رہا تھا جسے وہ اپنے تئیں ہمیشہ کے لیے بند کر چکی تھی۔

☆☆☆

''میرا نہیں خیال کہ ہمارے درمیان کوئی ایسی وجہ باقی رہ گئی ہے جو تمہاری مجھ سے ملاقات کا سبب بن سکے۔'' اس نے تقریباً انیس سال بعد اس عورت کو دیکھا تھا۔ انیس سال میں وہ بڑھاپے کی حدود میں ضرور داخل ہو گئی تھی لیکن اس کی شخصیت کا تن تناؤ اور غرور بالکل پہلے جیسا تھا۔ وہ ماضی کی طرح اب بھی آنکھوں میں حقارت لیے اسے دیکھ رہی تھی۔

''سبب موجود ہے میڈم اور وہ سبب ہے اظفر کمال کا بیٹا سمیر اظفر۔'' وہ اب انیس سال پہلے کی نوعمر لڑکی نہیں تھی جو ان سے ڈر کر خاموش ہو جاتی وہ اب ایک ماں تھی جسے اپنے بیٹے کی بقا کی جنگ لڑنے کے لیے خود کو مضبوط کرنا تھا۔

''اوہ...... ایک اور نیا ڈراما۔ برسوں جانے کہاں کہاں منہ کالا کرنے کے بعد آج تم اپنا کوئی گناہ ہمارے سر تھوپنے آئی ہو۔ شاید تمہارا خیال ہے کہ اس طرح تم برسوں پہلے جو مقاصد حاصل نہیں کر سکی تھیں، انہیں حاصل کر لو گی۔'' انہوں نے حقارت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے تیر چلایا۔

''آج کے سائنسی دور میں، میرے لیے اپنے دعوے کو ثابت کرنا بالکل بھی مشکل ثابت نہیں ہو گا۔ صرف ایک ڈی این اے ٹیسٹ آپ کی اچھالی ہوئی اس کیچڑ کو صاف کر دے گا۔ فی الحال آپ ان کاغذات کی نقول دیکھیے جن میں میرے پہلے پریگنینسی ٹیسٹ سے لے کر سمیر کی پیدائش تک کا سارا ریکارڈ موجود ہے۔ اس ریکارڈ میں موجود تاریخیں ہو سکتا ہے۔ آپ کی عقل پر بندھی پٹی کھو دیں۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو کل میں ایک پریس کانفرنس کروں گی اور اپنے دعوے کو ثابت کرنے کے لیے نکاح نامہ، طلاق کے کاغذات اور سمیر کا برتھ سرٹیفکیٹ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ازخود ڈی این اے کی تجویز پیش کر دوں گی۔ میرا نہیں خیال کہ ایک ایسے وقت میں جبکہ آپ قومی اسمبلی کا الیکشن لڑنے جا رہی ہیں، یہ معاملہ اٹھنا آپ کے لیے سودمند ہو گا کیونکہ میں صرف دعویٰ نہیں کروں گی میں عوام کو اپنی طلاق میں آپ کے کردار کو بھی بیان کروں گی اور مجھے نہیں لگتا کہ

لوگ ایک ظالم اور پتھر دل عورت کو ووٹ دینا پسند کریں گے۔'' وہ کبھی بھی اتنی زیادہ بہادر نہیں رہی تھی لیکن اپنے بیٹے کی بقا کی جنگ لڑنے میدان میں اُتری تھی تو لہجے میں خودبخود ہی ایک شیرنی کی سی غراہٹ آگئی تھی۔

''اتنے بلند و بانگ دعوے مت کرو بی بی! میں چاہوں تو یہاں سے واپس بھی نہ لوٹ سکو۔'' انہوں نے اسے صاف طور پر دھمکایا۔

''میں آپ کی ذہنیت کو جانتی ہوں اس لیے آنے سے پہلے اس بات کا انتظام کر کے آئی ہوں کہ میری گمشدگی کی صورت میں آپ کو ہی ذمّے دار سمجھا جائے۔'' اسے شہباز نے مکمل تیاری سے بھیجا تھا اس لیے اطمینان سے ہر بات کا جواب دے رہی تھی۔

''میں حیران ہوں کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچی ہو تو اتنے برسوں بعد تمہارے دل میں یہ خیال کیسے آیا؟ تمہیں تو بہت پہلے ہی سامنے آجانا چاہیے تھا۔'' وہ اس کی دھمکی سے قدرے خائف ہوئی تھیں لیکن برسوں سیاست کی بھول بھلیوں میں گھومنے کے باعث انہیں ہر قسم کے حالات میں خود کو پُرسکون ظاہر کرنے کا ہنر آتا تھا۔

''میں اب بھی نہ آتی لیکن میری مجبوری مجھے یہاں تک لے آئی ہے۔'' وہ جو اب تک خود کو مضبوط ثابت کرنے کی اداکاری کرتی رہی تھی، دلگرفتہ ہوگئی اور اپنے سارے حالات بیان کرتی چلی گئی۔

''تو اب ایک ڈاکو اور قاتل کا تعلق اظفر کمال کے خاندان سے جوڑنے کی کوشش کی جائے گی۔'' اس عورت کے جملے نے ثابت کر دیا کہ وہ آج بھی سینے میں پتھر کا دل لیے بیٹھی ہے۔

''اس کوشش میں اور کچھ ہو سکے یا نہ ہو سکے یہ ثابت ہو جائے گا کہ جو خاندان اپنی اولاد کو سنبھالنے کا اہل نہیں، وہ ملک کا مستقبل کیا خاک سنبھالے گا۔'' ان کی پتھر دلی نے اسے طیش میں مبتلا کر دیا وہ اپنا پرس سنبھال کر ایک جھٹکے سے کھڑی ہوتے ہوئے بولی۔

''اب میڈیا اور عدالت دونوں جگہ میرا سامنا کرنے کے لیے تیار رہیے گا۔ گزرے کل میں اگر اظفر کمال کے ایک بیٹے کو بچانے کے لیے اس کی ماں ہر حد سے گزر گئی تھی تو آج اظفر کمال کے دوسرے بیٹے کو بچانے کے لیے اس کی ماں ہر حد سے گزر جائے گی۔'' وہ اپنی بات کہہ کر تیز تیز قدموں سے چلتی اس عالیشان دفتر سے باہر نکل گئی جبکہ کرسی پر بیٹھی عورت کا ماتھا شکنوں کے جال سے پُر ہو چکا تھا۔

☆☆☆

''گواہان کے حوالے سے سمیر کی پوزیشن کافی بہتر ہوئی ہے۔ غضنفر آغا نے صاف کہہ دیا ہے کہ اسے اپنے گھر آنے والے ڈاکوؤں اور سمیر کی شخصیت ایک ہونے میں شک ہے۔ داؤد مرزا نے بھی بیان دیا ہے کہ انہوں نے سمیر کا تعارفی کارڈ پکڑنے کے فوراً بعد نہیں بلکہ اپنی گردن میں کچھ چبھنے کے بعد چکر محسوس کیے تھے لیکن وہ یہ بات بھول گئے تھے جبکہ تیسری گواہ عفت سلطانہ تو عدالت میں پیش ہی نہیں ہوئی۔'' شہباز جانتا تھا کہ وہ خود بھی ان سب باتوں سے واقف ہے لیکن اس کے بے حد سنجیدہ تاثرات کو دیکھتے ہوئے کسی طرح اسے ریلیکس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''سنا ہے عفت سلطانہ کی بیٹی اسپتال میں ایڈمٹ ہے، بے چاری کینسر کی لاسٹ اسٹیج پر ہے۔'' وہ ذہنی طور پر الجھی ہوئی تھی لیکن شہباز پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے ایک غیر ضروری بات سے گفتگو میں شمولیت اختیار کی۔

''ہوں...... سنا تو میں نے بھی تھا۔'' شہباز نے جواب دیتے ہوئے اسے غور سے دیکھا۔

''پریشان ہو؟''

''ہاں......'' اس نے فوراً اعتراف کر لیا۔

''کیوں؟''

''سوچ رہی ہوں بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ تو ڈال دیا ہے لیکن ایسا نہ ہو کہ فائدہ حاصل ہونے کے بجائے مزید نقصان ہو جائے۔''

''رسک تو لینا ہی تھا۔ سمیر کا کیس بہتر طور پر لڑنے اور اسے پولیس کی تحویل میں تشدد سے بچانے کے لیے ہمیں بڑی رقم کی ضرورت ہے جو ظاہر ہے ہم میں سے کسی کے پاس موجود نہیں ہے تو بس یہی ایک ذریعہ تھا ہمارے پاس رقم حاصل کرنے کا اور یہ کوئی غلط بات نہیں ہے۔ سمیر کا حق ہے اپنے باپ کی دولت پر۔''

''اس بے چارے کو تو کبھی باپ پر بھی حق حاصل نہیں ہو سکا۔'' اسے شہباز کی دلیل نے افسردہ کر دیا۔

''جو حاصل نہ ہو سکا اس کو چھوڑو ابھی تو ہمیں اس پر غور کرنا ہے جو حاصل ہو سکتا ہے۔ میرے پاس بیگم شہوار کے بارے میں خاصی معلومات ہیں۔ دیکھنے میں بہت دبنگ لیڈی لگتی ہیں لیکن ہمیشہ اسکینڈلز سے بچنے اور پس پردہ سودے بازی کرنے کو ترجیح دیتی ہیں۔ اب بھی مجھے امید ہے کہ پریس کانفرنس کے لیے دیے گئے وقت سے پہلے تم سے رابطہ کریں گی۔'' شہباز نے اسے تسلی دی اور پھر یہ کہتا

ہوا رخصت ہو گیا۔

''کوئی پیشرفت ہو تو مجھے کال کر دینا ورنہ پانچ بجے میں تمہیں بلوا لوں گا۔ اتنی ساکھ ہے میری کہ چاہوں تو گھنٹے بھر کے نوٹس پر بھی بڑے بڑے صحافیوں کو پریس کانفرنس کے لیے جمع کر لوں۔''

''اللہ کرے کہ اس کی نوبت نہ آئے۔'' وہ جسے کبھی شوبز کی چکاچوند لبھاتی تھی، آج کیمرے کا سامنا کرنے سے خوف زدہ تھی۔

کوئی بہت انوکھی کہانی نہیں تھی عبیرہ کی۔ سفید پوش طبقے کی حسین لڑکی جسے ایک اتفاق ماڈلنگ کی دنیا میں لے گیا اور اپنا پہلا ہی کمرشل اس ٹیکسٹائل مل کے مالک کی نظروں میں لے آیا جس کی لان کے اشتہار کے لیے اس کا انتخاب کیا گیا تھا۔ اظفر کمال عمر میں اس سے سترہ برس بڑا تھا لیکن اس کی وجاہت، دولت اور دیوانگی کے اظہار نے اس فرق کو تو کیا اس حقیقت کو بھی پس پشت ڈال دیا کہ وہ پہلے سے شادی شدہ اور ایک پندرہ سال کے بیٹے کا باپ ہے۔

عبیرہ اپنی بیوہ ماں کی اکلوتی بیٹی تھی اس لیے اس شادی کی راہ میں اس کی طرف سے کوئی رکاوٹ ڈالنے والا نہیں تھا اور اظفر کمال نے کسی کو کان و کان خبر نہیں ہونے دی تھی۔

شادی کے بعد انہوں نے ایک ماہ دبئی میں خوب عیش کرتے ہوئے گزارے پھر وہ اظفر کے ایک لگژری اپارٹمنٹ میں ماں سمیت رہنے لگی۔ اظفر نے ابھی تک شادی کا اعلان نہیں کیا تھا اس لیے اس کے پاس مستقل قیام نہیں کرتا تھا لیکن آنے بہانے اس کے پاس آنے کا موقع نکال لیتا تھا۔ وہ اس پر بھی خوش تھی کہ اظفر کی بے تحاشا محبت کے ساتھ ساتھ زندگی کی وہ ساری سہولیات جن سے پہلے محروم رہی تھی، ایک بیس سالہ لڑکی کو بہلانے کے لیے کافی تھیں۔

تین ماہ ایک خواب کے مانند گزرے اور پھر یہ خواب ٹوٹ گیا۔ اظفر کی شادی کی خبر اس کے خاندان تک پہنچ گئی۔ یہ ایک دن ہونا ہی تھا اور اظفر کا خیال تھا کہ جب بھی ایسا ہوا وہ معاملات کو سنبھال لے گا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اسے اپنی محبت کو منوانے کے لیے بیوی اور اس کے رشتے داروں سے لڑنا پڑے گا لیکن ہوا یوں کہ اس کا اپنا ہی خون اس کے مقابل ڈٹ گیا اور وہ بھی یوں کہ اظفر کو اس کا مقابلہ کرنے کی ہمت ہی نہیں ہو سکی۔ پندرہ سالہ بیٹا نیند کی گولیاں کھا کر زندگی اور موت کی کشمکش میں پڑا ہو تو باپ کو اپنا عشق بھولنا ہی پڑتا ہے۔ بچ جانے کے بعد اس نے اظفر کو صاف دھمکی دی کہ اگر اس نے عبیرہ کو طلاق نہیں دی تو وہ ایک بار پھر یہی حرکت کرے گا۔ بیٹے کی ضدی طبیعت سے وہ واقف تھا چنانچہ عبیرہ سے سوری کہا اور طلاق نامہ کے ساتھ حق مہر کا چیک پکڑا کر اپنی زندگی سے رخصت کر دیا۔

عبیرہ اور اس کی ماں کے لیے وہ زندگی کا ایک کڑا وقت تھا۔ بیوگی کا عذاب کاٹنے والی اس کی ماں زیادہ دن تک اس دکھ کے ساتھ نہیں جی سکی اور عبیرہ کو تنہا چھوڑ گئی۔ ان ہی دنوں عبیرہ کو اپنے اُمید سے ہونے کا پتا چلا اور ساتھ ہی پرانی دوست فریحہ سے ملاقات ہو گئی۔ فریحہ معاشی میدان میں شوہر کا ساتھ دینے کی منصوبہ بندی کر رہی تھی خود اسے بھی اپنے مستقبل کا سوچنا تھا چنانچہ فریحہ کے ساتھ مل کر مہر کی رقم سے چھوٹے پیمانے پر کام کا آغاز کیا۔ آج ان کا بوتیک کامیابی سے چل رہا تھا اور شہر میں اس کی اچھی ساکھ تھی لیکن یوں بھی نہیں تھا کہ دولت کی ریل پیل ہو گئی ہو بس معاملات زندگی اچھی طرح چل رہے تھے۔ ایسے میں سمیر کے کیس کو اس سطح پر جا کر لڑنا کہ حالات اپنے حق میں ہو جائیں، کوئی بچوں کا کھیل نہیں تھا اس لیے اسے شہباز کا مشورہ مان کر اظفر کمال کی بیوی شہوار کے پاس سمیر کا حق مانگنے جانا پڑا۔ دو سال قبل اسے اخبارات کے ذریعے اظفر کی دل کے دورے میں ہلاکت کی خبر مل گئی تھی اس لیے شہوار کے پاس جانا مجبوری تھی۔ اگر مجبوری نہ ہوتی تو وہ اس عورت کے پاس کیوں جاتی جو بیس سال قبل بہت طنطنے سے اظفر کے ساتھ اس کی قیام گاہ پر آئی تھی اور پُرغرور نظروں اور حقارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ اس کے طلاق نامے، مہر کے چیک اور تین کپڑوں کے ساتھ اظفر کی زندگی سے نکلنے کا تماشا دیکھتی رہی تھی۔

''تمہارا فون بج رہا ہے عبیرہ۔'' ماضی کو سوچتے سوچتے وہ جانے کتنی دور نکل گئی تھی کہ موبائل کی گھنٹی بجنے کی خبر بھی نہیں ہو سکی۔ فریحہ نے اس کا شانہ ہلا کر اسے متوجہ کیا تو اس نے انجان نمبر سے آنے والی کال ریسیو کی۔

''میرے کال کرنے سے یہ مت سمجھنا کہ تم مجھے ڈرانے میں کامیاب ہو گئی ہو۔ میں نے صرف انسانی ہمدردی کی بنیاد پر تم سے رابطہ کیا ہے۔'' وہ اس پُرغرور آواز کو پہچان سکتی تھی۔

''آپ کتنی ہمدرد خاتون ہیں، میں اس بات سے انیس سال پہلے واقف ہو چکی ہوں اس لیے اس بارے میں بتا کر میرا وقت ضائع نہ کریں۔'' اس کے لہجے میں سرد مہری تھی۔

''میں نے تمہارے حالاتِ زندگی معلوم کروائے ہیں۔ میں جان کر متاثر ہوئی کہ تم نے اظفر کے بعد کسی مرد کو اپنی زندگی میں جگہ نہیں دی اور خود کام کر کے بیٹے کو پالتی رہیں۔ تمہارے بیٹے کا کیس سنگین ہے لیکن میں سمجھتی ہوں کہ تم اپنے بیٹے کی رہائی کے لیے کتنی بے چین ہوگی۔ وہ بے گناہ ہے یا مجرم، مجھے اس سے دلچسپی نہیں بس تمہاری حالت پر رحم کھا کر چیک بھجوا رہی ہوں مگر یاد رکھنا کہ یہ آخری بار ہوگا۔ آئندہ اگر تم نے مجھے دھمکانے یا حق جتانے کی کوشش کی تو تمہارے بیٹے کے پھانسی کے پھندے تک پہنچنے کے عمل میں تیزی آجائے گی۔'' بولتے بولتے ان کے لہجے میں ایسی سفاکی کی در آئی تھی کہ عبیرہ کانپ کر رہ گئی۔ حقیقتاً اس کا بیگم شہوار سے کوئی مقابلہ نہیں تھا لیکن یہ ممتا کا جذبہ تھا جس نے چڑیا کو سانپ سے لڑنے کا حوصلہ دے دیا تھا۔ وہ بچہ جس پر اس نے اپنی ساری جوانی لٹا دی تھی، اسے موت کے جبڑوں سے چھڑانے کے لیے وہ ہر خطرے کو مول لینے کے لیے تیار تھی۔

☆☆☆

''میرے پاس تمہارے لیے ایک اچھی اطلاع ہے۔''

''وہ کیا؟'' شہباز کے الفاظ نے اس کے اندر سنسنی پھیلا دی اور خود بخود ہی موبائل پر گرفت مضبوط ہو گئی۔

''ہم اس ریسٹورنٹ کی سی سی ٹی وی فوٹیج حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جہاں سمیر اور جنید نے کھانا کھایا تھا۔ انہیں سرو کرنے والے ویٹر کی گواہی بھی مل گئی ہے اور ہم کم از کم یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں کہ جس وقت ٹیکسی ڈرائیور کو کال کی گئی، اس کے بعد کم از کم آدھے پون گھنٹے تک دونوں لڑکے ریسٹورنٹ میں ہی موجود رہے ہیں۔ یعنی انہوں نے ٹیکسی میں سفر نہیں کیا اور سمیر کا یہ بیان سچا ہے کہ اس نے کسی لڑکی کی فرمائش پر اس کی مدد کے لیے اپنے موبائل سے آن لائن ٹیکسی کے لیے کال کی تھی۔''

''یا اللہ تیرا شکر ہے میرے بچے کی بے گناہی کا ایک ثبوت تو ملا۔'' شہباز کی بات سن کر اس نے بے ساختہ ہی اللہ کا شکر ادا کیا۔

''مگر یہ الجھن ابھی باقی ہے کہ سمیر کا والٹ ٹیکسی میں کیسے پہنچا۔'' شہباز کا انداز سوچنے والا تھا۔

''سمیر نے بتایا تو تھا کہ کسی نے بازار میں اس کی جیب کاٹ لی تھی۔'' اس نے گویا شہباز کو یاد دلایا۔

''مجھے یہ بات یاد ہے عبیرہ لیکن ذرا سوچو تو کہ ہر واقعہ اشارہ کر رہا ہے کہ کسی نہ کسی طرح سمیر کو پھنسانے کی

موت و حیات

گھنٹی بجی تو تیر صاحب گھر سے نکلے۔ انہوں نے چند باریش حضرات کو دروازے پر کھڑے پایا۔ ایک صاحب نے بات شروع کی۔ ''جناب! آپ نے کبھی سوچا کہ زندگی کتنی ناپائیدار چیز ہے اور موت ایک اٹل حقیقت ہے جس سے فرار ممکن نہیں۔''

''جی ہاں، میں تو سارا دن یہی سوچتا رہتا ہوں کیونکہ میں ایک انشورنس ایجنٹ ہوں۔'' تیر صاحب نے جواب دیا۔

محمد حسین کی کراچی سے کڑی نظر

ادیبوں کے لطائف

سزا

نوجوان ادیب۔ ''میں آپ کے پرچے میں شائع کرانے کے لیے ایک کہانی لایا ہوں۔''

ایڈیٹر۔ ''پڑھ کر سنائیں۔''

نوجوان ادیب نے کہانی پڑھ کر سنائی پھر پوچھا۔ ''مجھے اس کے بدلے کیا ملے گا؟''

ایڈیٹر۔ ''میں ایڈیٹر ہوں۔ کوئی مجسٹریٹ نہیں جو آپ کو سزا دوں۔''

دو ادیب دوست

ایک دوست اپنے کسی ادیب دوست سے ملنے ان کے گھر گئے تو پتا چلا کہ دوست گھر پر نہیں ہیں۔ کہیں گئے ہوئے ہیں۔ ان صاحب کو بہت غصہ آیا۔ غصے میں آکر انہوں نے دروازے کے اوپر ''احمق'' لکھا اور چلے گئے۔

کچھ ہی دیر بعد ان کے ادیب دوست گھر سے ہو کر سیدھے ان کے پاس آئے اور بڑے ادب سے عرض کیا۔

ادیب دوست۔ ''معاف کیجیے گا مجھے کچھ دیر ہو گئی تھی۔ واپس آیا تو اپنے دروازے پر حضور کا نام لکھا تھا تو فوراً حاضر ہو گیا ہوں۔''

کوہاٹ سے ندیم علی شاہ بنوری کی برجستگی

کوشش کی گئی ہے اور باقاعدہ ثبوت تیار کیے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ جنید بھی صرف اس کا دوست ہونے اور اس کے ساتھ رہنے کی وجہ سے رگڑے میں آرہا ہے ورنہ اصل ہدف سمیر ہی ہے۔ تم سوچو کہ آخر ایسا کون ہوسکتا ہے جو سمیر سے اس حد تک دشمنی رکھتا ہے؟'' اس نے ایک بار پھر وہ بات دہرائی جو پہلے بھی کہی جاتی رہی تھی۔

''میرا تو دماغ کام نہیں کر رہا۔ اپنی پوری زندگی میں، میں نے صرف ایک غلطی کی ہے اور وہ غلطی تھی اظفر کمال سے شادی کرنا۔ اس غلطی کا نتیجہ میں نے بھگت لیا اور پھر اظفر اور اس کی فیملی میرے لیے ایسے ہو گئے جیسے ان کا دنیا میں کوئی وجود ہی نہ ہو۔ دونوں طرف سے یہی صورت حال تھی ورنہ میں سوچتی کہ شاید بیگم شہوار ایسا کر رہی ہیں۔'' اس نے الجھے الجھے انداز میں اپنی رائے دی۔

''ہوسکتا ہے وہی ہوں اس سب کے پیچھے۔ آخر سمیر، اظفر کمال کا بیٹا ہے۔ انہیں یہ ڈر تو ہوگا کہ کبھی تم اسے وراثت کے حق کے لیے ان کے سامنے کھڑا کرسکتی ہو۔''

''مگر انہیں تو سمیر کے وجود کا علم ہی نہیں تھا۔ میں نے جب رقم کے حصول کے لیے ان سے ملاقات کی تب بھی ان کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ انہیں سمیر یا سمیر کے ساتھ ہونے والی ٹریجڈی کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی۔ فرض کرو وہ اداکاری بھی کر رہی تھیں تو ایسی صورت میں انہیں مجھے رقم نہیں دینا چاہیے تھی۔ رقم دے کر تو ایک طرح سے انہوں نے سمیر کو بچانے کی جدوجہد میں حصہ ڈالا ہے۔'' وہ الجھ جانے کے باوجود شہباز کی رائے سے خود کو متفق نہیں کر پارہی تھی۔

''چلو پھر دیکھتے ہیں کہ آگے کیا ہوتا ہے۔ موجودہ ثبوت ملنے کے بعد تو وکیل بھی خاصا پُرامید نظر آنے لگا ہے۔'' شہباز نے کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ وہ بھی اپنا موبائل میز پر ڈال کر کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر بیٹھ گئی۔ سمیر کی گرفتاری کے بعد سے اس کے لیے ہر دن قیامت کا دن تھا لیکن اس نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ اگر اسے اپنے بیٹے کو بچانا ہے تو خود کو مضبوط رکھنا ہوگا۔ اپنے آپ کو اپنی مضبوطی کا یقین دلانے کے لیے اس نے ایک بار پھر کام پر دھیان دینا شروع کر دیا تھا اور اسی لیے آج بوتیک پر موجود تھی۔

''میڈم! عفت سلطانہ نامی ایک خاتون آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔'' وہ اپنی سوچوں میں گم بیٹھی ہوئی تھی کہ اطلاع دینے والی کی آواز نے چونکا دیا۔

''کون عفت سلطانہ......؟'' وہ غائب دماغی کی کیفیت میں بڑبڑائی پھر فوراً ہی اسے یاد آگیا کہ وہ سمیر کے خلاف ایک گواہ تھی۔

''بھیج دو انہیں۔'' اس نے حیران سی کیفیت میں اجازت دی۔ ایک منٹ بعد ہی عفت سلطانہ اس کے روبرو تھی۔ ملگجے سے لباس میں روئی روئی سی آنکھوں اور ستے ہوئے چہرے نے اسے حیران کر دیا۔ اس سے قبل وہ اس عورت کو پورے تک سک سے تیار عدالت کے کمرے میں دیکھ چکی تھی۔

''پلیز تشریف رکھیے۔'' کسی انہونی کے احساس کے ساتھ اس نے خاتون کو بیٹھنے کی پیشکش کی۔

''کچھ لیں گی آپ؟ کوئی مشروب؟'' اس نے، اس کے پپڑی زدہ ہونٹوں کو دیکھتے ہوئے ہمدردی سے پوچھا لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔

''سنا تھا آپ کی بیٹی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اب کیا حال ہے اس کا؟'' اس نے ڈرتے ڈرتے دریافت کیا۔ خاتون کی کیفیت اسے کسی غیر معمولی پن کا احساس دلا رہی تھی۔

''اللہ نے اسے ہر تکلیف سے نجات دے دی۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

''اوہ آئی ایم سوری۔ عبیرہ کو سچ مچ افسوس ہوا۔ کسی ماں سے اس کی اولاد کا جدا ہو جانا کتنا بڑا سانحہ ہوتا ہے، وہ اندازہ لگا سکتی تھی۔

''وہ میری ایک ہی بیٹی تھی اس کی جان بچانے کے لیے میں آخری حد تک گئی پھر بھی اسے نہیں بچا سکی۔'' اب وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

''اللہ آپ کو ہمت دے۔ قدرت کے فیصلوں پر صبر کے سوا کیا ہی کیا جاسکتا ہے؟'' عبیرہ بے ساختہ ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب جا کھڑی ہوئی اور اس کی پشت سہلاتے ہوئے اسے دلاسا دینے کی کوشش کرنے لگی۔ ایک تو اسے عفت سلطانہ کے یہاں آنے کی وجہ سمجھ نہیں آرہی تھی دوسرے اس صورت حال نے بھی سٹپٹا کر رکھ دیا تھا بہرحال انسانی ہمدردی کے ناتے، وہ اسے جتنی تسلی دے سکتی تھی دی۔

''آئی ایم سوری۔ میں نے آپ کو پریشان کر دیا۔'' آخر عفت سلطانہ خود کو سنبھالنے میں کامیاب ہوگئی۔

''اٹس اوکے۔ میں سمجھ سکتی ہوں آپ کی تکلیف۔ اولاد کی جدائی کے غم سے بڑھ کر دنیا میں شاید ہی کوئی تکلیف ہو۔'' اسے سلاخوں کے پیچھے قید اپنے بیٹے کا خیال آیا۔ اس

کے پاس کم از کم امید تو تھی کہ سمیر کو بے گناہ ثابت کر کے دوبارہ پاسکتی ہے لیکن یہ بے چاری عورت تو ہمیشہ کے لیے اپنی بیٹی کو کھو چکی تھی۔

''میں اسی لیے یہاں آئی ہوں۔ میں اپنی بیٹی کو نہ بچا سکی لیکن آپ کے بیٹے کو بچانے کا سبب بن سکتی ہوں۔'' عفت سلطانہ کے ہونٹوں سے ادا ہونے والے اس جملے نے اسے چونکا دیا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ آپ کے بیٹے کو باقاعدہ ٹریپ کیا گیا ہے اور میں نے ٹریپ کرنے والوں کا ساتھ اس لیے دیا کہ مجھے اپنی بچی کے علاج کے لیے بڑی رقم کی ضرورت تھی۔'' اس کے انکشاف نے عمیرہ کو گنگ کر دیا۔

''میں آپ سے معذرت چاہتی ہوں لیکن میری ممتا نے مجھے خودغرض بنا دیا تھا لیکن اللہ نے بتایا کہ خودغرضی سے کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔ ڈاکٹرز نے مجھے بہت اُمید دلائی تھی کہ میری بیٹی کا کینسر قابلِ علاج اسٹیج پر ہے لیکن کیا ہوا؟ وہ پہلی تھراپی کے دوران ہی مر گئی۔''

''آپ کو کس نے سمیر کو پھنسانے کے لیے ہائر کیا تھا؟'' عمیرہ نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''میرے جنرل منیجر نے۔ شاید ان لوگوں نے سمیر کی ریکی کروائی تھی۔ مجھے بس ایک چھوٹا سا پارٹ ادا کرنا تھا۔'' وہ بتانے لگی کہ کیسے پیٹرول پمپ پر سمیر کو ٹریپ کیا گیا۔

''ایکچولی شروع میں مجھے اس معاملے کی سنگینی کا اندازہ بھی نہیں تھا۔ مجھے بس اتنی ہدایت کی گئی تھی کہ مجھے بلیو اپر والے لڑکے کے قریب کس قسم کی گفتگو کرنی ہے۔ اور اگر وہ اس گفتگو کو سُن کر مجھے اپنا کارڈ دیتا ہے تو اس کارڈ پر ان کا دیا ہوا کیمیکل لگانے کے بعد کب اور کیا کرنا ہے۔ کیونکہ مجھے ایک آسان کام کے عوض بہت اچھی رقم مل رہی تھی اس لیے میں راضی ہوگئی۔ بعد میں جب کورٹ میں کیس شروع ہوا اور سمیر پر سنگین الزامات عائد کیے گئے تو مجھ پر صورتِ حال واضح ہوئی لیکن اس وقت میں پیچھے نہیں ہٹ سکتی تھی اس لیے چپ ہوگئی لیکن اب......'' اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''اب کیا؟'' عمیرہ نے سرد لہجے میں اس سے پوچھا۔

''اب میں اپنے گناہ کی تلافی کرنا چاہتی ہوں۔ میں کورٹ میں نیا بیان دوں گی۔'' عفت سلطانہ نے جھکی نظروں کے ساتھ جواب دیا۔

''اگر آپ نے ایسا کر دیا تو میرے آپ سے سارے گلے دور ہوجائیں گے۔'' اس بار عمیرہ نے قدرے نرمی سے جواب دیا اور میز پر دونوں کہنیاں جما کر ذرا سا آگے کو جھکتے ہوئے بولی۔

''کیا آپ مجھے میرے چند سوالات کے جواب دے سکتی ہیں؟''

☆☆☆

''دیکھا...... میں نے کہا تھا نا کہ یہ بیگم شہوار ہی ہیں جو سارا کھیل، کھیل رہی ہیں۔'' عفت سلطانہ کے بیان کے بعد کیس کا پانسا پلٹ گیا تھا اور معاملے کی نئے سرے سے تحقیق کی گئی تھی۔ اس تحقیق کے نتیجے میں جو حقائق سامنے آئے تھے، اس کے مطابق واقعی سمیر کی مستقل ریکی کی جاتی رہی تھی اور اس ریکی کے نتیجے میں اس کے خلاف پورا منصوبہ تیار کیا گیا تھا۔ مجرم اس کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ہر اس جگہ گئے تھے جہاں وہ محض اپنے چھوٹے سے کام کو فروغ دینے کی نیت سے گیا تھا۔ اس کی موجودگی کے مقام پر اس چالاکی سے جرم کے نشان چھوڑے گئے تھے کہ وہ سمیر کے خلاف ٹھوس ثبوت بن گئے تھے۔ ثبوتوں کو پکا کرنے کے لیے سمیر سے ملتے جلتے قدوقامت کے ایک بندے کو استعمال کیا جاتا رہا تھا جو سمیر کے اَپر جیسا نیلا اپر پہن کر کارروائی کرتا تھا اور اس کا ساتھ دینے کے لیے ایک فربہی مائل آدمی بھی موجود ہوتا تھا۔ اس آدمی کو جنید سمجھا گیا تھا لیکن عفت سلطانہ کے بیان کے نتیجے میں گرفتار ہونے والے اس کی کمپنی کے جنرل منیجر نے ساری گرہیں کھول دی تھیں۔

دراصل عفت سلطانہ، بیگم شہوار ہی کی ایک کمپنی میں ملازمت کرتی تھی اسی لیے ان لوگوں نے اسے آسانی سے استعمال کر لیا تھا۔ غضنفر آغا کا بھی بالکل یہی معاملہ تھا لیکن اس کے سلسلے میں منصوبہ بندی اس وقت کی گئی تھی جب سمیر اور جنید نے اس کے گھر جا کر اس کا کمپیوٹر ٹھیک کیا تھا۔ آغا کا سارا ریکارڈ کمپنی کے پاس موجود تھا اس لیے ڈاکو جانتے تھے کہ وہ اپنی رقم بینک اکاؤنٹ میں نہیں رکھتا اور اس بات کا ایک ہی مطلب تھا کہ رقم اس کے گھر پر ہوتی ہے۔ وہاں ڈاکا ڈلوایا گیا اور سمیر کے خلاف ثبوت چھوڑے گئے لیکن یہ مجرموں کی بدقسمتی تھی کہ سب سے پہلے آغا نے ہی اس بات کو نوٹ کیا کہ حلیہ ایک ہونے کے باوجود سمیر اور ڈاکو کی شخصیات میں فرق تھا۔ آغا کے بدلے ہوئے بیان نے جہاں سمیر کو شک کا فائدہ پہنچایا، وہیں عفت سلطانہ کا

بیان تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا۔

ان لوگوں کی خوش قسمتی تھی کہ کیس کا نیا تفتیشی افسر ایمان دار اور مضبوط بیک گراؤنڈ کا بندہ نکلا اس لیے بیگم شہوار جیسی اثر ورسوخ والی شخصیت کا نام سامنے آنے پر بھی اس نے ہتھیار نہیں ڈالے اور سمیر کی بے گناہی کے ثبوت جمع کرتا چلا گیا۔ شاید اس کی ایمان داری کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ بیگم شہوار کے مخالف سیاسی گروپ کا ہمدرد تھا اور اسے اس کیس کے ذریعے بالواسطہ اپنے آقاؤں کو فائدہ پہنچانے کا موقع مل گیا تھا۔

''آپ نے کہا تھا لیکن میں یقین اس لیے نہیں کر سکتی تھی کہ مجھے لگتا تھا کہ جب میرا اور سمیر کا ان کی زندگیوں سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے تو وہ کیوں ہمارے ساتھ ایسی کوئی حرکت کریں گی؟'' عبیرہ نے سادگی سے اسے جواب دیا۔

آج وہ بہت خوش تھی۔ سمیر کی رہائی کی خوشی میں اس نے اپنے گھر پر فریحہ اور شہباز کو ان کی فیملیز سمیت دعوت پر بُلا رکھا تھا اور اس وقت وہ لوگ خوش گوار موڈ میں بیٹھے ایک دوسرے سے گفتگو کررہے تھے۔

''اظفر کمال کے وکیل کے منظر پر آنے سے وجہ بھی تو سامنے آگئی نا۔ مائی گاڈ سمیر...... میں سوچ، سوچ کر ایکسائٹڈ ہو رہی ہوں کہ تم اتنے امیر ہو چکے ہو کہ تمہارے سامنے ہم سب بالکل غریب غربا لگیں گے۔'' فریحہ نے اپنے ساتھ والے صوفے پر بیٹھے سمیر سے کہا تو وہ شرما گیا۔

''ذرا سوچیں تو شہباز بھائی...... یہ اتنے بڑے ہوٹل کا مالک بن گیا ہے جس کی سالانہ آمدنی کا حساب کرنا ہم جیسوں کے بس کی بات نہیں اور یہاں یہ مزے ہیں کہ برسوں سے سارا منافع ایک اکاؤنٹ میں جمع ہوتا رہا موصوف کے لیے......'' جان بوجھ کر آنکھیں پھیلا پھیلا کر بولتی فریحہ کے انداز اور سمیر کے شرمانے کو سب انجوائے کررہے تھے۔

''کیوں سمیر میاں! تمہارے ہوٹل میں آنے پر ہمیں کوئی رعایت ملا کرے گی یا نہیں؟'' فریحہ کے شوہر نے بھی بیگم کا ساتھ نبھاتے ہوئے اس سے چھیڑ چھاڑ کی۔

''رعایت کی کیا بات ہے انکل...... آپ تو وہاں میرے اسپیشل گیسٹ ہوں گے۔'' سمیر کے جواب پر ان سب نے زور سے ''اوہو'' کہا تو وہ بے چارہ مزید جھینپ گیا۔

''بس بھئی مت چھیڑیے میرے بچے کو۔ دیکھیں کتنا شرما رہا ہے۔'' مسز شہباز نے اس کی طرف داری کی۔

''ویسے بھی میں نے اور سمیر نے مل کر فیصلہ کرلیا ہے کہ فی الحال یہ ہوٹل وغیرہ کے معاملات میں نہیں پڑے گا اور اپنی تعلیم پر توجہ دے گا۔ ہوٹل کے معاملات کو جیسے پہلے بخاری صاحب دیکھ رہے تھے اب بھی وہی دیکھتے رہیں گے۔'' عبیرہ نے ان لوگوں کو آگاہ کیا۔

''مناسب فیصلہ ہے۔'' فریحہ کے شوہر نے اس کے فیصلے کی تائید کی۔

''بالکل ٹھیک...... دولت چاہے جتنی بھی ہو انسان کو اپنی تعلیم ضرور مکمل کرنی چاہیے۔'' شہباز نے بھی اپنی رائے دی۔

''میرا خیال ہے اب کھانا کھا لیتے ہیں۔'' عبیرہ نے موضوع بدلا اور کھانے کی پلیٹیں سجاتی ان دو خواتین کی طرف اشارہ کیا جنہیں اس نے آج بطور خاص اپنی مدد کے لیے معاوضا بلوایا تھا۔

''بالکل بھئی، خوشبوؤں نے معدے میں ہلچل مچا دی ہے۔'' مزاج شناس فریحہ نے فوراً سمجھ لیا کہ اب وہ اس موضوع پر گفتگو نہیں چاہتی ہے۔

اس خوشگوار شام کے اختتام پر جب وہ سب مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد اپنے کمرے میں تنہا رہ گئی تو اس نے دراز کھول کر چپکے سے وہ خط دراز سے نکالا جو اظفر کمال کے وکیل کی معرفت اسے ملا تھا۔ لکھا تھا۔

''پیاری عبیرہ!

میں جانتا ہوں کہ میں تمہارا اتنا بڑا مجرم ہوں کہ تم سے معافی طلب کرنے کا حق بھی نہیں رکھتا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں زبیر کی خودکشی والی حرکت سے اتنا خوف زدہ ہو گیا تھا کہ تمہیں زندگی سے نکال دینا ہی سب سے بہترین حل لگا تھا لیکن یقین کرو کہ تمہیں خود سے الگ کر کے میں پھر بھی جی نہیں سکا اور مارے باندھے زندگی کے معاملات چلاتا رہا۔

تم یقین کرو یا نہ کرو عبیرہ لیکن یہ سچ ہے کہ میں نے تمہیں بہت ٹوٹ کر چاہا تھا اور صدقِ نیت سے تمہیں اپنی شریکِ حیات بنایا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میری زندگی میں خوشیوں کے بس وہی چند ماہ ہیں اور اس کے بعد کا ہر دن میں ایک بوجھ کی طرح گزاروں گا۔ ان گزرے ماہ و سال میں، میں تم سے بھی بے خبر نہیں رہا۔ مجھے سمیر کی دنیا میں آمد سے لے کر تمہارے کاروبار شروع کرنے تک ہر معاملے کی خبر ہے اور میں خوش ہوں کہ تم میرے بیٹے کی بہت اچھی تربیت کررہی ہو۔ اصولاً مجھے سمیر کی پرورش کے لیے تمہاری مالی معاونت کرنی چاہیے لیکن جہاں تک میں تمہیں سمجھا ہوں اس کے مطابق میری ایسی کوئی پیشکش تمہارے لیے قابلِ









JASOOSI DIGEST
PUBLI



255

قبول نہیں ہوگی۔ دوسرے میں شہوار اور زبیر سے بھی خائف ہوں۔ وہ دونوں ماں بیٹا تمہیں میری زندگی سے نکال کر مطمئن ہیں لیکن انہیں میرے تم سے کسی رابطے کی بھنک بھی پڑ گئی تو وہ تمہیں اور سمیر کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ تم دونوں کو کسی نقصان سے بچانے کے لیے میں اپنے دل پر پتھر رکھ رہا ہوں لیکن یہ میرا وعدہ ہے کہ سمیر کو اس کا حق ضرور ملے گا۔

سمیر کے نام سے میں ایک ہوٹل خفیہ طور پر تعمیر کروا رہا ہوں۔ اس راز کے امین میرے دوست اور نہایت قابلِ اعتماد وکیل بخاری صاحب ہیں۔ میں رہوں نہ رہوں بخاری صاحب، سمیر کے اٹھارہ سال کا ہونے پر اس کی امانت اسے سونپ دیں گے اور اس کی ہر ممکنہ مدد اور رہنمائی بھی کریں گے...... تم ان پر مکمل اعتماد کرسکتی ہو۔

آخر میں تم سے بس اتنی درخواست ہے کہ اگرچہ میں اس لائق نہیں لیکن ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔'' ڈیڑھ جملے کی یہ معافی خط کے آخری الفاظ تھے جو عبیرہ کو ہر بار پڑھنے پر رلا دیتے تھے۔ جس شخص کی چند ماہ کی رفاقت نے اسے زندگی میں پھر کسی کا نہیں ہونے دیا تھا، اس کے مرنے کے بعد وہ اسے معاف بھی نہ کرتی تو اور کیا کرتی؟

☆☆☆

''ممی......'' بیگم شہوار نے بیٹے کے پکارنے پر سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''آپ نے ایسا کیوں کیا ممی؟'' وہ ان کے دونوں ہاتھ تھام کر رو دیا۔

''میرے پاس یہی ایک راستہ تھا۔'' انہوں نے سپاٹ سے لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔

''آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' وہ اتنا اونچا لمبا مرد ہو کر رو رہا تھا۔ اپنی ماں کو جیل کے اس ملاقاتی کمرے میں دیکھنا اس کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔

''میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کرسکتی تھی زبیر۔ جو ہو گیا اسے چھوڑ دو اور مردوں کی طرح ڈٹ کر حالات کا مقابلہ کرو۔'' انہوں نے اسے ٹوکا۔

''تو پھر مجھے اعتراف کرنے دیں، میں......''

''ہرگز نہیں۔ اگر تم نے ایسی کوشش بھی کی تو اپنی ماں کا مرا ہوا منہ دیکھو گے۔ تم جانتے ہو کہ تمہاری ماں تم سے کم ضدی نہیں ہے۔'' انہوں نے اسے بات مکمل کرنے کا موقع دیے بغیر ہی اپنا فیصلہ سنا دیا تو وہ کچھ کہنے کے لائق نہیں رہا۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ نفرت میں کسی اور کو تباہ کرتے کرتے میں اپنی ماں کو ہی تباہ کردوں گا۔ آپ جیسی باعزت اور باوقار خاتون کو یوں مجرموں کی طرح یہاں دیکھ کر میرا دل کٹنے لگتا ہے۔'' کچھ دیر کے توقف کے بعد اس نے یہ جملے کہے تو ضبط کی کوشش کے باوجود آنکھوں میں نمی آنے سے نہیں روک سکا۔

''محبت ہمیشہ خراج مانگتی ہے زبیر...... کل تمہارے باپ نے تمہاری خاطر اپنی محبت کی قربانی دی تھی، آج میں نے اپنا مقام و وقار داؤ پر لگا دیا تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ زندگی کی بات میں اس لیے نہیں کررہی کہ مجھے معلوم ہے پیسے کے بل بوتے پر تم میری زندگی بچانے کا انتظام کر ہی لو گے۔ ویسے نہ بھی بچاؤ تو کوئی حرج نہیں۔ اس عمر میں ویسے بھی انسان الٹی گنتی گننا شروع کر دیتا ہے۔ حیات کے یہ جو چند بچے کھچے برس رہ گئے ہیں، وہ نہ بھی ملیں تو مجھے کوئی افسوس نہیں ہوگا۔ میری تو اب بس اتنی تمنا ہے کہ تم بہت لمبی اور خوشیوں بھری عمر گزارو۔'' وہ جو دوسروں کے لیے بہت متکبر اور مغرور خاتون تھیں، بیٹے کی محبت میں موم کی طرح پگھلی جارہی تھیں۔ زبیر نے ان کی اس درجے محبت پر بے ساختہ ہی ان کے دونوں ہاتھ تھام کر چوم لیے۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی آنکھوں سے دو آنسو لڑھک کر ان کے ہاتھوں پر ٹپک گئے تھے۔

''کاش میں نے اپنے حسد اور ضد کو قابو میں رکھا ہوتا۔'' ماں سے رخصت ہو کر جاتے ہوئے اس کے ذہن میں ایک ہی سوچ تھی اور وہ اس دن کو پچھتا رہا تھا جب اسے سمیر اور اس کے نام پر موجود ہوٹل کے بارے میں علم ہوا تھا۔

یہ بالکل اتفاق تھا کہ اظفر کمال کے وکیل صمد بخاری کے بیٹے امجد نے جو کہ اس کا دوست بھی تھا، اس کے سامنے اس معاملے کا تذکرہ کر دیا۔ اصل میں صمد بخاری صاحب اپنے علاج کے سلسلے میں بیرونِ ملک گئے ہوئے تھے اور انہوں نے امجد کو عبیرہ اور سمیر کے بارے میں معلوم کرنے کی ہدایت کی تھی۔ بخاری صاحب کے پاس عبیرہ کی جس آخری رہائش گاہ کا پتا تھا، وہ اس نے تبدیل کر لی تھی اور اس کا نیا پتا تلاش کرتا امجد بے دھیانی میں، زبیر سے یہ ذکر چھیڑ بیٹھا تھا۔ زبیر کے لیے تو یہ اطلاع ہی بہت بڑی تھی کہ برسوں پہلے اس نے اپنے باپ کی جس شادی کو ختم کروا دیا تھا، اس شادی کا ایک ثمر اس کے سوتیلے بھائی کی صورت میں موجود تھا۔ امجد کے پتا ڈھونڈنے نے اسے مزید چوکنا کر دیا اور دوستی کی دھونس زبردستی کو استعمال کر کے وہ اصل معاملہ جاننے میں بھی کامیاب ہو گیا۔

اس جیسی فطرت کے شخص کے لیے سمیر سوتیلا بھائی

نہیں، دشمن تھا جسے وہ فوری طور پر جان سے مار کر ہمیشہ کے لیے جان چھڑوا لینا چاہتا تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ اگر ایسا ہوا تو امجد کا شک اس پر ہی جائے گا اور قانون پسندی میں وہ بالکل اپنے باپ کی طرح تھا۔ معاملے کا سیدھا حل استعمال کرنے کی گنجائش نہ پا کر اس نے انگلیاں ٹیڑھی کیں اور سمیر کے خلاف سازش کا جال بچھانے میں مصروف ہو گیا۔ وہ اپنی کوشش میں کامیاب تھا اور بالکل قانونی طریقے سے سمیر کو ٹھکانے لگانے ہی والا تھا کہ عفت سلطانہ کی گواہی نے سب کچھ تلپٹ کر دیا۔

جنرل منیجر کی گرفتاری کے بعد اس کی اپنی گرفتاری زیادہ دور نہیں تھی لیکن ایسے میں اس کی والدہ حرکت میں آئیں اور اپنا اثر ورسوخ استعمال کر کے جی ایم کے بیان سے پہلے اس سے ملاقات کرنے میں کامیاب رہیں۔ اس ملاقات کا ایک نکاتی ایجنڈا یہ تھا کہ جی ایم کو ہر معاملے سے زبیر کا نام نکال کر بیگم شہوار کا نام لینا تھا۔ جی ایم کو ان کی بات ماننی پڑی یوں اب زبیر کی جگہ وہ جیل میں تھیں اور وہ پچھتاوے کی آگ میں جل رہا تھا۔

''برسوں پہلے جیسے میں نے تیری ماں کے قبضے سے اپنے باپ کو واپس حاصل کر لیا تھا اب تیرے قبضے سے اپنے باپ کی جائداد کو واپس حاصل کر لوں گا۔'' واپسی کے راستے میں وہ دانت کچکچاتے ہوئے سمیر کے تصور سے مخاطب تھا۔

''تو نہیں رہا تو تیری دولت مجھے ہی ملے گی ناں۔ آفٹر آل میں تیرا اکلوتا بھائی ہوں۔'' بڑبڑانے کے ساتھ ہی اس نے زوردار آواز میں قہقہہ لگایا۔ اس قہقہے کو موبائل کی رنگ ٹون نے بریک لگائے۔

''ہیلو۔'' اس نے امجد کا نام دیکھتے ہوئے کال ریسیو کی اور گاڑی کو ایک یوٹرن پر گھمایا۔ اس وقت وہ شہر کی ایک مصروف ترین شاہراہ پر موجود تھا۔

''کہاں تھے یار! میں کب سے تمہیں کال کر رہا تھا لیکن تمہارا فون بند جا رہا تھا۔'' اس کی آواز سنتے ہی امجد نے شکوہ کیا۔

''میں ممی سے ملنے گیا تھا اس لیے فون آف تھا۔ تم بتاؤ کہ کیوں کال کر رہے تھے؟'' اس نے جواب دیا تو امجد ایک لمحے کے لیے چپ سا ہو گیا۔ بیگم شہوار کا یہ انجام اس کے لیے بھی افسوس ناک تھا خصوصاً اس لیے بھی کہ وہ سمجھتا تھا کہ زبیر کو اس سارے واقعے سے شدید صدمہ پہنچا ہے۔

''تم نے بتایا نہیں کہ تم مجھے کیوں کال کر رہے تھے؟'' اسے خاموش پا کر زبیر نے اسے ٹوکا۔

''ایکچوئیلی میں نے سمیر کی خواہش پر تمہیں کال کی تھی۔ وہ آج کچھ ضروری کاغذی کارروائی کے لیے آفس آیا ہوا تھا اور مجھ سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ میں اپنے بڑے بھائی سے ملنا چاہتا ہوں تو میں نے سوچا تم سے بات کر کے دیکھ لوں۔'' امجد نے اسے وجہ بتائی۔

''مائی فٹ...... میں کروں گا اس سے ملاقات۔ کوئی بھائی وائی نہیں ہے وہ میرا، میں اپنے باپ کی اکلوتی اولاد ہوں۔'' گاڑی میں چلتے اے سی کی ٹھنڈک کے باوجود وہ جھلس کر رہ گیا۔

''جذباتیت کو چھوڑو یار! نہ ماننے سے حقیقت بدل تو نہیں جائے گی۔ ویسے بھی میرا خیال ہے کہ ان لوگوں سے بہتر تعلقات قائم کرنا آنٹی کے کیس میں معاون ثابت ہو سکتا ہے۔'' امجد نے اسے سمجھانے کی کوشش کی جس پر اس نے جواب دینے کے بجائے اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور گاڑی کی رفتار بے ساختہ ہی بڑھا دی۔

''سمیر بہت اچھا لڑکا ہے یار! چھوٹی سی عمر میں اتنے حساس اور سمجھدار لڑکے بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ تم اس سے ملو گے تو وہ تمہیں بھی متاثر کرے گا۔'' امجد اس کی کیفیت سے بے خبر بولتا جا رہا تھا۔

''تمہیں پتا ہے اس نے ابھی سے اپنی وصیت بھی تیار کروا دی ہے جس کے مطابق اس کے مرنے کے بعد اس کی ساری جائداد ایک فلاحی ادارے کے سپرد کر دی جائے گی اور اس کی ٹرسٹی اس کی والدہ ہوں گی۔'' امجد نہیں جانتا تھا کہ یہ اطلاع اس شخص کے لیے کیسی ثابت ہو گی جو چند لمحوں پہلے ہی سمیر کو مار کر اس کی دولت کا حق دار بننے کے ارادے باندھ رہا تھا۔ ناکامی در ناکامی نے اس کے اندر ایسا ابال اٹھایا کہ وہ اپنے آپ سمیت اپنی تیز رفتار گاڑی کو بھی قابو میں نہیں رکھ سکا اور گاڑی ایک ہیوی لوڈر میں گھستی چلی گئی۔ درد میں ڈوبی آخری سانسیں لیتے ہوئے اسے اپنے ہی الفاظ یاد آئے تھے۔

''تو نہیں رہا تو تیری دولت مجھے ہی ملے گی نا! آفٹر آل میں تیرا اکلوتا بھائی ہوں۔''

موت نے سمیر کے بجائے اس کا انتخاب کر لیا تھا اور اس کے مرنے کے بعد اس کے حصے کی جائداد اس کے ''اکلوتے بھائی'' کو ہی ملنی تھی۔ اعمال اچھے نہ بھی ہوں کم ازکم ... نیت اچھی ہو تو اس کا صلہ بھی مل جاتا ہے...... جو لوگ بدنیت ہوتے ہیں...... ان کے اعمال بھی سیاہ ہوتے ہیں۔



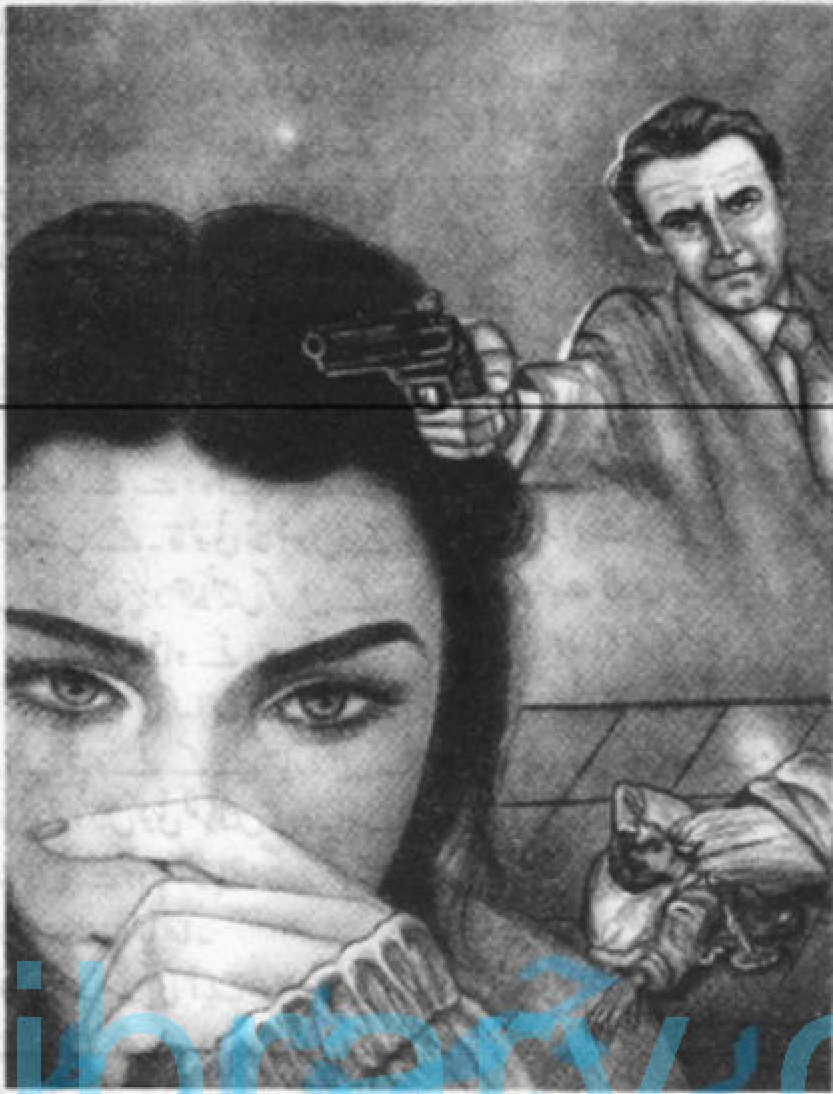
نجاتِ نیم شب

خالد شیخ طاہری

وقت کے ساتھ ہر شے کے تقاضے بدل رہے ہیں... زندگی کے چلن... رنگ ڈھنگ میں تیزی سے تبدیلیاں آرہی ہیں... نیکی کم سے کم اور بدی کے راستے وسیع سے وسیع تر ہورہے ہیں... دولت کے حصول کا لالچ ایسے ایسے راستے سُجھا رہا ہے... جسے سوچ کر انسانیت شرما جائے... ایسے ہی راستوں سے گزرتی کہانی کے پیچ و خم... ایک سیدھے سادے نوجوان لڑکے کی نیک نیتی... اپنے والد سے ورثے میں ملی شرافت... صداقت اور قانون پسندی اس کے لہو میں بسی تھی... وہ جان دے سکتا تھا مگر قانون شکنی کا مرتکب نہیں ہو سکتا تھا... سکھ چھین کر دکھ دینے والے چہروں کا تماشائے عبرت... سرورق کا ایک تیکھا رنگ...

مگر کچھ صفت انسانوں کا کھیل جو طاقت کے نشے میں انسانیت کو ختم کررہے تھے...

رات بھاری بیل کی طرح آہستہ آہستہ دوسرے پہر کی جانب سرک رہی تھی۔ مغربی اُفق سے اٹھنے والے سیاہ بادل چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹے، اب ایک جگہ جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی بھی وقت بارش شروع ہو جائے گی۔ دم توڑتا چاند جب کسی بادل کی اوٹ سے جھانکتا تو ایک پُراسرار سی روشنی پھیل جاتی۔ ورنہ اندھیرے نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ایسے ماحول میں شہر کے وسط میں واقع ایک قبرستان میں انسان تو کیا کسی جانور کی موجودگی کی سوچ بھی عبث تھی۔ ایسے میں ایک انسانی ہیولا اپنے اردگرد کے ماحول سے بے نیاز، قبرستان کے مرکزی گیٹ سے اندر داخل ہوا۔ اب ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔ انسانی ہیولے نے ایک بڑی سی سیاہ چادر سے خود کو بارش سے محفوظ کرلیا، مگر بارش کی ایک تیز پھوار نے چادر کو بھگو کر اس کے جسم سے چپکا دیا۔ اس نے اپنے کندھے پر لٹکے بیگ کو چادر کے نیچے چھپالیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ بار بار چادر کے کونے سے چہرے سے بارش کے قطروں کے ساتھ بہنے والے آنسو بھی صاف کر رہا تھا۔ ہونٹ سختی سے بھینچے ہوئے تھے۔ اس کی منزل قبرستان کے جنوبی کونے میں بنی ایک قبر تھی۔ بجلی کی چمک میں اس کی نظر قبر پر پڑی، جس پر پرانے پھولوں کی چادر بے ترتیب پڑی ہوئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ قبروں سے بچتا ہوا، قبر کے نزدیک پہنچ گیا۔ ایک نظر قبر کو دیکھا۔ اب دل کا غبار آنکھوں کے ساتھ ساتھ، سسکیوں کی صورت میں نکلنے لگا۔ قبرستان کا ماحول ویسے ہی خوفناک منظر پیش کر رہا تھا۔ ایسے ماحول میں اس کے رونے کی آواز کسی نڈر انسان کے بھی رونگٹے کھڑے کردینے کے لیے کافی تھی۔ روتے روتے اس نے آسمان کی جانب سر اٹھایا، تو بارش کی موٹی موٹی بوندیں اس کے چہرے پر پڑنے لگیں۔ اچانک اس کے حلق سے ایک آہ نکلی اور پھر یہ آہ دردناک چیخ میں بدل گئی پھر نکلتی ہی چلی گئی۔ درختوں پر بیٹھے پرندوں میں ہلچل سی مچ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے قبر کی گیلی مٹی اپنی مٹھی میں زور سے بھینچی ہوئی تھی۔ اس کی آہ وفغاں سے ایسا لگ رہا تھا، جیسا اتنے سالوں کا رکا غبار وہ آج ہی نکال دے گا۔ آج اس کا ذاتی انتقام پورا ہو چکا تھا۔ اب اسے آنے والی نسل کو بچانا تھا۔ جس پر اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی موت کے سائے



منڈلا رہے تھے۔ یہی عہد کرنے وہ اس وقت اپنے باپ کی قبر پر آیا تھا۔

☆☆☆

''دیکھیں! اگر آپ کے بیٹے کا یہی چال چلن رہا تو ہمیں مجبوراً انتہائی قدم اٹھانا پڑے گا، جو آپ کے بیٹے کے مستقبل پر بہت بُرا اثر ڈالے گا۔ آپ کے بیٹے کا نام اسکول سے خارج بھی ہوسکتا ہے۔'' میڈم نے ناک پر ٹکے چشمے کی اوٹ سے سامنے بیٹھے رافع، پھر قمر النساء کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اپنے سامنے رکھی ایک درخواست ان کے سامنے سرکا دی۔ درخواست ایک بچے کے والدین کی جانب سے اسکول انتظامیہ کو دی تھی۔ جس میں رافع کو اسکول بدر کرنے کی اپیل کی گئی تھی۔ قمر النساء نے درخواست پڑھ کر واپس میڈم کو دی جو جواب طلب نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

''دیکھیں میڈم! یکطرفہ درخواست پر عمل کر کے آپ جانبداری کا مظاہرہ کریں گی۔ جس سے مجھے شکایت ہوگی۔ میری آپ سے درخواست ہے، شواہد کو سامنے رکھ کر کوئی فیصلہ کیا جائے۔ تاکہ سب واضح ہو کہ اصل بات کیا تھی۔ کیونکہ مجھے اپنی تربیت اور بیٹے پر پورا بھروسا ہے۔ کل آپ متاثرہ بچے اور اس کے والدین کو بھی بلوا لیں، میں کل پھر حاضر ہو جاؤں گی۔'' ایڈووکیٹ قمر النساء نے بال میڈم کے کورٹ میں پھینک دی۔ میڈم یہ بات سن کر نرم پڑ گئیں۔ ان کے چہرے کے تاثرات بھی اعتدال پر آ گئے۔

''ٹھیک ہے، میں کل نبیل کے والدین کو بلوا لیتی ہوں۔ آپ گیارہ بجے آجائیے گا۔'' میڈم نے درخواست دراز میں رکھتے ہوئے کہا۔

قمر النساء نے ایک نظر بیٹے کی جانب دیکھا، جو سر اٹھائے ماں کو ہی دیکھ رہا تھا۔ دونوں نے میڈم کو سلام کیا اور آفس سے نکل آئے۔ گھر پہنچ کر قمر النساء نے شوہر کو کال کر کے ساری تفصیل بتا دی اور کھانا بنانے کچن کی جانب چل دیں۔ انہوں نے رافع سے کوئی تفصیل نہیں پوچھی، وہ چاہتی تھیں کہ ان کے شوہر ہی آکر اپنے بیٹے سے وضاحت طلب کریں۔ رافع کا مطمئن چہرہ ان کے اندر ایک فخر کی کیفیت پیدا کر رہا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کی پرورش جن خطوط پر کر رہی تھیں، وہ بہترین ہیں۔

یہ وہی وقت تھا۔ جب قمرالنساء گھر پہنچی تھیں تو ان کے شوہر فاروق احمد صدیقی دفتر میں میز پر رکھی فائل کو ایسے شعلہ بار نظروں گھور رہے تھے جیسے اسے جلا ہی دیں گے۔ ویسے ان کا خیال بھی یہی تھا کہ ایسی فائلوں کا جلا دینا چاہیے۔ اچانک فون کی گھنٹی نے انہیں اپنے خیالات سے چونکا دیا۔ ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا دوسری جانب سے بیگم کی آواز سن کر ان کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ بات ختم کر کے انہوں نے فائل سائیڈ پر لگے ریک میں لگا دی۔

فائل پر دستخط اور نوٹ کے حوالے سے وہ اپنے فیصلے سے ایک قدم بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھے۔ قانونی تقاضوں کے بنا، وہ کسی بھی صورت میں اس فائل پر دستخط نہیں کریں گے، یہ ان کا اٹل فیصلہ تھا۔ آج بھی رستم شاہ نے اعلیٰ افسران سے فون کروایا تھا اور تاکید کروائی تھی کہ اس فائل پر دستخط کر دیں، بصورت دیگر اپنے تبادلے کے لیے تیار رہیں۔ بات صرف تبادلے کی ہوتی تو انہیں کوئی فکر نہیں تھی، یہ سب ان کے ساتھ پچھلے دس سالوں سے ہوتا آ رہا تھا، مگر رستم شاہ نے اس معاملے کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا۔

اڑتیس سالہ فاروق احمد صدیقی ایک خوبصورت و خوب سیرت شخصیت کے مالک تھے۔ ایماندار افسر تھے۔ جہاں ان کی شخصیت کو پسند کرنے والے موجود تھے وہیں کچھ لوگ ان کی ایمانداری سے نالاں تھے۔ محکمے میں فاروق احمد کے بارے میں مختلف آرا پائی جاتی تھیں۔ اچھے لوگوں کو وہ بہت اچھے لگتے اور بُرے لوگوں کو بہت ہی بُرے۔ اس بار معاملہ گمبھیر تھا کیونکہ تبادلے کے ساتھ جان سے مارنے کی دھمکیاں بھی ملی تھیں۔

انہیں پتا تھا کہ یہ کام وہ نہیں تو کوئی اور کر دے گا۔ ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا، اس سے پہلے بھی وہ کئی بار تبادلے کا مزہ چکھ چکے تھے۔ مگر اس بار رستم شاہ کی طرف سے دھمکیاں پریشان کن تھیں۔ انہیں اپنی پروا نہیں تھی۔ ان کے سامنے بیوی اور دس سالہ بیٹے کا چہرہ آ جاتا اور اب تو ایک اور مہمان آنے والا تھا۔ فاروق احمد کی بیوی ایڈووکیٹ قمرالنسا امید سے تھیں۔ یہ ہی ان کی پوری کائنات تھی، فاروق احمد نے سر کو کرسی کی پشت سے لگایا اور آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر ایسی حالت میں سوچتے رہے۔ جب سر اٹھایا تو ایک فیصلہ کر چکے تھے۔ وہ سیدھے ہوئے اور سائیڈ پر رکھے فون کا ریسیور اٹھایا اور کال کرنے لگے۔ اپنے محکمے کے اعلیٰ افسر کو اپنا فیصلہ سنا کر فون بند کر دیا۔ ان کے چہرے پر طمانیت بھری مسکراہٹ تھی۔ یہ مسکراہٹ اس وقت چہرے پر آتی ہے جب روح اور ضمیر مطمئن ہوں اور انسان اپنے عمل پر۔ یہ فیصلہ رستم شاہ کی اس فائل پر ان کا آخری ٹھپا تھا۔ وہ آفس ٹائم ختم ہونے سے پہلے پہلے اپنے کام نمٹانا چاہتے تھے۔ انہیں پتا تھا اب ان کا اس آفس سے دانہ پانی اٹھنے والا ہے۔ لہٰذا وہ دوپہر کا آخری کھانا کھانے اٹھ کھڑے ہوئے۔ شام تک رستم شاہ کی فائل کو ایک بار پھر اچھی طرح دیکھ کر اپنا تفصیلی نوٹ لگا دیا اور فائل میز کے درمیان رکھ کر اوپر پیپر ویٹ رکھ دیا۔ آفس ٹائم ختم ہو چکا تھا، انہوں نے اپنا بیگ اٹھایا، ایک طنزیہ مسکراہٹ فائل پر ڈالتے ہوئے آفس سے باہر نکل گئے۔ بہت دنوں کے ذہنی دباؤ کے بعد آج وہ خود کو پُرسکون اور ہلکا پھلکا محسوس کر رہے تھے۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا، جیسے کوئی بہت وزنی بوجھ اُن کے سر سے اتر گیا ہو۔ رات کھانے کے بعد جب انہوں نے رافع کو طلب کیا تو رافع پُراعتماد تھا۔

”کیا ہوا تھا؟“ فاروق احمد نے کتاب بند کرتے ہوئے رافع کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ جہاں ندامت یا احساسِ جرم کا کوئی تاثر نہیں تھا۔

”پاپا! نبیل ایک بدتمیز لڑکا ہے۔ آئے دن کسی نا کسی کو تنگ کرتا رہتا ہے۔ میرے بیگ سے بھی کئی بار چیزیں نکال کر خراب کر چکا ہے۔ مجھ سے اور شان سے اسے نہ جانے کیا تکلیف ہے۔ بہت بار اسے سمجھایا بھی مگر وہ باز ہی نہیں آ رہا تھا۔ میڈم سے بھی شکایت کی مگر انہوں نے بھی کوئی خاص ایکشن نہیں لیا۔ کل جب اس نے شان کا بیگ اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینکا، تو شان نے پوچھا ”کیوں پھینکا“ تو الٹا شان کو مارنے لگا۔ میں شان کو بچانے لگا تو اس نے مجھے بھی مارنے کی کوشش کی، میں نے اپنے بچاؤ کے لیے ہاتھ چلایا تو میرا مُکا اس کی ناک پر لگا اور اس کا سر ڈیسک کے کونے پر جا لگا۔ اس کی ناک اور سر سے خون بہنے لگا۔ اسی وقت میڈم آ گئیں پھر یہ بات آپ لوگوں تک پہنچ گئی۔“ رافع نے پورا واقعہ من و عن تفصیل سے بیان کر دیا۔

”ہمم...... اس ساری صورتِ حال پر آپ کا قانون کیا کہتا ہے وکیل صاحبہ؟“ فاروق احمد نے کتاب سامنے رکھی چھوٹی سی میز پر رکھی اور قمرالنساء کی طرف استفسار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”بیٹا! آپ اپنے کمرے میں جائیں۔“ قمرالنساء نے رافع کو کہا اور پھر فاروق احمد سے گویا ہوئیں۔

"مجھے نہیں لگتا، میڈم اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کریں گی جو انہوں نے پہلے سے کر رکھا ہوگا۔ نبیل اسکول کے سب سے بڑے ڈونر کا بیٹا ہے۔ اُن پر شدید دباؤ ہوگا۔ آپ رافع کے لیے دوسرا اسکول ڈھونڈ لیں۔"

فاروق احمد کے چہرے پر فکرمندی کی سلوٹیں نمایاں ہوگئیں لیکن وہ اندر سے مطمئن بھی تھے کہ یہ سب ہونے والا تھا۔ ویسے بھی انہیں بہت جلد دوسرے شہر جانے کا پروانہ ملنے والا تھا۔ لیکن قدرت کے کچھ فیصلے ایسے ہوتے ہیں، جو ازل سے ہی انسان کی قسمت میں لکھ دیے جاتے ہیں۔ جن کا بدلنا انسان کے بس میں نہیں ہوتا۔ ایسا ہی ایک فیصلہ موت کا بھی ہے، جو کبھی کہیں بھی صادر ہو سکتا ہے اور یہ فیصلہ فاروق احمد کے لیے صادر ہو چکا تھا۔ دوسرے دن جب فاروق احمد آفس کے لیے گھر سے نکلے، نامعلوم سمت سے آنے والی گولی نے اس فیصلے پر نوٹ کے ساتھ دستخط بھی کر دیئے اور وہ ہو کر رہا، جو ازل سے ان کی کتابِ زیست میں لکھا جا چکا تھا۔

☆☆☆

امریکا کے شہر شکاگو کے نواح میں واقع ایک فیکٹری کی لیبارٹری میں جشن کا سا سماں تھا۔ لیبارٹری میں موجود ہر شخص کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ بیوٹی اینڈ بیوٹی کمپنی کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر سمیت تمام افسران حال ہی میں ہونے والے ایک کامیاب تجربے پر خوشیاں منانے یہاں جمع ہوئے تھے۔ جن تین خواتین پر تجربہ کیا گیا تھا، وہ بھی اس جشن میں شریک تھیں۔ ان کی عمریں پچاس سے پچپن سال کے درمیان تھیں۔ ہر زبان پر ان کی خوبصورتی کی تعریف تھی۔ جسے سن کر وہ پھولے نہیں سما رہی تھیں۔ اس مختصر سے جشن میں بیس کے قریب افراد مدعو تھے۔ کھانے کے بعد سب شراب نوشی سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ اچانک ایک آواز نے سب کی توجہ اپنی جانب مبذول کرالی۔

"تمام دوستوں کو کامیابی کی بہت بہت مبارکباد! دوستو...... ! یہ تجربہ ہماری کامیابی کی ابتدا ہے، بہتر نتائج کے لیے ہمیں بہت کچھ کرنا ہے۔ یہ آسان نہیں ہوگا۔ جن ممالک سے ہم نے تجربے کے لیے سیمپل حاصل کیے، ان میں عراق، ایران اور پاکستان شامل تھے۔ پاکستان سے حاصل کیے گئے سیمپل کا رزلٹ مسز لوسی کی شکل میں سب کے سامنے ہے۔" یہ آواز کمپنی کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر کی تھی۔ غیر ملکی لہجہ مگر شائستہ انگریزی میں بولے جانے والے

کروڑپتی

اخباری نمائندے نے انٹرویو کے دوران میں ایک کروڑپتی سے پوچھا۔

"فارغ وقت میں آپ کے کیا مشاغل ہیں؟"

"پینٹنگ۔" کروڑپتی نے جواب دیا۔ "فارغ وقت میں، میں پینٹنگ کرتا ہوں۔ اپنے بنگلے کے سارے دروازے، کھڑکیاں اور گیٹ میں نے خود پینٹ کیے ہیں۔"

کراچی سے امتیاز احمد کا فخر

گھڑی

ایک دفتر کا مالک انشورنس ایجنٹ کو بتا رہا تھا کہ اس نے گھڑی کے علاوہ تمام چیزوں کا بیمہ کروالیا ہے۔

ایجنٹ نے پوچھا۔ "گھڑی کا بیمہ کیوں نہیں کروایا؟"

مالک بولا۔ "گھڑی چوری نہیں ہو سکتی کیونکہ یہاں کام کرنے والے ہر آدمی کی نظر گھڑی پر ہی ہوتی ہے۔"

ایجنٹ نے پھر پوچھا۔ "لیکن لنچ کے وقت تو وہ چوری ہو سکتی ہے۔"

مالک بولا۔ "نہیں لنچ کے وقت میری نظر گھڑی پر ہوتی ہے۔"

پنجاب سے اکرم مپال کی عقل مندی

الفاظ کے ساتھ ہی لیبارٹری تالیوں سے گونج اٹھی۔ سب کی نظریں تعریفی انداز میں مسز لوسی پر مرکوز ہوگئیں۔

"اس رزلٹ کو دیکھتے ہوئے، یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ پاکستان میں ہم اپنی این جی او کو منظم کریں گے۔ اس سلسلے میں وہاں کے بااختیار اور قابل لوگوں کو پہلے ہی اپنی ٹیم میں شامل کر لیا گیا ہے۔ پاکستان میں سب کاموں کی نگرانی میں خود کروں گا۔ کیونکہ پاکستان ہی واحد ملک ہے جہاں ہم اپنا ٹارگٹ آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں۔ دیکھنا دوستو! ہماری یہ پروڈکٹ پوری دنیا میں دھوم مچا دے گی۔" یہ کہہ کر ایگزیکٹو ڈائریکٹر نے اپنے ہاتھ میں تھامے ریموٹ کا ایک بٹن دبا دیا۔ بٹن دبتے ہی سامنے لگی ایل ای ڈی روشن ہوگئی اور بیوٹی اینڈ بیوٹی کمپنی کی ایک بیوٹی

کریم کا اشتہار چلنا شروع ہوگیا۔ جس میں دکھایا جارہا تھا کہ بیوٹی اینڈ بیوٹی کمپنی کی تہلکہ مچادینے والی پروڈکٹ کس طرح اپنا کام کرتی ہے۔ مہینوں کا رزلٹ دنوں میں ہی کیسے نظر آتا ہے۔ اشتہار ختم ہوتے ہیں لیبارٹری کا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

☆☆☆

وہ دسمبر کی ایک ٹھٹھرتی ہوئی رات تھی۔ جو آہستہ آہستہ دھند میں لپٹی سحر کی جانب بڑھ رہی تھی۔ صبح کے چار بجنے والے تھے۔ شہر قائد کے ایک مکان میں رخسانہ ایسے مراحل سے گزر رہی تھی جس کی تکمیل پر خدا نے عورت کے قدموں تلے جنت رکھ دینے کا وعدہ کیا ہے۔ محلے کی تجربہ کار دائی شریفاں اپنے کام میں مصروف تھی۔ پڑوس کی دو عورتیں چارپائی کے سرہانے کھڑی رخسانہ کے ہاتھ پکڑے حوصلے اور صبر کی تلقین کررہی تھیں۔ کمرے کے باہر رخسانہ کا شوہر عتیق اور پانچ سالہ معذور بیٹا نادر چارپائی پر بیٹھے تھے۔ نادر اپنی ماں کی آہیں سن کر، سہم جاتا اور باپ کے سینے سے لگ جاتا۔ رخسانہ کی آہیں اب ہلکی ہلکی چیخوں میں بدل گئی تھیں۔ اور پھر ایک زوردار چیخ کے ساتھ کمرے سے ایک نومولود کے رونے کی آواز سنائی دی۔ رخسانہ کی چیخیں مدھم ہوتی چلی گئیں۔

”رخسانہ مبارک ہو بیٹی ہوئی ہے۔ ماشاء اللہ بہت پیاری اور صحت مند ہے۔“ دائی نے بچی کو جلدی جلدی صاف کر کے رخسانہ کے پہلو میں لٹاتے ہوئے کہا اور پھر اپنے کام کو جلدی جلدی نمٹانے لگی۔

رخسانہ کی نظر جب روتی ہوئی بیٹی کے چہرے پر پڑی تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ایک ماں کی پوری زندگی میں بس یہی ایک لمحہ ہوتا ہے، جب وہ اپنی اولاد کو روتا ہوا دیکھ کر مسکراتی ہے۔ پچھلی تمام تکلیفیں بھول کر ”میری بیٹی فریال“ کہہ کر رخسانہ نے بیٹی کو سینے سے لگا لیا۔ رخسانہ نے پہلے ہی سوچ لیا تھا، اگر اس کی بیٹی ہوئی تو اس کا نام فریال رکھے گی۔ ان کا پہلا بچہ نادر دو سال کی عمر میں پولیو جیسے مہلک مرض میں مبتلا ہو کے ایک ٹانگ سے ہمیشہ کے لیے معذور ہو گیا۔ دوسری بار جب رخسانہ نے اپنے امید سے ہونے کی خوشخبری عتیق کو سنائی، اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔ پورے پانچ سال بعد اس کے آنگن میں کوئی کلی کھلی تھی۔

جب کمرے میں خاموشی چھا گئی تو عتیق نادر کو گود میں لے کر اٹھا اور دروازے کے پاس آ گیا۔

”باجی شریفاں! نادر کو اندر لے آؤں؟ باہر سردی بہت ہو گئی ہے۔“ عتیق دروازے کی اوٹ سے دائی شریفاں سے مخاطب ہوا۔ حالانکہ اندر جانے کے لیے وہ خود بے چین تھا۔

”ہاں لے آئیں صاحب۔“ دائی نے جواب دے کر رخسانہ پر لحاف ڈال دیا۔ وہ اپنا کام پورا کر چکی تھی۔ باقی دونوں عورتیں بھی اب سامنے آکر کھڑی ہو گئی تھیں۔

”باجی اب ہم چلتے ہیں۔ دوپہر میں چکر لگا لیں گے۔“ عتیق کو اندر آتا دیکھ کر ایک عورت نے کہا۔

”ٹھیک ہے بہن! ویسے بھی شریفاں ہے میرے پاس۔ صبح ماسی نرگس بھی آجائے گی۔ تم لوگوں کا احسان ہے، جو اس مشکل گھڑی میں میرا ساتھ دیا۔ اب تم لوگ بھی جا کر آرام کرو۔“ رخسانہ نے کہا اور عتیق کی طرف دیکھنے لگی جو نادر کو بیڈ پر بٹھا کر اس کی چارپائی کے پاس آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ پھر رخسانہ مسکرا کر نادر کو دیکھنے لگی جو اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دونوں عورتیں چلی گئیں۔ عتیق نے چھوٹی سی فریال کو گود میں لے کر پیار کیا اور رخسانہ کا ہاتھ پکڑ کے چارپائی کی پٹی پر بیٹھ گیا۔ دونوں کی نگاہوں میں ایک دوسرے کے لیے بے پناہ پیار تھا۔

”تم ٹھیک ہو نا؟“ عتیق نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ عتیق کے منہ سے اطمینان بھری سانس خارج ہوئی اور اس نے رخسانہ کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

دائی شریفاں نے اپنا بستر چارپائی کے قریب لگا دیا۔ بستر بچھا کر رخسانہ کا سر دبانے لگی۔ عتیق نے فریال کو پیار کر کے رخسانہ کے پہلو میں لٹا دیا اور خود نادر کے پاس آ کر رخسانہ کی طرف کروٹ لے کر لیٹ گیا۔

☆☆☆

وقت کا پکھیرو اُڑتا ہے تو پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا۔ اس کی راہ متعین ہے، وہ اُڑتا چلا جاتا ہے۔ اس کی کوئی منزل نہیں مگر اپنے پیچھے نہ جانے کتنی منزلیں چھوڑ جاتا ہے۔

شہر کے رہائشی علاقے میں زیر تعمیر پلازا جس کی پچھلی جانب رکھی چارپائی پر بیٹھے، دو لڑکے چرس سے بھری سگریٹ کا دھواں بگولوں کی صورت میں منہ سے چھوڑ رہے تھے۔ یہ لڑکے پچھلے کئی دنوں سے اہل محلہ کے لیے وبالِ جان بنے ہوئے تھے۔ جب سے پلازا تعمیر ہونا شروع ہوا تھا، تب سے ہی انہوں نے یہاں ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ آج ایک بزرگ نے ہمت کی اور ان کے پاس جا پہنچے۔

''بیٹا اگر یہی سب کچھ کرنا ہے، تو کسی ویرانے میں جا کے کرو۔ یہاں سے شریف لوگوں کی مائیں، بہنیں اور بچے گزرتے ہیں، ان پر بُرا اثر پڑتا ہے۔'' بزرگ نے اتنا ہی کہا تھا کہ دونوں لڑکے اٹھ کر بزرگ کے قریب آ گئے۔ ایک نے بزرگ کا گریبان پکڑ لیا......

''او بڈھے! اپنے بچوں کا اتنا ہی خیال ہے تو انہیں کہہ دے، یہاں سے مت گزرا کریں، سمجھے!'' لڑکے نے گریبان جھٹکے سے چھوڑتے ہوئے کہا۔

''شرم نہیں آتی اپنے باپ کی عمر......'' بزرگ نے اتنا ہی کہا تھا کہ پاس کھڑے دوسرے لڑکے نے بزرگ کو تھپڑ رسید کر دیا۔ پہلے والے لڑکے نے بزرگ کو لات ماری جس سے وہ زمین پر گر پڑے۔ دونوں لڑکے بزرگ کی حالت دیکھ کر قہقہے لگانے لگے۔

یہ سارا منظر روڈ کے کنارے کھڑا رافع دیکھ رہا تھا۔ اس نے تیزی سے اپنی بائیک کا رخ ان کی طرف کر دیا۔ وہ ٹیوشن سینٹر سے گھر لوٹ رہا تھا۔ شام کے وقت یہ لڑکے اکثر اسے یہاں نظر آتے تھے۔ جو بے فکری سے چرس پیتے اور آتی جاتی خواتین پر جملے کستے تھے۔ رافع نے قریب پہنچ کر بزرگ کو اٹھایا اور ان کے کپڑے صاف کرنے لگا۔

''انکل آپ کو لگی تو نہیں؟'' رافع نے بزرگ کو اپنی بائیک کے ساتھ کھڑے کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں...... نہیں بیٹا میں ٹھیک ہوں۔'' بزرگ کے لہجے میں بے بسی نمایاں تھی۔

رافع نے بزرگ کی بات سن کر جب سامنے دیکھا۔ وہ دونوں لڑکے اپنی قمیصوں کے کالر کھڑے کیے، اس کی جانب ہی دیکھ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ابھی بھی سگریٹیں دبی ہوئی تھیں۔ آس پاس کی دکانوں سے بھی کچھ لوگ نکل کر یہ سب تماشا دیکھ رہے تھے۔ رافع کو ان کی بے حسی پر غصہ آ رہا تھا۔ جو ایک بزرگ کو ذلیل ہوتا دیکھ کر بھی بُتوں کی طرح خاموش کھڑے تھے۔ رافع دونوں لڑکوں میں سے ایک کو جانتا تھا۔ وہ ملک کی ایک بڑی سیاسی جماعت کے عہدے دار کا بیٹا تھا۔ جب کہ دوسرا اجنبی تھا۔ رافع نے ایک نظر ان پر ڈالی، جو اَب اسے ہی گھور رہے تھے۔ بزرگ کی موجودگی میں وہ کوئی جھگڑا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چپ چاپ اس نے بائیک اسٹارٹ کی اور بزرگ کو ان کے گھر چھوڑ کر، اپنے گھر کی طرف جانے والی سڑک پر دوبارہ آ گیا۔ اس کے دماغ میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ مظلوم کو بے بس دیکھ کر ہی ظالم کی ہمت بڑھتی ہے۔

امید

ایڈیٹر۔ ''کیا یہ وہی کہانی نہیں جسے میں نے تین سال پہلے ناقابلِ اشاعت قرار دیا تھا؟''

مصنف۔ ''جی ہاں۔''

ایڈیٹر۔ ''تو پھر آپ اسے دوبارہ کیوں لے آئے ہیں؟''

مصنف۔ ''میں نے سوچا شاید تین سال میں آپ کو کچھ عقل آ گئی ہو۔''

ساہیوال سے عمار اقبال کا جواب

جھوٹ

ایڈیٹر (افسانہ نگار سے)۔ ''آپ بہت خوب صورت کہانیاں لکھتے ہیں۔''

افسانہ نگار۔ ''کاش اسی قسم کا کوئی تعریفی جملہ میں بھی آپ کے بارے میں کہہ سکتا......'' اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

ایڈیٹر۔ ''ضرور کہہ سکتے ہیں بشرطیکہ آپ بھی میری طرح جھوٹ بولنے کے عادی ہوں۔''

بلندی

پرواز کے دوران میں طیارے کے انجن میں آگ لگ گئی۔ پائلٹ نے قریبی کنٹرول ٹاور سے مدد حاصل کرنے کے لیے ریڈیو ٹرانسمیٹر آن کر دیا اور چیخ چیخ کر یہ الفاظ دہرائے۔

''مے ڈے...... مے ڈے طیارے کے انجن میں آگ لگ چکی ہے۔''

''اپنی بلندی اور پوزیشن بتاؤ۔'' کنٹرول ٹاور سے فوری پوچھا گیا۔

''میں پانچ فٹ آٹھ انچ لمبا ہوں اور اس وقت کاک پٹ میں ہوں۔'' پریشان حال پائلٹ نے بھی تیزی سے جواب دیا۔

ویٹ پلیز

ایک صاحب ہوائی جہاز میں سوار ہونے جا رہے تھے۔ جب انہوں نے سیڑھیوں پر قدم رکھا تو ائر ہوسٹس نے رکنے کے لیے کہا۔

''ویٹ پلیز۔''

انہوں نے برجستہ جواب دیا۔ ''ایک سو ساٹھ پاؤنڈ۔''

حافظ آباد سے بشریٰ افضل کا تعاون

جوں جوں ظالم کی ہمت بڑھتی ہے، مظلوم ذلت کے گڑھے میں گرتا چلا جاتا ہے۔ کبھی بھی خود کو ظالم کے سامنے بے بس نہیں سمجھنا، کیونکہ تمہاری بے بسی اسے زندہ رکھتی ہے ورنہ ظلم ایک دن ظالم کے ساتھ نیست و نابود ہو جانے کے لیے ہے۔ فاروق احمد کے قتل کے بعد بھی قمر النساء نے رافع کی تربیت انہی خطوط پر کی تھی۔ جس پر عمل کرتے ہوئے ان کے شوہر نے اپنی جان دی تھی۔ رافع کی رگوں میں آج بھی وہی تربیت خون بن کر دوڑ رہی تھی۔ رافع نے سوچ لیا تھا، وہ ان لڑکوں کو سبق سکھا کر ہی رہے گا۔

☆☆☆

اس واقعے کے بعد رافع روز ٹیوشن سینٹر سے واپسی پر تھوڑی دیر یہاں رکتا، ایک نظر اس جگہ کو دیکھتا جہاں وہ لڑکے بیٹھا کرتے تھے مگر ایک ہفتے سے کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ آج شام چائے پی کر وہ جیسے ہی پڑھنے کے لیے بیٹھا تو ماں کی آواز سن کر اپنے کمرے سے نکلا۔

”رافع بیٹا! مارکیٹ سے میرا گاؤن تو لے آؤ۔“ قمر النساء نے ایک رسید دیتے ہوئے کہا۔

”جی ماما۔“ رافع نے رسید جیب میں ڈالی اور بائیک نکال کر بازار کی جانب چل دیا۔ جیسے ہی پلازا کے پاس پہنچا، فضا میں چرس کی بُو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ زور زور سے ہنسنے کی آوازوں نے رافع کو رکنے پر مجبور کر دیا۔ اس کا خون جوش مارنے لگا۔ رافع نے دیکھا اب وہاں پانچ لڑکے بیٹھے تھے اور ایک دوسرے سے مذاق کے ساتھ ساتھ بے پروائی سے چرس کا دھواں بھی اُگل رہے تھے۔ راستے سے گزرنے والا محلے کا ہر شخص ایک نظر ان پر ڈالتا، منہ بناتا اور چپ چاپ گزر جاتا۔ پلازا دو منزلہ بن چکا تھا اور اس کے چاروں طرف پارٹی کے جھنڈوں کے ساتھ مختلف رنگوں کے جھنڈے بھی لگے ہوئے تھے۔ پلازے کے پچھلی جانب محلے کی گلیاں تھیں۔ یہ محفلِ بدتمیز پلازے کی اسی جانب جمتی تھی جہاں بچوں کا پارک بنا تھا۔ لڑکے اس بات سے بے خبر چرس کے سگریٹ بنانے میں مصروف تھے کہ دو آنکھیں انہیں مسلسل گھور رہی ہیں۔ رافع کے دماغ میں بزرگ والے واقعے کے بعد ایک عجیب سی کشمکش جاری تھی۔ وہ اکثر سوچتا کہ یہ دادا گیر لوگ اور ان کی اولادیں معاشرے کا ناسور ہیں۔ ان کو ختم کر دینا چاہیے۔ وہ اس ناسور کو جڑ سے اکھاڑ دینا چاہتا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ بزرگ کو مارنے والے دونوں لڑکوں کو جان سے مار دے۔ تاکہ اہلِ محلہ کی آنے والی نسل ان کے شر سے محفوظ رہے۔ مگر اپنی ماں اور چھوٹے بھائی کی وجہ سے دل اور دماغ کو ٹھنڈا کر لیتا تھا۔ اچانک اس نے ایک آٹھ نو سالہ بچے کو اس جگہ پر ٹھٹک کر رکتے ہوئے دیکھا جہاں لڑکوں کی محفل جمی ہوئی تھی۔ بچے کے ہاتھ میں تھیلی تھی۔ رافع نے بچے کو ڈرتے ڈرتے ان لوگوں کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ بچے کو لڑکوں نے آواز دے کر بلایا تھا۔

رافع کو ایسا لگا، جیسے اس کا سارا خون اس کے دماغ میں جمع ہو گیا ہے۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی، کچھ ہونے والا ہے۔ رافع نے جلدی سے بائیک ان لڑکوں کے سامنے لا کر روک دی۔ لڑکے بچے سے تھیلی چھین کر اس میں سے سموسے نکال کر کھا رہے تھے۔ بچہ پاس کھڑا رو رہا تھا۔ رافع بائیک سے اترا اور لڑکوں کے سامنے جا پہنچا۔

”کیا ہے بے! کیا دیکھ رہا ہے؟ چل اپنا کام کر!“ ایک لڑکے نے رافع کو سامنے کھڑا دیکھا تو ہاتھ کا اشارہ کر کے جانے کو کہا اور سموسہ کھانے لگا۔

”بچے کو کیوں تنگ کر رہے ہو......؟“ ”شرم نہیں آتی، بچوں اور بزرگوں کو تنگ کرتے ہو، بڑے باپ کی اولاد ہو تو کیا غریب لوگوں کا جینا محال کرو گے؟“ رافع کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور غصے سے چہرہ لال ہو رہا تھا۔ یہ سن کر ایک لڑکا اٹھا اور رافع کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ رافع نے تھپڑ کھا کر اپنا منہ سیدھا کیا اور ایک زوردار مکا تھپڑ مارنے والے لڑکے کی ناک پر دے مارا۔ لڑکا لڑکھڑا کر اینٹوں کے ڈھیر پر جا گرا۔ دوسرے لڑکوں نے جب یہ دیکھا تو وہ رافع پر پل پڑے۔ بچہ روتا ہوا بھاگ گیا۔ رافع لاتیں اور مکے کھا رہا تھا مگر وہ موقع کی تلاش میں تھا کہ کسی طرح کوئی چیز اس کے ہاتھ میں آ جائے۔ پھر وہ موقع اسے مل گیا۔ جب اینٹوں پر گرے لڑکے نے اٹھ کر ایک زوردار لات رافع کے پیٹ پر ماری تو وہ کنارے پر بنی کیاری پر جا گرا اور کیاری کے قریب لگی اینٹ اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ وہ پھرتی سے اٹھا، اینٹ سامنے کھڑے لڑکے کے سر پر دے ماری۔ وہ لڑکا وہیں گر کر بے ہوش ہو گیا۔ پھر رافع نے وہی اینٹ ایک اور لڑکے کو مارنا چاہی، مگر پیچھے سے ایک لڑکے نے لوہے کی موٹی سی سلاخ اس کے سر کے پچھلے حصے میں ماری، رافع وہیں لہرا کر گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔ یہ سلاخ مارنا ہی اس لڑکے کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی جس کا انجام بہت برا ہونے والا تھا۔

☆☆☆

بیوہ ہونے کا صدمہ کسی بھی عورت کے لیے کم نہیں

ہوتا۔ یہ دکھ اُس وقت اور بھی اذیت ناک ہو جاتا ہے جب سسرال اور میکے دونوں میں کوئی ساتھ بھی نہ ہو۔ عورت کے لیے یہ حالات اسے توڑ دینے کے لیے کافی ہوتے ہیں مگر قمر النساء ایک حوصلہ مند خاتون تھیں۔ انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ اپنے بچوں کے لیے کمر کس کر زندگی کے میدان میں اتر آئیں۔ اپنی وکالت جاری رکھی اور بچوں کی پرورش میں کوئی کمی نہیں آنے دی۔ اب رافع بھی انٹر کر چکا تھا۔ پڑھائی میں ہوشیار تھا۔ ایک ٹیوشن سینٹر میں پڑھانے لگا تھا۔ قمر النساء رافع پر خصوصی توجہ دیتی تھیں۔ کیونکہ رافع میں انہیں فاروق احمد کی جھلک نظر آتی تھی۔ وہی رکھ رکھاؤ، وہی غصہ، وہی طنطنہ مگر انتہائی مخلص، ایماندار اور اصولوں پر قائم رہنے والا، کسی کو تکلیف میں نہ دیکھنے والا۔ جب حماد پیدا ہوا تھا، رافع نے ہی گھر سنبھالا تھا۔ حالانکہ وہ اس وقت دس سال کا تھا۔

رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ رافع کو انہوں نے شام کو بازار بھیجا تھا۔ وہ ابھی تک لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ وہ موبائل بھی گھر ہی چھوڑ کر گیا تھا۔ انہوں نے ٹیوشن سینٹر اور دو دوستوں کو کال کر کے پوچھ لیا مگر رافع کہیں بھی نہیں تھا۔ جب ممتا کی بے قراری حد سے بڑھ گئی، تو انہوں نے اپنے ایک کولیگ سے رابطہ کرنے کا سوچا۔

”سوری ریاض! آپ کو اس وقت تکلیف دے رہی ہوں۔ بات دراصل یہ ہے، میں نے رافع کو بازار بھیجا تھا۔ وہ ابھی تک گھر نہیں پہنچا اور اس کا موبائل بھی گھر پر ہی ہے۔“ بات کرتے کرتے قمر النساء کی آواز رُندھ گئی تھی۔

”آپا! آپ فکر مت کریں۔ میں پتا کرتا ہوں۔ آپ مجھے اس کے دوستوں اور جہاں جہاں وہ جا سکتا ہے، نمبر اور ایڈریس سینڈ کریں۔ آپ پریشان مت ہوں سب ٹھیک ہوگا۔“ ریاض نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

”بہت شکریہ ریاض! ٹیوشن سینٹر اور ایک دو دوستوں سے تو میں پوچھ چکی ہوں مگر وہ وہاں نہیں ہے۔ اللہ پاک میرے بچے کی حفاظت کرے۔ آپ دوسری جگہوں پر چیک کریں۔“ قمر النساء اسپتال کہتے ہوئے لرز رہی تھیں۔

”جی آپا! میں ابھی نکلتا ہوں۔“ ریاض سمجھ گیا تھا، قمر النساء کیا کہنا چاہ رہی ہیں۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد ہی قمر النساء کو رافع کی خیریت کی اطلاع مل گئی۔ وہ زخمی حالت میں پولیس کی حراست میں تھا اور اس کے خلاف اقدامِ قتل کی ایف آئی آر کاٹی جا چکی تھی۔

☆☆☆

رافع کو جب ہوش آیا تو وہ ایک ہال نما کمرے میں تھا۔ کچھ دیر تو اسے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے مگر پھر سب یاد آتا چلا گیا۔ اس کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ اس نے اپنا سر ہاتھوں سے دبانا چاہا مگر اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ وہ ایک دم چونک گیا۔ اس نے اپنی دائیں طرف دیکھا تو ایک پولیس کانسٹیبل کھڑا اسے گھور رہا تھا۔ رافع نے جب سارے ماحول کا جائزہ لیا تو پتا چلا، وہ پولیس کی حراست میں ہے اور وہ جس جگہ موجود ہے وہ کوئی اسپتال نہیں، ایک چھوٹا سا ہال ہے جسے اسپتال کے وارڈ کی شکل دے دی تھی۔ اس کے دائیں بائیں دو پیلے بلب جل رہے تھے۔ اس کے بیڈ کے ساتھ دو بیڈ اور بھی تھے، جو خالی تھے۔ کسی نے اس کے بیڈ کو بجایا تو وہ ایک دم چونک گیا۔ اس نے جب سامنے دیکھا تو ایک کانسٹیبل اپنی گن سے اس کا بیڈ بجا رہا تھا۔

”ہوش آگیا...... چل تیار ہو جا۔ تیری تیارداری بھی کرنی ہے۔ بڑی اکڑ ہے تیرے اندر۔ بڑے لوگوں کے بچوں کو جان سے مارنے چلا تھا۔ ہاں......! ساری اکڑ نکالتے ہیں تیری، بس ڈاکٹر آجائے۔“ کانسٹیبل رافع کو گھورتا ہوا بولا۔ اس سے پہلے رافع کوئی جواب دیتا۔ ایک اے ایس آئی اور کانسٹیبل وارڈ میں داخل ہوئے اور رافع کے بیڈ کے پاس آکر کھڑے ہو گئے۔ اُن کے پیچھے پیچھے ڈاکٹر بھی آگیا۔ ڈاکٹر نے رافع کا چیک اَپ کیا اور پولیس والوں کو اسے لے جانے کی اجازت دے دی۔ تھانے پہنچنے سے پہلے ہی رافع کے خلاف اقدامِ قتل کی ایف آئی آر کاٹی جا چکی تھی۔ ہتھکڑی لگے جب رافع نے تھانے میں قدم رکھا، سامنے ہی ریاض احمد کو بیٹھے دیکھا۔ وہ فوراً اس کے پاس پہنچے۔

”بیٹا فکر مت کرنا! سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ ریاض اس کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ریاض... ایف آئی آر دیکھ چکا تھا۔ اسے پتا تھا یہ سب جھوٹ ہے۔ یہ ایف آئی آر کس کے کہنے پر کاٹی گئی ہے، یہ بھی ریاض احمد نے پتا کر لیا تھا۔ رافع نے اثبات میں سر ہلایا تو ساتھ کھڑے کانسٹیبل نے اسے جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔

”چلیں وکیل صاحب! اب جو ہوگا، عدالت میں ہوگا وہیں سب باتیں کر لیجیے گا۔ چل اوئے......!“ آخری لفظ کہہ کر کانسٹبل نے رافع کو حوالات میں دھکیل دیا۔

☆☆☆

پوش علاقے کے ایک بنگلے کے کمرے میں گمبھیر

خاموشی طاری تھی۔ ائرکنڈیشن چلنے کی ہلکی آواز بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ کمرے کے وسط میں رکھی بیضوی میز کے ایک جانب ملک کی مایہ ناز گائنا کالوجسٹ ریحانہ اختر بیٹھی تھیں۔ ساٹھ سال کی عمر میں بھی چاق و چوبند، چھریرا بدن اور نفیس سی عینک ناک پر لگائے سامنے رکھی فائل کو گھور رہی تھیں۔ ان کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر شخص بیٹھا تھا۔ سرخ و سپید رنگت، سر کا درمیانی حصہ بالوں سے بے نیاز، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، ستواں ناک اور موٹے ہونٹوں کے اوپر گھری اور سخت مونچھیں جو ہلکے ہلکے لرز رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی اضطرابی کیفیت میں ہے۔ یہ امریکا کی سرپرستی میں چلنے والی خواتین کی بہبود کی عالمی این جی او کا سربراہ ناظمی العبادی تھا۔ جو خاص طور اس میٹنگ میں شرکت کے لیے پاکستان آیا تھا۔ اور این جی او کے مقاصد پورے ہونے تک اسے پاکستان میں قیام کرنا تھا۔ اس کے سامنے والی کرسی خالی تھی۔ جبکہ میز کی صدارتی کرسی پر تھری پیس میں ملبوس، امریکا کی مشہور کاسمیٹک بیوٹی اینڈ بیوٹی کمپنی کا ایم ڈی رابرٹ براجمان تھا۔ جس کے چہرے پر غصے اور انتظار کی ملی جلی کیفیت تھی۔ وہ ہاتھ میں پکڑے پین کو بار بار گھوما رہا تھا۔ اور سامنے دیوار پر لگی گھڑی کو دیکھ کر پہلو بدل رہا تھا۔ انہیں کسی کا انتظار تھا۔ جو ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ اسی اثنا میں کمرے کا واحد دروازہ کھلا اور شلوار قمیص میں ملبوس ایک شخص اندر داخل ہوا۔ یہ رستم شاہ تھا۔ جس کا اثر و رسوخ اعلیٰ حکام اور حکومت میں موجود وزرا، ایم این اے اور ایم پی اے تک تھا۔

سب نے چونک کر اسے دیکھا اور سنبھل کر بیٹھ گئے۔

”سوری! مجھے دیر ہوگئی۔“ رستم شاہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں رابرٹ کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

رابرٹ نے ایک نظر اسے دیکھا اور سامنے رکھی فائل کو کھول کر دیکھنے لگا۔ چند لمحوں بعد اس نے ہنکارا بھرا اور گمبھیر لہجے میں بولنا شروع کیا۔

”اب وقت آگیا ہے، ہم اپنے کام کی رفتار تیز کردیں۔ آغاز تو ہم نے آٹھ سال پہلے ہی کردیا تھا۔ مسٹر شاہ کی جدوجہد سے اسپتال کے لیے زمین پہلے ہی حاصل کر لی گئی تھی۔ اب وہ اسپتال مسز ریحانہ کی کوششوں سے اپنا مقام بنا چکا ہے۔ مسٹر ناظمی......“ رابرٹ نے فائل سے نظر اٹھا کر ناظمی العبادی کی طرف دیکھا پھر گویا ہوا۔ ”رپورٹس کے مطابق آپ کا ابھی تک کا کام بہترین رہا لیکن عراق کی موجودہ صورت حال اب ہمارے کام کے لیے موزوں نہیں رہی، وہاں ہم کھل کر کام نہیں کر سکتے۔ اس لیے فیصلہ یہ ہوا کہ پاکستان میں اپنے نیٹ ورک کو ترجیحی بنیادوں پر جلد از جلد اور بہتر کریں۔ جو سیمپل پاکستان سے ہماری لیبارٹری پہنچ رہے ہیں، ان کا رزلٹ بہترین جا رہا ہے۔ آپ کو بلوانے کا مقصد یہی اطلاع دینا تھا کہ اب ہمارے کام کو پاکستان میں ڈاکٹر ریحانہ اور مسٹر شاہ دیکھیں گے۔ آپ ان کا پاکستان میں ساتھ دیں گے اور باقاعدہ ہمارے نیٹ ورک کا حصہ رہیں گے۔“ رابرٹ نے رستم شاہ کی معذرت کو نظرانداز کرتے ہوئے بات شروع کردی۔

”یس سر۔“ ناظمی العبادی نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

”مسز ریحانہ! آپ کو اپنے تمام یونٹ ہنگامی طور پر فعال کرنے ہوں گے۔ این جی او میں ہمارا عملہ بھرتی کریں اور کام کو تیز کردیں۔“ رابرٹ، ڈاکٹر ریحانہ اختر کی طرف اپنی کرسی گھماتے ہوئے بولا۔

”مسٹر رابرٹ! یہ کام میں پہلے ہی شروع کر چکی ہوں۔ بس آپ کی جانب سے اجازت کی ضرورت تھی۔“ ڈاکٹر ریحانہ نے سامنے رکھی فائل رابرٹ کی جانب سرکا دی۔

”گڈ ورک ڈاکٹر ریحانہ! اور مسٹر شاہ آپ ان کو ہر محاذ اور ہر جگہ این جی او کو سپورٹ کریں گے۔ جیسا کہ آپ کرتے آئے ہیں۔ آپ کی ذمے داری بہت اہم ہے۔ آپ کی کارکردگی ہمارے کام کے لیے بہت اہمیت کی حامل ہے۔ باقی تفصیلات سے مسٹر ناظمی آگاہ کردیں گے۔“ رابرٹ نے آخری میں رستم شاہ کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

”اور آج سے آپ لوگوں کا ہیڈ کوارٹر یہ ہی بنگلا ہو گا۔ اسی بنگلے سے مجھے رپورٹس امریکا دی جائیں گی۔“ رابرٹ نے ایک سانس لیا اور پھر اٹھتے ہوئے بولا۔ ”باقی معاملات آپ لوگ حالات دیکھ کر طے کر سکتے ہیں۔ ہماری کمپنی کو بس ہر ماہ اپنا ٹارگٹ مکمل کرنا ہے۔ کیونکہ ہماری پروڈکٹ کی مانگ پوری دنیا میں بڑھتی جا رہی ہے۔ اب میری فلائٹ کا وقت ہونے والا ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔ بیسٹ آف لک۔“ رابرٹ نے باری باری تینوں سے ہاتھ ملایا اور کمرے سے نکل گیا۔

☆☆☆

ایس ایچ او فتح ملک یونیفارم میں نہ بھی ہوتا تو دور سے

ہی پہچان لیا جاتا تھا کہ یہ پولیس والا ہے۔ بے ڈول جسم، باہر نکلی ہوئی مٹکے جیسی توند جو حرام کی کمائی کا دور سے ہی ڈھول پیٹتی دکھائی دیتی تھی، سرخ موٹی موٹی آنکھیں جو شیطانی پانی کا کثرت سے استعمال کرنے کی چغلی کھاتی باہر کو نکلی رہتی تھیں، اوپر سے گہری سانولی رنگت نے اسے اور بدہیئت بنا دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ رافع کا جرم اتنا بڑا نہیں ہے مگر وہ مجبور تھا۔ فقیر داد گمسی کا نمک خوار و وفادار تھا۔ سیاسی مخالفین کے خلاف جھوٹے مقدمے بنانا، ان کے گھر والوں کو ڈرانا دھمکانا اور جھوٹے اِن کاؤنٹر کرنا اس کی جیسے ڈیوٹی میں شامل تھے۔ یہ سب وہ فقیر داد گمسی کے حکم پر کرتا تھا۔ تین دن کسی کو رافع سے ملنے نہیں دیا گیا۔ ان دو دنوں میں فتح ملک نے رافع پر ظالم کے پہاڑ توڑ دیے۔ وہ ہمیشہ نشے کی حالت میں ہوتا۔ رافع خاموشی سے اس کا ہر ظلم سہہ رہا تھا۔ کاش تیسرے دن فتح ملک تھانے نہ آیا ہوتا یا پھر نشے میں نہ ہوتا۔ کیونکہ اس کا نشے میں تھانے آنا عنقریب اس کے لیے ایک ذلت آمیز موت کا سبب بننے والا تھا۔ رافع کے دونوں ہاتھ آگے کی جانب باندھے ہوئے تھے۔ وہ حوالات میں ایک کونے میں گٹھڑی بنا پڑا تھا۔ اس کے جسم کا پور پور دکھ رہا تھا۔ تفتیش کے نام پر اسے اذیتیں دے دے کر نامعلوم جرم اگلوائے جا رہے تھے جو اس نے کیے ہی نہیں تھے۔

حوالات میں پہنچتے ہی فتح ملک نے رافع کو بازو سے پکڑا اور کھڑا کر دیا۔ رافع نے جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا لیا۔

''بڑی اکڑ ہے تیرے اندر! بالکل ماں پر گیا ہے، وہ روز آکر اکڑ دکھاتی ہے۔ کسی روز ہم نے اکڑ دکھائی نا......''

''چپ کر کمینے......! اگر میری ماں کے لیے ایک لفظ بھی اپنے گندے منہ سے نکالا تو زبان کھینچ لوں گا۔'' رافع نے فتح ملک کی بات کاٹتے ہوئے غصے سے کہا۔

''ہاہاہا......'' فتح ملک رافع کے پاس آکر زور سے ہنسا۔ اس کے منہ سے شیطانی پانی کی گندی بدبو نکل کر رافع کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ رافع کا دل متلانے لگا۔

''باپ تو بہت شریف تھا۔ چپکے سے ایک گولی سے ہی مر گیا تھا لیکن تجھے ماروں گا نہیں، تڑپاؤں گا۔'' فتح ملک نشے میں کچھ زیادہ ہی بول گیا۔

رافع یکدم چونک گیا اور پھر اس کی آنکھوں میں نفرت کی لہریں موجیں مارنے لگی۔ اس کا دل غم و غصے سے پھٹنے لگا۔ یہ انکشاف اس کے لیے سوہانِ روح تھا کہ اس کے باپ کا قاتل فتح ملک ہے۔

فتح ملک کی زبان سے رافع کی ماں اور باپ کے لیے نکلے الفاظ اس کی عبرت ناک موت کے تابوت میں آخری کیلیں ثابت ہو رہے تھے۔ فتح ملک نے جب رافع کی آنکھوں میں نفرت دیکھی تو وہ غصے سے دہاڑا۔

''مراد......! او مراد......!''

''یس سر۔'' مراد کانسٹیبل پیچھے ہی کھڑا تھا۔

''مارو سالے کو...... اس وقت تک مارنا۔ جب تک اس کی اکڑ ختم نہ ہو جائے۔ بس یہ خیال رکھنا کوئی ہڈی نہ ٹوٹنے پائے۔'' فتح ملک اس بات سے بے خبر حوالات سے نکل آیا کہ رافع یکدم پُرسکون ہو گیا ہے۔ اس کی نفرت آمیز نظریں اس کی پشت کو گھور رہی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ اپنے آفس میں بیٹھا۔ اپنے خبیث چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ لیے رافع کی چیخیں سن رہا تھا۔

☆☆☆

جدید سہولتوں سے آراستہ الشفا اسپتال اس وقت میدانِ جنگ بنا ہوا تھا۔ ہنگامہ کرنے والوں کا مطالبہ تھا کہ وہ ڈاکٹر ریحانہ اختر سے ملنا چاہتے ہیں۔ مریضہ کے یہ لواحقین خاصے مشتعل تھے۔ مرنے والی کوئی عام عورت نہیں تھی۔ مشہور داداگیر محبوب بلوچ کی بیوی تھی۔ محبوب کی بیوی امید سے تھی۔ تیسرا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ اُسے معمول کے چیک اپ کے لیے لایا گیا تھا۔ بھلی چنگی تھی۔ اچانک نہ جانے کیا ہوا ڈاکٹر ریحانہ نے اس کی طبیعت خراب ہونے کا اعلان کر کے فوراً ابارشن کا کہہ دیا۔ محبوب نے فوراً خون کا بندوبست کیا اور آپریشن تھیٹر کے باہر اپنی بیوی کی جان بچانے کی دعائیں کرنے لگا۔ محبوب کے ساتھ آنے والے نیچے لان میں جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ کیونکہ محبوب علاقے کا ہر دلعزیز شخص تھا۔ اس کی داداگیری امیروں اور بگڑے ہوئے لوگوں تک محدود تھی۔ غریبوں کا وہ ہمدرد تھا، دکھ سکھ میں ان کا ساتھ دیتا تھا۔ ایسے حالات میں بھلا کون اس کو اکیلا چھوڑتا۔ محبوب نے ڈاکٹر ریحانہ کو کہہ دیا تھا کہ اسے اپنی بیوی عزیز ہے۔ اگر بچہ نہیں بچتا تو کوئی مسئلہ نہیں۔ بس اس کی بیوی کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن جب ایک گھنٹے کے بعد ڈاکٹر ریحانہ نے اس کی بیوی کی موت کی خبر سنائی، وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ ڈاکٹر ریحانہ تو خبر سنا کر پچھلے گیٹ سے نکل کر گھر روانہ ہو گئی مگر اسپتال اکھاڑا بن گیا۔ اسپتال انتظامیہ نے فوراً پولیس کو طلب کر لیا۔ انتظامیہ اپنی ساکھ بچانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی۔ پولیس نے محبوب سمیت دس افراد کو گرفتار کر لیا۔

محبوب نے جیل سے ہی اپنے ذرائع سے معلوم کروالیا کہ اس کی بیوی کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ ڈاکٹر ریحانہ نے آپریشن میں حصہ لیا ہی نہیں تھا۔ اس کی جونیئر ڈاکٹر کی غفلت سے اس کی بیوی کی جان گئی تھی۔ اسپتال اور ڈاکٹر ریحانہ کی پشت پناہی کون کون کررہا تھا، وہ سب اس کے علم میں آچکا تھا۔ بس وہ اپنی سزا مکمل ہونے کے انتظار میں تھا۔ جب اس کا جیل میں آخری دن تھا، اسی دن ایک نیا قیدی اس کے بیرک میں بھیجا گیا۔

☆☆☆

قمرالنساء پر تو جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ پولیس نے تین روزہ جسمانی ریمانڈ حاصل کرلیا۔ ناجائز اسلحہ ... کی سرِعام نمائش، ہنگامہ آرائی، جلاؤ گھیراؤ اور پُرتشدد کارروائی جس کے نتیجے میں دو آدمی شدید زخمی بھی ہوئے۔ یہ سب دفعات لگا کر چالان انسدادِ دہشت گردی کی عدالت میں پیش کیا گیا تھا۔ جن کو مدِنظر رکھتے ہوئے عدالت نے ریمانڈ دے دیا۔ قمرالنساء اور ریاض بھی کمرائے عدالت میں موجود تھے۔ رافع نے ماں کی جانب دیکھا تو ان کا دل بھینچ کر رہ گیا۔ ریاض نے رافع کو تسلی دی۔ یہ سب ان لڑکوں کے بااثر والدین کی سیاسی طاقت کا کمال تھا۔ قانون جن کی جیب میں پڑا ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں شاید شریفوں کے لیے قانون کچھ اور ہی بنا ہوا ہے۔ بلکہ ہے ہی نہیں۔ قمرانساء جانتی تھیں کہ اب تفتیش کے نام پر ان کے بیٹے پر ظلم کے پہاڑ ٹوٹنے والے تھے۔ کمرائے عدالت سے نکلتے وقت قمرالنساء نے بیٹے کے چہرے پر وہ سختی دیکھی، جو ایک نڈر اور بے باک انسان کے چہرے پر مشکل اور آزمائش کے وقت ہوتی ہے۔ پولیس موبائل رافع کو لے جاچکی تھی۔ قمرالنساء اور ریاض عدالت کی عمارت سے باہر نکل کر کے گیٹ پر کھڑے تھے کہ ایک لینڈ کروزر آکر رکی۔ دونوں نے چونک کر گاڑی کی جانب دیکھا۔ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے شخص جس کی گھنی مونچھیں بل کھا کر اوپر اٹھی ہوئی تھیں، چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں غصے کی چمک تھی اور بال شانوں پر پڑے تھے۔ وہ دونوں کو گھور رہا تھا۔ یہ شخص انہیں کمرائے عدالت میں بھی نظر آیا تھا۔ یہ رستم شاہ تھا۔ ریاض نے ہاتھ میں پکڑی فائل دوسرے ہاتھ میں منتقل کی اور آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ قمرالنساء نے اس کا ہاتھ پکڑ کے روک لیا۔ لینڈ کروزر میں بیٹھا شخص طنزیہ انداز میں مسکرایا اور ڈرائیور کو چلنے کا اشارہ کردیا۔

''چلیے...... آپا میں آپ کو گھر چھوڑ دیتا ہوں۔'' ریاض نے جب قمرالنساء کو سوچوں میں گم دیکھا تو اُن کا سامان لیتے ہوئے بولا۔

''نہیں ریاض! آپ جائیں۔ میں رکشے میں چلی جاؤں گی۔ حماد کو بھی اسکول سے لینا ہے۔'' قمرالنساء نے کہا اور ریاض کا جواب سنے بغیر گیٹ سے باہر نکل آئیں اور سڑک کے کنارے لگے بس اسٹاپ کے شیڈ کے نیچے کھڑی ہوگئیں۔

چند ساعت کے بعد ہی ان کے سامنے سے رکشا گزرا۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے رکنے کو کہا مگر وہ آگے نکل گیا۔ انہوں نے بے بسی سے اسے جاتے ہوئے دیکھا، لیکن رکشا تھوڑی دور جا کر رک گیا اور پھر یوٹرن لے کر ان کی جانب آنے لگا۔ رکشے کی پچھلی سیٹ دروازوں سے بند تھی ۔ رکشا جب ان کے پاس آکر رکا، ایک جانب کا دروازہ کھلا اور بڑی سی چادر میں ایک عورت اتر کر ان کے پاس آکر رک گئی۔ پہلے تو قمرالنساء نے اسے نظرانداز کیا مگر جب غور سے دیکھا تو ان کی آنکھوں میں خوشگوار حیرت اتر آئی۔ یہی حال آنے والی عورت کا تھا۔ دونوں چند لمحے ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔ پھر قمرالنساء ''رخسانہ'' کہہ کر عورت کے گلے لگ گئیں۔ ''قمر میری بہن'' آنے والی عورت کے منہ سے نکلا۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ جب الگ ہوئیں تو دونوں کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور چہرے کسی اندرونی خوشی سے دمک رہے تھے۔

''رخسانہ!'' قمرالنساء کی ...... ہتھیلیاں رخسانہ کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔

''ہاں قمر!'' رخسانہ نے قمرالنساء کے ہاتھ تھام لیے۔ ''چل کہاں جانا ہے! نہیں، میرے ساتھ گھر چل...... چل آجا۔'' رخسانہ قمرالنساء کو رکشے کی جانب لے جاتے ہوئے بولیں۔

''راستے میں بیٹے کو اسکول سے لینا ہے۔'' وہ تذبذب کا شکار ہوئیں۔

''کوئی بات نہیں، رکشے والا ہمارا پڑوسی ہے۔ جہاں کہو... گی، وہیں چلیں گے مگر پھر میرے گھر چلنا ہے۔ ہاں......'' رخسانہ اور قمرالنساء رکشے میں بیٹھ چکی تھیں۔ قمرالنساء نے پتا بتایا تو رکشے والے نے رکشا آگے بڑھا دیا۔

☆☆☆

فریال جیسے ہی لیبر روم سے نکل کر ریکوری ایریے کے دروازے پر پہنچی، ٹھٹک کر رک گئی۔ اس کی آہٹ سے بے ہوش مریضہ کے پاس کھڑا ٹیکنیشن سیدھا ہو گیا۔ فریال کو پہلے ایسا لگا، شاید اسے دیکھنے میں مغالطہ ہوا ہے۔ اپنے شک کو دور کرنے وہ دروازے سے واپس لیبر روم میں آئی اور ریکوری ایریے کی جانب کھلنے والی کھڑکی کا پردہ ہلکے سے ہٹا کر دیکھنے لگی۔ غم و غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ٹیکنیشن جوان سالہ بیہوش مریضہ کے ڈھیلے ڈھالے آپریشن والے لباس کے گریبان میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھا اور اس کے ہونٹ مریضہ کے چہرے سے پیوست تھے۔ وہ غصے سے لیبر روم سے نکلی اور سیدھا ٹیکنیشن کے پاس جا پہنچی۔ وہ گڑبڑا گیا اور جلدی سے باہر جانے لگا۔

''شرم نہیں آتی ......'' ابھی فریال کے منہ سے اتنا ہی نکلا تھا کہ مریضہ کے ساتھ آئی عورت اندر داخل ہوئی۔ جسے دیکھ کر وہ باہر نکل گیا۔ فریال کی آنکھوں میں شدتِ غم و غصے سے آنسو نکل آئے۔ اس نے سوچ لیا تھا، ایم ایس سے شکایت ضرور کرے گی۔ سرکاری نوکری کا یہ اس کا دوسرا ہی مہینہ تھا۔ پہلے ماہ اس کی ڈیوٹی سرجری وارڈ میں لگائی گئی تھی۔ اب دوسرے ماہ سے اس کی ڈیوٹی مستقل لیبر روم میں لگائی دی گئی تھی۔ اس نے جلدی جلدی مریضہ کے ساتھ آنے والی عورت کو دوائیوں اور دیگر سامان کا پیپر دیا اور لیبر روم میں آکر رونے لگی۔

نازونعم سے پلی فریال بچپن سے ہی ہوشیار تھی۔ دو سال کی عمر میں ہی فرفر بولنے لگی تھی۔ عتیق اور رخسانہ اسے بولتے ہوئے دیکھتے تو بہت خوش ہوتے۔ کبھی کبھی رخسانہ جھنجلا جاتی، خاص طور جب وہ کام سے تھکی ہاری آرام کے لیے لیٹتی۔ فریال ضد کرتی کہ اس کے ساتھ باتیں کرے۔ رخسانہ سے ڈانٹ کھا کر وہ نادر کا دماغ کھانے اس کے پاس پہنچ جاتی، نادر اس کی باتیں غور سے سنتا اور وہ اپنی ساری باتیں نادر سے ہی کر ڈالتی۔ چار سال کی عمر میں فریال کو اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ وہ نادر کے ساتھ اسکول جاتی، عتیق دونوں کو اسکول چھوڑ کر آفس چلا جاتا۔ واپسی میں نادر اپنے ایک کندھے پر دونوں کے بیگ لٹکاتا، دوسری جانب بغل میں بیساکھی ڈالے، فریال کی شرارتوں پر کبھی ڈانٹتا، کبھی مسکراتا گھر لے آتا۔ دونوں پڑھائی میں ہوشیار تھے۔ دونوں بہن بھائی ہر کلاس میں نمایاں پوزیشنز لیتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ فریال میٹرک کلاس میں پہنچ گئی تھی اور نادر یونیورسٹی جانے لگا،

عتیق نے نادر کو بائیک ڈلوا دی تھی جس کے پچھلی طرف ایکسٹرا ٹائر لگے ہوئے تھے۔ اب دونوں بہن بھائی ایک ساتھ اسکول اور یونیورسٹی جاتے اور واپس آتے۔ عتیق اور رخسانہ کی خواہش تھی کہ فریال ڈاکٹر بنے۔ جب کے نادر کا رجحان کمپیوٹر کی جانب تھا۔ اس نے کمپیوٹر سائنس میں داخلہ لے لیا تھا۔ فریال ڈاکٹر نہ بن سکی۔ میٹرک اور پھر انٹر میں اے ون گریڈ بھی اسے سرکاری میڈیکل کالج میں داخلہ نہ دلوا سکا۔ پری انٹری ٹیسٹ میں پاس ہونے کے بعد اسے انٹرویو میں فیل کر دیا۔ جب کہ اسی کالج کی ایک لڑکی، جو اے گریڈ میں پاس ہوئی تھی۔ اسے داخلہ مل گیا، کیونکہ وہ ایک جاگیردار کی بیٹی تھی لیکن فریال اپنے شوق سے پیچھے ہٹنے والی نہیں تھی۔ اس نے جنرل نرسنگ کرنے کے بعد سرکاری جاب حاصل کر لی۔ اب اس کا ارادہ بی ایس این کرنے کا تھا۔ جس کے بعد اس کا کمیشن کا امتحان دینے کا ارادہ تھا۔ آج اس کے دل کی کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی۔ اپنے مقدس پیشے کی بے حرمتی پر اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ اچانک موبائل کی گھنٹی بجنے پر وہ چونک گئی۔ اس نے موبائل جیب سے نکالا اسکرین پر نمبر بھیا کے نام کے ساتھ شو ہو رہا تھا۔ نادر اسے لینے اسپتال پہنچ چکا تھا۔ فریال نے بھائی کو میسج کیا اور کپڑے بدلنے چینج روم میں چلی گئی۔ کپڑے بدل کر جب وہ او ٹی سے باہر آئی تو یکدم اس کے قدم رک گئے۔ سامنے ٹیکنیشن شبیر کھڑا اسے گھور رہا تھا۔

''اگر کسی سے شکایت کی یا کسی کو اس بات کا پتا چلا...... اچھا نہیں ہوگا!'' شبیر اس کے پاس آکر انگلی کھڑی کر کے بولا۔

''تمہیں شرم نہیں آتی! ایک بیہوش مریضہ کے ساتھ ایسی گھٹیا حرکت کرتے ہوئے۔'' فریال اس کی دھمکی نظر انداز کرتے ہوئے غصے سے بولی۔

شبیر اس کے جارحانہ انداز سے گھبرا سا گیا۔ ''میں کل صبح ہی ایم ایس صاحب سے تمہاری شکایت ضرور کروں گی۔ چاہے تم کچھ بھی کر لو...... سمجھے!''

''ہمم...... میں بھی دیکھتا ہوں تم شکایت کیسے کرتی ہو۔'' شبیر ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوا بولا۔ ''اور ہاں! یہ مت بھولنا میں ایم ایس صاحب کا ہی بندہ ہوں۔'' وہ طنزیہ انداز میں مسکرایا اور او ٹی میں چلا گیا۔ فریال نے غصے سے دروازے کو دیکھا اور سیڑھیاں اتر کر نیچے آگئی جہاں نادر اس کا انتظار کر رہا تھا۔

☆☆☆

فریال گھر پہنچی تو صحن میں ٹھٹک کر رک گئی۔ ماں کے کمرے سے ہلکے ہلکے رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔

''یااللہ خیر۔'' یہ کہتے ہوئے وہ کمرے کی جانب لپکی۔ کمرے میں ماں کے ساتھ ایک مہذب سی خاتون کو بیٹھے دیکھا۔ جو حلیے سے وکیل لگ رہی تھیں۔ منہ پر دوپٹا رکھے رو رہی تھیں۔

''السلام علیکم!'' فریال نے ماں کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے سلام کیا اور ماں کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔

''وعلیکم السلام!'' قمرالنساء نے آنسو صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔

''بیٹی! یہ تیری خالہ ہیں۔ جو میری بہن نہیں ہے مگر بہن سے بڑھ کر ہے۔'' رخسانہ نے بیٹی کی نظروں کا مطلب سمجھتے ہوئے جواب دیا۔ ''یہ میری بیٹی ہے فریال......'' رخسانہ نے قمرالنساء سے فریال کا تعارف کرایا۔

قمرالنساء نے فریال کا ہاتھ پکڑ کے اپنے پاس بٹھا لیا۔ اس وقت نادر بھی اپنی اسٹک کے سہارے کمرے میں پہنچ گیا۔ کمرے میں اجنبی خاتون کو بیٹھا دیکھ کر دروازے پر ہی رک گیا۔

''آجا بیٹا آجا!...... یہ تیری قمر خالہ ہیں۔''

رخسانہ نے جب نادر کو واپس جاتے ہوئے دیکھا تو ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔

نادر سلام کر کے ماں کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

''امی آپ نے کبھی خالہ کا ذکر نہیں کیا۔'' نادر نے ماں سے کہا۔

''بیٹا یہ تمہاری سگی خالہ نہیں ہے۔ یہ ایک فرشتہ صفت انسان کی بیٹی ہے۔ اگر وہ نہ ہوتا تو شاید تم اپنی ماں کو اس حال میں نہیں دیکھ پاتے۔ تمہارے نانا کے ایکسیڈنٹ میں انتقال کے بعد ان کی ماں نے مجھے اور تمہاری نانی کو گھر سے نکال دیا تھا۔ کیونکہ تمہارے نانا نے غیر برادری میں شادی کی تھی۔ غیر برادری اور لاوارث ہونے کی وجہ سے اس گھر میں تمہاری نانی کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ جائیداد میں بھی کوئی حصہ نہیں تھا۔ میں اس وقت ایک سال کی تھی۔ تمہاری نانی مجھے لے کر کہاں جاتی۔ اتنے بڑے شہر میں اگر کوئی فرشتہ نظر آیا، وہ اشتیاق انکل تھے۔ جنہوں نے تمہاری نانی کو بیٹی بنا کر اپنے گھر میں رکھا۔ یہ قمر اس وقت دو سال کی تھی۔ ہم ان کے گھر رہنے لگے۔ امی سلائی کڑھائی جانتی تھیں۔ جب انہوں نے اشتیاق انکل کو کام کرنے کو کہا تو وہ پہلے ناراض ہوئے پھر کچھ سوچ کر اجازت دے دی۔ یہ بعد میں پتا چلا کہ وہ تمہاری نانی کو احساسِ کمتری میں مبتلا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے تمہاری نانی کی شادی بھی کروانا چاہی مگر امی نے انکار کر دیا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ میں سوتیلے باپ کے نام سے پہچانی جاؤں اور اگر امی شادی کر لیتیں تو تمہارے نانا کی جائیداد سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے۔ اشتیاق انکل نے قانونی طور پر کوشش کر کے ایک مختص رقم تمہارے نانا کے گھر والوں سے ہمیں دلوا دی تھی۔ جب تک میں سات سال کی ہو چکی تھی۔ اب ہم خودمختار تھے مگر امی اشتیاق انکل کے پاس ہی رہیں۔ میں اور قمر ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے اور کالج تک ہم دونوں ساتھ ہی تھے۔ اشتیاق انکل کے جاننے والے ہمیں بہنیں سمجھتے تھے۔ اشتیاق انکل بھی یہی کہتے تھے رخسانہ اور قمر میری بیٹیاں ہیں۔''

رخسانہ ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ قمرالنساء نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا جیسے آگے کچھ بتانے سے منع کر رہی ہوں۔ فریال اور نادر جو انہماک سے سن رہے تھے، چونک کر دونوں کو دیکھنے لگے۔

''نہیں قمر! کہنے دے مجھے، تم لوگوں کے احسانات ہیں مجھ یتیم پر، میرے بچوں کو بھی پتا ہونا چاہیے کس کس کے قرض ہیں ہم پر۔'' رخسانہ کی آواز رُندھ گئی۔ پھر فریال اور نادر سے گویا ہوئی......

''پھر تمہارے ابو کا رشتہ آیا۔ جانتے ہو وہ رشتہ کس کے لیے آیا تھا! قمر کے لیے مگر تمہاری دادی کو میں پسند آگئی۔ ان خداترس لوگوں کے ماتھے پر ایک شکن تک نہ آئی اور تمہاری نانی سے اجازت لے کر میری شادی تمہارے ابو سے دھوم دھام سے کروا دی۔ اس کے چھ ماہ بعد ہی تمہاری نانی فوت ہوگئیں۔ اس وقت میں امید سے تھی اور جب نادر ایک سال کا تھا ہم پر قیامت ٹوٹ پڑی...... ہاں وہ قیامت ہی تھی جب اشتیاق انکل کا انتقال ہوا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا، جیسے میں یتیم ہوگئی ہوں۔ میں دس دن قمر کے ساتھ رہی پھر کراچی آگئی۔ لیکن جب چہلم پر گئی، گھر پر تالا لگا ہوا تھا۔ آس پڑوس سے پتا کیا، کسی کو پتا نہیں تھا کہ یہ لوگ کہاں گئے ہیں۔ بس اتنا پتا چلا کہ قمر کے بھائی کی کسی سے دشمنی ہوگئی تھی۔ اچانک ہی گھر چھوڑ کر چلے گئے۔ آج اتنے سالوں کے بعد مجھے میری بہن ملی، جو تمہارے سامنے بیٹھی ہے۔'' رخسانہ نے یہ کہہ کر جب

قمر النساء کی جانب دیکھا وہ رو رہی تھیں۔ فریال نے انہیں گلے سے لگالیا۔ فریال کے خود کے آنسو چھلک رہے تھے۔ نادر بھی اٹھ کر قمر النساء کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے دونوں کے سروں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔ شام کی چائے کا وقت ہو چکا تھا۔ حماد دونوں بہنوں کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھا کر ٹیوشن سنٹر جا چکا تھا۔ قمر النساء نے واپسی میں اسے ساتھ لے کر گھر جانا تھا۔ چائے پینے کے بعد جب قمر النساء جانے لگیں فریال اور نادر ان کے موجودہ تمام حالات سے بھی باخبر ہو چکے تھے۔

☆☆☆

ریمانڈ ختم ہونے کے بعد جب رافع کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ اس کی حالت دیکھ کر قمر النساء اپنے آنسو روک نہیں پائیں۔ کمرائے عدالت میں بڑی مشکل سے خود پر ضبط کیے بیٹھی تھیں۔ جج نے کیس داخل کر کے اگلی تاریخ دے دی اور اسے جیل کسٹڈی کا حکم سنا دیا۔ ریاض احمد نے رافع سے وکالت نامے پر اس کے دستخط لیے اور قمر النساء کو اپنے اعتماد میں لے لیا۔ قمر النساء کو ریاض پر بھروسا تھا کہ وہ اس کے بیٹے کو ظالموں کے چنگل سے نکال لائے گا۔ جس کے لیے وہ خود بھی پس پردہ اس کی معاونت کرنے کے لیے موجود تھیں۔ جیسے ہی رافع کمرائے عدالت سے باہر آیا، وہ بیٹے سے لپٹ کر رو دیں۔

''امی......'' رافع کے منہ سے بس اتنا ہی نکلا مگر وہ خود کو مضبوط بنا کر رکھنا چاہتا تھا۔ ماں کے سینے سے لگ کر اس کے اندر ایک حوصلے کی لہر دوڑ گئی۔ اسے خود اپنا آپ یکدم ہی خاندان کا سربراہ سا محسوس ہونے لگا۔ اس نے قدرے دور کھڑے حماد کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔

''امی کا خیال رکھنا، زیادہ تنگ مت کرنا، میں بہت جلد واپس آؤں گا۔ دیکھنا پھر سے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اپنی پڑھائی پر دھیان دینا۔ سمجھے!'' حماد جب قریب آیا تو رافع اسے سمجھانے لگا۔

''جی بھائی۔'' حماد نے رُندھی ہوئی آواز کے ساتھ سر بھی ہلایا۔

قمر النساء نے رافع کو ایک نظر دیکھا۔ اس کے چہرے میں فاروق احمد کا عکس نظر آ رہا تھا۔ وہی لہجہ، وہی انداز اور وہی خود اعتمادی جو اُن کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ ریاض بھی ان کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''آپا......! آپ بھی وہی دیکھ رہی ہیں جو میں دیکھ رہا ہوں؟'' ریاض نے رافع کو دیکھتے ہوئے قمر النساء سے پوچھا۔

''ہاں ریاض! مجھے ایسا لگ رہا ہے، جیسے فاروق میرے سر پر اپنا مہربان وجود لیے کھڑے ہیں اور میں ایک بہت بڑے سائبان کے نیچے ہوں۔ اس سائبان نے جیسے میرے گھر کو اپنے حصار میں لے لیا ہے۔'' قمر النساء رافع کو مسلسل دیکھتے ہوئے بولیں۔ رافع اب حماد سے ہتھکڑی لگا ہاتھ ملا رہا تھا۔ پھر اس نے ماں کو دیکھا جو اسے ہی دیکھ رہی تھیں، دونوں کی نظر ٹکرائیں تو قمر النساء نے مسکرا کر بیٹے کو دیکھا۔ جیل کی گاڑی اسٹارٹ ہو چکی تھی۔ ریاض آگے بڑھ کر رافع سے ملا اور اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ قمر النساء نے سینے سے لگایا اور اس کی آنکھوں میں آئی نمی کو اپنے انگوٹھے کی پور سے صاف کیا اور ماتھے پر الوداعی بوسہ دیا۔

''امی......! اپنا خیال رکھیے گا اور فکر مت کیجیے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' رافع نے ماں کو حوصلہ دیا۔

''ہاں میرے بچے......'' قمر النساء نے اس کے گال پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''چلو بھائی جلدی کرو! بہت ہو گیا رونا دھونا۔'' سپاہی نے رافع کو گاڑی کی جانب دھکیلا۔

مڑتے مڑتے رافع نے مسکرا کر ماں کی جانب دیکھا اور گاڑی کی جانب چل دیا۔ رافع اپنے ماتھے پر ممتا بھرے ہونٹوں کا لمس محسوس کرتا ہوا، گاڑی میں موجود دوسرے قیدیوں کے درمیان آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا۔

☆☆☆

''میں دیکھ رہی ہوں، کچھ دنوں سے آپ پریشان ہیں۔ سب خیریت ہے نا؟'' ڈاکٹر ریحانہ نے جب رستم شاہ سے استفسار کیا تو اس نے ایک نظر سامنے بیٹھے ناظمی العبادی کو دیکھا اور پھر گویا ہوا۔

''بس ایک مسئلہ تھا۔ جس کی وجہ سے مصروف ہو گیا تھا۔ بچوں کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ فقیر داد صاحب کا بیٹا زخمی ہو گیا تھا لیکن اب سب ٹھیک ہے۔'' رستم شاہ نے مختصر جواب دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ناظمی کے سامنے اس موضوع پر بات ہو۔

یہ تینوں بنگلے میں بیٹھے رابرٹ کی کال کا انتظار کر رہے تھے۔ جس میں ان کی پہلی میٹنگ ہوئی تھی۔ ناظمی العبادی جو اُن کے ساتھ پچھلے دو ماہ سے تھا اب مقامی زبان بولنے اور سمجھنے لگا تھا۔

''او...... مسٹر شاہ! بہت تشویش والی بات ہے۔

ہمارے کام میں احتیاط بہت ضروری ہے۔ ہمیں اپنا سارا دھیان اپنے ٹارگٹ پر رکھنا چاہیے۔ مسٹر رابرٹ شاید اس بات کو پسند نہیں کریں۔ گوکہ ہم نے اگلے تین ماہ کا ٹارگٹ مکمل کرلیا ہے مگر ابھی بہت سا کام کرنا ہے۔ بہتر یہ ہے اس معاملے کو جلد از جلد ختم کریں۔'' ناظمی جو شکل سے ہر وقت پریشان سا دکھائی دیتا تھا مگر اس کا دماغ بہت تیز تھا۔ جس طرح اس کی این جی او نے پورے صوبے میں اپنا کام کیا تھا، اس سے کمپنی کی ڈیمانڈ آسانی سے پوری ہوگئی تھی۔ کمپنی کی پروڈکٹ نے پوری دنیا میں دھوم مچادی تھی۔ ابھی رستم شاہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ ڈاکٹر ریحانہ کے موبائل پر رابرٹ کی ویڈیو کال آنے لگی۔

''کیسے ہیں آپ لوگ؟ آپ لوگوں کی کارکردگی بہترین جارہی ہے۔ مسز ریحانہ! آپ کی رپورٹس میل کے ذریعے مجھے ملتی رہتی ہیں۔ اسپتال والا واقعہ میرے علم میں آیا تھا۔ خیال کریں، ہم اس طرح کے واقعات کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ جتنا اپنا ہاتھ صاف رکھیں گے، اتنا ہی ہمیں اپنے کام میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ ذرا سی غفلت سارا کام خراب کرسکتی۔ لہٰذا آئندہ خیال کریں اور مسٹر شاہ! آپ سے کمپنی بہت خوش ہے۔ آپ نے اسپتال والا معاملہ جس طرح ہینڈل کیا، قابلِ ستائش ہے۔ اپنے باقی معاملات بھی جلد از جلد نمٹائیں، یقیناً آپ سمجھ گئے ہوں گے، میں کس سلسلے کی بات کررہا ہوں۔ حسبِ وعدہ آپ لوگوں کے اکاؤنٹ میں رقم بھجوادی گئی ہے۔'' رابرٹ نے بغیر کسی تمہید کے بولنا شروع کردیا۔ رابرٹ کے بولنے کا انداز ایسا ہوتا تھا جیسے وہ کسی کا لکھا ہوا پڑھ رہا ہو، ایک لفظ زیادہ نہ کم۔ رستم شاہ نے ایک نظر ناظمی کی جانب دیکھا جو موبائل پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔

''تین ماہ کا اسٹاک ہمارے پاس جمع ہوچکا ہے لیکن جس تیزی سے ہماری پروڈکٹ مشہور ہورہی ہے، اس سے اندازہ ہورہا ہے کہ آنے والے وقت میں ہمیں اپنے کام کا دائرہ بڑھانا پڑے گا۔ اسی سلسلے میں کمپنی نے فیصلہ کیا ہے کہ کشمیر اور شمالی علاقہ جات میں اپنے مراکز قائم کیے جائیں۔ اس سلسلے میں ساری تفصیلات مسٹر ناظمی کو ارسال کردی گئی ہیں۔ وہ آپ کو بریف کردیں گے کیونکہ این جی او کے تمام معاملات اور فنڈ کی پوری تفصیلات وہی دیکھ رہے ہیں۔ اگر کوئی سوال ہے تو آپ لوگ مسٹر ناظمی سے پوچھ سکتے ہیں۔'' رابرٹ کی ساری بات سن کر رستم شاہ اور ڈاکٹر ریحانہ کو اس بات کا تو اندازہ ہوگیا تھا کہ ناظمی العبادی بہت اہم آدمی ہے۔ جس کو کمپنی کے تمام فیصلوں کا پہلے سے پتا ہوتا ہے۔

''تھینک یو اینڈ گڈ بائے مسٹر رابرٹ!'' یہ کہہ کر ناظمی نے ہاتھ بڑھا کر کال منقطع کردی اور ایک فائل کھول کر تفصیلات بتانے لگا۔

☆☆☆

فریال دوسرے دن ہی ایم ایس کے آفس جا پہنچی تھی۔

''تم اپنی ڈیوٹی پر دھیان دو، ابھی نئی نئی جاب ہے۔ میں تمہاری ڈیوٹی او ٹی سے آئی سی یو میں چینج کررہا ہوں۔ آج سے تم آئی سی یو میں ڈیوٹی کروگی۔ اب تم جاؤ۔'' اتنی بڑی بات پر ایم ایس کا ایسا رویہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ الٹا اس کی ڈیوٹی بدل دی تھی۔

''سر......''

''رہی بات شبیر کی...... اس کو میں خود سمجھادوں گا۔''

ابھی فریال نے جواب دینا ہی چاہا تھا کہ ایم ایس صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔ فریال خاموشی سے ایم ایس کے آفس سے نکل آئی۔ اسے اندازہ ہوگیا کہ شبیر کے خلاف کچھ نہیں ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ آئندہ خیال کرنے کو کہا جائے گا اور ہوا بھی یہی۔ ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ شبیر کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی بلکہ اب جب بھی وہ فریال کے سامنے آتا، ایسے فاتحانہ انداز سے مسکراتا جیسے اس کا مذاق اڑا رہا ہو۔ وہ بے بسی سے ہونٹ کاٹ کر رہ جاتی۔ ہاں یہ ضرور فرق پڑا کہ وہ اب کسی قسم کی بات نہیں کرتا تھا۔ فریال کو آئی سی یو میں ڈیوٹی کرتے ایک ہفتے سے زیادہ ہوچکا تھا۔ آئی سی یو کا ماحول پُرسکون تھا۔ ہر کوئی خاموشی سے کام میں لگا رہتا۔ مگر یہ اس کی بھول تھی۔ اس پُرسکون خاموشی کے پیچھے جو گھناؤنا کام ہورہا تھا، وہ اس سے ناواقف تھی۔ کیونکہ ایک تو وہ نئی نئی آئی سی یو میں آئی تھی، دوسرا مریض بھی دو ہی تھے۔ جو تقریباً ٹھیک ہوچکے تھے۔ فریال کو اس گھناؤنے کام کا پتا اس وقت چلا، جب تین مریض کے بعد دیگر آئی سی یو میں شفٹ ہوئے۔ ایک کی حالت نازک تھی۔ ڈاکٹر نے فوراً ٹیکنیشن کو وینٹ کا بیڈ تیار کرنے کو کہا اور مریض کا چیک اپ کرنے لگا۔ وارڈ بوائے نے مریضوں کے ساتھ آنے والوں کو باہر ہی رکنے کی ہدایت دی اور آئی سی یو کا دروازہ اندر سے لاک کردیا۔ فریال ڈاکٹر کے ساتھ ہی کھڑی مریض کا بلڈ پریشر چیک کررہی تھی۔ بلڈ پریشر بار بار چیک کرنے پر انتہائی کم

ریکارڈ ہو رہا تھا۔ نبض بھی ڈوبتی جارہی تھی۔ مریض نے جیسے ہی ہچکی لی ڈاکٹر دوڑ کر کاؤنٹر پر پہنچا اور جلدی جلدی دواؤں کا پیپر تیار کرنے لگا۔ اسی اثنا میں فریال نے ڈاکٹر کو آواز دی، جسے اس نے اَن سنی کر دی اور وارڈ بوائے کو اشارہ کرتا ہوا دواؤں کا پیپر لے کر باہر نکل گیا۔ ٹیکنیشن اور وارڈ بوائے جلدی جلدی اپنے کاموں میں لگ گئے۔

جیسے ہی ڈاکٹر واپس آیا، دوسرے مریض کی جانب بڑھ گیا۔ ٹیکنیشن بھی اس مریض کو سفید چادر اوڑھ کر ڈاکٹر کے پاس آگیا۔ ڈاکٹر نے اس کے کان میں سرگوشی کی جو فریال سن نہیں پائی۔

''سر......! وہ مریض ایکسپائر ہو چکا ہے۔'' فریال نے وائٹل ٹرالی دوسرے مریض کے بیڈ کے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''آئی نو۔'' ڈاکٹر بے پروائی سے بولا اور مریض کا چیک اپ کرنے لگا۔ فریال جانتی تھی کہ آئی سی یو میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔ ٹریننگ کے دوران ایسی کئی اموات اس کے سامنے ہو چکی تھیں۔ باہر کے دروازے پر زور زور کی دستک ہونے لگی۔ ڈاکٹر نے ٹیکنیشن کو اشارہ کیا، وہ وارڈ بوائے کو ساتھ لے کے دروازے پر چلا گیا۔ ڈاکٹر مریض کو چھوڑ کر کاؤنٹر پر کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ وارڈ بوائے نے دروازے کی اوٹ سے مر جانے والے مریض کے ساتھ آنے والوں سے دواؤں سے بھری شاپر لے لی اور ٹیکنیشن باہر نکل گیا۔ فریال یہ سب حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے وارڈ بوائے سے شاپر لی اور کاؤنٹر کے نیچے بنے خانے میں ڈال دی۔ ٹیکنیشن واپس آگیا اور ڈاکٹر سے کہنے لگا۔

''سر...... میں نے سمجھا دیا ہے۔''

ڈاکٹر نے تعریفی انداز سے اُسے دیکھا اور دوسرے مریض کے لیے ہدایت دینے لگا۔ فریال کبھی مرے ہوئے مریض کو دیکھ رہی تھی، کبھی اس خانے کو جہاں دواؤں کا شاپر رکھ دیا گیا تھا۔ یہ سب اتنے منظم طریقے سے ہوا کہ فریال کا دماغ ماؤف ہونے لگا مگر وہ دوسرے مریضوں کی جانب متوجہ ہو گئی۔ آدھے گھنٹے کے بعد ہی مرے ہوئے مریض کی موت کا اعلان کر دیا گیا۔ ڈاکٹر موبائل سے مریض کے کنسلٹنٹ ڈاکٹر کو مریض کی موت اور ان دواؤں کی تفصیل بتانے لگا جو مریض کو دی ہی نہیں گئی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد مرنے والے کے لواحقین روتے دھوتے اپنے پیارے کو اللہ کی مرضی جان کر لے گئے۔ دس منٹ بعد ہی چند ہزار روپے میں اپنا ایمان داؤ پر لگانے والے انسانیت کے مسیحا خوش گپیوں میں مصروف کھانا کھانے لگے۔ فریال کو کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ جانتی اور سمجھتی تھی کہ اس پیشے میں کبھی کبھی غفلت ہو جاتی ہے۔ جو جان بوجھ کر بھی نہیں کی جاتی۔ جس سے مریض کو نقصان پہنچتا ہے یا اس کی تکلیف بڑھ جاتی ہے مگر ایک مرے ہوئے انسان سے ایمان کا سودا اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

''ہیلو سویٹی! کیا سوچ رہی ہو؟'' فریال اپنے خیالات سے اچانک چونک گئی۔ سامنے ہی ڈاکٹر اُسے مسکراتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

''سر یہ کیا ہے؟'' فریال نے ڈاکٹر کا لگاوٹ بھرا لہجہ نظر انداز کرتے ہوئے شاپر والے خانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ڈاکٹر کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمایاں ہوئے مگر وہ فوراً سنبھل گیا۔

''یہ دواؤں کا شاپر ہے جو مریض بھول کر چلے گئے ہیں۔'' ڈاکٹر نے اطمینان سے جواب دیا تو فریال بھڑک اٹھی۔

''مگر سر...... یہ تو مریض کی موت کے بعد آپ نے لکھی تھیں۔ آپ کو پتا بھی تھا کہ مریض مر چکا ہے۔'' فریال کی تیز آواز سے ٹیکنیشن اور وارڈ بوائے بھی کاؤنٹر کے پاس آگئے۔

''اس مسئلے پر ڈیوٹی کے بعد بات کریں گے۔'' ڈاکٹر نے دھیمی آواز سے کہا اور شاپر نکال کر وارڈ بوائے کو دے دیا۔ ''جاوید جاؤ دیکھو...... مریض کے لواحقین اگر نکلے نہ ہوں تو انہیں دے آؤ۔'' جاوید ڈاکٹر کا اشارہ سمجھ گیا تھا۔ ''جی سر۔'' یہ کہہ کر شاپر پکڑے تیزی سے آئی سی یو سے نکل گیا۔

''دیکھیں اسٹاف...... یہ دوائیں ہم ایمرجنسی کے لیے منگواتے ہیں۔ اگر استعمال نہیں ہوتیں، تو واپس کر دیتے ہیں۔ آپ کوئی غلط فہمی مت پال لیے گا۔'' ڈاکٹر جو اس کھیل کا پرانا کھلاڑی تھا، متانت سے بولا لیکن فریال جانتی تھی یہ سب جان چھڑانے کے ہتھکنڈے ہیں۔

''جی سر۔'' فریال نے بظاہر تو خاموشی اختیار کر لی تھی مگر اس کا دماغ کچھ اور سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

اچھے اور بُرے معاشرے کا تصور ہمیں وراثت میں ملا ہے لیکن معاشرہ انسانوں سے بنتا ہے۔ اس موضوع پر بحث صدیوں سے چلی آرہی ہے اور نتیجہ بالآخر عدل و

انصاف کے ترازو پر جا ٹھہرتا ہے۔ جس طرف کا پلڑا بھاری ہوتا ہے، وہی معاشرہ کہلاتا ہے۔

ایک بُرے معاشرے میں جہاں انصاف کے لیے دردر کی ٹھوکریں ملیں اور ایک شریف انسان اپنی شرافت اور عزت کو بچانے کے لیے یا تو خاموشی سے ظلم سہتا رہے یا پھر معاشرے کو اس نہج پر لانے والوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہو۔ رافع نے فیصلہ کرلیا تھا۔ وہ معاشرے کو ایسے لوگوں سے پاک کر کے ہی دم لے گا۔ جنہوں نے عدل و انصاف کو اپنے گھر کی لونڈی بنا رکھا تھا۔ مگر اسے صبر کرنا ہوگا، مناسب وقت کا انتظار کرنا ہوگا۔ جو اسے ضرور ملے گا۔ بس اسے اپنی ضمانت کا انتظار تھا۔

آج رافع کا جیل میں پہلا دن تھا۔ اس کو جرائم پیشہ افراد کے بیرک میں رکھا گیا تھا۔ وہ کونے میں اپنا سر گھٹنوں میں دیے بیٹھا تھا۔ اچانک ران پر لگنے والی ٹھوکر سے چونک اٹھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو ایک چالیس پینتالیس سالہ، خوش شکل قیدی اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے اسے گھور رہا تھا۔ اس کا حلیہ دوسرے قیدیوں سے مختلف تھا۔ وہ صاف ستھرا اور پڑھا لکھا نظر آرہا تھا۔ خضاب سے رنگے بال سرسوں کے تیل کی وجہ سے سلیقے سے جمے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں سرمہ پھیرا ہوا تھا۔ بظاہر تو وہ رافع کو گھور رہا تھا مگر اس کی نظروں میں ایک اپنائیت سی تھی۔ رافع نے ایک نظر اسے دیکھا پھر سر جھکا لیا۔

''محبوب نام ہے میرا۔'' قیدی رافع کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

''مجھے پتا ہے، تو کس جرم میں آیا ہے۔ اور یہ بھی پتا ہے وہ جرم تو نے کیا ہی نہیں ہے۔ بس تو نے پنگا غلط لوگوں سے لے لیا تھا۔ فقیر داد بھی کیا کرتا تو نے بے چارے کے اکلوتے بیٹے کو خون میں نہلا دیا تھا، اوپر سے رستم شاہ کے بھتیجے کو بھی زمین چٹا دی۔ کام تو، تو نے جی داری والا کیا تھا۔ سارا غرور خاک میں مل گیا کمینوں کا۔'' محبوب کے لہجے میں کڑواہٹ گھلی ہوئی تھی۔ وہ رافع کے ساتھ اب دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ رافع نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تو وہ مسکرانے لگا۔ محبوب نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''میرا آج آخری دن ہے یہاں اور تیرا پہلا، مگر محبوب کی نظریں دیکھ رہی ہیں، ہماری ملاقات بہت جلد ہونے والی ہے۔ باہر آکر مجھ سے ملے گا نا؟'' محبوب نے کہا اور سوالیہ نظروں سے رافع کو دیکھنے لگا۔

''پتا نہیں۔'' رافع نے مختصر جواب دیا۔

''ہمم...... اتنا بیزار دنیا سے...... لیکن بہت جلد سنبھل جائے گا۔'' یہ کہہ کر محبوب اٹھ کھڑا ہوا اور جیب میں سے سگریٹ کی ڈبیا نکال کر حوالات کی آہنی سلاخوں کے پاس چلا گیا۔ باہر کھڑے سپاہی کو مخاطب کیا۔ ''او...... منظور! ذرا پین دے۔'' پین لے کر سگریٹ کی ڈبیا پر ایک پتا لکھا اور واپس آکر رافع کی گود میں ڈال دیا۔ ''یاد کرلے اچھی طرح اِسے، کام آئے گا۔'' یہ کہہ کر محبوب نے رافع کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

رافع نے حیرت سے محبوب کو دیکھا اور پھر پتا پڑھنے لگا۔

''رفیق......!'' محبوب کی آواز بیرک میں گونجی۔

''جی استاد......'' بیرک کے کونے میں بیٹھا ایک قیدی جلدی سے محبوب کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔

''اس کا خیال رکھنا۔ تیرے حوالے کر کے جارہا ہوں۔ مجھے یہ کبھی سلامت باہر چاہیے۔ سمجھ گیا؟'' محبوب معنی خیز انداز میں بولا تو رافع نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

''جی استاد سمجھ گیا۔ آپ بے فکر ہو کر جائیں۔'' رفیق نے سعادت مندی سے جواب دیا اور رافع کی جانب دیکھنے لگا۔

☆☆☆

زندگی کے تمام تر تلخ حقائق کے ساتھ جینے کے راستے پر چلنا تو وہ اپنے والد سے سیکھ گئی تھیں مگر سچائیوں کے ساتھ دلیری، ہمت اور ثابت قدمی ان کے بعد سیکھی، جب زندگی کے گرم سرد نے اپنے جلوے دکھانے شروع کیے۔

قمرالنساء کی پوری زندگی لامتناہی مشکلات کے جاموں سے لبریز رہی تھی۔ ان کی زندگی نے اس وقت ایک ایسا موڑ لیا، جب وہ یونیورسٹی میں داخلہ لینے پہنچیں۔ والد کے انتقال کے بعد بھائی ہی ان کا واحد سہارا تھے۔ قدرت نجانے کیا چاہتی تھی۔ یکدم ایک ہنستے مسکراتے دکھی انسانیت کی خدمت کرنے والے گھر کے مکینوں کی زندگی طوفانوں میں گھر گئی۔ اشتیاق صاحب کے انتقال کو ابھی چالیس روز بھی نہیں گزرے تھے۔ یونیورسٹی کے داخلے شروع ہو گئے۔ وہ ایک بدلتے موسموں کی صبح تھی۔ جس نے ان کی زندگی ہی بدل ڈالی تھی۔ احتشام بھائی نے انہیں

یونیورسٹی ڈراپ کیا اور ایک گھنٹے بعد آنے کا کہہ کر چلے گئے۔ وہ ایڈمیشن آفس سے فارم اور معلومات لے کر ڈیپارٹمنٹ کے باہر ہی بھائی کا انتظار کرنے لگیں۔ ابھی انہیں کھڑے پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ اُن کے سامنے ایک جیپ آکر رکی۔ کلف لگے سفید کاٹن کے سوٹ، آنکھوں پر براؤن گلاسز، سر پر قیمتی سندھی ٹوپی اور کندھے پر ایک مہنگی شال ڈالے، ایک خوبصورت نوجوان باہر نکلا۔ پچھلی سیٹ سے اس کا گارڈ بھی بندوق لیے باہر نکل کر اس کے پیچھے چوکس کھڑا ہوگیا۔ نوجوان اپنے حلیے اور رکھ رکھاؤ سے کسی بڑے گھرانے کا بگڑا ہوا سپوت لگ رہا تھا۔ اس نے جیپ سے اتر کر اِدھر اُدھر دیکھا جیسے ہی اس کی نظر قمرالنساء پر پڑی کچھ دیر انہیں دیکھتا رہا، پھر ان کی جانب بڑھنے لگا۔ اس کے چلنے کے انداز سے ہی اس کی تربیت کا پتا چل رہا تھا۔ وہ شاہانہ انداز سے چلتا ہوا ان کے پاس آکر رک گیا۔ انہوں نے ہاتھ میں پکڑی فائل کو زور سے دبایا اور دوسری جانب دیکھنے لگیں۔

''معاف کیجیے گا! ایڈمیشن آفس بتائیں گی کہاں ہے؟'' وہ سامنے آتے ہوئے مہذب انداز سے بولا۔

''جی...... جی وہ سامنے والی عمارت ہے۔'' انہوں پُراعتماد لہجے میں جواب دیا اور دوسری جانب رخ پھیر لیا۔

''اچھا......'' وہ عمارت کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''دراصل میں اپنے بھائی کے لیے فارم لینے آیا ہوں۔ آپ تھوڑی مدد کر دیں گی۔'' وہ دوبارہ ان کے سامنے آگیا۔

''سوری...... سامنے عمارت ہے آپ جا کر خود لے سکتے ہیں۔'' انہوں نے اپنے لہجے کو پُرسکون و پُراعتماد ہی رکھا۔ مگر ساتھ ہی وہ دعا کر رہی تھیں کہ جلد ہی احتشام بھائی آجائیں اور اس مصیبت سے جان چھوٹے۔ انہوں نے دیکھا نوجوان زیرِلب مسکرا رہا ہے اور نظریں انہی پر گاڑی ہوئی ہیں۔

''فارم تو میں لے ہی لوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ اپنی ٹھوڑی کھجانے لگا اور گہری نظروں سے ان کا جائزہ لینے لگا پھر گویا ہوا۔ ''آپ شاید کسی کا انتظار کر رہی ہیں؟''

''میرے خیال سے آپ کو اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔ کون کیا کر رہا ہے اس سے آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔ امید ہے آپ میری بات سمجھ گئے ہوں گے۔'' قمرالنساء کا لہجہ نہ چاہتے ہوئے ترش اور تیز ہوگیا۔ انہیں امیرزادے کی ہوس ناک نظروں اور اُس کا خود کو اِس

مدد آپ کی...

''میرے گھر میں چور گھس آئے ہیں... جلدی کسی کو بھیجو۔'' اس نے پولیس اسٹیشن فون کیا۔

''سب گشت پر گئے ہوئے ہیں، یہاں کوئی دستیاب نہیں ہے۔'' اس جواب کے ساتھ فون بند ہوگیا۔

''وہ تین ہیں، تینوں مسلح ہیں۔ میں نے کھڑکی سے انہیں دیکھ لیا ہے۔'' چند منٹ بعد اس نے گھبرا کر دوبارہ فون کیا۔

''اپنے دروازے مقفل کر کے اندر چھپے رہو... کوئی آیا تو اسے تمہاری طرف بھیج دیں گے۔ اس وقت کوئی نہیں ہے۔'' فون پھر بند ہوگیا۔

''میں مارا جاؤں گا... وہ گرل اکھاڑ رہے ہیں۔ کسی بھی لمحے اندر گھس سکتے ہیں۔'' تیسری بار اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''مسہری کے نیچے یا الماری میں چھپ جاؤ... مزاحمت بالکل نہ کرنا۔ بچنے کا یہی ایک طریقہ ہے... تھانے میں اس وقت تمہاری مدد کے لیے کوئی دستیاب نہیں ہے۔''

فون بند ہونے کے چند ثانیوں بعد اس نے چوتھی بار تھانے فون کیا اور کہا۔ ''اب کسی کو آنے کی ضرورت نہیں... میں نے ان تینوں کو شوٹ کر دیا ہے۔'' جواب سے بغیر اس نے فون بند کر دیا۔

چند ہی منٹ میں تین موبائلوں میں بیس سپاہی وہاں آپہنچے اور تینوں چوروں کے ساتھ اسے بھی گرفتار کر کے لے گئے کیونکہ اس نے جھوٹ بول کر ''بلاوجہ'' ان کی دوڑ لگوائی تھی۔

▲▲▲

ایک خاتون کو اپنے بچے کے لیے آیا کی تلاش تھی۔ ایک خاتون انٹرویو کے لیے آئی۔

خاتون۔ ''میرے شوہر بہت وہمی ہیں۔ وہ چاہتے ہیں گھر میں کام کرنے والے ہر ملازم اور ملازمہ کو خوب چھان بین کرنے کے بعد رکھا جائے۔ یہ بتاؤ، کیا تم وفادار ہو۔ محبت کرنے والی ہو؟ تمہاری طبیعت میں تحمل، رواداری اور خوش مزاجی ہے؟ اور کیا تم......''

امیدوار (بات کاٹتے ہوئے) ''محترمہ! مجھے آپ کے بچے کو سنبھالنا ہے یا شوہر کو؟''

راحیلہ بھٹی کا لاہور سے انتخاب

طرح مخاطب کرنا بالکل بھی اچھا نہیں لگا۔
نوجوان کا چہرہ۔۔ شدتِ ہتک سے سرخ ہو گیا۔
آس پاس سے گزرنے والے طلبا رک کر انہیں دیکھنے لگے۔ گارڈ بھی تیزی سے ان کی جانب لپکا۔ نوجوان نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔
''میں نے صرف انسانیت کے ناتے پوچھا تھا محترمہ۔ لیکن تم چھوٹے لوگوں کو عزت راس ہی نہیں آتی۔ چاہوں تو اٹھا کر بھی لے جا سکتا ہوں۔'' نوجوان ایک قدم آگے بڑھ کر قمرالنساء کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے بولا۔
''بے غیرت انسان۔ ایک عورت کو دھمکی دے رہا ہے۔ شرم نہیں آتی۔'' قمرالنساء کا لہجہ رُندھ گیا، غم و غصے سے ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔
بے غیرتی کا طعنہ سن کر نوجوان آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے قمرالنساء کا بازو پکڑا اور گاڑی کی جانب لے جانے لگا۔ ان کے ہاتھ سے فائل گر گئی۔ ہاتھ خالی ہوتے ہی انہوں نے ایک قدم آگے بڑھایا اور نوجوان کے گال پر تھپڑ رسید کر دیا۔ ساتھ ہی جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا لیا اور الٹے پاؤں پیچھے ہٹنے لگیں۔ چند لمحوں کے لیے تو نوجوان سن ہو کر رہ گیا۔ اسے امید نہیں تھی کہ ایک کمزور سی لڑکی اسے تھپڑ مار دے گی۔ وہ غصے سے پلٹا مگر اسی اثنا میں احتشام بھی پہنچ گئے۔ انہوں نے جب بہن کو اس حالت میں روتے ہوئے دیکھا۔ غصے کی ایک لہر ان کے تن بدن میں دوڑ گئی۔ وہ دوڑ کر ان کی جانب بڑھنے والے نوجوان پر پل پڑے۔ مکوں اور گھونسوں پر رکھ لیا۔ نوجوان اس نئی آفت سے گھبرا گیا۔ گارڈ نے جب اپنے مالک کو پٹتے دیکھا، فوراً اسے بچانے آیا۔ قریب پہنچ کر بندوق کا دستہ پوری قوت سے احتشام کے پہلو میں مارا جس سے وہ درخت سے ٹکرا گئے۔ جب تک نوجوان اور گارڈ احتشام تک پہنچتے، وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور بندوق کی پروا کیے بغیر گارڈ کو گریبان سے پکڑا اور اس کے منہ پر زوردار مُکا جڑ دیا۔ گارڈ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ خود کو سنبھالتے ہی اس نے بندوق کا رخ جیسے ہی احتشام کی جانب کیا نوجوان نے بندوق کی نال نیچے جھکا دی۔
''نہیں دریا خان! ایسے نہیں، ان کو تو میں خود دیکھ لوں گا۔'' نوجوان نے آخری جملہ قمرالنساء کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور زمین پر گری اپنی ٹوپی اٹھا کر جیپ کی جانب بڑھ گیا۔ اس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔
قمرالنساء بھائی کے ساتھ آکر کھڑی ہو گئیں۔ جیپ جھٹکے سے آگے بڑھی اور ایک لمحے کے لیے ان کے سامنے آکر رکی۔ نوجوان نے اپنا ہاتھ باہر نکالا اور ایک کاغذ لہرایا، جسے دیکھ کر دونوں بہن بھائی بُری طرح چونک گئے۔ وہ کاغذ اشتیاق صاحب کے قومی شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی تھی۔ جو قمرالنساء کی فائل سے نکل کر وہیں کہیں گر گئی تھی۔
اس سے پہلے کہ۔۔ وہ کچھ کرتے، جیپ تیزی سے یونیورسٹی کے گیٹ کی جانب بڑھ گئی۔ گھر پہنچتے پہنچتے احتشام ایک فیصلہ کر چکے تھے۔ فیصلہ سن کر قمرالنساء تذبذب کا شکار ہو گئیں۔ فیصلہ بغیر کسی کو بتائے نوابشاہ شفٹ ہونے کا تھا۔ جب احتشام نے سمجھایا تو وہ مان گئیں۔ شفٹ ہونے کے بعد انہوں نے اپنے تمام جاننے والوں سے قطع تعلق کر لیا۔ فاروق احمد سے قمرالنساء کی شادی کے بعد احتشام نے بھی شادی کر لی اور دبئی شفٹ ہو گئے مگر قمرالنساء کی زندگی میں ابھی کئی امتحان باقی تھے۔

☆☆☆

گورنمنٹ اسپتال میں ہونے والے مکروہ فعل فریال کے لیے نوکری چھوڑنے کے لیے کافی تھے۔ استعفا دینے کے بعد اس نے بی ایس این میں داخلہ لے لیا اور شام کی شفٹ میں شہر کے مشہور الشفا اسپتال میں نوکری کر لی۔ محنتی، ہوشیار اور قابل تو وہ پہلے ہی تھی۔ کچھ دنوں میں ہی وہ ڈاکٹر ریحانہ کی پسندیدہ اسٹاف بن گئی۔ ایک ماہ بعد ہی اس کی تنخواہ میں بھی خاطر خواہ اضافہ کر دیا گیا۔ ایمرجنسی کال پر آنے پر الگ سے شیئر ملنے لگا۔ اب تو اسپتال کی جانب سے پک اینڈ ڈراپ کی سہولت بھی مل گئی تھی۔ بی ایس این کرنے کے دوران لگنے والی اس کی ڈیوٹیز بھی، ڈاکٹر ریحانہ نے اپنے اثر و رسوخ سے اپنے ہی اسپتال میں لگوا دی تھیں۔ ڈاکٹر ریحانہ کی طرف سے اتنی عنایات کا سوچ کر فریال اکثر انجانے خدشات میں گھِر جاتی تھی، مگر پھر فوراً ہی نفی میں گردن ہلا دیا کرتی تھی۔ کیونکہ ابھی تک کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی تھی۔ میڈم اچھا کام کرنے والوں کی قدر کرتی ہیں، یہی خام خیالی تھی جو ایک دن تلخ حقیقت بن کر اس کے سامنے آگئی۔ شروع میں ڈی این سی کے کیسوں کو عام سے کیس سمجھتی رہی، مگر جب اندرونِ سندھ سے آنے والے مسلسل کیسوں سے اس کا ماتھا ٹھنکا، تو وہ اب ہر کیس کی فائل سے مریضہ کی ہسٹری پڑھنے لگی۔ جب ایک ہی صورتِ حال سامنے آئی تو شش و پنج میں مبتلا ہو گئی۔ اب کیا کرے کیا نہ کرے۔ آج جب ایک کیس آیا تو اس نے مریضہ سے خود بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

''ادی آپ کو کیا تکلیف ہوتی ہے، جو آپ اپنی اولاد ضائع کرا رہی ہو؟'' فریال مریضہ کو انجکشن لگانے لگی تو پوچھا۔

''میڈم نے کہا ہے کہ میرا بلڈ پریشر بہت بڑھا ہوا ہے جس سے بھی بھی بچی کو نقصان ہو سکتا ہے۔ اگر بچی پیٹ میں ضائع ہو گئی، تو میری زندگی کو بھی خطرہ ہے۔ یہ سن کر میرے شوہر نے اجازت دے دی ہے۔'' مریضہ نے جب یہ تفصیل بتائی تو فریال کو ایک اور حیرت کا جھٹکا لگا۔ اس نے ایک بار پھر مریضہ کی فائل میں لگی الٹرا ساؤنڈ کی رپورٹ دیکھی تو مریضہ کا گیارھواں ہفتہ شروع ہوا تھا۔ فریال سمجھ گئی یہ کوئی بہت گھناؤنا کام ہو رہا ہے۔ اس کام کے پیچھے کیا مقاصد ہیں، یہ جاننے کے لیے اس کے اندر تجسس پیدا ہو گیا۔ چھٹی ہونے کے بعد سارے راستے وہ سوچ میں گم رہی۔ اس سلسلے میں وہ جس پر اعتماد کر سکتی تھی، وہ نادر تھا جو اس کا بھائی ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین دوست بھی تھا۔ وہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوئی گھر میں خوشگوار ماحول بنا ہوا تھا۔ اندر کمرے سے کچھ لوگوں کے ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جس میں نادر کا قہقہہ سب سے نمایاں تھا۔

☆☆☆

رافع کو جیل میں چھ ماہ ہو چکے تھے۔ رفیق کے ہوتے ہوئے اسے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ مگر دو اہلکار اسے معنی خیز نظروں سے دیکھ کر مسکراتے تھے۔ رافع کو ان کی مسکراہٹ زہر لگتی تھی۔ ان کی نظروں کا مطلب رافع خوب جانتا تھا۔ شروع کے دنوں میں رفیق کا ایک قیدی سے جھگڑا ہو گیا۔ رفیق چاہتا تھا کہ قیدی رافع کی جگہ چلا جائے اور رافع اس کی جگہ، مگر وہ قیدی نہیں مانا۔ رفیق کو جھگڑا کرنے کی پاداش میں ایک ہفتہ بند وارڈ کر دیا گیا مگر رافع کو اس کا ساتھ دینے پر سزا دی گئی۔ سزا کے دوران دونوں اہلکاروں نے جو کچھ رافع کے ساتھ کیا تھا، وہ کام ان کی عبرت ناک موت کا سبب بننے والا تھا اور یہ عبرت ناک موت رافع کے ہاتھ لکھی جا چکی تھی۔ رفیق کی سزا پوری ہونے کے بعد رافع نے اسے کچھ نہیں بتایا، وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی مسئلہ ہو اور اس کی ضمانت میں رکاوٹ پیدا ہو۔ رافع نے اب جیل میں سب سے میل جول بڑھا لی تھی۔ رفیق اس کے ساتھ ہی ہوتا۔ اس کے ذریعے محبوب بھائی کے متعلق سب معلومات مل چکی تھیں۔ رافع نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ضمانت ہوتے ہی محبوب بھائی سے رابطہ کرے گا اور اپنے باپ کے قاتل اور اس معاشرے کے ناسوروں کو کیفر کردار تک پہنچائے گا۔ اور بھی بہت سے کام تھے جن کو وہ نمٹانا چاہتا تھا۔ اس کے اندر ایک آگ تھی، جو اسے سکون سے رہنے نہیں دیتی تھی۔ ملک میں الیکشن کی گہما گہمی شروع ہو چکی تھی۔ فقیر داد اپنے سیاسی ہنگاموں میں مصروف ہو گیا۔ رستم شاہ بھی کئی عدالتی پیشیوں سے غائب تھا۔ اس نے اب شمالی علاقہ جات اور کشمیر میں ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ ان لوگوں کی اس کیس میں دلچسپی ختم ہو چکی تھی۔ رافع کو یقین تھا، اگلی پیشی پر اس کی ضمانت ہو جائے گی۔ پچھلی ملاقات میں قمر النساء کے ساتھ ریاض بھی ملنے آیا تھا۔ اس نے پورا یقین دلایا تھا کہ وہ آزاد ہونے والا ہے۔

☆☆☆

الشفا اسپتال کے ایک ائر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھی ڈاکٹر ریحانہ نے یو ایس بی لیپ ٹاپ کے ساتھ منسلک کی اور مختلف فائلز مسٹر رابرٹ اور مسٹر ناظمی کو میل کرنے لگی۔ اپنا کام مکمل کر کے اس نے لیپ ٹاپ ایک جانب سرکا دیا اور میز پر رکھا ایک بٹن دبا دیا جس سے باہر ایک بیل بجی۔ یہ اشارہ تھا اب مریض چیک اپ کے لیے اندر بھیجے جا سکتے ہیں۔ دیہات کے رہنے والوں کی جہالت نے ڈاکٹر ریحانہ کے کام کو آسان بنا دیا تھا۔ ڈاکٹر ریحانہ نے دیہات میں اپنی این جی او کے تمام سینٹرز میں جہاں اس کا اپنا عملہ تھا، سمجھا دیا تھا کہ کس طرح پڑھے لکھے، جاہل اور غریب لوگوں کو ابارشن کی جانب راغب کرنا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے پاس سب سے بڑا ہتھیار بیٹی پیدا ہونے کا ڈر تھا۔ جاہل لوگ بیٹی کا سن کر فوراً ابارشن کے لیے راضی ہو جاتے۔ اگر کوئی پڑھا لکھا آ جاتا تو اسے پیچیدگیوں کا بتا کر راضی کر لیا جاتا۔ جتنی تیزی سے وہ کام رہی تھی، اتنی ہی تیزی سے اس کے اکاؤنٹ میں رقم بڑھتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر ریحانہ اس بات سے بے خبر اپنے مذموم عزائم کی تکمیل میں مشغول تھی کہ کوئی اس کا قریبی ساتھی اس کی ٹوہ میں لگ چکا ہے۔ اور اس کی وجہ سے وہ اپنی زندگی کے اذیت ناک ترین دور کے قریب ہوتی جا رہی ہے۔

☆☆☆

رافع جیسے ہی محبوب بھائی کے سامنے پہنچا، محبوب بھائی نے آگے بڑھ کر ''میرا کاکا'' کہتے ہوئے اسے گلے سے لگا لیا۔ رافع کی ضمانت ہوئے آج دوسرا دن تھا۔ پہلا دن وہ اپنی ماں کے ساتھ گزار کر سیدھا محبوب بھائی کے پاس پہنچا تھا۔

"مجھے پتا تھا تو ضرور آئے گا۔" محبوب بھائی اُسے سینے سے لگاتے ہوئے بولے۔

"آپ سے تو ملنا ہی تھا محبوب بھائی۔ مجھے بہت سے کام کرنے ہیں جس کے لیے مجھے آپ کی رہنمائی کی بہت ضرورت ہے۔ رفیق نے آپ کے متعلق مجھے سب بتا دیا ہے۔" یہ کہہ کر رافع نے محبوب بھائی کی طرف مسکرا کر دیکھا اور پاس رکھی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ "مگر محبوب بھائی ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ نے مجھے کاکا کیوں کہا حالانکہ میں بہت بڑا ہوں۔" اب مسکرانے کی باری محبوب بھائی کی تھی۔

"تجھے دیکھ کر کوئی یاد آجاتا ہے۔ اب یہ مت پوچھنا وہ کون ہے۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔" محبوب بھائی نے آخری جملہ کہہ کر سر جھکا دیا مگر جلدی سے سر اٹھا کر کہا۔ "تجھے جیل میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی نا؟ میں نے رفیق کو سب سمجھا دیا تھا۔" اب محبوب بھائی کا ہاتھ رافع کے کندھے پر رکھا ہوا تھا۔

جیل کی بات سن کر رافع نے چونک کر محبوب بھائی کی طرف دیکھا اور سوچنے لگا محبوب بھائی کو سب کچھ بتا دیا جائے یا نہیں۔ پھر کچھ سوچ کر رافع نے سب کچھ محبوب بھائی کو بتا دیا۔ جسے سن کر محبوب بھائی کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ رافع سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

"تو فکر مت کر، ان دونوں کو تو میں نہیں چھوڑوں گا۔" محبوب بھائی کھڑے ہو گئے۔ "اور ایس ایچ او فتح ملک کو کتے کی موت ماروں گا۔"

"نہیں محبوب بھائی! یہ میرے شکار ہیں۔ بس آپ میری تھوڑی مدد کر دینا۔ مجھے کچھ چیزوں کی ضرورت ہوگی جن سے میرا کام آسان ہو جائے۔" رافع بھی کھڑا ہو گیا۔

"کاکے میرے بچے......! میرے ہوتے ہوئے تو کیوں پریشان ہوتا ہے۔ میں ہوں نا......تو......"

"نہیں محبوب بھائی اس طرح میرے سینے کی آگ نہیں بجھے گی۔ مجھے سکون نہیں ملے گا۔" رافع نے محبوب بھائی کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔

اسی اثنا میں رافع کے موبائل پر کال آنے لگی۔ اس نے اٹینڈ کی۔

"جی امی...... میں دوست سے ملنے آیا ہوں، بس ایک گھنٹے میں آرہا ہوں۔" رافع نے موبائل جیب میں رکھا اور محبوب بھائی کو کندھوں سے پکڑ کر دوبارہ بٹھا دیا۔

"محبوب بھائی فون پر چیزوں کی تفصیل بتادوں گا۔ آج تو امی کے ساتھ کہیں جارہا ہوں۔ کل ملتا ہوں آپ سے۔ اب یہ ہی میرا دوسرا گھر ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔" رافع نے آخری جملہ مسکراتے ہوئے کہا تو محبوب بھائی کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ محبوب بھائی رافع کو جاتا ہوا دیکھ رہے تھے اور انہیں اپنے چھوٹے بھائی کی یاد آرہی تھی جو ایک جھگڑے میں انہیں بچاتے ہوئے گولی کا نشانہ بن گیا تھا۔

رافع جب گھر پہنچا تو قمرالنساء تیار بیٹھی تھیں۔ انہیں رخسانہ کے گھر جانا تھا۔ رافع کی ضمانت کی خوشی میں رخسانہ نے ان کی دعوت کی تھی۔ رافع سے مل کر رخسانہ اور نادر بہت خوش ہوئے۔ ابھی کھانا نہیں کھایا گیا تھا۔ انہیں فریال کا انتظار تھا جو پہنچنے والی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد فریال بھی پہنچ گئی۔ سب نے مل کر کھانا کھایا۔ قمرالنساء اور رخسانہ باتوں میں لگ گئیں۔ حماد، نادر کے ساتھ کمپیوٹر میں کوئی مسئلہ حل کرنے میں لگ گیا۔ فریال اور رافع باتیں کرنے لگے۔ کچھ دیر میں ہی رافع سب سے بے تکلف ہو چکا تھا۔ فریال نے جب بتایا کہ وہ الشفا اسپتال میں کام کرتی ہے تو رافع کا ماتھا ٹھنکا۔ رفیق کے ذریعے اسے محبوب بھائی کی ٹریجڈی کا پتا چل گیا تھا۔ ان کی بیوی نے اسی اسپتال میں دم توڑا تھا۔ رافع نے جب محبوب بھائی والے کیس کا فریال کو بتایا، تو فریال چونک گئی، کیونکہ یہ مسئلہ اس کے جوائن کرنے سے پہلے کا تھا۔ اس کے بعد فریال نے کھل کر رافع کو اپنی پریشانی بتادی۔ جو اسے بہت دنوں سے لاحق تھی۔ رافع نے فریال سے موبائل نمبر لے لیا۔

☆☆☆

جب سے رافع ضمانت پر رہا ہو کر آیا تھا، تب سے قمرالنساء کو اس کے مستقبل کی فکر نے آن گھیرا تھا۔ مگر رافع سارا سارا دن نجانے کہاں غائب رہنے لگا تھا۔ اس کی ضمانت ہوئے دس دن ہو چکے تھے، وہ بمشکل دو دن گھر میں رہا تھا۔ صبح نکلتا، رات گئے گھر میں گھستا۔ ایک دوبار انہوں نے پوچھا بھی مگر رافع نے دوستوں کا کہہ کر ٹال دیا۔ آج جب وہ عشا کی نماز سے فارغ ہوئیں تو رافع گھر میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چرمی بیگ تھا۔ وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا اور دس منٹ بعد باہر نکلا تو اس کے چہرے پر دبا دبا سا جوش تھا۔ ماں پر نظر پڑتے ہی وہ ان کی طرف دیکھ کر مسکرایا مگر ماں کی نظروں سے اپنی کیفیت چھپا نہ سکا۔

"امی کیا پکایا ہے؟ بہت زوروں کی بھوک لگی ہے۔"

وہ ماں سے نظریں چُراتا ہوا کھانے کی میز کی جانب بڑھ گیا۔ کھانے کے دوران بھی وہ خاموش رہا۔ بس حماد کی باتوں کا ہوں، ہاں میں ہی جواب دے رہا تھا۔ کھانا کھا کر جب رافع اٹھا تو اس کے چہرے پر گمبھیر سنجیدگی طاری تھی۔ رافع کو دیکھ کر قمر النساء کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ ان کی ہمت نہیں ہوئی، رافع سے کچھ پوچھنے کی۔ کیونکہ اسی سنجیدگی کو فاروق احمد کے چہرے پر اس وقت دیکھا کرتی تھیں جب وہ کوئی اہم کام کرنے جا رہے ہوتے تھے۔

☆☆☆

فریال کے لیے فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا۔ گھر کے اخراجات اس کی نوکری کی وجہ سے بہتر حالت میں پورے ہو رہے تھے۔ نادر اپنی پڑھائی کا خرچہ ٹیوشن پڑھا کر پورا کر لیتا تھا۔ فریال کے لیے نوکری کرنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ دوسرے پیشوں کی طرح اس مقدس پیشے کو بھی بددیانت لوگوں نے بدنام کر کے رکھ دیا تھا۔ آئے دن اسپتال میں آبرو ریزی، چوری اور غفلت کے کیس سامنے آ رہے تھے۔ نرسنگ کا پیشہ اختیار کرنے والی لڑکیوں کو ایسی نظر سے دیکھا جاتا جیسے وہ چلتی پھرتی جسم فروش ہوں۔ اتنے عرصے نرسنگ کے شعبے سے وابستہ ہونے کی وجہ سے وہ اتنا تو جان چکی تھی کہ لوگ کچھ غلط بھی نہیں سوچتے تھے۔ اس پیشے سے وابستہ اکثر لڑکیاں واقعی مختلف کرپشن میں ملوث تھیں اور پیسے کی ہوس میں مختلف طریقے اختیار کر جاتی تھیں۔ یہ سب حالات دیکھ کر اس کا دل اپنے پیشے سے اُچاٹ ہوتا جا رہا تھا۔ فریال نے سوچ رکھا تھا، وہ جب تک اس پیشے سے وابستہ ہے، کبھی غلط کام اور راستے پر نہیں چلے گی۔ لیکن اب اس کا اپنے پیشے سے وابستہ لوگوں کے بھیانک چہروں سے..... واسطہ پڑ چکا تھا۔ جس کا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اسے بس نادر کی جاب لگنے کا انتظار تھا۔ پھر وہ یہ نوکری چھوڑ دیتی... اور درس و تدریس سے وابستہ ہو جاتی۔ رافع نے اسے نوکری نہ چھوڑنے کا مشورہ دیا تھا اور اس کے ذمے ایک کام لگا دیا تھا۔ جسے وہ خود بھی پورا کرنا چاہتی تھی۔ آج اسے موقع مل گیا تھا۔ ڈاکٹر ریحانہ مریض دیکھتے ہوئے اچانک ایمرجنسی میں کہیں چلی گئی تھی۔ پچھلے ایک ہفتے سے وہ ڈاکٹر ریحانہ کے ساتھ او پی ڈی میں تھی۔ اسے ڈاکٹر ریحانہ کے لیپ ٹاپ کا پاس ورڈ معلوم کرنا تھا۔ جو اس نے چار دن میں ہی معلوم کر لیا تھا۔ ڈاکٹر ریحانہ، فریال کی موجودگی میں بے فکر ہو کر لیپ ٹاپ آن کر لیا کرتی تھی۔ فریال کو پاس ورڈ زبانی یاد ہو گیا تھا۔

"فریال......! میں جا رہی ہوں۔ باقی رہ جانے والے مریضوں کو ڈاکٹر فردوس کی او پی ڈی میں چیک کروا دو۔ سب مریضوں کو کہنا کل اپنی رپورٹس مجھے ہی چیک کروائیں۔" ڈاکٹر ریحانہ نے جلدی جلدی سامان سمیٹتے ہوئے فریال کو ہدایات دیں اور کمرے سے نکل گئی۔

فریال نے باہر آ کر کاؤنٹر پر ڈاکٹر ریحانہ کی ہدایت نوٹ کرائیں اور تیزی سے واپس روم میں آ گئی۔ دروازہ لاک کر کے، اس نے جلدی سے لیپ ٹاپ نکالا اور پاس ورڈ ڈال کر آن کر لیا۔ یونیفارم کی جیب سے یو ایس بی نکالی اور فائلیں کاپی پیسٹ کرنے لگی۔ ایک ڈرائیو سے کاپی کرنے کے بعد، اس نے دوسری ڈرائیو اوپن کی۔ ڈرائیو کو خالی دیکھ کر چونک گئی۔ ڈرائیو کی پراپرٹی آپشن سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ڈرائیو میں کچھ ہے۔ جو چھپایا ہوا ہے۔ اس نے فوراً... فولڈر شو کیے تو ایک بار پھر چونک گئی۔ اس کے سامنے دو فولڈرز نظر آئے۔ ان کو بھی شو کرنے کے بعد ایک ساتھ سلیکٹ کر کے یو ایس بی میں کاپی کرنے لگی۔ کاپی کرنے کے بعد اس نے لیپ ٹاپ واپس اسی جگہ پر رکھ دیا، جہاں سے اٹھایا تھا۔ کمرے کی لائٹس بند کر کے وہ دھڑکتے دل کے ساتھ باہر آ گئی اور اپنے کام... میں لگ گئی۔ اب اسے رافع سے ملنا تھا اور یو ایس بی اسے دینی تھی مگر اس سے پہلے وہ نادر سے ان فائلز کی تفصیلات جاننا چاہتی تھی۔ وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ ان فائلز میں ایسا کیا ہے، جو ڈاکٹر ریحانہ کے ساتھ ساتھ رافع کے لیے بھی ضروری ہے۔ شام کو جیسے ہی ڈیوٹی کا وقت ختم ہوا، وہ جلدی جلدی اسپتال سے باہر آئی۔ اسپتال کی گاڑی کا بھی انتظار نہیں کیا اور رکشا پکڑ کے گھر پہنچ گئی۔ نادر صحن میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ فریش ہو کر جب وہ باہر آئی تو نادر کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا، اپنا کام شروع کرنے والا تھا۔ فریال، بھائی کے ساتھ آ کر بیٹھ گئی۔ نادر نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

"بھائی! آپ سے ایک کام ہے۔" فریال نے کہا تو نادر مسکرانے لگا۔

"تمہارے بیٹھنے کے انداز سے ہی سمجھ گیا تھا کہ تمہیں کوئی کام ہے۔ بولو......!" نادر نے کرسی تھوڑی سی پیچھے سرکالی۔

فریال نے اپنی ہتھیلی نادر کے سامنے پھیلا دی جس پر یو ایس بی رکھی ہوئی تھی۔

"بھائی! اس میں کچھ فائلز ہیں۔ مجھے پتا کرنا ہے، ان فائلز میں کیا ہے؟" فریال اپنی کرسی آگے سرکاتے ہوئے بولی۔

"ہمم۔ لاؤ دیکھتے ہیں، کیا لائی ہو۔" نادر نے یو ایس بی اس کے ہاتھوں سے لی اور کمپیوٹر میں لگادی۔ یکے بعد دیگرے نادر فائلز کھولتا گیا۔ دونوں بہن بھائی پڑھتے گئے۔ جیسے جیسے وہ فائلز پڑھتے جارہے تھے، ویسے ویسے اُن کے چہروں کے تاثرات بدلتے جارہے تھے۔

☆☆☆

اس نے ایک بار پھر بیگ میں سب چیزیں چیک کیں، اطمینان کر کے بیگ کندھے پر ڈالا اور گھر سے نکل کر گلی میں کھڑی اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے سڑک پر آگیا۔ آج اس کی منزل وہ جگہ تھی، جہاں اس نے اپنے دو دشمنوں کا شکار کرنا تھا۔ وہ پانچ دن سے مسلسل نگرانی کر رہا تھا۔ آج ہیڈ کانسٹیبل کے بیٹے کا ولیمہ تھا۔ رافع کو جن کا شکار کرنا تھا، وہ ولیمے میں شریک تھے۔ ان کی واپسی گیارہ بجے تک متوقع تھی۔ اسے ایسے ہی وقت کا انتظار تھا۔ بڑی سڑک سے دائیں جانب نکلنے والی ذیلی چھوٹی سڑک جس کے دونوں اطراف درخت قطار میں لگے ہوئے تھے۔ اسی سڑک پر ایک فرلانگ دور جا کر اس نے ایک جگہ اپنی موٹر سائیکل روکی اور بیگ سے ٹارچ نکال کر جگہ کا معائنہ کرنے لگا۔ سڑک کے دوسری جانب لگے درخت کا انتخاب کر کے اس کے تنے پر ایک بڑی سی کیل ٹھونک دی اور دوسری طرف لگے درخت کا اندازہ کرنے لگا۔ پھر بیگ سے ایک پتلی مگر مضبوط رسی نکال کر کیل میں باندھ دی اور رسی لے کر سڑک کی دوسری طرف آکر درخت کے پاس لا کر چھوڑ دی۔ اور خود درخت کے ساتھ بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ رات کے اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ مگر وہ اس ون ٹو فائیو کی آواز پہچانتا تھا۔ جس پر سوار ہو کر اس کے شکار اپنی موت کی مقررہ... جگہ پر پہنچتے۔

اس نے گھڑی میں ٹائم دیکھا، گیارہ بج کر دس منٹ ہو چکے تھے۔ اس نے اپنا ریوالور نکالا گولیاں چیک کیں اور سائیلنسر فٹ کر کے چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔ دس منٹ کے انتظار کے بعد اسے ون ٹو فائیو کی آواز سنائی دی۔ جیسے جیسے آواز قریب آتی جارہی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکنوں کی رفتار بڑھتی جارہی تھی۔ خون اس کی کنپٹی پر ٹھوکریں مارنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت اتر آئی۔ اس کے ربڑ کے ملائم دستانے پسینے سے بھیگ گئے تھے۔ اس نے اپنی سانسوں کو بحال کیا اور پھر جیسے ہی بائیک کی روشنی قریب پہنچی۔ اس نے رسی کو کھینچ کر درخت کے ساتھ لپیٹ دیا۔ بائیک رسی سے ٹکرائی، اس کا توازن بگڑا اور وہ سلپ ہو کر روڈ پر دور تک گھسٹتی ... چلی گئی۔ جیسے ہی اس کے دونوں شکار سڑک پر گرے، وہ درخت کی اوٹ سے نکلا اور بھاگتا ہوا ان کے سروں پر پہنچ گیا۔ سب سے پہلے اس نے اپنے ایک شکار کے سینے پر ٹانگ رکھ کر، سر میں گولی ماری، جو نشے میں گالیاں دیتا ہوا اٹھ رہا تھا، اب ہمیشہ کے لیے لیٹ گیا۔ پھر اطمینان سے تھوڑے فاصلے پر پڑے دوسرے شکار کی طرف دیکھا۔ جو حیرت سے اسی کی جانب دیکھ رہا تھا اور اس کی آنکھیں اندھیرے میں آخری حد تک کھلی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک سائے کو اپنے ساتھی کو گولی مارتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ گرنے کی وجہ سے ٹانگ میں لگی چوٹ کو بھول کر پیٹ پر ہاتھ مارنے لگا۔ وہ اپنا ریوالور ڈھونڈ رہا تھا، جو گرنے کی وجہ سے بیلٹ سے نکل کر دور کہیں اندھیرے میں جا پڑا تھا۔ رافع اپنے مرے ہوئے شکار پر ایک نظر ڈال کر دوسرے شکار کی جانب لپکا۔ رافع نے دو قدم آگے بڑھا کر اس کے کولھوں پر لات ماری۔ جس سے وہ روڈ کے کنارے پر پڑے پتھر پر جا پڑا۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ کیونکہ اس کا منہ پتھر سے زور سے ٹکرایا تھا۔ رافع آگے بڑھا اور پتھر پر ہی اس کی گردن پر پاؤں رکھ دیا اور اس کے ماتھے پر اپنے ریوالور کی نال رکھ کر ٹریگر دبا دیا۔ اس کا بھیجا پورے پتھر پر پھیل گیا اور خون زمین کو سرخ کرنے لگا۔ دونوں کو جہنم رسید کر کے، باری باری حقارت سے دیکھا۔ اس کے سینے کی آگ ابھی ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے ذہن میں جیل میں بیتی ہوئی وہ رات گھوم رہی تھی جس رات انہوں نے اس کی روح کو مجروح کیا تھا۔ رافع نے سڑک کے کنارے پڑے ایک بڑے پتھر کو اٹھایا اور باری باری پوری قوت سے دونوں کی ٹانگوں کے درمیان دے مارا۔ رافع نے اپنا کام بمشکل سات آٹھ منٹ میں مکمل کر لیا تھا۔ اپنی سانسوں کو بحال کرتا ہوا وہ درخت سے رسی کھولنے لگا۔ اس کی نظریں اندھیرے میں چاروں طرف گھوم رہی تھیں۔ جلدی جلدی اس نے اپنا سامان سمیٹ کر اپنی موٹر سائیکل درخت کے پیچھے سے نکالی اور تیزی سے بڑی سڑک پر آگیا۔ وہ کوئی پیشہ ور قاتل نہیں تھا... مگر انہی لوگوں نے اسے ایک سفاک قاتل بنا دیا تھا۔ وہ بس اب اپنا انتقام لے رہا تھا۔ آج اس کا اپنی ذات پر ہونے والے ظلم کا پہلا انتقام تھا... مگر

اس کا انتقام ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ ابھی اُسے بہت سے حساب برابر کرنے تھے۔

☆☆☆

زندگی کے نشیب و فراز چاہے کتنے بھی کٹھن ہوں۔ اگر انسان ہمت سے کام لے تو منزل پر پہنچ ہی جاتا ہے۔ اس کی زندگی بھی ایسی ہی کٹھن راہگور سے گزر کر یہاں تک پہنچی تھی۔ پیدائش کے ایک سال کے بعد سے ہی یتیمی کا درد، ماں کی انتھک محنت کا غم اور ماں کا اس کے لیے بڑے بڑے خواب دیکھنا۔ وہ یہ سب بچپن سے ہی جھیلتا، دیکھتا اور سنتا آرہا تھا۔ ماں کی خواہش تھی، بیٹا جوان ہو کر بڑا آدمی بنے۔ اچھے اسکول میں داخل کرایا، پڑھایا لکھایا اور معاشرے کا مفید انسان بنا دیا۔ حالانکہ وہ بچپن سے جسمانی لحاظ سے کمزور تھا۔ اسکول میں ہر کوئی اسے پریشان کرتا اور وہ کچھ نہیں کر پاتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر رو پڑتا تھا۔ اسے یاد ہے، جب ایک بار اسکول سے پھٹے کپڑوں کے ساتھ گھر پہنچا تو اس کی ماں نے اسے اس حال میں دیکھ کر کہا تھا۔ ''بیٹا اگر آگے بڑھنا ہے تو ہر محاذ پر مقابلہ کرنا ہوگا، خود کو مضبوط بنا کر یہ ثابت کرنا ہوگا کہ تم ان سے بہتر ہو، مگر خیال رہے، بھی کسی کے ساتھ زیادتی مت کرنا۔ کبھی کسی کا حق مت کھانا، بھی ظالم کا ساتھ مت دینا، مظلوم کی آہ سے بچنا، انصاف کرنا پھر دیکھنا ہر کوئی تم سے ڈرے گا۔'' وہ دن اور آج کا دن اس نے ماں کی یہ نصیحت اپنے دامن سے باندھ لی۔ آج واقعی وہ اس مقام پر تھا۔

انسپکٹر ذیشان حیدر آنکھیں بند کیے، سر کو کرسی کی پشت سے لگائے پولیس اسٹیشن میں بیٹھا، اپنے ماضی کو یاد کر رہا تھا۔ اپنے دو چیتی بند بھائیوں کے قتل کا کیس اس کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ اسے ابھی تک کوئی کلیو ہاتھ نہیں لگا تھا۔ جائے واردات کا باریک بینی سے جائزہ لینے کے بعد، وہ ابھی تک اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ قاتل ایک ہی تھا اور بہت ہوشیاری اور مہارت سے اپنے کام کو انجام دیا تھا۔ کوئی ثبوت نہیں چھوڑا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق قتل ہونے والے دونوں مقتول نشے کی حالت میں تھے اور دونوں کو سر میں گولی مار کر اور بیدردی سے کچل کر ہلاک کیا گیا تھا۔ دونوں پولیس والوں کا تعلق جیل پولیس سے تھا۔ پولیس والوں کا قتل ہوا تھا، تو انسپکٹر ذیشان پر انتظامیہ اور میڈیا کا دباؤ بھی بہت تھا۔

''سر!'' سیلیوٹ کی آواز پر اس نے آنکھیں کھولیں اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے کانسٹیبل نیاز کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر دبا دبا سا جوش تھا۔

''بولو نیاز......! کیا بات ہے؟''

''سر! نصیر اور سلیم کے کیس میں، میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔'' نیاز کی بات سن کر انسپکٹر ذیشان نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ نیاز واقعی ایک ہوشیار پولیس والا تھا، ایمان دار اور دلیر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھا شوٹر بھی تھا۔ فٹنس بھی لاجواب تھی۔ والی بال کا بہترین کھلاڑی تھا۔ اس کے اندر کچھ کر دکھانے کا جذبہ تھا۔ ڈیوٹی پر ہر وقت چاق و چوبند رہتا، جس کی وجہ سے انسپکٹر ذیشان اسے پسند کرتا تھا۔ اسٹیشن کے ساتھ بنے کوارٹر میں ہی رہتا تھا۔

''ٹھیک ہے، مگر تم کچھ بھی میری اجازت کے بغیر نہیں کرو گے۔ اگر کچھ کرنا پڑ بھی جائے تو مجھے ضرور اطلاع کرو گے۔'' انسپکٹر ذیشان نیم رضامندی ظاہر کرتے ہوئے بولا۔ دونوں کا مزاج ایک ہی تھا۔ ذیشان جانتا تھا، نیاز جارحانہ حکمتِ عملی اختیار کرتا ہے۔ جو کبھی ناکام اور اکثر کامیاب ہو جاتی ہے۔

''جی سر! میں خیال کروں گا مگر......'' نیاز کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

انسپکٹر ذیشان نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''مگر سر! میں چاہتا ہوں سلیم اور نصیر کے قاتل کو زندہ پکڑا جائے۔ کیونکہ سلیم اور نصیر ہمارے محکمے پر کلنک کا ٹیکا تھے۔ ان کو مارنے والا یقیناً کوئی اچھا انسان ہے۔ جس کو کم سے کم سزا ملنی چاہیے۔''

نیاز نے اپنی بات پوری کی تو انسپکٹر ذیشان کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور نیاز کو جانے کا اشارہ کر دیا۔ نیاز سیلیوٹ مار کر باہر نکل گیا۔

☆☆☆

رستم شاہ کے لیے زمین حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اپنے اثر و رسوخ کی بنیاد پر اس نے مری کے نواح میں اسپتال کے لیے زمین حاصل کر لی تھی۔ تمام معاملات طے ہو چکے تھے۔ تعمیراتی کام بھی دو تین دن میں شروع ہونے والا تھا۔ رستم شاہ اور ناظمی مری کے ایک ریسٹ ہاؤس میں مقیم تھے۔ وہ دوپہر کا وقت تھا۔ مری کو بادلوں نے گھیر رکھا تھا۔ جس کی وجہ سے سردی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ رستم شاہ اپنے کمرے سے موسم کا مزہ لینے باہر نکلا اور ٹہلتا ہوا ابھی ناظمی کے کمرے کے دروازے کے سامنے

پہنچا ہی تھا کہ اچانک ٹھٹک کر رک گیا۔ ناظمی کے کمرے سے زور زور سے بولنے کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ناظمی فون پر کسی کو ڈانٹ رہا ہو۔ رستم شاہ دروازے سے کان لگا غور سے سننے لگا۔ جیسے جیسے وہ باتیں سنتا گیا، ویسے ویسے اس کی آنکھیں حیرت سے کھلتی جا رہی تھیں۔ ناظمی کی آواز بند ہوتے ہی وہ تیزی سے پلٹا اور اپنے کمرے میں آ کر ڈاکٹر ریحانہ کو کال کرنے لگا۔ ڈاکٹر ریحانہ اس وقت مریضوں کو دیکھ رہی تھی۔

''مسٹر شاہ! میں آپ کو تھوڑی دیر بعد خود کال کرتی ہوں۔ پھر تفصیل سے بات کرتے ہیں۔'' ڈاکٹر ریحانہ کا جواب سن کر رستم شاہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کو اس بات کا پہلے ہی شک تھا مگر آج خود اپنے کانوں سے سن کر اسے یقین ہو گیا تھا کہ ناظمی ہی اس پورے سیٹ اَپ کا کرتا دھرتا ہے۔ رابرٹ محض ایک مہرہ ہے۔ جسے سامنے رکھ کر ناظمی پاکستان میں اپنا کام خود اپنی نگرانی میں کروا رہا ہے۔ اسے بے چینی سے ڈاکٹر ریحانہ کی کال کا انتظار تھا۔

☆☆☆

انسپکٹر ذیشان ایک ذہین پولیس افسر تھا مگر پچھلے کیس نے اسے بری طرح الجھا دیا تھا۔ اس کے دماغ میں نیاز کی ایک بات گونج رہی تھی ''کہ یہ قتل کسی اچھے انسان نے کیے ہیں'' جب سے اس نے سلیم اور نصیر کی ڈیپارٹمنٹ فائلز دیکھی تھیں۔ کافی حد تک وہ نیاز کی بات سے متفق ہو چکا تھا اور چاہتا تھا کہ قاتل کو زندہ گرفتار کرے، کیونکہ ایک تو دونوں مقتولین کا ریکارڈ بہت خراب تھا۔ سیاسی بنیاد پر بھرتیوں کی وجہ سے انہوں نے اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ مل کر جیل میں اپنی دھاک بٹھا دی تھی۔ انسپکٹر ذیشان کے سامنے سلیم اور نصیر کی فائلز کھلی پڑی تھیں۔ بظاہر تو وہ سر جھکائے، ان کی ورق گردانی کر رہا تھا مگر اس کا دماغ مسلسل سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ نیاز کو اس نے صبح ہی جیل بھیج دیا تھا۔ تا کہ کچھ معلومات مل سکے جو قاتل کو پکڑوانے میں مدد دے سکے۔ نیاز کی صلاحیتیں اور اس کیس میں اس کا جوش و خروش عروج پر تھا۔ وہ جس تندہی سے کام کر رہا تھا، ذیشان کو قوی گمان تھا جیل سے نیاز کوئی نہ کوئی کلیو لے کر ہی آئے گا۔ دو گھنٹوں کے انتظار کے بعد ذیشان کا گمان یقین میں بدل گیا۔ نیاز جب آفس میں داخل ہوا تو اس کے چہرے پر کامیابی کا جوش مارتا دریا لہریں مار رہا تھا۔ ایک پیپر پر موجود ساری تفصیلات کی صورت میں نیاز نے جب اس دریا کا رخ انسپکٹر ذیشان کی جانب موڑا تو انسپکٹر ذیشان کی آنکھوں کی چمک یکدم بڑھ گئی، جس کی تحسین آمیز روشنی نیاز کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ نیاز واقعی ایک ایسے راز کا کھوج لگا کر لایا تھا، جس راز کو افشاں کرنے انسپکٹر ذیشان فوراً کھڑا ہو گیا۔

''نیاز...... ! ہم سادہ لباس میں جائیں گے۔ تم فوراً وردی بدل کر آؤ میں اپنی گاڑی نکالتا ہوں۔''

''یس سر۔'' نیاز نے سیلوٹ مارا اور کمرے سے نکل گیا۔

انسپکٹر ذیشان ضروری سامان لے کر پولیس اسٹیشن سے باہر آ گیا۔ نیاز پانچ منٹ میں ہی تیار ہو کر پہنچ گیا۔ انسپکٹر ذیشان اس کی پھرتی پر مسکرا کر رہ گیا۔ نیاز کے گاڑی میں بیٹھتے ہی انسپکٹر ذیشان نے گاڑی اپنے فلیٹ کی جانب موڑ دی، جہاں وہ اکیلا رہتا تھا۔ نیاز کو گاڑی میں چھوڑ کر، وہ خود جلدی سے فلیٹ پر پہنچا، جو پہلی ہی منزل پر تھا۔ اس نے جلدی جلدی وردی تبدیل کی اور گاڑی میں آ بیٹھا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ اسے دیکھ کر نیاز بھی الرٹ ہو گیا۔

☆☆☆

نادر کے کمرے میں گمبھیر خاموشی طاری تھی۔ رافع، فریال اور نادر تینوں گہری سوچ میں گم ـــ تھے۔ رافع نے فریال کے ذمے یہی کام لگایا تھا کہ وہ الشفا اسپتال کے متعلق معلومات حاصل کرے کہ وہ کس مقصد کے لیے کام کر رہا ہے۔ اس کی فنڈنگ اور پشت پناہی کون کر رہا ہے۔ فریال نے ابتدائی معلومات ہی ایسی فراہم کر دی تھیں کہ اب کسی اور معلومات کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔

''میرے خیال سے ہمیں پولیس کو اطلاع دے دینی چاہیے۔'' نادر نے خاموشی کو توڑا۔

''کوئی فائدہ نہیں ہو گا میرے بھائی! ان لوگوں کی پشت پر بڑے بڑے ہاتھ ہیں۔ وہ صاف بچ جائیں گے۔'' رافع نے نادر کو جواب دیا۔

''اس صورت حال میں ہم کیا کر سکتے ہیں؟'' فریال نے رافع کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا۔ فی الحال تم لوگ اس بات کا ذکر کسی سے نہیں کرنا۔ کیونکہ یہ بہت خطرناک بات ہے اور خاص طور تم!'' رافع نے فریال کو دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر گویا ہوا۔ ''تم اپنی ڈیوٹی ویسے ہی سرانجام دیتی رہو، جیسے دیتی آ رہی ہو۔ کیونکہ ابھی کچھ اور معلومات درکار ہوں گی۔'' رافع نے یہ کہہ کر اپنا رخ نادر کی جانب کیا اور

دونوں بہن بھائی کو آگے کی پلاننگ سمجھانے لگا۔

☆☆☆

جب کڑی سے کڑی ملتی ہے تو ایک ذہین انسان کامیابی ضرور حاصل کرلیتا ہے۔ اگر انسان اپنے کام سے مخلص ہو تو کامیابی کی منزل خود اس کے قدموں کی جانب لپکتی ہے۔ انسپکٹر ذیشان کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ پانچ دن کی بھاگ دوڑ کے بعد بالآخر وہ قاتل کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا بلکہ ایک طویل ملاقات بھی کر چکا تھا۔ ملاقات کے بعد واپسی میں گاڑی میں گمبھیر خاموشی طاری تھی۔ انسپکٹر ذیشان کی آنکھوں میں فاتحانہ چمک تھی اور چہرے پر گہری سنجیدگی، اس کے چہرے سے لگ رہا تھا جیسے وہ گہری سوچ میں ہو۔ نیاز کچھ کہنے کے لیے منہ کھولتا مگر جب اس کی نظر انسپکٹر ذیشان کے سنجیدہ چہرے پر پڑتی، وہ اپنا منہ بند کرلیتا۔ انسپکٹر ذیشان اور نیاز شہر کے مضافات سے کامیاب و کامران لوٹ رہے تھے مگر ان کے ساتھ قاتل نہیں تھا۔

''سر! میں کچھ سمجھا نہیں۔'' نیاز سے رہا نہیں گیا بالآخر اس کی چپ نے صبر کا دامن چھوڑ دیا۔ انسپکٹر ذیشان نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا اور گاڑی کو پولیس اسٹیشن کی جانب موڑتے ہوئے بولا۔

''نیاز! معاملہ بہت گمبھیر ہے اور حل طلب بھی۔ اگر اس معاملے کو سمجھنا ہے تو تھوڑا صبر کرنا ہوگا اور ہاں...... تمہیں میرا ساتھ دینا ہے۔ میں تم پر بھروسا کرتا ہوں۔'' انسپکٹر ذیشان نے بظاہر تو نیاز کو مطمئن کیا تھا مگر نیاز انسپکٹر ذیشان کا مطلب سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے۔

''یس سر! آپ مجھ پر بھروسا کرسکتے ہیں، آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔'' نیاز نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پُرجوش لہجے میں کہا تو انسپکٹر ذیشان کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اسی اثنا میں وہ پولیس اسٹیشن پہنچ چکے تھے۔

☆☆☆

کمرے میں بلب کی زرد ملگجی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ یہ محبوب بھائی کے گھر کا کمرا تھا۔ جس کے ایک جانب پلنگ پر رافع اور اس کے ساتھ رکھی کرسی پر فریال بیٹھی تھی۔ محبوب بھائی اور نادر ایک ساتھ رکھی کرسیوں پر براجمان تھے۔ بظاہر وہ ہلکی پھلکی باتیں کر رہے تھے لیکن انہیں کسی کا انتظار تھا۔ تھوڑی دیر بعد کمرے کے باہر بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ منتظر اندر داخل ہوا تو چاروں نے اس کا مسکرا کر استقبال کیا۔ رافع اور محبوب بھائی نے اٹھ کر ہاتھ ملایا۔ نادر نے ہاتھ ملا کر اسے اپنے پاس ہی بٹھالیا۔

''ہاں بھئی کاکے! کیسی گزر رہی ہے زندگی؟'' آنے والے نے بے تکلفی سے رافع سے پوچھا۔ آنے والے کی بات سن کر محبوب بھائی کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ محبوب بھائی کی دیکھا دیکھی محبوب کے جاننے والے قریباً سبھی رافع کو کاکا ہی بلانے لگے تھے۔

''جی بھائی! سب ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔'' رافع نے جواب دیا اور نادر کی طرف اشارہ کر کے لیپ ٹاپ نکالنے کو کہا۔

سب نے نادر کی جانب دیکھا جو لیپ ٹاپ نکال چکا تھا۔

''میرے خیال سے جس کام کے لیے ہم اکٹھے ہوئے ہیں، وہ کرلیا جائے۔'' رافع نے کہا اور اٹھ کر دیوار کے ساتھ لگی ایک چھوٹی سی میز کو ہاتھ بڑھا کر سرکا کر درمیان میں لے آیا اور لیپ ٹاپ اس پر رکھ دیا۔

نادر نے لیپ ٹاپ کھولا اور اس کا رخ تھوڑا سا آنے والے کی جانب کردیا۔ آنے والے نے ایک نظر رافع کو دیکھا۔

''یہ کچھ فائلز ہیں۔ جن کو دکھانے کے لیے آپ کو بلایا ہے۔'' نادر لیپ ٹاپ کے پیڈ پر انگلیاں گھماتے ہوئے بولا۔

رافع دونوں کے پیچھے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا۔ نادر ایک ایک کر کے فائلز کی تفصیلات آنے والے کو بتانے لگا۔

وہ ہونٹ بھینچے ساری تفصیلات سن رہا تھا۔

''یہ سب بہت گھناؤنا ہے۔ سب سے زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ انسانی... بہبود کی آڑ میں کھلے عام ہو رہا ہے۔ اس کو روکنا بہت ضروری ہے۔ اور مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانا اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔'' یہ کہہ کر آنے والے نے رافع کی جانب دیکھا جو اب اپنی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ اس سے پہلے کوئی جواب دیتا وہ پھر گویا ہوا۔ ''آپ لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ میں ہر تعاون کرنے کو تیار ہوں۔''

''میں چاہتا ہوں ان انسانیت کے دشمنوں کو نیست و نابود کردوں۔'' رافع کا چہرہ جوش سے سرخ ہو رہا تھا۔

''محبوب بھائی! میں رافع کو اس وقت سے جانتا ہوں، جب یہ اسکول میں پڑھا کرتا تھا۔ یہ اُس وقت بھی ایسا ہی تھا۔ پُرجوش، انسانیت کا درد رکھنے والا اور مجھے یاد

ہے جب رافع کے والد کو سرِعام قتل کر دیا گیا تھا۔ اس وقت یہ پانچویں جماعت میں تھا اور میں اسی اسکول سے میٹرک کا امتحان دے کر فارغ ہوا تھا۔'' آنے والا... انسپکٹر ذیشان تھا جو محبت سے رافع کو دیکھ رہا تھا۔ نادر، فریال اور محبوب بھائی کی نظروں میں بھی رافع کے لیے محبت جھلک رہی تھی۔

''انسپکٹر صاحب! ہم بس یہ چاہتے ہیں کہ اس گھناؤنے کاروبار میں ملوث لوگوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے میں، قانون ہماری راہ میں رکاوٹ نہ بنے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں۔ اگر ہم نے قانون کا سہارا لیا تو ہمیں کچھ حاصل نہیں ہوگا اور ہماری آنے والی نسل اسی طرح دنیا میں آنے سے پہلے ہی ختم کی جاتی رہے گی۔'' محبوب بھائی نے جب اپنا موقف بیان کیا تو انسپکٹر ذیشان کے چہرے پر گہری سوچ کی لکیریں نمایاں ہوگئیں۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا، پین اور اپنا کارڈ نکال کر اس کی پشت پر ایک نمبر لکھا اور... خاموشی سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

''مسٹر ناظمی ہی اصل باس ہے۔ جس کی نگرانی میں ہر کام ہو رہا ہے۔'' یہ انکشاف ڈاکٹر ریحانہ کے لیے حیرت انگیز ہونے کے ساتھ ساتھ فکر انگیز بھی تھا۔ کئی مواقع ایسے بھی آئے تھے جب ڈاکٹر ریحانہ نے کمپنی اور این جی او کی پالیسی اور رابرٹ کے رویے پر مسٹر ناظمی کے سامنے اپنی رائے دی تھی۔ جو کسی بھی لحاظ سے کمپنی اور این جی او کے حق میں نہیں تھی۔ اور اس کی رائے پر رستم شاہ نے بھی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔ وہ لوگ ناظمی کو بھی اپنی طرح کرائے کا آدمی سمجھ رہے تھے۔ لیکن اب پوری حقیقت عیاں ہو کر ان کے سامنے آچکی تھی۔ ان حالات میں دونوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ انجان بن کر اپنے کام کرتے رہیں اور آئندہ سوچ سمجھ کر قدم اٹھائیں۔ رستم شاہ کو فوری طور ایک دن کے لیے کراچی آنا پڑا۔ وہ ڈاکٹر ریحانہ کے ساتھ مل کر ان تمام فائلز اور ثبوتوں کو مٹا دینا چاہتا تھا۔ جن سے ان دونوں کے کھیلوں کا مسٹر ناظمی کو پتا چل جاتا تھا۔

ڈاکٹر ریحانہ اپنے آفس میں بیٹھی، بے تابی سے رستم شاہ کا انتظار کر رہی تھی۔ رستم شاہ کے پیغام کے مطابق وہ ائیرپورٹ سے سیدھا اسی کے پاس آرہا تھا۔

ڈاکٹر ریحانہ کی آفس میز پر اس کے سامنے دو فائلز کے بنڈل رکھے ہوئے تھے جو فریال نے الماری سے نکال کر رکھے تھے۔ فریال، ڈاکٹر ریحانہ کے سامنے ہی کھڑی تھی۔ اس نے اس زاویے سے اپنا موبائل سامنے والی جیب میں رکھا ہوا تھا کہ وہ جہاں گھومتی، وہاں کی پوری ویڈیو ریکارڈ ہو رہی تھی۔

دروازہ کھلنے کی آواز سے وہ اچانک چونک گئی۔ رستم شاہ اندر داخل ہو رہا تھا۔ رستم شاہ نے ایک نظر فریال پر ڈالی اور ڈاکٹر ریحانہ کو سلام کرتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ رستم شاہ کے بیٹھتے ہی ڈاکٹر ریحانہ نے فریال کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔

''اب کیا ہوگا... مسٹر شاہ! میری تو سمجھ میں نہیں آرہا کیا کرنا چاہیے۔'' فریال کے باہر جاتے ہیں ڈاکٹر ریحانہ نے بے تابی سے سوال کیا۔

''کچھ نہیں ہوگا۔ آپ فکر مت کریں۔ بس وہ تمام فائلز اور پیپرز غائب کر دیں... جن کی موجودگی سے ہمارے فنڈز میں غبن کے ظاہر ہونے کا خطرہ ہو سکتا ہے۔'' رستم شاہ کرسی آگے کی جانب سرکاتے ہوئے بولا۔

''آپ ایسا کریں! اِن فائلز کو دیکھیں۔ میں لیپ ٹاپ سے فائلز ریمو کرتی ہوں۔'' ڈاکٹر ریحانہ لیپ ٹاپ میں پاس ورڈ ڈالتے ہوئے بولی۔ ''یہ کام میں پہلے بھی کر سکتی تھی مگر میں چاہتی تھی، ہم دونوں میں اعتماد کی فضا قائم رہے۔''

''ہمم......'' رستم شاہ نے اپنا سر ہلایا اور سامنے رکھی فائلز کا ایک بنڈل کھولنے لگا۔

ڈاکٹر ریحانہ نے جیسے ہی کمپیوٹر میں ڈرائیو اوپن کی ایکدم چونک سی گئی اور اپنے ماتھے کو کھجانے لگی۔ اس کے اہم ترین فولڈرز جن کو وہ چھپا کر رکھتی تھی، وہ سامنے شو ہو رہے تھے۔ اسے اچھی طرح یاد تھا آخری بار جب اس نے فائلز سیو کی تھیں تو ان فولڈرز کو چھپایا تھا۔ اس نے اپنی پریشانی رستم شاہ پر ظاہر نہیں ہونے دی اور اپنے کام میں لگ گئی۔

☆☆☆

موبائل پر آنے والے پیغام کو پڑھتے ہی رافع کے چہرے پر پُراسرار مسکراہٹ دوڑ گئی۔ رات کا ایک بج چکا تھا۔ بجلی شام سے ہی گئی ہوئی تھی۔ دو دن بارش ہونے کے بعد آج سارا دن موسم ابر آلود رہا تھا۔ ابھی بھی حبس سے بُرا حال تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کبھی بھی بارش ہو سکتی ہے۔ وہ اس وقت اپنے کمرے میں لیٹا ہوا سوچوں میں گم تھا۔ وہ اسی پیغام کے انتظار میں جاگ رہا تھا جو ابھی ابھی ملا تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھا اور اپنے بیڈ کے نیچے رکھے، ایک ٹرنک

سے اپنا بیگ نکال لیا۔ آج رات رافع وہ کام کرنے جا رہا تھا۔ جس کام کو کرنے کے لیے اس نے دن رات گن گن کے گزارے تھے۔ بیگ میں اپنے کام کی سب چیزیں تیار حالت میں رکھ کر، دبے پاؤں کمرے سے نکلا اور مین گیٹ کی جانب بڑھ گیا۔ یو پی ایس چلنے کی آواز برآمدے میں گونج رہی تھی۔ حماد کے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی۔ جب کہ قمرالنساء کا کمرا اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا، قمرالنساء سو چکی تھیں۔ رافع چاہتا بھی یہی تھا۔ دروازے سے باہر آکر گلی میں کھڑی موٹر سائیکل کو اِن لاک کیا اور اسٹارٹ کیے بغیر گلی کے نکڑ تک لے آیا۔

روڈ پر آتے ہی اس نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور سنسان روڈ پر دوڑانے لگا۔ آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد وہ ایک نئی ہاؤسنگ سوسائٹی میں پہنچ گیا۔ اس نے موٹر سائیکل ایک درخت کے نیچے کھڑی کی اور پیدل ہی زیرِ تعمیر بنگلوں کو کراس کرتے ہوئے، ایس ایچ او فتح ملک کے بنگلے کے عقب میں پہنچ گیا۔ بنگلا سنگل اسٹوری بنا ہوا تھا۔ بنگلے کی عقبی گلی میں بارش کا پانی جمع تھا۔ جس کی رافع کو پروا نہیں تھی۔ آس پاس کے قریباً سبھی بنگلے تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پوری سوسائٹی میں سناٹے کا راج تھا۔ فتح ملک کے بنگلے کے اندر سے جنریٹر چلنے کی آواز آرہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ اسے بادلوں کی اوٹ سے جھانکتے طباق چاند کی روشنی میں دیوار کے ساتھ پانی کا ایک پائپ تھوڑا سا باہر نکلا نظر آیا، جو گھروں میں زیرِ زمین ٹینک بھرنے کے لیے باہر نکال دیا جاتا ہے۔ بنگلے کے اندر لگے درخت کی شاخیں باہر جھکی ہوئی تھیں۔ اس نے بیگ سے دستانے نکال کر پہن لیے، بیگ کو اپنی کمر سے لٹکایا اور ایک نظر اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا پانی کے پائپ پر پاؤں رکھ کر درخت کی شاخ کو پکڑ کر لٹک گیا اور دوسرے ہی لمحے وہ درخت پر تھا۔ درخت کے پتّوں کو ہٹا کر اس نے بنگلے کے اندر کا جائزہ لیا۔ اس نے دیوار اور شاخ کے درمیانی فاصلے کا اندازہ لگایا اور اچھل کر دیوار پر آگرا۔ اور خود کو سنبھال کر دیوار کے اوپر ہی لیٹ گیا۔ اس کی پنڈلی پر دیوار کا کونا لگا۔ ایک تکلیف کی لہر سارے جسم میں دوڑ گئی۔ چند لمحے اپنی تکلیف کو برداشت کرتے ہوئے ایسے ہی لیٹا رہا۔ جب کوئی ردِعمل ظاہر نہ ہوا، تو اس نے دیوار کا کونا پکڑ کے آہستہ سے خود کو اندر چھوڑ دیا۔ اس طرح بغیر آواز پیدا کیے وہ بنگلے کے اندر داخل ہو گیا۔ کچھ دیر گملوں کی اوٹ لے کر وہیں بیٹھا رہا۔ کیونکہ چوکیدار کیبن سے باہر نکل کر ٹارچ کی روشنی چاروں طرف مارنے لگا تھا۔ چوکیدار جیسے ہی دوبارہ کیبن میں گیا وہ دبے پاؤں سے بھاگتا ہوا برآمدے میں آکر ایک ستون کے پیچھے چھپ گیا۔ معلومات کے مطابق صرف ایک دروازہ تھا، جو اسے کھلا ملتا اور وہ دروازہ ستون سے دس قدم کے فاصلے پر تھا۔ چوکیدار کی نظروں میں آئے بغیر اس دروازے تک رسائی ناممکن تھی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے جھک کر لان کی جانب جاتا ہوا پانی کا پائپ پکڑ لیا اور آہستہ آہستہ اپنی جانب کھینچنے لگا۔ جیسے ہی پائپ کا سرا اس کے ہاتھ میں آیا، اس کی محنت وصول ہو گئی۔ پائپ کے سرے پر لوہے کے پائپ کی چھوٹی سی نلکی لگی ہوئی تھی۔ رافع نے وہ نلکی نکالی اور سامنے دیوار پر دے ماری۔ آواز کی گونج پیدا ہوتے ہی اسے کرسی کھسکنے کی آواز سنائی دی۔ وہ الرٹ ہو گیا۔ جیسے ہی چوکیدار کا سایہ ستون کے پاس سے گزر کر آگے بڑھا، اس نے اپنی جگہ چھوڑی اور تیزی سے دروازے کی جانب لپکا۔ چوکیدار ٹارچ کی روشنی دیوار پر مار رہا تھا۔ اس سے پہلے چوکیدار پلٹتا، رافع کمرے میں داخل ہو چکا تھا۔ اسے بنگلے کی پوری بناوٹ سے پہلے ہی آگاہ کر دیا گیا تھا۔ اب وہ بیٹھک نما کمرے میں پہنچ چکا تھا۔ اس نے ایک لمبی سانس لی اور ... بنگلے کے اندر کھلنے والے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ دوسری طرف ایک چھوٹا سا ڈرائنگ روم

رائے

ایک آرٹسٹ نے بیس دن کی زبردست محنت کے بعد اپنی ایک شاہکار پینٹنگ مکمل کی۔ انہوں نے عالم نزع میں ایک شخص کی منظر کشی کی تھی۔ وہ موت کی ہولناکی کو اجاگر کرنا چاہتے تھے۔ اسی روز ان کے دوست نجمی صاحب آگئے جو پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں۔ آرٹسٹ نے بڑے فخر سے اپنی پینٹنگ انہیں دکھائی اور ان کی رائے جاننا چاہی۔

”نجمی صاحب کافی دیر تک مختلف زاویوں سے پینٹنگ کا معائنہ کرتے رہے پھر بولے۔ ”میرے خیال میں تو یہ شخص ملیریا سے مر رہا ہے ویسے نمونیا بھی ہوسکتا ہے۔ بہتر ہے کہ تم کسی اسپیشلسٹ سے بھی رائے لے لو۔“ ڈاکٹر صاحب نے اپنی رائے دی۔

چترال سے محمد رضا کا مشورہ

تھا۔ وہاں صرف صوفے رکھے ہوئے تھے۔
پورے بنگلے میں خاموشی کا راج تھا۔ کیونکہ اس وقت پورے بنگلے کے اندرونی حصے میں فتح ملک اور ایک جسم فروش لڑکی کے سوا کوئی نہیں تھا۔ وہ کئی دنوں سے اسی دن کا انتظار کر رہا تھا۔ مسلسل نگرانی کے بعد آج موقع ملا تھا۔ ایس ایچ او کے بیوی، بچے شادی کے سلسلے میں گاؤں گئے ہوئے تھے۔ اسے مصدقہ اطلاع ملی تھی کہ آج فتح ملک کو داد عیش دینے کے لیے ایک لڑکی بھی موجود ہے۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے اپنے ریوالور پر سائیلنسر فٹ کیا۔ گولیاں چیک کیں اور سامنے قطار میں بنے کمروں کی جانب بڑھ گیا۔ انہی دونوں کمروں میں سے ایک میں اس کا شکار موجود تھا۔ وہ اطمینان سے ایک کمرے کی طرف بڑھا اور دروازے سے کان لگا دیے۔ اندر سے لڑکی کی مخصوص چیخنے کی آواز سن کر خود بھی مسکرا دیا۔
اس نے آہستہ سے دروازے کا ہینڈل گھمایا۔ دروازہ اندر سے لاک تھا۔ اب اسے جو کچھ کرنا تھا، انتہائی تیزی سے کرنا تھا۔ اس نے ریوالور کی نال لاک کے سوراخ میں رکھی اور فائر کر دیا۔ لاک ٹوٹتے ہی وہ تیزی سے اندر داخل ہوا۔ سامنے ہی اس کا شکار لڑکی کے اوپر عریاں لیٹا ہوا تھا۔ اس کا سارا دھیان وجودِ زن پر مرکوز تھا۔ جب ہی اسے فوری طور پر لاک ٹوٹنے اور اس کے اندر آنے کا احساس نہیں ہوا، مگر لڑکی نے اُسے دیکھتے ہی ایک زوردار چیخ ماری۔ فتح ملک نے جیسے ہی گردن گھمائی، وہ اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے ریوالور اس کے ماتھے پر رکھ دیا۔ رافع کو اس حالت میں اپنے سامنے دیکھ فتح ملک کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ لڑکی کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا۔ اس کی آنکھیں باہر نکل آئیں۔ ایک چیخ کے بعد اس کے منہ سے دوسری آواز ہی نہیں نکلی۔ اس سے پہلے فتح ملک کچھ کرتا، رافع نے ٹریگر دبا دیا۔ خون اور بھیجے کے ٹکڑے لڑکی کے عریاں جسم پر پھیل گئے۔ لڑکی کی کھلی آنکھیں ایک دم بند ہو گئیں۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ انہیں اسی حالت میں چھوڑ کر رافع باہر نکلا تو چوکیدار اپنے کیبن میں جا چکا تھا۔ وہ جس راستے بنگلے میں داخل ہوا تھا اسی راستے سے باہر نکل کر اپنی موٹر سائیکل کے پاس پہنچ گیا۔ اندر کا غم وغصہ ٹھنڈا پڑا تو اس کا سینہ ایک انجانے غبار سے بھر گیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے آسمان کے ساتھ اس کی آنکھیں بھی برسنا چاہتی ہیں۔ اس نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور اس کا رخ شہر کے وسط میں واقع ایک قبرستان کی جانب موڑ دیا۔ جہاں فاروق احمد کی آخری آرام گاہ تھی۔

☆☆☆

فقیر داد گمسی کے آبائی شہر میں ہونے والا پارٹی کا جلسہ اختتام پذیر ہو چکا تھا۔ الیکشن کی تیاری پورے زور و شور سے جاری تھی۔ جلسے کے بعد شہر کے معزز مہمانوں کو حویلی میں شاندار ظہرانہ دیا جا رہا تھا۔ پارٹی کے تمام مرکزی رہنما شریک تھے۔ رستم شاہ بھی میزبانی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ کیونکہ آج فقیر داد گمسی اپنی بیٹی کی شادی رستم شاہ کے بھتیجے سے کرنے کا اعلان کرنے والا تھا۔ تمام مہمان خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ڈاکٹر ریحانہ اور مسٹر ناظمی بھی ایک جانب صوفوں پر براجمان تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی پارٹی سربراہ تشریف لے آئے۔ ڈنر شروع ہو گیا۔ ڈاکٹر ریحانہ، مسٹر ناظمی، رستم شاہ اور فقیر داد گمسی ایک میز پر کھانا کھا رہے تھے۔ کھانے کے بعد جیسے ہی مشروبات تقسیم کیے جانے لگے۔ فقیر داد گمسی نے اپنی بیٹی کی شادی کا اعلان کر دیا۔ اب دونوں، سب مہمانوں سے مبارک باد قبول کر رہے تھے۔ رات دیر تک مہمان رخصت ہوتے رہے۔ اب صرف مقامی مہمان ہی رہ گئے تھے جو آہستہ آہستہ رخصت ہو رہے تھے۔ شادی کی تاریخ باہمی مشورے سے بیس اگست رکھ دی گئی۔ کچھ دیر بعد جب فقیر داد گمسی اور رستم شاہ ایک دوسرے سے بغلگیر ہو کر رخصت ہو رہے تھے، وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ انہوں نے شادی کی نہیں، اپنی بربادی کی تاریخ مقرر کر دی ہے۔ اس تاریخ کو ان کے خاندانوں پر قیامت ٹوٹنے والی تھی۔ پھر وہی ہوا جو ازل سے ہی لکھا جا چکا تھا۔ اس دن زندگی دینے والے سے جنگ کرنے والے، ہمیشہ کے لیے نیست و نابود ہونے جا رہے تھے۔

☆☆☆

سب کی نظریں لیپ ٹاپ پر مرکوز تھیں۔ جیسے ہی نادر کی انگلیاں رکیں، سب نے فریال کی جانب دیکھا جو بڑے غور سے لیپ ٹاپ کی اسکرین کو دیکھتے ہوئے ایک چھوٹے سے پیپر پر کچھ لکھ رہی تھی۔
''اگر سمجھ نہیں آیا تو دوبارہ کر کے بتاؤں؟'' نادر نے استفساری نظروں سے فریال کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔
''نہیں...... نہیں بھائی! سمجھ گئی۔'' فریال نے نادر کو مسکراتے ہوئے جواب دیا اور پیپر اپنے پرس میں رکھ لیا۔
''اچھا، ہمیں کر کے دکھاؤ۔! نادر کے پاس بیٹھے

رافع نے فریال سے کہا۔ نادر نے لیپ ٹاپ فریال کی جانب سرکا دیا۔ فریال کی انگلیاں کی بورڈ اور ٹچ پیڈ پر چلنے لگیں۔ دو منٹ میں فریال نے لیپ ٹاپ کا رخ نادر اور رافع کی جانب موڑ دیا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ دونوں نے تعریفی انداز سے فریال کی جانب دیکھا۔

''آخر کمپیوٹر ماسٹر کی بہن ہوں۔'' فریال نے اپنی بھویں اچکاتے ہوئے کہا تو نادر اور رافع کے قہقہوں کے ساتھ ساتھ محبوب بھائی کا قہقہہ بھی کمرے میں گونج اٹھا۔

یہ سب محبوب بھائی کے کمرے میں جمع تھے۔ انسپکٹر ذیشان نے انہیں تمام مطلوبہ سامان مہیا کر دیا تھا۔ رافع، فریال اور محبوب بھائی نے فقیر داد مگسی کی بیٹی کی شادی میں شرکت کرنی تھی۔ جس کی تیاری آخری مراحل میں تھی۔ رافع مووی میکر کی حیثیت سے شادی میں موجود رہتا۔ فریال اور محبوب بھائی ایک مہمان کے طور پر رافع کا ساتھ دینے کے لیے اس کے آس پاس ہی رہتے۔ انسپکٹر ذیشان اور نیاز ان کے سہولت کار تھے۔ نادر کا کام سب سے اہم تھا۔ وہ محبوب بھائی کے گھر میں بیٹھا، لیپ ٹاپ پر شادی ہال کے تمام سی سی ٹی وی کیمروں کو اپنے کنٹرول میں لیتا۔ جس کے لیے ایک سوفٹ ویئر یو ایس بی میں فریال کو دیا جا چکا تھا اور اس کو انسٹال کرنا اور نادر کو کال کے ذریعے آئی ڈی اور پاس ورڈ بتانا تھا۔ جو فریال نے ایک دو دفعہ دیکھنے سے ہی سیکھ لیا تھا اور ضروری باتیں لکھ بھی لی تھیں۔ ساڑھے سات بج چکے تھے، انہیں آٹھ بجے نکلنا تھا۔ ایک بار پھر تمام احتیاطی تدابیر کا جائزہ لینے کے بعد وہ نکلنے کے لیے بالکل تیار تھے۔ انسپکٹر ذیشان نے محبوب بھائی اور فریال کے لیے شادی کارڈ کا انتظام کر دیا تھا، جسے دکھا کر وہ ہال میں پہنچ جاتے، رافع کا گیٹ پاس وہ اسے گزشتہ رات ہی دے گیا تھا۔ محبوب بھائی نے اپنے ذرائع سے کیمرے کا انتظام کر دیا تھا۔

جیسے ہی وہ تینوں نکلے، نادر نے لیپ ٹاپ کو چارج پر لگا دیا۔ اسے پتا تھا ایک گھنٹے بعد اس کا کام شروع ہو جائے گا۔ وہ اب کرسی پر ٹیک لگائے، دل ہی دل میں ان کی کامیابی کی دعائیں مانگنے لگا۔

☆☆☆

شہر کے پوش علاقے کا سب سے خوبصورت شادی ہال برقی قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ ہال کے اندر بھی روشنی کا ایسا انتظام تھا کہ پورا ہال ہی بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔

آج فقیر داد مگسی کی بیٹی کی شادی تھی۔ دوستی اب رشتے داری میں بدلنے جا رہی تھی۔

مہمانوں کی آمد شروع ہو چکی تھی۔ ہال آہستہ آہستہ مہمانوں سے بھرتا جا رہا تھا۔ مہمانوں میں ملک کے ممتاز سیاست دان بیوروکریٹس اور مشہور و معروف بزنس مین شامل تھے۔ ہال کے اندر سیکیورٹی کا سارا انتظام پولیس کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ جو سادہ لباس اور باوردی سب پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے۔ انسپکٹر ذیشان کی ڈیوٹی پانچ ماتحتوں کے ساتھ مین گیٹ پر لگائی گئی تھی۔ وہ سب گیٹ پر چوکس کھڑے تھے۔ ہر آنے جانے والوں کی سخت جانچ پڑتال کی جا رہی تھی۔ مشہور اور معروف شخصیات کے اندر آنے کے لیے ایک الگ سے دروازہ تھا۔ جہاں ایس پی صاحب بذاتِ خود رینجرز اہلکاروں کے ساتھ موجود تھے۔

انسپکٹر ذیشان نے ایک بار پھر ہال کے باہر آکر پارکنگ ایریے اور اردگرد کا طائرانہ جائزہ لیا۔ نیاز گیٹ پر کھڑا آنے والے ہر مہمان کو نظر میں رکھے ہوا تھا۔ ہمیشہ کی طرح چاق و چوبند نظر آ رہا تھا۔ جب سے وہ انسپکٹر ذیشان کے ساتھ کام کرنے لگا تھا، اس کی تو جیسے من کی مراد بر آئی تھی۔ پولیس فورس میں جس مقصد کے لیے بھرتی ہوا تھا، وہ مقصد صحیح معنوں میں پورا ہو رہا تھا۔ آج بہت اہم دن تھا۔ جس کا انتظار انسپکٹر ذیشان اور نیاز کے ساتھ ساتھ کچھ اور لوگ بھی کر رہے تھے۔ اچانک انسپکٹر ذیشان کی نظر مرکزی گیٹ پر پڑی۔ جہاں محبوب بھائی اور فریال کھڑے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور وہ تیزی سے گیٹ کی جانب لپکا۔ نیاز نے جب انسپکٹر ذیشان کو اس انداز سے اپنی طرف آتے دیکھا تو فوراً الرٹ ہو گیا۔

''تمام ڈرائیورز کو پارکنگ ایریا تک محدود رکھو اور کسی بھی غیر متعلقہ افراد کو ہال کے احاطے کے اندر آنے کی اجازت نہیں دینا۔'' اپنے اہلکاروں کو ہدایات دیتا ہوا وہ گیٹ کے پاس پہنچ گیا اور دو اہلکاروں کو پارکنگ کی جانب بھیج دیا۔

''سر پلیز! آپ اندر آ جائیں!'' نیاز انسپکٹر ذیشان کا اشارہ ملتے ہی محبوب بھائی سے مخاطب ہوا۔

محبوب بھائی مسکراتے ہوئے گیٹ کے قریب آئے اور ہاتھ میں پکڑا ہوا دعوت نامہ انسپکٹر ذیشان کے سامنے کر دیا۔

''جی سر! آپ گیٹ نمبر ون سے اندر تشریف لے جائیں۔'' انسپکٹر ذیشان نے کارڈ پر ایک نظر ڈالی اور

اندرونی گیٹ کی طرف اشارہ کر دیا اور نیاز کو محبوب بھائی اور فریال کے ساتھ جانے کو کہا۔ ان کے اندر جاتے ہی رافع بھی اپنے کندھے پر بیگ اور ہاتھ میں کیمرا لٹکائے گیٹ پر نمودار ہوا۔ اسی اثنا میں پارکنگ کی جانب گئے ہوئے دونوں اہلکار بھی واپس پہنچ گئے۔ انسپکٹر ذیشان نے رافع کو وہیں گیٹ پر روک دیا۔ خود آگے بڑھ کر اس کی جامہ تلاشی لی اور بیگ کو کھول کر ایک نظر دیکھا اور اندر جانے کا اشارہ کر دیا۔

ابتدائی کام پورا ہو چکا تھا۔ اب وہ مرحلہ شروع ہونے والا تھا، جس کے اختتام تک اسے اور نیاز کو بہت ہوشیاری اور عقلمندی سے کام لینا تھا۔ جس کی وہ منصوبہ بندی کر کے آئے تھے۔

☆☆☆

محبوب بھائی اور فریال نے اسٹیج سے دور ایسی میز کا انتخاب کیا۔ جہاں سے کسی کی نظر براہِ راست ان پر نہیں پڑ سکتی تھی۔ محبوب بھائی کو اتنا خطرہ نہیں تھا، جتنا فریال کو تھا۔ ڈاکٹر ریحانہ اور رستم شاہ اسے اچھی طرح جانتے تھے۔ دونوں نے بیٹھنے کا رخ بھی ایسا اختیار کیا کہ کسی کی نظر اگر پڑ بھی جاتی تو کوئی پہچان نہیں سکتا تھا۔ فریال نے اپنے حلیے میں تھوڑی سی تبدیلی کر لی تھی۔ ہلکے سے میک اَپ، ہیئر اسٹائل اور لباس سے وہ قدرے بڑی عمر کی خاتون لگ رہی تھی۔

اسی اثنا میں رافع بھی ہال میں داخل ہو گیا۔ محبوب بھائی اور فریال جس میز پر بیٹھے تھے، اس کی دائیں طرف ہال کا آفس تھا۔ آفس کی ایک کھڑکی میں ڈارک براؤن گلاس لگا ہوا تھا۔ آفس کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا روم تھا جس پر کنٹرول روم کی تختی آویزاں تھی۔ اس کے آگے ہی ایک طرف لیڈیز اور دوسری طرف جینٹس واش روم بنے ہوئے تھے۔ فریال کو کنٹرول روم میں جانا تھا اور اپنا کام سرانجام دینا تھا۔ اسے انسپکٹر ذیشان کے اشارے کا انتظار تھا جو کسی بھی وقت مل سکتا تھا۔ فریال نے اپنے ذہن میں ایک بار پھر سب دہرایا، جو اس کی ذمے داری تھی۔ موبائل کی پیغامی ٹون پر وہ اپنے خیالات سے چونک کر باہر آ گئی۔ اس نے پیغام پڑھا اور دروازے کی جانب دیکھا۔ جس میں سے انسپکٹر ذیشان اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس نے جلدی سے بیگ میں سے اسکن کلر کے باریک دستانے نکالے اور ہاتھ پر چڑھا لیے۔ چند سیکنڈ بعد فریال اٹھی اور اپنا پرس سنبھالتے ہوئے کنٹرول روم کی جانب بڑھ گئی۔ اس کے اٹھتے ہی رافع، محبوب بھائی اور انسپکٹر ذیشان چوکنا ہو گئے۔ فریال نے کنٹرول روم کی جانب بڑھتے ہوئے اپنے بیگ کی زپ کھولی اور اس میں ہاتھ ڈال دیا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے ایک لمبا سانس لیا اور دستک دی۔ اسے یقین تھا، اندر بیٹھا شخص اسے کیمرے میں ضرور دیکھے گا اور فوراً دروازہ کھول دے گا۔ وہی ہوا آٹومیٹک دروازے کا لاک یکدم کھول گیا۔ دروازہ کھلتے ہی فریال تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ اس سے پہلے کہ اندر بیٹھا شخص اس سے آنے کا سبب پوچھتا، فریال نے اپنے بیگ سے ایک سرنج نکالی جو تین سی سی تک بھری ہوئی تھی، حیرت سے تکتے شخص کی گردن میں پیوست کر کے پوری خالی کر دی۔ فریال کا چہرہ پُرسکون تھا۔ اسے یقین تھا باہر سے کوئی مداخلت نہیں ہوگی۔ انسپکٹر ذیشان اس طرف کسی کو بھٹکنے نہیں دے گا۔ کرسی پر بیٹھے شخص نے چند لمحوں میں ہی ہاتھ پیر چھوڑ دیے۔ اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ فریال نے جلدی سے بیگ سے یو ایس بی نکالی اور سامنے رکھے کمپیوٹر سے منسلک کر دی۔ ساتھ میں اس نے پیپر لیا اور سامنے رکھ لیا۔ اب اس کے ہاتھ میں ماؤس تیزی سے حرکت کرنے لگا۔ سوفٹ ویئر انسٹال اور اوپن کرنے کے بعد اس نے پرس سے موبائل نکالا اور نادر کو کال کر کے جلدی جلدی آئی ڈی اور پاس ورڈ بتانے لگی۔ چند لمحوں بعد ہی نادر، محبوب بھائی کے گھر بیٹھا، ہال کا سی سی ٹی وی کیمروں کا کنٹرول سنبھال چکا تھا۔ فریال کے منہ سے اطمینان بھری سانس خارج ہو گئی۔ سامنے رکھی چابیاں اٹھا کر بیگ میں رکھیں اور ہاتھ بڑھا کر میز کے ساتھ لگا بٹن دبا دیا، جس سے دروازے کا لاک کھل گیا، وہ اطمینان سے باہر نکل آئی۔

☆☆☆

محبوب بھائی فریال کے باہر آتے ہی واش روم کی جانب بڑھ گئے۔ فریال ان کے پاس سے گزرتی ہوئی اپنی میز پر آ کر بیٹھ گئی۔ محبوب بھائی نے واش روم میں داخل ہوتے ہی اپنی جیب سے موبائل اور چھوٹا سا ہیڈ فون نکالا۔ ہیڈ فون کان میں لگاتے ہی باری باری رافع، نادر، فریال اور انسپکٹر ذیشان کو کال کرنے لگے۔ اب یہ پانچوں کانفرنس کال پر ایک دوسرے سے رابطے میں تھے۔

انہوں نے ہاتھ سے اپنی واسکٹ کے اندر چھپے سائیلنسر لگے پسٹل کو محسوس کیا اور واش روم سے باہر نکل آئے۔ ایسا ہی ایک پسٹل رافع کے پاس بھی تھا اور ایک انسپکٹر ذیشان کی کمر کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ پندرہ منٹ کے بعد ہی نادر کی جانب سے ”سب ٹھیک ہو گیا“ کا اشارہ... مل گیا۔ اس

وقت پارٹی کے سربراہ اور رہنما نکاح کے بعد دولھا کو مبارک باد دے رہے تھے۔ اس کے بعد کھانا شروع ہو جاتا۔ اب انہیں اس لمحے کا انتظار تھا۔ جب یہ چاروں ایک جگہ جمع ہوں اور وہ لمحہ فوٹو سیشن کے دوران ہی مل سکتا تھا۔ انسپکٹر ذیشان کا اشارہ ملتے ہی پورے ہال کی لائٹ دس سیکنڈ کے لیے بند ہو جاتی۔ یہ ذمے داری نیاز نے نبھانی تھی۔ اسی دوران رافع، محبوب بھائی، انسپکٹر ذیشان اور فریال کو اپنا کام کرنا تھا۔ چاروں نے اپنے ٹارگٹ منتخب کر لیے تھے۔ رستم شاہ اور دولھا بنے اس کے بھتیجے کو رافع کو ختم کرنا تھا۔ فقیر داد کو محبوب بھائی نے چن لیا تھا۔ فقیر داد کو پلاننگ کے مطابق صرف زخمی کرنا تھا۔ کیونکہ فقیر داد کے ''سہولت کار'' ہونے کے ٹھوس ثبوت انسپکٹر ذیشان کے پاس محفوظ تھے۔ انسپکٹر ذیشان کا نشانہ مسٹر ناظمی تھا۔ انسپکٹر ذیشان کے حکم کے مطابق انہیں دشمنوں کے سر میں گولی مارنی تھی۔ تاکہ زیادہ شور شرابہ نہ ہو۔ اور وہ انہیں کور کر کے محفوظ جگہ پہنچا دے۔ اس جگہ تک پہنچانے کے لیے اس نے وی وی آئی پی گیٹ کا انتخاب کیا تھا۔ ان کے لیے ایک پولیس موبائل تیار کھڑی تھی۔ جسے نیاز نے اپنا کام ختم کر کے ہال کے احاطے سے نکال کر لے جانا تھا۔ فریال کو اس دوران دوبارہ کنٹرول روم میں جا کر سوفٹ ویئر انسٹال کرنا تھا۔ ڈاکٹر ریحانہ اور فقیر داد مگسی کو زندہ چھوڑنے کا فیصلہ ایک خاص مقصد کے تحت کیا گیا تھا۔ اب محبوب بھائی اسٹیج کے قریب پہنچ چکے تھے۔ انہیں امید نہیں تھی کہ ڈاکٹر ریحانہ انہیں پہچان لے گی مگر پھر بھی وہ اس جانب کم ہی رخ کر رہے تھے۔ انہوں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو رافع بھی کیمرا کندھے سے لگائے، دوسری جانب سے اسٹیج کے قریب پہنچ چکا تھا۔

☆☆☆

رافع نے اپنی پی کیپ کی اوٹ سے محبوب بھائی کی طرف دیکھا، جو اسی کو دیکھ رہے تھے۔ اسی لمحے اس کے کانوں میں انسپکٹر ذیشان کی سرگوشی گونجی۔

''ابھی نہیں...... تھوڑا انتظار۔'' یہ سرگوشی بیک وقت محبوب بھائی، فریال اور نادر نے بھی سنی۔ اسٹیج پر اس وقت پارٹی کا سربراہ اور دیگر رہنما موجود تھے۔ ان کے باڈی گارڈ اسٹیج کے آس پاس ہی منڈلا رہے تھے۔ بس یہ بھیڑ چھٹتے ہی نئی نسل پر موت کے سیاہ بادل بھی ہمیشہ کے لیے چھٹ جانے والے تھے۔ رافع کی نظریں اب کیمرے کی اوٹ سے محبوب بھائی اور انسپکٹر ذیشان کو ہی دیکھ رہی تھیں۔ انسپکٹر ذیشان، مسٹر ناظمی اور ڈاکٹر ریحانہ کے قریب سے گزر کر ان کے ساتھ والی میز کے پاس کھڑا تھا جبکہ محبوب بھائی ایسی پوزیشن پر تھے کہ اشارہ ملتے ہی ایکشن میں آ جاتے۔ اچانک پارٹی کا سربراہ موبائل فون کان سے لگائے، عجلت میں اسٹیج سے اترا اور وی وی آئی پی گیٹ کی جانب بڑھ گیا۔ اس کے دو باڈی گارڈ بھی تیزی سے اس کے پیچھے لپکے۔ رافع نے دیکھا، انسپکٹر نے تیزی سے اپنی جگہ چھوڑی اور گیٹ کی جانب دوڑا۔ رافع نے محبوب بھائی کی جانب دیکھا تو وہ بھی مضطرب نظر آئے، مگر چند لمحوں کے بعد ہی اس کے کان میں سرگوشی گونجی۔ ''سب ٹھیک ہے۔'' اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ اب آہستہ آہستہ اسٹیج سے بھیڑ چھٹ رہی تھی۔ ایک ایک کر کے سب مبارک باد دے کر اسٹیج سے اتر رہے تھے۔ رافع نے دیکھا کہ انسپکٹر ذیشان نے جیب سے دوسرا موبائل نکالا اور ایک پیغام لکھ کر دوبارہ جیب میں ڈال لیا۔ وہ پروفیشنل انداز سے کیمرے کو گھماتا ہوا اسٹیج کو کور کرنے لگا۔ دس منٹ اعصاب شکن انتظار کے بعد ہی ہال تاریکی میں ڈوب گیا۔ اس کے ساتھ ہی سب کے کانوں میں انسپکٹر ذیشان کی آواز گونجی۔ ''ایکشن۔''

☆☆☆

ملک میں الیکشن ہو چکے تھے۔ فقیر داد مگسی کی پارٹی پورے ملک میں بری طرح شکست کھا چکی تھی۔ مرکز تو دور کی بات، صوبائی حکومت میں بھی اسے اپوزیشن میں بیٹھنا پڑا۔ پارٹی نے اپنے رہنما کے قتل اور گرفتاری کو الیکشن میں کیش کروانے کی پوری کوشش کی مگر انسپکٹر ذیشان نے ان کی تمام غیر قانونی سرگرمیوں کو مع ثبوت کے ساتھ اعلیٰ احکام اور خفیہ طور پر میڈیا کے حوالے کر دیا تھا۔ ڈاکٹر ریحانہ اور فقیر داد مگسی کو گرفتار کر لیا گیا۔ الشفا اسپتال کا تمام ریکارڈ تحویل میں لے کر اسپتال کو کچھ عرصے کے لیے سیل کر دیا گیا۔ پورے ملک میں متعلقہ این جی او کو کام کرنے سے روک دیا گیا اور اس کے ریکارڈ کی باریک بینی سے جانچ کرائی جانے لگی۔ ایک ماہ کے دوران جب ڈاکٹر ریحانہ سے تفتیش اور جانچ پڑتال مکمل ہوئی تو گرفتاریوں کا سلسلہ آزاد کشمیر و شمالی علاقہ جات تک پھیل گیا۔

امریکا میں قائم بیوٹی اینڈ بیوٹی کمپنی کے خلاف وہاں کے متعلقہ اداروں کو آگاہ کر دیا گیا۔ پاکستان کی جانب سے دیے گئے ٹھوس ثبوتوں کی بنیاد پر۔ امریکا کے سیکیورٹی اداروں نے کمپنی کے خلاف فوری ایکشن لیا۔ رابرٹ کو

گرفتار کرلیا گیا۔ اس سے تفتیش کے دوران ہوشربا انکشاف سامنے آئے۔ کمپنی کی مشہور بیوٹی کریم میں استعمال ہونے والے مختلف غیر قانونی اجزاء استعمال کیے جاتے تھے جن میں ایک جز ایسا بھی استعمال کیا جاتا تھا جو انسانی جلد پر حیرت انگیز طور پر اثر کرتا تھا۔ مہینوں بعد رونما ہونے والی تبدیلیاں دنوں میں رونما ہو جاتی تھیں۔ اسی وجہ سے یہ پراڈکٹ دنیا بھر کے اعلیٰ طبقے کی خواتین میں تیزی سے مشہور ہورہی تھی اور یہ جزُ انسانی جسم سے ہی حاصل کیا جاتا تھا جس کی وجہ سے انسانی ”فیٹل پول“ کی مانگ بھی بڑھ گئی تھی۔ عراق امریکا جنگ میں، اپنے وطن سے غداری اور امریکا کی غلامی کا دم بھرنے والا ناظمی تو مارا جاچکا تھا۔ این جی او کی مختلف ممالک میں کام کرنے والی تمام شاخیں بھی فوری طور پر بند کردی گئیں۔ انسپکٹر ذیشان یکدم ہی ہیرو بن گیا۔ ہر کامیابی کے پیچھے اس کا نام لیا جارہا تھا لیکن وہ جانتا تھا۔ یہ سب ان لوگوں کی محنت ہے، جو آنے والی نسل کا درد دل میں رکھتے ہیں۔ جنہیں اپنے لوگوں سے، اپنے وطن سے اور اپنی نسلِ نو سے پیار ہے۔ انسپکٹر ذیشان شاندار کامیابیوں کے بعد بھی ناکام تھا۔ اسے اپنے تین چھٹی بند بھائیوں اور شادی ہال میں خون خرابہ کرنے والے قاتلوں کو بھی پکڑنا تھا۔ جس کی پلاننگ آج رات ہونے والی تھی اور یہ کوئی معمولی رات نہیں تھی۔ یہ رافع اور فریال کی سہاگ رات تھی۔ جس میں یہ بات طے ہوئی تھی کہ پولیس اہلکاروں کا اصل قاتل اور شادی ہال میں ہونے والی خونریزی کا ماسٹر مائنڈ صبح کس انداز میں اپنی گرفتاری پیش کرے گا۔

☆☆☆

مسجدوں سے فجر کی اذانیں ختم ہو چکی تھیں۔ ہر طرف ایک پُرسکون سا سکوت طاری تھا۔ کچھ دیر بعد اس سکوت کو سرکاری جوتوں کی منظم دھیمی دھیمی دھمک تار تار کررہی تھی۔ پانچ منٹ میں ہی دو درجن سے زائد پولیس اہلکاروں نے ایک مکان کو گھیرے میں لیا۔ مصدقہ اطلاع کے مطابق، دو پولیس اہلکار اور ایس ایچ او فتح ملک کا قاتل اور شادی ہال میں ہونے والی خونریزی کا ماسٹر مائنڈ اس وقت مکان کے اندر موجود تھا۔ انسپکٹر ذیشان خود اس کارروائی کی سربراہی کر رہا تھا۔ مکان اس وقت گھپ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایک کمرے سے بلب کی زرد روشنی روشن دان سے باہر نکل رہی تھی۔ انسپکٹر ذیشان نے پولیس اہلکاروں کی پوزیشن سیٹ کی... اور چار بہترین اہلکار جن میں نیاز پیش پیش تھا۔ اپنے ساتھ لے کر، دبے پاؤں مکان کے دروازے تک جا پہنچا۔

چوبی دروازہ اندر سے بند تھا۔ انسپکٹر ذیشان نے کچھ دیر دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر سوچا اور اپنے پسٹل کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر چوکس ہو گیا۔ آنکھوں کے اشارے سے دیوار کے ساتھ کھڑے دو اہلکاروں کو دروازہ توڑنے کا حکم دیا۔ اہلکار دروازے کے سامنے پہنچ کر دو قدم پیچھے ہٹے اور ایک ساتھ دروازے پر زوردار لات ماری۔ جس کے نتیجے میں دروازہ زوردار آواز کے ساتھ اندر کی جانب ٹوٹ کر چھوٹے سے صحن میں جاگرا۔ دروازہ ٹوٹتے ہی چاروں اہلکار اپنی بندوقیں لیے فوراً اندر داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے پیچھے انسپکٹر ذیشان بھی اندر داخل ہوا۔ سامنے برآمدے کا منظر دیکھ کر سب ٹھٹک کر رک گئے۔ سامنے ایک شخص نماز کی نیت باندھے کھڑا تھا۔ انسپکٹر ذیشان کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اہلکاروں کو گھر کی تلاشی لینے کو کہا اور خود اپنا پسٹل ہاتھ میں پکڑے، نماز پڑھنے والے شخص کو دیکھنے لگا۔ دو منٹ کے بعد ہی اہلکاروں نے گھر کو کلیئر قرار دے دیا۔ نماز پڑھنے والے شخص نے سلام پھیرا اور ایک نظر کمرے میں موجود اہلکاروں کو دیکھا۔ بندوقیں یکدم اس پر تان لی گئیں۔ یہ سب ایک منصوبہ بندی کے ساتھ ہوا تھا۔ انسپکٹر ذیشان پُرسکون تھا۔

”آپ لوگ بیٹھیں! دو رکعت فرض پڑھ لوں، پھر چلتے ہیں۔“

انسپکٹر نے اثبات میں گردن ہلائی اور اہلکاروں کو بندوقیں نیچے کرنے کا اشارہ کردیا۔

دس منٹ کے بعد ہی انسپکٹر ذیشان پولیس موبائل میں ملزم کے ساتھ بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اس اہم کامیابی کو کس کے نام منسوب کرے۔ اُسے یقین تھا، اس کیس کو حل کرنے کے بعد اس کی ترقی لازماً ہوگی۔ لیکن ترقی سے زیادہ وہ اس بات پر خوش تھا کہ اس نے آنے والی نسل کے دشمنوں کا ساتھ نہیں دیا۔ اس نے ممنون نظروں سے ہتھکڑی لگے ملزم کو دیکھا جو اسی کی جانب دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

”محبوب بھائی! آپ کی یہ قربانی آنے والی نسل پر ایک احسان ہے۔“ انسپکٹر ذیشان نے ملزم کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

انسپکٹر ذیشان کی بات سن کر محبوب بھائی کے چہرے پر آسودہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور آنکھیں بند کرلیں۔

❖❖❖